رجسٹرڈ نمبر ال

جولائی ۱۹۸۰ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

قیمت پندرہ روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(کاتب حلیم تابانی)

جلد ۱۲۶ ماہ شعبان المعظم ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۸۰ء عدد ۱

مضامین

مقالات

وفیات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے چودہ سو سال ہو رہے ہیں، اس مدت میں عیسائی مبلغین، مورخین اور مستشرقین یہ دکھانے کی برابر کوشش کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کی تاریخ سفاکیوں، ہولناکیوں اور خونریزیوں سے ایسی بھری ہوئی ہے کہ یہ قصائی کی دوکان نظر آتی ہے، ع :- ہیں اُن کی گفتگو کے انداز مجرمانہ،

عیسائی مسلمانوں کے خلاف یہ جارحانہ رنگ اختیار کر کے اپنی داغدار تاریخ کی مدافعت کرتے ہیں، کیونکہ درحقیقت ان ہی کی تاریخ شروع سے مذبح خانہ بنی رہی، یورپ کے فرمانروا چارلس اعظم کی فتوحات کی بڑی دھوم ہے، اس نے سیکسن، ایوارڈ، لمبارڈ، وسطی یورپ کے جرمن قبیلوں اور شمالی اٹلی کو اپنے زیرنگیں کر کے ایک بڑی سلطنت بنالی تھی، جب سیکسن اس کے خلاف اٹھے تو اس نے ایک روز ساڑھے چار ہزار سیکسن کو تہ تیغ کیا، شمالی سیکسنی، اور ناردل نن جن کو تباہ و برباد کرا دیا، وہاں کی عورتوں اور بچوں کو گھسیٹ کر اُن کے گھروں سے نکلوایا، اور ان کو جلا وطن کیا، اس کی تفصیل کیمبرج میڈیول ہسٹری جلد دوم میں پڑھی جا سکتی ہے، ولیم اول نے ۱۰۶۶ء میں انگلستان کو فتح کیا، تو اس کے حکم سے مفتوحہ علاقے کے گھر، کھلیان، اور کھیت وغیرہ سب کچھ جلا دیئے گئے، ایک لاکھ سے زیادہ مردوں، بچوں اور عورتوں کو قتل کرایا، لِن گارڈ نے تاریخ انگلستان جلد دوم میں لکھا ہے، کہ یارک اور ڈرہم کے علاقے اس طرح تباہ کر دیئے گئے تھے کہ نو سال تک وہاں کی زمین کھیتی کے لائق نہیں رہی، ایڈم نے اپنی پولیٹکل ہسٹری آف انگلینڈ جلد دوم میں لکھا ہے کہ اس زمانہ میں فاتحین مفتوحین کے ساتھ کسی قسم کی رو رعایت نہیں کرتے،

سینٹ برتھالومیو ایک مشہور کیتھولک ولی گذرا ہے، اس کا میلہ ہر سال ۲۴ اگست کو ہوا کرتا ہے ۱۵۷۲ء میں عین اس میلے کی رات کو فرانس کے بادشاہ چارلس نہم کے حکم سے ملک کے کل پروٹسٹنٹ قتل کر ڈالے گئے، ان کی تعداد صرف پیرس میں پانچ سو معززین اور دس ہزار عوام کی تھی یہ قتل عام تاریخ کا بڑا مشہور واقعہ ہے،

سترہویں صدی میں جرمنی میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کی جنگ شروع ہوئی، جو یورپ کی تیس سالہ جنگ کے نام سے مشہور رہی، یورپ کی بہت سی حکومتیں اس میں الجھ کر رہ گئی تھیں، مورخین کا بیان ہے کہ اس لڑائی میں بوہیمیا کے ۳۵ ہزار گاؤں میں سے صرف چھ ہزار باقی رہ گئے تھے، بویریا، فرنیکونیا، اور سوابیا میں غارتگری ایسی کی گئی کہ یہ سارے علاقے قحط اور امراض سے تباہ ہوکر ویران ہوگئے، جرمنی میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کی آبادی تھی، اس جنگ کے بعد صرف ساٹھ لاکھ رہ گئی، اسپینیوں نے میکسیکو اور پیرو پہونچ کر جو مظالم کئے، اُن کی ہولناک تفصیل پریس کوٹ کی تاریخ میں پڑھی جاسکتی ہے، اُن کے ہاتھوں میں بائبل ہوتی، ان کی معیت میں پادری ہوتے، اور وہ مذہب کے نام پر تمام ہولناکیاں برُوے کار لاتے، جو اُن کا ذہن سوچ سکتا تھا، ڈچ ریپبلک کے مصنف موٹلے نے لکھا ہے کہ ۱۵۶۸ء میں پوپ کے حکم سے نیدرلینڈ کے ۳۰ لاکھ باشندے سولی پر چڑھائے گئے

۱۹۱۴ء کی پہلی جنگِ عظیم میں کیا کچھ نہیں ہوا، مشہور مورخ ایچ۔ جی۔ ویلس نے لکھا ہے کہ اس سوا چار سال کی جنگ میں ایک کروڑ آدمی تو میدانِ جنگ میں مارے گئے، دو ڈھائی کروڑ کی جانیں اس زمانہ کے مصائب میں تلف ہوئیں، کروڑوں طرح طرح کی مصیبتوں میں گھرے اور اچھی غذاؤں سے محروم رہے، دوسری جنگِ عظیم میں اتنی ہی جانیں ضائع ہوئیں، اور اسی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے چودہ سو سال ہو رہے ہیں، اس مدت میں عیسائی مبلغین مورخین اور مستشرقین یہ دکھانے کی برابر کوشش کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کی تاریخ سفاکیوں ہولناکیوں اور خونریزیوں سے ایسی بھری ہوئی ہے کہ یہ قصائی کی دوکان نظر آتی ہے، ع :- ہیں اُن کی گفتگو کے انداز مجرمانہ، عیسائی مسلمانوں کے خلاف یہ جارحانہ رنگ اختیار کر کے اپنی داغدار تاریخ کی مدافعت کرتے ہیں، کیونکہ درحقیقت ان ہی کی تاریخ شروع سے مذبح خانہ بنی رہی، یورپ کے فرمانروا چارلس اعظم کی فتوحات کی بڑی دھوم ہے، اس نے سیکسن، ایوارڈ، لیبارڈ، وسطی یورپ کے جرمن قبیلوں اور شمالی اٹلی کو اپنے زیر نگیں کر کے ایک بڑی سلطنت بنالی تھی، جب سیکسن اس کے خلاف اٹھے تو اس نے ایک روز ساڑھے چار ہزار سیکسن کو تہ تیغ کیا، شمالی سیکسنی، اور نارول نن جن کو تباہ و برباد کرا دیا، وہاں کی عورتوں اور بچوں کو گھسیٹ کر ان کے گھروں سے نکلوایا، اور ان کو جلا وطن کیا، اس کی تفصیل کیمبرج میڈیول ہسٹری جلد دوم میں پڑھی جا سکتی ہے، ولیم اول نے سنہ ۱۰۶۶ء میں انگلستان کو فتح کیا، تو اس کے حکم سے مفتوحہ علاقے کے گھر، کھلیان، اور کھیت وغیرہ سب کچھ جلا دیئے گئے، ایک لاکھ سے زیادہ مردوں بچوں اور عورتوں کو قتل کرایا، لن گارڈ نے تاریخ انگلستان جلد دوم میں لکھا ہے، کہ یارک اور درہم کے علاقے اس طرح تباہ کر دیئے گئے تھے کہ نو سال تک وہاں کی زمین کھیتی کے لائق نہیں رہی، ایڈم نے اپنی پولٹیکل ہسٹری آف انگلینڈ جلد دوم میں لکھا ہے کہ اس زمانہ میں فاتحین مفتوحین کے ساتھ کسی قسم کی رو رعایت نہیں کرتے،

سینٹ برتھالومیو ایک مشہور کیتھولک ولی گذرا ہے، اس کا میلہ ہر سال ۲۴ اگست کو ہوا کرتا ہے، ۱۵۷۲ء میں عین اس میلے کی رات کو فرانس کے بادشاہ چارلس نہم کے حکم سے ملک کے کل پروٹسٹنٹ قتل کر ڈالے گئے، ان کی تعداد صرف پیرس میں پانچ سو معززین اور دس ہزار عوام کی تھی یہ قتل عام تاریخ کا بڑا مشہور واقعہ ہے،

سترھویں صدی میں جرمنی میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کی جنگ شروع ہوئی، جو یورپ کی تیس سالہ جنگ کے نام سے مشہور ہے، یورپ کی بہت سی حکومتیں اس میں الجھ کر رہ گئی تھیں، مورخین کا بیان ہے کہ اس لڑائی میں بوہیمیا کے ۳۵ ہزار گاؤں میں سے صرف چھ ہزار باقی رہ گئے تھے، بویریا، فرینکونیا، اور سوابیا میں غارتگری ایسی کی گئی کہ یہ سارے علاقے قحط اور امراض سے تباہ ہو کر ویران ہو گئے، جرمنی میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کی آبادی تھی اس جنگ کے بعد صرف ساٹھ لاکھ رہ گئی، اسپینیوں نے میکسیکو اور پیرو پہنچ کر جو مظالم کئے، اُن کی ہولناک تفصیل پریس کوٹ کی تاریخ میں پڑھی جا سکتی ہے، اُن کے ہاتھوں میں بائبل ہوتی، ان کی معیت میں پادری ہوتے، اور وہ مذہب کے نام پر تمام ہولناکیاں بروے کار لاتے، جو اُن کا ذہن سوچ سکتا تھا، ڈچ ریپبلک کے مصنف موٹلے نے لکھا ہے کہ ۱۵۶۵ء میں پوپ کے حکم سے نیدرلینڈ کے ۳۰ لاکھ باشندے سولی پر چڑھائے گئے

۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم میں کیا کچھ نہیں ہوا، مشہور مورخ ایچ ۔ جی ۔ ویلس نے لکھا ہے کہ اس سوا چار سال کی جنگ میں ایک کروڑ آدمی تو میدان جنگ میں مارے گئے، دو ڈھائی کروڑ کی جانیں سامانہ کے مصائب میں تلف ہوئیں، کروڑوں طرح طرح کی مصیبتوں میں گھرے اور اچھی غذاؤں سے محروم رہے، دوسری جنگ عظیم میں اتنی ہی جانیں ضائع ہوئیں، اور اسی

حساب کا سامنا، عیسائیوں کے مظالم کی انتہا دیکھنی ہیں؟ آج جب مغربی
یورپ نے ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر اس کے لاکھوں مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو چشم زدن میں
موت کے گھاٹ اس طرح اتار دیئے، کہ چنگیز اور ہلاکو کی ساری داستانیں بھلا دی گئیں۔

ویٹ نام میں امریکہ کے عیسائیوں نے تین سال تک جنگ کی، لندن کے اخبار ٹائمس کا بیان ہے کہ اس مدت میں امریکی فضائیہ نے اٹھارہ لاکھ ننانوے ہزار چھ سو اڑسٹھ حملے کئے، ستر لاکھ ستائیس ہزار چوراسی ٹن بم گرائے، وہاں کے نباتات کو تباہ کرنے کے لئے ایک کروڑ نوے لاکھ گیلن کا تباہ کن مادہ پھینکا، ۵۱ لاکھ ایکڑ پر زہریلی دوائیں چھڑکیں، جن کا اثر ایک سو برس تک رہے گا، ایک کروڑ افراد بے گھر ہوئے، نو لاکھ بچے یتیم، اور پندرہ لاکھ ساٹھ ہزار شہری مجروح ہوئے، چھتیس لاکھ باسٹھ ہزار آدمی مارے گئے،

عیسائیوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو سفاکی دکھائی، اس پر بھی ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے، وہ افریقہ، ایشیا اور دنیا کے کسی خطہ میں جا کر اپنی سامراجیت کا پرچم لہرائیں، تو اس کو ہر طرح حق بجانب ثابت کرتے ہیں، مگر یورپ میں مسلمانوں نے کسی خطہ میں اپنا قدم جمایا تو وہ اس کو کبھی گوارا نہیں کیا، سسلی میں مسلمانوں نے دو سو برس تک حکومت کی، اور یہاں سے بقول ڈریپر یورپ کی عقلی اور دماغی ترقی کو بڑی تقویت پہنچائی، مگر عیسائیوں کی نظروں میں اُن کی حکومت برابر کھٹکتی رہی، جب نارمن عیسائیوں نے ان پر حملہ کیا تو پلرم شہر میں پانچ سو مسجدیں تھیں، ان کو منہدم کر کے گرجا گھر میں تبدیل کر دیا، وہاں علماء، صوفیہ، اور حکماء کی جتنی تربتیں تھیں، سب نیست و نابود کر دی گئیں، چارلس دوئم کے زمانہ میں سسلی کے مسلمانوں

کو زبردستی عیسائیوں کا بپتسمہ دیدیا گیا، بوسیا اور بوسیرا کے مسلمانوں کی تعداد دستی ہزار تھی، اُن کو زبردستی عیسائی بنالیا گیا، ہر جگہ مسلمانوں سے خالی کرالی گئی، اس کی تفصیل ہستوریز ہسٹری آف دی ورلڈ میں پڑھی جاسکتی ہے،

بارہویں اور تیرہویں صدی میں یورپ کے عیسائیوں نے دو سو برس تک مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ اس لئے کی کہ اُن کو صفحۂ دہر سے نابود کردیں، تاریخ یورپ کے مصنف اے۔جی گرانٹ نے لکھا ہے، کہ صلیبیوں کے نزدیک دشمن کو قتل کرنا خدا کی عبادت کے مساوی تھا بیت المقدس عیسائیوں نے فتح کیا تو ایڈورڈ گبن لکھتا ہے، کہ "صلیب کے علمبرداروں نے تین دن تک اتنا قتل عام کیا کہ ستتر ہزار لاشوں کی وجہ سے وبا پھیل گئی، جب اس سے بھی ان کو تشفی نہیں ہوئی تو یہودیوں کو ان کی عبادتگاہوں میں جلایا گیا،" اُن کے فوجی سرداروں نے اس خونریزی کی خوشی میں اپنے پوپ کو لکھا کہ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ ہم نے اپنے دشمنوں کے ساتھ کیا سلوک کیا، تو اتنا لکھ دینا کافی ہے، کہ جب ہمارے سپاہی حضرت سلیمانؑ کے معبد میں داخل ہوئے تو اُن کے گھوڑوں کے گھٹنوں تک مسلمانوں کا خون تھا،

اسپین میں مسلمان آٹھ سو برس تک رہے اور بقول موسیولیبان اس ملک کو انھوں نے یورپ کا سرتاج بنادیا تھا، مگر یہاں سے عیسائیوں نے ان کو جس طرح دربدر کیا، اس کی تاریخ موسیولیبان نے اس طرح لکھی ہے کہ ۱۴۹۹ء سے وہاں کے مسلمانوں پر وہ مظالم شروع ہوئے، جو ایک صدی کے اندر اُن کے اخراج کلی پر منتج ہوئے، پہلے تو وہ بجبر عیسائی بنائے گئے،

پھر اس معاہدے کرد عیسائی ہیں، وہ بھی مقدس مذہبی عدالت کے سپرد کئے گئے جنہوں نے جہاں تک ممکن ہوا آگ میں جلایا، پھر یہ ایک تجویز پیش کی گئی، کہ کل غیر عیسائی عرب عورتوں اور بچوں کے ساتھ قتل کر دئے جائیں، یہ ممکن نہ ہوسکا تو یہ عام اشتہار دیا گیا، کہ سارے عرب ایک ساتھ ملک سے نکل جائیں۔ راہب بلیڈا نے بڑی خوشی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ان عربوں میں سے ¾ راہ میں قتل کر دیئے گئے، ایک ہی مہاجرت میں جس میں ایک لاکھ چالیس ہزار عرب افریقہ کو جارہے تھے، ایک لاکھ مار ڈالے گئے، چند مہینے کے اندر اندلس سے دس لاکھ سے بھی زیادہ آدمی نکل گئے، سدی یو، اور اکثر مورخین اذعان کرتے ہیں کہ فرڈی ننڈ کی فتح سے لے کر مسلمانوں کے اخراج تک اندلس سے بتیس ۳۲ لاکھ رعیت نکل گئی، ایسے قتل عام کے بعد سینٹ برتھالیمو کا واقعہ دھندلا ہو کر رہ جاتا ہے، موسیو لیبان ہی کا بیان ہے کہ وحشی سے وحشی اور بے رحم سے بے رحم ملک گیروں نے کبھی اس قسم کے دردناک قتل عام کا دھبہ اپنے دامن پر نہیں لگایا،

۱۸۲۱ء میں یونان کے علاقہ موریا میں تین لاکھ اور یونان کے شمالی حصہ میں ہزاروں مسلمان، مرد بچے اور عورتیں بڑی بے رحمی سے ہلاک کی گئیں، تفصیل مارماڈیوک پکتھال کی کتاب دی کلچرل سائڈ آف اسلام میں پڑھی جاسکتی ہے۔

خود ہندوستان کے اندر عیسائی سامراجیوں کی بدولت کیا کم دردانگیز نہیں ہیں؛ سات سمندر پار کے ایک ملک سے آکر انگریزوں نے یہاں کے جائز باشندوں کو اپنی توپ تفنگ سے موت کے گھاٹ اتارا، ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں نواب سراج الدولہ کو

شکست دے کر اس کو اسکی وراثت سے محروم کیا، ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کو اس کے قلعہ کے انتقال کر تہ تیغ کیا، ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستانیوں نے اپنے ملک کی آزادی کی خاطر سرفروشی سے کام لیا، تو انہی انگریزوں نے اپنی توپ وتفنگ سے ستائیس ہزار مسلمانوں اور ہندوستانیوں کو لقمۂ اجل بنادیا، دہلی کو مذبح خانہ بنادیا گیا، نوے سال کے بڑھے بہادر شاہ ظفر کو معزول کر کے اُن کو جلاوطن کیا، اُن کے شہزادوں میں سے مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر کو دہلی دروازہ کے پاس لاکر اور اُن کے کپڑے اتروا کر بڑی سفاکی سے گولی ماردی، اُن کی لاشوں کو سربازار لٹکائے رکھا، اس کے بعد بیس اور شہزادوں کو پھانسی دی گئی، کیا وہ ملکہ وکٹوریہ کی مادرِ وطن پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، کہ اس جرم کی سزا اُن کو دی گئی، ؟

اس بیسویں صدی میں جب جمہوریت، اخوت، مساوات، اور انسانی ہمدردی کا اعلیٰ درس دیا جانے لگا، تو پہلی جنگ عظیم کے بعد ٹرکش امپائر کا تیا پانچہ کرنے کے لئے جب عیسائیوں کی فوج اناطولیہ میں ۱۵ مئی ۱۹۱۹ء کو داخل ہوئی، تو یورپ کا مشہور مورخ ٹوائن بی لکھتا ہے، کہ یہ فوج اناطولیہ پر ایک بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوئی، سمرنا کی گلیوں میں شہر کے لوگوں کا قتل عام شروع ہوگیا، محلّے کے محلّے اور گاؤں کے گاؤں لوٹ لئے گئے، زرخیز وادیوں میں آگ کے شعلے بھڑکنے لگے، خون کی ندیاں بہنے لگیں، ملک کی تجارت کو تباہ کر دیا گیا، مکان، پل اور سڑکیں مسمار کر دی گئیں، ملک کے باشندے تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے، جو بچ رہے، اُن کو جلاوطن کر دیا گیا،

مسلمان حکمرانوں کے زمانہ میں بھی لڑائیاں ہوتی رہیں، وہ ان میں فتحیاب بھی ضرور ہوئیں، مگر یورپ کے عیسائی فرمانرواؤں کی سفاکیوں اور خصوصاً دوسروں کے وطن میں جاکر وہاں کے لوگوں کو غلام بنانے کے سلسلے میں اُن کی شر انگیزیوں اور فتنہ پردازیوں کی مفصل تاریخ لکھی جائے تو پھر اُن کے مقابلہ میں مسلم حکمران صفحۂ دہر سے باطل کو مٹانے والے، نوعِ انسان کو غلامی سے چھڑانے والے اور مے توحید کا جام پلانے والے ہی نظر آئیں گے، وہ جہاں پہونچے، اس کی خاک کو اپنی جبینوں میں بسایا، اس کے ذرّے ذرّے کو سینوں سے لگایا، سات سمندر پار دہ کر درخشندہ فلزات سے اپنے بینکوں کی عمارتوں کی تعمیر کی رعنائی اور رونق میں اضافہ نہیں کیا،

پھر دونوں میں یہ بھی فرق رہا کہ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ زیادتی کرنے والوں سے لڑائی لڑی جائے جو لوگ دین کے بارے میں لڑیں اُن سے بھی لڑائی کی جائے، جو لوگ گھروں سے نکال باہر کریں اُن سے اور اُن کی مدد کرنے والوں سے بھی جنگ کی جائے، عیسائیوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ جو تیرے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو اس کے سامنے اپنا بایاں گال بھی پھیر دے، جو تجھ کو ایک میل بیگار لیجائے تو اس کے ساتھ دو میل جا، جو تیرا کوٹ مانگے، تو اس کو اپنا کرتا بھی دیدے، کیا عیسائی فرمانرواؤں نے اس پر عمل کیا؟ عمل کرنے کے بجائے وہ جہاں پہونچے، اس کو مرگھٹ اور گورستان بنا دیا، مگر اپنی تاریخ نویسی کے طلسم سامری سے اپنے سارے جرائم دوسروں خصوصاً مسلمانوں پر رکھ کر معصوم بننے کی کوشش کرتے ہیں، مسلمانوں کو ان عیارانہ تحریروں سے بے نیاز ہو کر یہ ثابت کر دکھانا ہے کہ

مرے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے مجھ سے بڑھکر ساز فطرت میں نوا کوئی،

مقالات

اسلامی ریاست کا تصور

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

یہ مقالہ بمبئی کی مجلس اخوان الصفا کے ایک سمینار میں ۵ اپریل ۱۹۸۰ء کو صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کے ہال میں پڑھا گیا، سمینار کا موضوع اسلام اور عصر جدید تھا، اس کی تیاری میں دارالمصنفین کی مطبوعات سے مدد لی گئی ہے۔

ہمارے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد خلفائے راشدین کی جو حکومت قائم ہوئی تو اس کا مطالعہ کرنے والے کچھ تو اس کو مذہبی، کچھ اس کو جمہوری، کچھ اس کو دستوری، کچھ اس کو زمینی (یعنی امرائی) اور کچھ اشتراکی بھی کہتے ہیں، جو جیسا چاہتا ہے ویسا ہی اس کی تعبیر کرنے لگتا ہے، یہ مذہبی ضرور تھی مگر اوتاری یعنی تھیوکریسی نہ تھی، اس کا خلیفہ نہ خدا کا اوتار تھا، نہ خدا کا مظہر سمجھا جاتا تھا، اور نہ خدا سے براہ راست احکام پاتا تھا، اس میں کوئی خدائی تقدیس نہ تھی، وہ محض ایک انسان تھا، جو انتخاب کے ذریعہ سے سربراہی کے لئے مامور ہوا، مگر حکومت کے حقوق اور فوائد میں امت کے عام افراد سے اس کو کوئی تفوق حاصل نہ تھا، اس لحاظ سے یہ جمہوری حکومت تھی، وہ ارباب شوریٰ اور اہل حل و عقد سے مشورہ کرتا رہتا، اس لئے اس میں دستوری حکومت کا بھی رنگ تھا لیکن اس کے

ہر جائز حکم اور صاحب بہ دیدہ بے چون و چرا عمل کرنا امت کے لئے ضروری ہوتا تھا، اس لئے وہ اپنے وقت کی قوت آمرہ بھی سمجھا جاتا، اس طرح اس حکومت میں مذہبی دستوری، جمہوری اور مذہبی کے فضائل تو ضرور تھے، مگر یہ اُن کے قبائح اور مثالب سے خالی تھی، اس لئے یہ ایک آئیڈیل حکومت قرار دی جاتی ہے، اور اس کو اسلامی حکومت کہا جاتا ہے، مگر یہ حکومت تیس سال تک قائم رہی، اس کے بعد جتنی حکومتیں قائم ہوتی گئیں، وہ خاندانی تھیں، کیا وہ اسلامی حکومتیں نہ تھیں؟ اگر وہ اسلامی حکومتیں نہ تھیں، تو کیا مسلمانوں کی بھی حکومتیں نہ تھیں، کیا ان میں اسلامی قوانین وغیرہ رائج نہیں رہے؟ اور اگر ان میں اسلامی قوانین اور شعار کی بالادستی رہی تو پھر ان کو اسلامی حکومتیں کہا جا سکتا ہے کہ نہیں کیا وہ ہماری سیاسی تاریخ یا سیاسی ورثہ میں داخل ہیں کہ نہیں؟

اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ خلفائے راشدین کا جو انتخاب ہوا تو کیا یہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایت کے مطابق تھا، ظاہر ہے کہ ہمارے رسولؐ نے حکومت کے سربراہ کے انتخاب کے سلسلہ میں کوئی واضح ہدایت نہیں دی، آپؐ کے یہاں حکمرانی کی ساری باتیں تو ملتی ہیں، مگر حکومت کے طرز اور تشکیل کی کوئی واضح ہدایت نہیں ملتی، آپؐ نے ہر شعبۂ زندگی کی جزوی باتوں کی واضح تعلیم دی ہے مگر طرزِ حکومت اور اس کی تشکیل کو بالکل غیر واضح چھوڑ دیا ہے، اسی لئے گذشتہ چودہ سو سال سے اس کی کوئی ایسی متعین شکل مرتب نہیں ہو سکی، جو ہر اسلامی ملک میں یکساں طور پر مروج ہو۔

اس کی وجہ بظاہر تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ حکومت جغرافیائی حالات اور زمانہ کے تحت بدلتی رہتی ہے، اس لئے ایک ملک یا ایک زمانہ کا طرزِ حکومت دوسرے ملک اور دوسرے زمانہ کے لئے ضروری نہیں کہ مفید اور موزوں ہو، اسلام ایک عالمگیر اور دائمی مذہب ہے، جو ہر ملک اور ہر زمانہ کے لئے ہے، اس لئے طرزِ حکومت اور اس کی تشکیل کا غیر واضح رہنا ہی مناسب ہے کہ

جب جیسی ضرورت ہو اسی کے مطابق حکومت بنائی جائے، مگر حکومت کے لئے کچھ بنیادی باتیں ایسی
ہیں جو ہر زمانے، ہر ملک اور ہر ماحول کے لئے لازمی ہیں، اُن کی وضاحت ہمارے رسول صلی اللہ
علیہ وسلم نے کر دی ہیں، جو ایسی اعلیٰ سیاسی تعلیمات ہیں، جن پر فخر کیا جا سکتا ہے،
آپ کی تعلیم یہ ہے کہ حکومت کا سربراہ اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ حاکمیت پر ایمان رکھتا ہو یعنی دنیا
کی سرزمین، اور اس سرزمین کا خواہ کوئی خطہ یا ملک ہو، اس کا حاکم اعلیٰ علی الاطلاق اور شہنشاہ
قادر مطلق اللہ تعالیٰ ہی ہے، بادشاہی اسی کی ہے، قرآن پاک میں خدا اپنے کو ملک الناس، الملک
القدوس السلام، الملک القدوس العزیز کہتا ہے، کلام مجید میں ہے "اللہ تعالیٰ ہی ہر سلطنت کا مالک ہے
جس کو چاہے سلطنت دے" (آل عمران۔۳) اس لئے قانون اور حکم بھی اسی کا ہوا، دوسرے
حکمرانوں کا حکم اسی وقت مانا جائے، جب وہ عین حکم الٰہی ہو، یا اس پر مبنی ہو، یا کم از کم اس کے
مخالف نہ ہو، اس کے بعد کسی قیصر و کسریٰ یا کسی آمر اور مطلق العنان حاکم کے پیدا ہونے کی گنجائش
نہیں رہتی، اور نہ سلطنت یا حکومت کسی کی ملکیت ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے، راعی اور
رعایا کی تفریق بھی نہیں رہتی ہے۔ ایک شہنشاہ ارض و سما کے آگے سارے بندے یا تو اس کے
خوف یا اس کی اطاعت گذاری کی خاطر سر افگندہ رہتے ہیں، یہ سر افگندگی انسانی قوانین
سے پیدا نہیں ہوتی، خدا کے قوانین کو ماننے کی اس لئے بھی ضرورت ہے، کہ ان میں ابدیت
رہتی ہے، مثلاً خدا نے یہ قانون بنایا ہے کہ گرم چیز گرم، اور ٹھنڈی چیز ٹھنڈی رہے گی، تو کسی
زمانہ میں آگ برف نہیں بن سکتی، اور برف آگ نہیں ہو سکتی ہے، خدا نے چاند اور سورج
کی جو گردش مقرر کی ہے، وہ برابر رہے اور برابر رہے گی، اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا کہ خدا کے
قانون میں کوئی ادل بدل نہیں پاؤ گے (فتح۔۳) اسی طرح خدا کا یہ بھی قانون ہے کہ نیکی بدی نہیں بن سکتی اور بدی نیکی نہیں
بن سکتی، اسی طرح اس کا قانون ہے کہ کسی حال میں جھوٹ نہ بولو ہمیشہ سچ بولو کسی سے ظلم نہ کرو، دوسروں کے حقوق کو غصب کرو...

[illegible] انگلستان [illegible] اس سرزمین کے مالک کا
[illegible] پر تصرف کریں [illegible]
اور ملکیت سمجھا جائے، بلکہ دنیا میں مومنین کی رضامندی کا خیال رکھو، لڑائی اور جھگڑے کے
بجائے نیکی اور نیک نظام کرو، بداخلاقی اور ظلم کو روکنے کی بندش کرو، رحمت و شفقت کا اظہار کرو، جو
بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن و سلامتی کا خیال کرو، لوگوں کے درمیان
حق شعور اور غریبوں کی نیک تعلیم کرو، یہ وہ قوانین ہیں جن میں ابدیت ہے، اور یہ سارے
بندوں کے لیے بنائے گئے ہیں، چاہے کالے ہوں یا گورے، یورپی ہوں یا ایشیائی، یا کسی مذہب
کے بھی پیرو ہوں سب کے لیے یکساں اور برابر ہیں، خود خدا کہتا ہے کہ خدا کے نافرمانوں سے
لڑتے رہو، یہاں تک کہ فساد نہ رہے، اور سب حکم اللہ کا ہو جائے۔ (انفال۔ ۵)

پھر اسلام جیسی اس کی تعلیم دیتا ہے کہ حکومت یا اس کا سربراہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کے قوانین کا پابند ہو، تو اس میں کہاں سے نقص پیدا ہوتا ہے، اور کون سی ایسی چیزیں ہیں جو قابل عمل نہیں، اللہ تعالیٰ کے قوانین اس لیے ہیں کہ دنیا میں فساد نہ ہو تو پھر ان قوانین پر عمل کرنے میں کیوں پس و پیش ہو۔

ہمارے رسولؐ نے یہ بھی فرمایا کہ حکومت اور مذہب دو علیحدہ چیزیں نہیں ہیں، یہ دو علیحدہ چیزیں تو اس وقت ہو سکتی ہیں جب حکومت کا نصب العین کچھ اور ہو، اور مذہب کا مقصد کچھ اور ہو، یہ کہا جاتا ہے کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو، اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو، یہ گویا اس کی تعلیم ہے کہ قیصر اور خدا دو متوازی قوتیں ہیں، ایک کا حکم دوسرے سے بالکل الگ ہے یعنی اگر خدا عدل، باہمی محبت، انسانی ہمدردی، اخلاص اور تعلیم دے کر دنیا سے فساد مٹانا چاہتا ہے، تو کیا یہ تعلیم قیصر اور اس کی حکومت میں نہ لے کر کیا اس سے وہ خالی رہ جاتی ہے؟

ہمارے رسول کی یہ بھی تعلیم ہے کہ حکومت کا سربراہ خدا کے قوانین پر عمل پیرا ہو کر متقی ہو، پرہیزگار ہو، اس کی سب سے بڑی عبادت رعایا کی خدمت، ان کے معاملات کی دادگری، اور ان کے کاموں کی نگرانی ہے، تو کیا مذہب کو حکومت سے اس لئے دور رکھا جائے کہ اس کا سربراہ فاسق ہو، فاجر ہو، عیاش ہو، شرابی ہو، وہ رعایا کی خدمت، ان کے معاملات کی دادگری، اور ان کے کاموں کی نگرانی سے بے نیاز ہو، قرآن مجید میں حضرت داؤدؑ کو یہی حکم تو دیا گیا تھا کہ اے داؤدؑ! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا، تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کرو، اور خواہش نفس کی پیروی کرو کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دے گا، (ص ۲) خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو امام یا حاکم ضرورت مندوں سے اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے وقت آسمان کا دروازہ بند کرے گا، (ترمذی ابواب الاحکام ـ ۲۲) قرآن پاک میں یہ بھی ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو، اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو، تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو، خدا تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے، بے شک خدا سنتا اور دیکھتا ہے، (نسا ـ ۸) قرآن پاک میں یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے (مائدہ ـ حجرات ـ ۲) اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، (آل عمران ـ ۲ ـ ۱۴) رسول اللہ نے فرمایا کہ جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگراں بنائے، اور وہ اس کی خیر خواہی پوری پوری نہ کرے، تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا" (صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۵ کتاب الاحکام) پھر فرماتے ہیں کہ بے شک انصاف کرنے والے حکام اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے ممبروں پر اس کے داہنے ہاتھ پر ہوں گے، (صحیح مسلم کتاب الامارہ) یہ بھی فرمایا کہ بے شبہ سب لوگوں سے خدا کو محبوب اور خدا سے قریب امام عادل ہوگا، اور خدا کے نزدیک سب سے مبغوض اور خدا سے دور وہ امام ہوگا جو ظالم ہو (ترمذی ابواب الاحکام) یہ آیتیں اور حدیثیں اسلامی حکومت کے آئین کے باب میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں، کیا حکومت

ہی چیزوں پر عمل کرنا پسند نہیں کرتی ہے، جو مذہب سے وحشت کھاتی ہے، پھر مذہب انسا
لوں نے حقوق دیتا ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں، قرآن پاک میں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو کچھ ہے
سب تمھارے لئے پیدا کیا گیا ہے، اس نے دریاؤں کشتیوں اور نہروں کو تمھارے قابو میں کر دیا
حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت میں پیدا کیا،

یہ ایک ایسا تصور ہے جو انسانیت کو بلند سے بلند مرتبہ تک پہنچاتا ہے، جس کے اندر سیاسی، اخلاقی، دنیاوی، اور دینی ساری باتیں ہیں، حکومت کیا انسان کو اس سے بھی بلند تر درجہ تک پہنچا سکتی ہے، جو تلقین کرتی ہے کہ حکومت اور مذہب کو الگ الگ خانے میں رکھو،

حکومت ہوتی ہے تو اس کو کسی نہ کسی موقع پر کسی سے جنگ بھی کرنی ہوتی ہے، اسلام میں لڑائیوں کے لڑنے کے جو ضوابط و قوانین مرتب کئے گئے ہیں، ان پر انسانیت فخر کر سکتی ہے

کلام پاک میں ہے کہ زیادتی کرنے والوں سے لڑائی لڑی جائے، (الحجرات، آیت ۹) جو لوگ دین کے بارے میں لڑیں اُن سے بھی لڑائی کی جائے، جو لوگ گھروں سے نکال باہر کریں، اُن سے اور اُن کی مدد کرنے والوں سے بھی جنگ کی جائے، (الممتحنہ رکوع ۲) جنگ کے زمانہ یا صلح کے بعد زمینوں، فصلوں، اور نسلوں کو تباہ کر دینا کسی حال میں جائز نہیں، (البقرہ ۲۰۵)
دشمن اگر صلح کے لئے جھکیں تو اُن سے صلح کر لی جائے، (انفال - ۶۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی مہم پر فوج روانہ فرماتے، تو سردار فوج کو جو احکام دیتے، ان میں ایک لازمی حکم یہ ہوتا کہ کسی بوڑھے کسی بچے یا کسی عورت کو قتل نہ کیا جائے، (ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی دعاء المشرکین،

آپ نے یہ منادی کر رکھی تھی کہ جنگ کے موقع پر جو دوسروں کے گھروں میں جا کر وہاں کے رہنے والوں کو تنگ کرے، یا لوٹ مار کرے، تو اس کا جہاد قبول نہیں کیا جائے گا، (ابو داؤد کتاب

کتاب الجہاد جلد اول ص ۲۵۲) آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص محض لوٹ مار کرنے یا مال غنیمت حاصل کرنے کی خاطر جہاد کرتا ہے اس کو کوئی ثواب نہیں ملے گا (بخاری کتاب الجہاد باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ہی العلیا و صحیح مسلم کتاب الامارۃ)

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ لوٹ کا مال مردار گوشت کے برابر ہے، (ابو داؤد کتاب الجہاد جلد ثانی باب فی النہی اذا کان فی الطعام قلۃ) آپ نے مقتولوں کا سر کاٹ کر گشت کرانے یا دشمن کو گرفتار کر کے کسی چیز سے باندھ کر تیروں کا نشانہ بنانے یا تلوار سے قتل کرنے کی سخت ممانعت کی (المبسوط) آپؐ نے یہ بھی ہدایت کی کہ جنگ میں جو لوگ گرفتار ہوں ان پر احسان کیا جائے یا ان سے فدیہ لیا جائے، ایک بار چند قیدیوں کے قتل کئے جانے کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تو آپ نے فرمایا، خدا کی قسم میں مرغ کو بھی اس طرح مارنا جائز نہیں کھتا (ابو داؤد جلد ۲ ص ۱۰)

ایک بار ایک قیدی آپؐ کے پاس لایا گیا، وہ آپ کے خلاف آتشیں تقریریں کیا کرتا تھا، جب وہ قیدی بنا کر لایا گیا تو آپؐ سے کہا گیا کہ اس کے دانت توڑ دئیے جائیں، یہ سن کر آپؐ نے فرمایا کہ اگر میں اس کے دانت تڑوا دوں تو اللہ تعالیٰ میرے دانت توڑ دے گا، اگرچہ میں نبی ہوں، (سیرۃ ابن ہشام) جنگ بدر کے قیدیوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا، وہ اپنی مثال آپ ہے، آپ نے قیدیوں کو صحابیوں کے حوالے یہ کہکر کیا کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، اُن کو کھانے پینے کی تکلیف نہ ہو، چنانچہ صحابہ خود کھجوریں کھا لیتے لیکن قیدیوں کو پورا کھانا کھلاتے حنین کی جنگ کے چھ ہزار قیدیوں کو آپ نے کپڑے کے چھ ہزار جوڑے دیئے

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ معاہدہ کا پیغام لے کر کوئی قاصد آئے، تو اُس کی جان کی پوری حفاظت کی جائے، یہ بھی فرمایا کہ دشمنوں سے معاہدہ کی پابندی ہر حال میں کی جائے، ہاں اگر دشمن معاہدہ کی خلاف ورزی کریں، تو ان کے خلاف جنگی

کارروائی کی جائے،

آپ کا یہ بھی حکم تھا کہ جب قیدی اور مفتوح علاقے کے لوگ اطاعت قبول کرلیں تو کوئی اُن پر حملہ نہ کرے بلکہ اُن کی پوری مدافعت کی جائے، اُن کو اُن کے مذہب سے برگشتہ نہ کیا جائے ان کی جان، اُن کی عزت، اُن کے مال کی حفاظت کی جائے، اُن کے قافلہ اور تجارت کے کارواں کو محفوظ رکھا جائے، اُن کی زمین، اُن ہی کے پاس رہے، جو چیزیں اُن کے قبضہ میں ہوں بحال رکھی جائیں، اُن کے پادری، رہبان اور پجاری، اُن کے عہدوں سے برطرف نہ کئے جائیں، صلیبوں اور مورتیوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے، اُن سے عشر نہ لیا جائے، اُن کے حقوق زائل نہ کئے جائیں، (فتوح البلدان ص ۶۵-۵۹، مقالات شبلی جلد اول ص ۱۸۹-۱۸۰) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہدایت کا عملی نمونہ نجران کے عیسائیوں سے حسن سلوک کرکے پیش کیا۔ جب پورا جزیرۃ العرب آپؐ کے زیر نگیں ہوگیا، تو نجران کے عیسائیوں کو یہ حقوق دئے کہ نجران اور اس کے اطراف کے باشندوں کی جانیں، اُن کا مذہب اُن کی زمینیں، ان کے اموال، اُن کے حاضر و غائب، اُن کے قافلے، اُن کے سفراء اُن کی عورتیں، اللہ کی امان اور اس کے رسول کی ضمانت میں ہیں، اُن کی موجودہ حالت میں کوئی تغیر نہ کیا جائے گا، اور نہ ان کے حقوق میں سے کسی حق میں دست اندازی کی جائے گی، اور نہ مورتیں بگاڑی جائیں گی، کوئی اسقف اپنی اسقفیت کوئی راہب اپنی رہبانیت اور کنیسہ کا کوئی منتظم اپنے عہدہ سے نہ ہٹایا جائے گا، اور جو کچھ بھی کم یا زیادہ ان کے قبضہ میں ہے، اسی طرح رہے گا، اُن کے زمانۂ جاہلیت کے کسی جرم یا خون کا بدلہ نہ لیا جائے گا، ان سے نہ قومی خدمت لی جائے گی، اور نہ اُن پر عشر لگایا جائے گا، اور نہ اسلامی فوج اُن کی زمین کو پامال کرے گی، اور اُن میں سے جو شخص کسی حق کا مطالبہ کرے گا، اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا، (فتوح البلدان بلاذری ص ۷۰، مطبوعہ مصر، کتاب الخراج امام

ابو یوسف) کیا اس سے بہتر جنگ و صلح کے قوانین آج کل کی اقوام متحدہ کی مجلس پیش کر سکتی ہے؟
یہ قرآن اور حدیث کی مذہبی ہدایات ہیں، اگر ایسی مذہبی ہدایات کو حکومت سے علیٰحدہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، تو اس کے یہ معنی ہیں کہ حکومت ایسی ہدایات پر عمل کرنا پسند نہیں کرتی، وہ چاہتی ہے کہ مذہبی احکام سے بالاتر ہو کر جنگ و صلح کے موقع پر جو چاہے کرے، نکتہ چیں مورخین مذہب کے نام پر لڑی جانے والی لڑائیوں میں بہت کچھ کیڑے نکال سکتے ہیں، مگر جمہوریت، قومیت، اشتراکیت اور اشتمالیت کے نام پر جو لڑائیاں لڑی گئی ہیں یا ہو رہی ہیں، اُن میں کہیں زیادہ کیڑے نکالے جا سکتے ہیں، بیسویں صدی کی جمہوری اور متمدن دنیا میں دو ایسی لڑائیاں لڑی گئیں، جو پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے نام سے یاد کی جاتی ہیں، ان لڑائیوں میں کیا کچھ نہیں ہوا،

انسانی خون کا سمندر بہایا گیا، انسان لنگڑے لولے، اور اندھے ہوئے، شہروں کی عمارتیں، عبادت گاہیں اور شفاخانے تباہ ہوئے، لاکھوں عورتیں بیوہ ہوئیں، اتنی ہی تعداد میں بچے یتیم ہوئے، دنیا میں اقتصادی بدحالی آئی، جنگ کے بعد جب صلح نامہ پر دستخط ہوئے، تو ملکوں کے حصے بخرے کئے گئے، لاکھوں آدمی گھر سے بے گھر ہوئے، بعض ممالک کے گلوں میں سامراجیت کی غلامی کا طوق ڈالا گیا، اُن کے باشندوں کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کیا گیا، اُن کے ضمیر، زبان، مذہب کی آزادی پر پابندی عائد کی گئی، ان ملکوں کی دولت سے سامراجیت کے خزانے کو پُر کیا گیا، پھر بھی ان لڑائیوں کے فاتحوں کے کارنامے زرّیں قرار دے کر ان پر بے شمار کتابیں قلمبند کی جا رہی ہیں، پھر جمہوریت کے علمبرداروں، اور مذہب کو حکومت سے علیٰحدہ رکھنے والوں ہی نے مراکش، الجزائر، شام، مصر، عراق، یمن وغیرہ کو غلام بنائے رکھا، انگلستان کو اپنی جمہوریت پر بڑا ناز ہے، لیکن ان ہی ناز کرنے والوں نے اپنے سامراجی جذبہ کو تسکین دینے کی خاطر، امریکہ، کینیڈا،

ہندوستان، عدن، روڈیشیا اور جنوبی افریقہ کے گلے میں غلامی کا طوق ڈالا، اور فخر کرتا رہا کہ اس کے امپائر میں آفتاب غروب نہیں ہوتا ہے، ہالینڈ محض زر اندوزی کی خاطر انڈونیشیا کو اپنی گرفت میں لے آیا، پرتگال اپنی آبادی کی مادی خوشحالی کے لئے ایشیا، افریقہ کے علاقوں پر بے جا تسلط اور قبضہ جما کر اپنی توسیع پسندی پر ناز کرتا رہا، امریکہ نے جمہوریت کے نام پر ستر لاکھ ٹن سے زیادہ ہلاکت آفریں اور زہریلے بم گرائے ویٹ نام میں کمیونزم کے نام پر پچیس ۲۵ برس تک انسانی خون سے ہولی کھیلی گئی، اور اسی نام پر مشرقی یورپ اور مشرقی جرمنی کو جھکنے پر مجبور کیا گیا، برلن کے بیچ شہر میں یاجوجی ماجوجی دیوار کھڑی کی گئی کہ اس شہر اور ملک کے اعزہ کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے سے دور کیا جائے اور ابھی حال ہی میں افغانستان کی ایک کروڑ بارہ لاکھ کی آبادی کے لئے ایک لاکھ فوج بھیجی گئی، اور دس لاکھ افغانیوں کو بے گھر کیا گیا،

یہ ان حکومتوں کے کارنامے ہیں جو اسی پر یقین رکھتی ہیں، کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو، اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو، اوپر کے تمام ہدیے ان قیصروں کو دیئے گئے ہیں، جنھوں نے اپنے یہاں یہ بورڈ لگا رکھا ہے کہ خدا کو بلا اجازت اندر آنے کی ممانعت ہے، آخر میں یہ کہنا ہے کہ مذہب سے سیاست خراب نہیں ہوتی، مگر جب مذہب میں سیاست کسی مصلحت سے داخل کر دی جاتی ہے تو مذہب اور سیاست دونوں میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں،

سیاست سے مذہب کو دور رکھ کر انسانی آبادی کو مصیبت، ہلاکت، خونریزی، قتل، غارتگری، معاشی بدحالی، اور حتی کہ معاشرتی زبوں حالی اور پراگندگی سے محفوظ نہیں کیا گیا، بیسویں صدی کی تاریخ یہی کہہ رہی ہے کہ اگر اسلام کی ان بنیادی باتوں پر جن کا ذکر اوپر کیا گیا تجربہ کر کے تھوڑے دنوں کے لئے دیکھا جائے، تو کیا عجب کہ انسان کی فلاح و بہبود کا سامان ہونے لگے

[illegible]

عمل نہیں کیا تو وہ اُن کی خاندانی یا اس علاقہ کے مسلمانوں کی حکومتیں تو ضرور ہیں مگر وہ اسلامی حکومتیں نہیں کہی جاسکتی ہیں، اور اگر اب بھی ان بنیادی باتوں پر عمل کرکے کوئی حکومت قائم کی جاتی ہے تو اس کی نوعیت خواہ بادشاہت کی ہو یا عوامی جمہوریت کی ہو، وہ اسلامی حکومت کہی جاسکتی ہے کوئی بادشاہ ان تمام باتوں پر عمل کرکے اپنی حکومت کو آئیڈیل بناتا ہے تو وہ جمہوریت کے ان نمائندوں سے بہتر ہے جو ظالم فاسق، فاجر، عیاش، شرابی، اور رند ہوں لیکن ان کو حکومت کرنے کا حق صرف اسلئے ہو کہ وہ عوام کے دوٹوں سے برسر اقتدار آئے ہیں۔

آخر میں پھر یہ کہنا ہے کہ اگر مسلمانوں کی حکومت کا کوئی نظام اسلامی تعلیمات پر مبنی نہیں ہے، تو اس کو کسی حال میں اسلامی حکومت نہیں کہا جاسکتا، مولانا ابوالکلام آزاد نے اسی بات کو اب سے ۵۰ برس پہلے اپنے موثر انداز بیان میں اس طرح کہا تھا:-

"اگر مسلمانوں نے اپنے لئے ایک نہایت آزادانہ پولیٹکل پالیسی تیار کرلی، کانگریس سے بھی بہتر ایک پروگرام اُن کے ہاتھ میں ہوا، آئرلینڈ کے حکومت طلبوں سے بھی بڑھ کر جوش اور سرگرمی پیدا کرلی، پالٹیکس میں وہ از سرتا پا غرق ہو گئے، اُن کا ہر فرد گلیڈسٹون اور بارنے ہو گیا، لیکن ساتھ ہی اگر انھوں نے اپنے معتقدات اور اعمال کے اندر اسلام کی عملی روح نہ پیدا کی، اپنے تئیں دین الٰہی کی سلطنت کے ماتحت داخل نہ کیا، اور خشیت الٰہی اور زہد و تقویٰ سے محروم رہے تو، میں اس یقین کی لازوال طاقت کے ساتھ جس میں کبھی موت و شکست نہیں، اس بصیرت الٰہی کے ساتھ جس میں کبھی تزلزل اور تذبذب نہیں، از سرتاپا صدائے ربانی بن کر لکھتا ہوں کہ اگر آگ جلاتی ہے، اور پانی ڈبوتا ہے، اگر آفتاب مشرق سے نمودار ہوتا اور مغرب کی جانب غروب ہوتا ہے، اگر مچھلی خشکی میں اور پرندہ دریا میں نہیں رہ سکتا، اگر قوائے فطریہ اور نوامیس طبیعیہ میں

تبدیل نہیں ہو سکتی۔ ۔۔۔ مگر یہ سچ ہے کہ دو اور دو پانچ نہیں بلکہ ہمیشہ چار ہوتے ہیں تو یہ کبھی نہ مٹنے والی صداقت صفحۂ کائنات پر نقش سنگ ہے کہ مسلمانوں کی یہ تمام بڑی سیاسی ہنگامہ آرائیاں تعلیم و تربیت کا غوغائے محشر خیزا اور پولیٹکل پالیسی کے تغیر و تبدل کا ہیجان ایک لمحہ، ایک دقیقہ اور ایک عشر دقیقہ تک کے لئے کبھی نفع نہیں پہونچا سکے گا۔"

(الہلال ۱۶ راکتوبر ۱۹۱۲ء ص ۶۰)

اسلام کا سیاسی نظام

اس میں کتاب و سنت کی روشنی میں اسلام کے سیاسی نظام کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے، پوری کتاب اٹھارہ (۱۸) ابواب میں تقسیم ہے جن میں نظریۂ خلافت، مجلس تشریعی، طریقۂ قانون سازی، حقوق رعایا، بیت المال، احتساب، حرب و دفاع، خارجی معاملات وغیرہ، قریب قریب اسلامی دستور کے سب اصولی اور اساسی پہلو آگئے ہیں۔ اٹھارہواں باب غیر اسلامی نظریات سیاست سے متعلق ہے، جس میں موجودہ سیاسی نظریات مثلاً شخصیت، آمریت، جمہوریت، سوشلزم وغیرہ پر مختصر مگر بہت جامع بحث کی گئی ہے

مؤلفہ:-

مولینا محمد اسحاق سندیلوی

ضخامت :- ۳۰۰ صفحے

قیمت :- ۱۳ روپیے،

مجلد

قرآنِ کریم

اور اس کی نسبت سے بعض علوم کی ایجاد و ترقی،

از

ڈاکٹر نذیر احمد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۳)

حضرت علیؓ اور ائمہ کرام کی طرف منسوب نسخے حضرت علیؓ اور دوسرے ائمہ کی طرف منسوب متعدد نسخے جو کوفی خط میں ہیں، دنیا کے اکثر کتاب خانوں اور میوزیموں میں پائے جاتے ہیں، ان میں حسب ذیل ادارے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں،

اردبیل (ایران)، مشہد آستان قدس، نیشنل میوزیم تہران، کتاب خانہ نجف اشرف، برٹش میوزیم لندن، انڈیا آفس لندن، کتاب خانہ خطی کابل وغیرہ۔

حضرت علیؓ کے نوشتہ قرآن کا نسخہ حضرت حسنؓ کے خاندان والوں میں ابن الندیم نے دیکھا تھا، لیکن اب اس کا حال معلوم نہیں، البتہ کتاب خانوں میں ایسے قرآن کے چند خطی نسخے جن کا انتساب حضرت علیؓ اور دوسرے ائمہ کی طرف ہے اس طرح پر ہیں،

(۱) قرآن مشہد آستان قدس شمارہ ۱/۴ ترقیمہ کتبہ علی بن ابی طالب جمادی الاول ۱۰۰۸ ہجری میں شاہ عباس صفوی نے اس کو وقف کیا، وقف نامہ بقلم بہا محمد عاملی کوفی خط، پوست آہو پر ہے، نقش و نگار، تذہیب اور اعراب و اعجام و تنوین کا وجود اس کی قدامت میں

محل ہے، فہرست نگار کا خیال ہے کہ تیری صدی ہجری سے پیشتر کا نہیں ہے، اس بنا پر حضرت علیؓ کی طرف انتساب مشکوک ہے۔

(۲) جزو قرآن منسوب بخط حضرت علیؓ، کتاب خانہ خطی کابل،

(۳) جزو قرآن جس کا انتساب حضرت علیؓ کی طرف ہے، کتاب خانہ خطی کابل،

(۴) یک ورق از کلام مجید بخط کوفی ہر صفحہ ۵ سطر، ہر طرح کی تزئین سے پاک، اس کو حضرت علیؓ کی کتابت بتاتے ہیں، کتاب خانہ سلطنتی تہران (قرآن ۲۰۷)

(۵) یک ورق از کلام کریم، کوفی خط میں، ہر صفحہ شامل ۵ سطر، بغیر تزئین اقدیم خط ہے، یہ بھی حضرت علیؓ کا خط قرار دیا جاتا ہے، کتاب خانہ سلطنتی تہران (قرآن ۲۰۸)

(۶) قرآن زیر شمارہ ۱ کتاب خانہ رامپور، خط کوفی منسوب بحضرت علیؓ۔

(۷) قرآن بخط کوفی، پوست آہو، یہ خط حضرت حسنؓ بن علیؓ بن ابی طالب کی طرف منسوب ہے؛ اور تاریخ کتابت ۴۱ ہجری درج ہے، لیکن یہ تحریر قرن سوم ہجری سے پہلے کی نہیں معلوم ہوتی، شاہ عباس نے اس کو آستان قدس مشہد کے کتاب خانے پر وقف کیا اور وقف نامہ بخط بہاء الدین محمد عاملی محفوظ ہے، (گنجینۂ قرآن زیر شمارہ ۲)

(۸) جزو قرآن منسوب بخط حضرت امام حسن بن علیؓ، کتاب خانہ خطی کابل،

(۹) قرآن بخط کوفی خفی منسوب بہ حضرت امام حسن بن علیؓ، کتاب خانہ سلطنتی فہرست ص ۱۸۱، صفحۂ اول پر یہ تحریر ہے: «این کلام اللہ مجید بصحت رسیدہ کہ خط یکے از ائمۂ اثنا عشر است دست بدست تا پادشاہ جنت مکان رسیدہ و شہرت دارد کہ خط امام حسن علیہ السلام است۔

ایک دوسری تحریر یہ ہے: «بعضے از اہل دانش کہ در قرائت خط کوفی دانشمند بودند، نظر بہ صفحۂ آخر گماشتند چناں فہمیدند کہ ایں کلام در ایام خلیفۂ ثالث نوشتہ شدہ و خط امام حسن علیہ السلام

ست ملا بعضے آیات ظاہر زدیغیر موضع باشد ثانی در ایام خلفاء عباسی رد و بدل شدہ باشد از ناہل
گی ولد مرید فی ایام دولت محمد اولجا تیو نوشتہ شد سنہ ۷۶۶ -

ایک صفحہ کے حاشیہ پر یہ عبارت ہے۔

هذا الکلام فی ایام السلطان اعظم مالک ملوک العالم وارث سید المرسلین المعتصم بحبل اللہ المتین خلد اللہ ایام دولتہ آمین شہر ربیع الثانی سنہ ۷۲۱ ۔ مقابل صفحہ پر "المعتصم باللہ" درج ہے۔

(۱۰) جزو قرآن منسوب بحضرت حسین بن علیؓ ، آستان قدس شمارہ ۳، خط کوفی، پوست آہو، ہر صفحہ سات سطری با اعراب و اعجام، مرتب فہرست اس کو قرن سوم کا قرار دیتے ہیں۔

(۱۱) جزو قرآن، ۲۸ ورق، خط کوفی منسوب بخط حضرت امام حسین بن علیؓ ترقیمہ "کتبہ حسین بن علی" شاہ اسمٰعیل صفوی کی اس تحریر سے مزین ہے

ھو، قد تشرفت بزیارۃ ہذا المصحف الشریف المبارک اسمٰعیل الحسینی الموسوی الصفوی بہادر خان وھی سبع و عشر و فاتر سنہ ۹۸۱،

ایک مہر بنام ھو الملک باللہ ۹۶۱ ، ایک اور تحریر اس طرح پر ہے۔

بتوسط جناب مرزا احمد حکیم ہاشمی عرض دیدار شد فرمان ہمایون شرف وا الاشد (کتابخانہ سلطنتی قرآن ۹۹)

(۱۲) جزو قرآن، ۲۸ ورق، خط کوفی، حضرت امام حسینؓ بن علیؓ کا نوشتہ قرار دیا گیا، ترقیمہ حسین بن علی ، شاہ اسمٰعیل صفوی کی یہ تحریر ہے۔

ھو قد تشرفت بزیارۃ هذا المصحف الشریف المبارک اسمٰعیل الموسوی الحسینی الصفوی

مہر بنام ھو الملک باللہ سنہ ۹۶۱ (کتابخانہ سلطنتی قرآن ۱۰۳)

(۱۳) جزو قرآن، خط کوفی، انتساب بخط علی بن حسین معروف بہ حضرت سجاد با ترقیمہ

کتبہ ... [illegible]

مداجام (گنجینۂ قرآن شمارہ ۴)

(۱۴) جزو قرآن، خط کوفی، ۶۹ ورق منتسب بہ حضرت سجاد امام زین العابدین مزین بہ تحریر

بہ امہ از قرار تصدیق اہالی خبرہ و صاحبان خط و وقوف معلوم گردید کہ خط جناب ہمام حضرت سجاد

امام زین العابدین بکہ ہیچ وجہ اختلاف ندارد، بعضی برآنند کہ خط انور جناب مستطاب اسد اللہ غالب

کل غالب مطلوب کل طالب علی ابن ابی طالب است، بلاشک از دو بیرون نیست (کتابخانہ

سلطنتی قرآن ۱۰۴)

(۱۵) قرآن شمارہ ۵ گنجینۂ قرآن مشہد، خط کوفی با اعراب و اعجام، ونقش زرین منسوب بہ

علی بن موسیٰ، یہ انتساب ایک تحریر کی بنیاد پہ ہوا ہے۔ کتبہ علی بن موسیٰ۔

بظاہر شاہ عباس حسینی کی اپنی یادداشت سے مزین ہے، آخر میں آیت اللہ میلانی کی ۹ ۱۳

لی یادداشت ہے جس میں نسخہ کو امام علی بن موسیٰ الرضا کا خط قرار دیا ہے۔

(۱۶) دار الکتب المصریہ میں ایک قرآن (شمارہ ۱) ہے جو بعد کی ایک تحریر کی بنا پہ حضرت جعفر

صادق بن محمد باقر بن زین العابدین علی بن امام حسین بن علیؑ بن ابی طالب کی طرف منسوب ہے،

قرآن نصف اول بخط کوفی، پوست آہو،

(۱۷) کتاب خانۂ رامپور میں قرآن شمارہ ۲ حضرت امام جعفر صادق کی طرف منسوب ہے۔

(۱۸) آستانِ قدس مشہد میں قرآن (شمارہ ۲۷) کا ایک نسخہ ہے جو شاہ عباس کے ایک وقف نامہ

دا شیخ بہائی مورخہ ۱۰۰۸ ہجری کے اعتبار سے امام جعفر صادق کے خط میں ہے چند اور عبارتوں سے

ں قیاس کی تائید ہوتی ہے مگر مرتب رہنمائے گنجینۂ قرآن اس کو اواخر قرن پنجم یا اوائل قرن ششم کا تحریر

یتے ہیں۔

اس طرح کے سینکڑوں نسخے کا مل پاتا تھا۔ مختلف کتاب خانوں اور میوزیم میں محفوظ ہیں لیکن

ان میں سے کسی ایک کو وثوق کے ساتھ کسی خاص شخصیت کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ اور اتنا تو یقینی ہے کہ یہ نسخے منقش و مذہب اور اعراب و اعجام والے ہیں وہ اتنے قدیم نہیں ہو سکتے اور ان کا انتساب بڑی حد تک مشتبہ ہے۔

ابن مقلہ اور ابن بواب کی طرف منسوب مصحف شریف کے نسخے

ابن مقلہ اور ابن بواب خطاطی کی دنیا میں بے پناہ شہرت کے مالک رہ چکے ہیں اور مصحف شریف کی کتابت کے سلسلے میں ان دونوں کی شہرت مسلّمہ ہے، ابن مقلہ کا پورا نام ابو علی محمد بن علی بن حسین بن مقلہ ہے، وہ ۲۷۲ ہجری میں بغداد میں پیدا ہوا، رفتہ رفتہ اس نے اتنی ترقی کی کہ مقتدر خلیفہ نے اس کو وزارت پر فائز کیا لیکن ابھی دو ہی سال ہوئے تھے کہ سازش کے نتیجے میں اس کو ۳۱۸ ہجری میں قید کر دیا، بعد میں اس کا داہنا ہاتھ بھی کٹوا دیا، قید کی حالت میں ۳۲۸ ہجری میں فوت ہوا، خوش نویسی میں اس نے اتنا کمال بہم پہنچایا تھا کہ لوگ اس کے نام کو مثالاً پیش کرتے، فارسی ادب میں ابن مقلہ کی خطاطی کی شہرت کی روایت بہت قدیم ہے۔ سعدی کہتے ہیں۔

کاش ابن مقلہ بودی در حیات　　　تا بمالیدی خطش بر مستنین

کہتے ہیں ابن مقلہ نے قرآن کے دو نسخے تیار کیے تھے،

ابن بواب کا نام ابوالحسن علاء الدین علی بن ہلال ہے۔ اس کی وفات ۴۱۳ یا ۴۲۳ ہجری میں ہوئی، خط ریحانی اور محقق کی ایجاد کا سہرا اس کے سر ہے، قرآن کے ۶۴ نسخے اس کی طرف منسوب ہیں، ان میں سے جو خط ریحانی میں ہے سلطان سلیم عثمانی کے پاس تھا، اس کو اس نے مسجد لالہ لی قسطنطنیہ میں ہدیہ کر دیا، اور نعت نامہ؛ و تحفہ؛ میں مندرج روایت کے بموجب اب تک وہاں محفوظ ہے، کہتے ہیں ابن مقلہ کی تحریر کا ایسا چربہ اتارتا تھا کہ اصل سے فرق کرنا مشکل تھا، شیراز میں بہاء الدولہ کے کتاب خانے میں ابن مقلہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن کے ۲۹ پارے موجود تھے تلاش کے

باوجود گم شدہ پارے کا نشان نہ ملا، ابن بواب نے خود اسکو اپنے ہاتھ سے لکھ کر بہاء الدین کے سامنے پیش کیا تو وہ اس کا کمال دیکھ کر دنگ رہ گیا اصل اور نقل میں ذرا برابر فرق نہ تھا۔

ابن مقلہ[1] کی لکھی ہوئی تحریریں بہت کم ملتی ہیں، عراق کے بعض شہروں میں بعض مصاحف اس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، لیکن محققین کو شبہ ہے، حال ہی میں پتہ چلا ہے کہ ہرات کے میوزیم میں ابن مقلہ کا لکھا ہوا مصحف موجود ہے، اسی طرح کتاب خانہ رامپور میں بھی ایک نسخہ ابن مقلہ کا بتایا جاتا ہے معلوم نہیں اس میں کتنی اصلیت ہے،

ربع رشیدی کے سلسلے میں رشید الدین فضل اللہ وزیر غازان خاں کا ایک خط ہے، جس میں لکھا ہے کہ اپنے گنبد کے جوار میں دائیں اور بائیں "بیت الکتب" بنایا ہے، اس میں منجملہ اور کتابوں کے ہزار نسخے قرآن عظیم کے وقف کئے گئے تھے، ان کی تفصیل اس طرح پر ہے۔

طلا سے لکھے ہوئے نسخے	۴۰۰ عدد
بخط یاقوت	۱۰ "
بخط ابن مقلہ	۲ "
بخط احمد سہروردی	۲۰ "
بخط اکابر	۲۰ "
بخط روشن خوب	۵۴۸ "
میزان	۱۰۰۰ "

گویا ابن مقلہ کے لکھے ہوئے دونوں نسخے رشید الدین فضل اللہ کے پاس موجود تھے (دیکھ مکتوبات رشیدی ص ۲۲۶-۲۲۷)

---

[1] دیکھئے رسالہ ابی العباس ... تحقیق پروفیسر مختار الدین احمد شامل "تذکرہ"

ابن بواب کے مصحف کے دو نسخے اب تک موجود بتائے جاتے ہیں، ایک چسٹر بیٹی گلکشن ڈبلن آئرلینڈ[1] میں تحت شمارہ قرآن، ۱۶، اوراق ۲۸۶، سطور ۱۵ فی صفحہ مکتوبہ ۳۹۱ھ آخری صفحہ پر خوش رقم خاں گجراتی کی تحریر اور دستخط بقید تاریخ ۱۱۵۵ ہجری ضبط ہے۔ مصحف کا ترقیمہ یہ ہے: کتب هذا الجامع علی بن هلال بمدینة السلم سنة احدی وتسعین وثلثمائة حامدا لله تعالی علی نعمه ومصلیاً علی نبیه محمد وآله مستغفراً من ذنبه۔

دوسرا نسخہ آثار ترکیہ اسلامیہ میوزیم میں محفوظ ہے، شمارہ ۴۴۹، اوراق ۲۸۶، سطور ۲۳ فی صفحہ، خاتمہ کی عبارت یہ ہے،

کتبه ابو الحسن علی بن هلال البغدادی ابغداد دار السلم فی شهور سنة احدی واربع مائة غفر الله له ولوالدیه ولجمیع امة محمد صلی الله علیه وآله واصحابه وسلم کثیراً

لیکن اس آخری نسخے کے بارے میں ڈاکٹر رئیس نے تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ اس کی نسبت ابن بواب کی طرف درست نہیں۔

دنیا کے اور دوسرے کتاب خانوں میں یاقوت مستعصمی کی طرف منسوب قرآن مجید کے نسخے پائے جاتے ہیں منجملہ ان کے چند نسخے سالار جنگ میوزیم حیدر آباد اور ہندوستان کے دوسرے کتاب خانوں میں ہیں، لیکن ان میں سے بعض کی نسبت غلط ہے،

ذیل میں خاص طور پر ایران اور مصر کے دو[2] کتاب خانوں کی بنیاد پر آٹھویں اور نویں صدی کے چند اہم نسخوں کا ایک مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے پہلے دار الکتب المصریہ پھر مشہد کے آستان قدس کے نسخوں کا ذکر ہوگا،

---

[1] D.S. Rice, The unique Ibn al Bawwab in the Chester Beatty Library (Dublin), 1955

(۱) ملک ناصر محمد بن قلاوون کے لئے جو قرآن لکھا گیا اس کا ایک جز، مکتوبہ ۷۱۳ ہجری
دار الکتب میں محفوظ ہے جس کو سیف الدین بکتمر بن عبد الساقی نے سنہ ۷۲۶ھ میں اس کتابخانے
پہ وقف کیا تھا، (ذیل ربعات ۷۲)

(۲) سلطان ملک ناصر محمد بن سلطان سیف الدین قلاوون کا موقوفہ نسخہ، تاریخ وقف
۷۳۰ (شمارہ ۴)

(۳) قرآن بخط حسن بن القاسم الجعفری مکتوبہ ۷۲۲ھ (شمارہ ۱۲۰)

(۴) قرآن بخط نسخ، کاتب الیاس بن محمد بن الیاس مکتوبہ ۷۳۰ھ (شمارہ ۲۳۹)

(۵) قرآن بخط ثلث، کاتب احمد بن محمد بن کمال بن یحیٰی الانصاری، مکتوبہ ۷۲۲ھ، واقف
ارغون شاہ اسمٰعیل (شمارہ ۱۸۴)

(۶) مصحف بخط عبد اللہ الشافعی ۷۴۰ھ (شمارہ ۱۱۱)

(۷) مصحف بقلم ثلث مکتوبہ ۷۴۳ھ (شمارہ ۱۶۲)

(۸) مصحف بخط ریحانی، کاتب احمد بن محمد بن کمال الانصاری المتطبب، کتابت ۷۴۳ھ
اسی کاتب کا ایک قرآن ۷۲۲ھ کا مکتوبہ زیر شمارہ ۱۸۴ موجود ہے (شمارہ ۷۶)

(۹) قرآن بخط یعقوب بن خلیل بن محمد بن عبد الرحمن الحنفی ۷۵۰ھ، اس کو ۷۶۹ھ میں سلطان
ابو المظفر شعبان بن شریف حسین بن سلطان ناصر محمد بن منصور قلاوون نے وقف کیا تھا، واقف
قرآن شمارہ ۴ کے واقف کا پوتا تھا، (شمارہ ۸۵)

(۱۰) مصحف بخط محمود بن حسین بن علی الخجوانی، تاریخ کتابت ۷۶۲ھ (شمارہ ۹۷)

(۱۱) قرآن موقوفہ خواند برکہ والدۂ سلطان ملک شرف ابو المظفر شعبان بن حسین بن ناصر
بن محمد بن قلاوون، تاریخ وقف ۷۶۹ (شمارہ ۶۵)

(۱۲) قرآن موقوفہ ملک اشرف ابوالمظفر شعبان بن شریف حسین بن سلطان ناصر محمد بن منصور[1] قلاوون تاریخ وقف ۷۷۰ (شمارہ ۷)

(۱۳) قرآن دوسرا نسخہ، واقف ملک اشرف ابوالمظفر شعبان مذکورۂ بالا، وقف ۷۷۰ھ (شمارہ ۹)

(۱۴) قرآن بخط علی بن محمد، کتابت ۷۷۴، واقف سلطان ابوالمظفر شعبان بن حسین تاریخ وقف ۷۷۸ ہجری (شمارہ ۱۰)

(۱۵) قرآن بتقطیع کلاں، کتابت ۷۷۶ھ (شمارہ ۲۴۰)

(۱۶) مصحف، خط ریحانی، کاتب احمد بن محمود الدین، تاریخ ۷۸۹ھ (شمارہ ۵۴)

(۱۷) مصحف بحکم امیر صرغتمش، کاتب محمد المکتب البنهانی، تاریخ کتابت ۷۷۶ھ (شمارہ ۱۵)

(۱۸) مصحف بخط عبدالرحمٰن بن صائغ، کتابت ۸۰۱ھ، مدت کتابت ۶۰ دن (شمارہ ۱۱۱)

(۱۹) مصحف بخط عبدالرحمن بن صائغ، کتابت ۸۱۴ھ، برائے ملک الناصر فرج بن سلطان ظاہر برقوق (شمارہ ۱۶)

(۲۰) ربعہ قرآن، واقف امیر صرغتمش، تاریخ وقف مذکور نہیں، اسی امیر کی نسبت سے ایک قرآن مکتوبہ ۷۷۶ھ زیر شمارہ ۱۵ مذکور ہے، (شمارہ ۶۱ ربعات)

(۲۱) قرآن مکتوبہ ۸۰۳ھ برائے ملک الناصر فرج بن برقوق (شمارہ ۱۵۲)

(۲۲) ربعہ قران، موقوف السلطان برقوق بدون تاریخ (ربعات، شمارہ ۱۲۰)

(۲۳) ربعہ قرآن، موقوف السلطان فرج بن برقوق، بدون تاریخ (ربعات شمارہ ۱۵۳)

(۲۴) جزو قرآن وقف السلطان برقوق بدون تاریخ (شمارہ ۷۷)

---

[1] سلطان منصور قلاوون کی قبر قاہرہ میں ہے، نزدیک بیمارستان سفرنامہ فارسی ج ۱ ص ۳۰ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ملک مظفر یوسف بن رسول سلطان یمن کی طرف سے غلاف کعبہ آتا تھا، لیکن ملک منصور قلاوون نے بعد میں یہ سعادت حاصل کرلی۔ سفرنامۂ فارسی ص ۴۴

(۲۵) جزء قرآن، وقف السلطان برقوق بدون تاریخ (شماره ۸۰م)

(۲۶) جزء قرآن، وقف سلطان فرج برقوق بدون تاریخ (شماره ۴۷م)

(۲۷ تا ۳۳) سلطان اشرف برسباری نے اس کتاب خانے میں سات قرآن وقف کئے تھے ان میں پہلا ۸۲۸ھ کا، دوسرا ۸۳۶ھ کا، تیسرا ۸۴۱ھ کا، چوتھا تاریخ ندارد، پانچواں اور چھٹا ۸۲۸ھ کا، ساتواں ۸۳۱ھ کا ہے، آخری تین ربعات کے ذیل میں ہے، شمارہ ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۹۹ اور پہلے چار زیر شمارہ ۹۶، ۹۳، ۹۴ اور ۹۸ موجود ہیں۔

(۳۴) مصحف بخط عبداللہ بن حجاج البرماوی سنہ ۸۴۴ھ (شمارہ ۱۲۴م)

(۳۵) مصحف بخط سعد الحافظ سنہ ۸۶۰ھ (شمارہ ۳۶)

(۳۶-۳۷) خطاب بن عمر الانجاوی کی کتابت کے دو قرآن مجید دار الکتب میں محفوظ ہیں ان میں سے پہلا ۸۷۹ھ کا مکتوبہ ہے جو کسی امیر جانی بک امیر آخور الملکی الاشرفی کے لئے لکھا گیا تھا (شمارہ ۵۵م) اور دوسرا ۸۸۹ھ میں مرتب ہوا اور جس میں یاقوت مستعصمی کے خط کی پیروی ہوئی، یہ دوسرا نسخہ الملک اشرف ابی النصر قایتبای نے ۱۹ المحرم ۸۹۰ھ کو وقف کیا تھا، (شمارہ ۱۲۶م)

(۳۸ تا ۴۲) سلطان قایتبای چرکسی کے چار موقوفہ نسخے اور موجود ہیں۔

وقف ۸۷۹ (شمارہ ۸۵م)

وقف ۸۵۷ (شمارہ ۱۰۱ ربعات م)

وقف ۵ صفر ۸۸۰ھ (شمارہ ۱۴۳م)

وقف بدون تاریخ (شمارہ ۸۸ ــ الاجزا)

(۴۳) قرآن، خط ثلث و نسخ، کاتب علی بن اخی قاسم بن رستم الوفاعی، سنہ کتابت ۸۸۵ھ م

دار الکتب میں محفوظ نسخوں کے ذکر کے بعد اب آستان قدس وغیرہ کے نسخوں کا مختصر تعارف

پیش کیا جاتا ہے ، ظاہر ہے یہ نسخے آٹھویں اور نویں صدی کے ہیں۔

ذیل میں چند نسخوں کا تعارف کرایا جاتا ہے جو تاریخی لحاظ سے کافی اہم ہیں۔

(۱) قرآن کے دو ورق ، خط کوفی میں پوست آہو ، جس پر ایک عبارت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قرآن کو محمد بن ابراہیم بن افلح العطار نے ۲۷۰ ہجری میں دمشق کی جامع مسجد کے لئے وقف کیا تھا، واضح ہے کہ اس تاریخ سے قبل کا نوشتہ ہوگا۔ یہ نسخہ دار الکتب المصریہ میں موجود ہے۔

(۲) قرآن کا ایک نسخہ جامع دمشق میں ہے۔ جو بقول دکتور صلاح الدین منجد ۲۶۷ ہجری کا مکتوبہ ہے، اس کا خط کوفی تزئینی ہے۔

(۳) گنجینۂ قرآن مشہد ایک قرآن مکشوف ہوا ہے جس کی کتابت ۲۷۲ ہجری میں اصفہان میں ہوئی تھی ، یہ خط معقلی میں ہے اور ایران کا قدیم ترین نسخۂ قرآن ہے۔

(۴) مشہد ہی میں قرآن کا ایک جزو خط کوفی آمیختہ بنسخ میں ہے ، اس کو محمود غزنوی کے ابو القاسم منصور بن محمد بن کثیر نے ۳۹۳ ہجری میں آستان قدس کے لئے وقف کیا ، وقف نامہ اسطرح ہے،

" سبلہ ابو القاسم منصور بن محمد بن کثیر علی المشہد بطوس فی شہر ربیع الاول سنۃ ثلاث وتسعین وثلاث مائۃ ابتغاءً لوجہ اللہ وطلباً لمرضاتہ لا یباع ولا یوھب ولا یورث غفر اللہ لہ ولوالدیہ "

ابو القاسم منصور[۱] بن ابی الحسین محمد بن ابی منصور کثیر بن احمد ہرات میں پیدا ہوا ، اس کا جد قائن (خراسان) سے تعلق رکھتا ہے ، اور اس کا باپ ابو الحسین[۲] محمد سامانیوں کے دور میں وزارت کے عہدے پر فائز رہ چکا تھا ، عربی کے شاعر ثعالبی[۳] نے اس کی مدح میں اشعار لکھے ہیں ،

۱؎ اس کے حالات کے لئے دیکھئے تاریخ بیہقی حبیب غیاض ص ۱ ، ۹۴ ، ۱۵۷ ، ۱۶۰ ، ۱۸۲ ـ ۱۸۴ ، ۲۹۷ ، ۳۶۴ ، ۳۸۸ ، ۳۸۹ ، ۶۰۰ ، ۶۶۱ ، ۶۶۴ وغیرہ۔

۲؎ دیکھئے تاریخ بیہقی ص ۲۰۶

ابو القاسم ... سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں وزیر اور دیوان عرض تھا اور سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں اسی طرح محترم و معزز رہا، پہلے دیوان عرض تھا اور پھر خراسان کا صاحب دیوان ہو گیا، اس کا شمار مسعود غزنوی کے چند محترم ترین امرا میں تھا جیسا کہ بیہقی کی اس عبارت سے ظاہر ہے :-

آنجا مردی باید محتشم و بو القاسم کثیر از مرات بیامده است و نام دارد، و بوسہل حمدوی نیز مردی محتشم و کافی است، و بوسہل زوزنی ہم محتشم و راز کشید و بندۂ خداوند است و ہم نامی دارد، و محمود نیز نام و جاه یافت، این اند محتشم تر بندگان خداوند که بنده نام برد (چاپ فیاض ص ۳۸۸)

اس کی تاریخ وفات نہیں معلوم لیکن ۴۳۲ تک وہ زندہ تھا، (تاریخ بیہقی ص ۶۶۴)

(۵) آستان قدس مشہد کے گنجینۂ قرآن میں ایک دوسرا نسخہ موجود ہے، اس کو ابو الحسن عراقی دبیر سلطان مسعود غزنوی نے آستان قدس پر وقف کیا ہے، یہ نسخہ نسخ متمایل بہ ثلث میں ہے، تاریخ بیہقی میں ہے :- " و عراقی دبیر بو الحسن ہر چند نام کفایت بر دی بود خود بدیوان کم نشستی و بیشتر پیش امیر بودی و کارہای دیگر راندی و محلی تمام داشت در مجلس این پادشاه " (ص ۱۴۴ - ۱۴۵)

ابو الحسن عراقی کی وفات ۴ شعبان ۴۲۹ ہجری کو ہوئی، وہ مشہد میں امام رضا کے روضہ میں دفن ہوا، امام رضا کے روضہ سے اس کی وابستگی کا ذکر بیہقی نے اپنی تاریخ میں اس طرح پر کیا ہے،

بقیہ حاشیہ ... لغت نامہ دہخدا اور رہنمای گنجینہ کتاب میں اصمعی شاعر لکھا ہے جو غلط ہے، اسلئے کہ اصمعی ۲۱۶ھ میں وفات پا چکا ہے یعنی تقریباً ڈھائی سو سال پہلے، منوچہری نے ایک مشہور قصیدہ اسکی مدح میں لکھا ہے، مطلع یہ ہے، نوروز فرخ آمد و نغز آمد و شیر ... با طالع مبارک و با کوکب منیر

ممدوح کا نام :- مرغان دعا کنند بگل بر ... سپیده دم ... بر جان و زندگانی بو القاسم کثیر

دیوان چاپ سیاقی ص ۴۴،

وروز دوشنبہ ششم بوالحسن عراقی و برگذشتہ شد رحمہ اللہ علیہ، و چناں گفتند کہ زنان او را وارد وعدند کہ او مطربۂ مرغزی را بزنی کردہ بود، و مرد سخت بخو بود و باریک گیر، ندانم کہ حال چون باشد، ما ودآں ہفتہ کہ گذشتہ شد من بعیادت او رفتہ بودم او را یافتم چون تار موی گداختہ ولیکن سخت ہوشیار گفت و وصیت بکرد تا تابوتش بمشہد علی موسی الرضا رضوان اللہ علیہ بردند بطوس، و آنجا دفن کردند کہ مال ایں کار را درحیات خود بدادہ بود و کاریز مشہد را کہ خشک شدہ بود باز رواں کردہ و کاروان سرای برآوردہ و دیہی مستقل بیک خراج بر کاروان سرای و بکارز وقف کردہ، و من در سنہ احدی و خمسین (واربع مایۃ) کہ بطوس رفتم با رایت منصور، پیش کہ ہزیمت دندانقاں افتاد و بنوقان رفتم و تربت رضا را رضی اللہ عنہ زیارت کردم، گور عراقی را دیدم در مسجد آنجا کہ مشہد است در طاقی پنج گز از زمین تا طاق، و او را زیارت کردم و بتعجب بماندم از حال ایں دنیای فریبندہ کہ درشت و نرسال ایں مرد را بر کشید و بر آسمان جاہ رفت و بدیں نقطہ برد و ناچیز گشت[1] (ص ۵۳۹)

(۶) آستان قدس مشہد کے گنجینۂ قرآن میں قرآن کا ایک حصّہ (۴۵ ورق) محفوظ ہے، یہ خط کوفی میں ہے اور کاتب ابو البرکات ہے، سنہ کتابت درج نہیں البتہ تاریخ وقف ۴۲۱ ہجری موجود ہے، اس نسخے کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ قرآن کا نسخہ آستان قدس میں ابوعلی بن حتولہ کے ذریعے وقف ہوا تھا جیسا کہ ذیل کی عبارت سے واضح ہے،

وقف مؤبد وسبیل مخلد وقفہ وسبلہ کاتبہ ابو البرکات علی مشہد الامام ابی الحسن علی بن موسی الرضا

---

[1] واضح ہو کہ وہ غزنین میں مرا ہے۔ [2] اس کے حالات کے لئے دیکھئے تاریخ بیہقی ص ۵۸،

۹۴، ۱۴۴، ۱۴۶، ۲۰۵، ۲۲۲، ۲۳۴، ۲۴۴، ۲۴۲، ۲۵۷، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۸، ۲۷۰، ۲۷۲، ۴۷۷، ۴۹۷، ۴۹۸، ۵۰۰، ۵۱۸، ۵۲۰، ۵۳۹۔

علیہ السلام [illegible] لمرضات الله عز وجل وطلبا لثوابہ وسطر ابو علی بن حسول علی ان یکون فی یدہ [illegible]
من الفقہ والمجد وذالک فی شہر رمضان سنہ احدی وعشرین واربعمائۃ

ابو علی بن حسول کے دو معاصرین ابو منصور ثعالبی اور باخرزی نے تتمۃ الیتیمہ اور دمیۃ القصر میں (علی الترتیب) اس کے حالات لکھے ہیں، وہ مدت تک مجد الدولہ دیلمی کا صاحب دیوان رسائل رہا تھا، ۴۲۰ ہجری میں جب سلطان محمود نے رے پر قبضہ کیا تو ابو علی کو اپنے ساتھ غزنیں لایا اور اس کو اپنا دبیر مقرر کیا، سلطان مسعود کے زمانے میں رے کے دیوان رسائل اس کے سپرد تھے، اسکی وفات ۴۵۰ ہجری میں بتائی گئی ہے،

(۷) گنجینۂ مشہد کا ایک نسخہ جس کو محمد بن موسیٰ نے ۴۰۲ ہجری میں آستانۂ قدس پر وقف کیا تھا، اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ خط نسخ میں ہے اور کوفی کے اثر سے پاک ہے، یہ نسخہ راہنمای گنجینہ میں شامل نہیں،

(۸) جزو قرآن دار الکتب المصریہ شمارہ ۶۴ بخط ابی علی محمد بن مقلہ (م: ۳۲۸) سال کتابت ۳۰۸، اس نسخہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فارسی ترجمہ شامل ہے، اور بظاہر قرآن کا سب سے قدیم فارسی ترجمہ ہے جو مکشوف ہوا ہے، اگرچہ متعدد قرآن دنیا کے کتاب خانے میں اس کے نام سے منسوب ہیں لیکن ایک قول کے مطابق اس نے صرف دو قرآن یادگار چھوڑے ہیں (رک، لغت نامہ ص ۴۵۳)

(۹) جزو قرآن، گنجینۂ قرآن مشہد، خط کوفی مشکول، تاریخ تحریر و تذہیب ۴۶۶ ہجری، کاتب و مذہب عثمان بن حسین وراق، علی بن ابی المفضل نے ربیع الآخر سنہ ۶۱۴ میں مشہد کے روضہ پر وقف کیا ہے،

(۱۰) قرآن بخط و تذہیب محمد بن عثمان وراق (خط کوفی ترئینی) موقوف ۴۱۶ھ

(۱۱) جزو قرآن، بخط عبدالملک بن عبداللہ بن احمد زکریا الزاہد اصفہانی، سال کتابت ۴۶۹ھ، دارالکتب المصریہ میں محفوظ ہے،

(۱۲) قرآن سال کتابت ۵۰۵ ہجری، بست افغان، مشتمل لائبریری پیرس خط کوفی تزیینی،

(۱۳) قرآن بخط کوفی بیرآموز، محفوظ چیسٹر بیٹی کلکشن،

(۱۴) جزو قرآن بخط کوفی تزیینی، کاتب و سنہ کتابت ندارد، لیکن ورق اوّل پر ایک تحریر ہے جو ۵۴۶ھ میں لکھی گئی، انداز خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اوائل قرن پنجم کی تحریر ہوگی، روضۂ مشہد پر وقف ہے،

(۱۵) جزو قرآن بخط کوفی تزیینی، کاتب ابوالقاسم حسن بن حسین بن احمد ابن علی خطیب، تاریخ تحریر شوال ۵۳۵ ہجری، اور اسی سال جمال الدین حاجی علی بن اسمٰعیل نے روضۂ مشہد پر وقف کر دیا تھا،

(۱۶) جزو قرآن، کاتب مسعود بن احمد الکاتب الاصفہانی، تاریخ کتابت ۱۰ ذی قعدہ سنہ ۵۵۵ھ، دارالکتب المصریہ میں محفوظ ہے،

(۱۷) جزو قرآن بخط کوفی تزیینی، کاتب محمد بن حسین، تاریخ تحریر غرہ جمادی الآخر ۵۶۵ ہجری، راھنمای گنجینۂ قرآن شمارہ ۲۲۔

(۱۸) نسخۂ قرآن بخط کوفی، کاتب و مذہب بکر بن احمد بن عبید اللہ الغزنوی، تاریخ کتابت اوّل رمضان سنہ ۵۶۶، دارالکتب المصریہ میں محفوظ ہے، یہ نسخہ اپنے خط و تذہیب کے اعتبار سے نہایت اہم ہے۔

(۱۹) قرآن خط کوفی دورۂ تکامل، با اعراب و اعجام و مد و تشدید، کاتب احمد بن علی المقری الیوفضابادی، کتابت ۵۰۳، مذہب محمد بن عبدالرحمن بن محمد الفرج الدامغانی، نسخہ گنجینۂ قرآن

[illegible] میں محفوظ ہے،

(۲۰) [illegible] مغربی میں پوست آہو پر ایک نسخۂ قرآن دار الکتب المصریہ میں موجود ہے (شمارہ ۱۹۱) اس کا کاتب عبد اللہ بن محمد بن علی ہے جس نے شہر بلنسیہ میں ۵۵۰ ہجری میں اس کی کتابت وزیر ابو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمن بن عبد اللہ المذحجی ثم القرشی کے لئے کی تھی،

(۲۱) دار الکتب المصریہ میں ایک نسخۂ قرآن بخط ریحانی (شمارہ ۲) کاتب عبد الرحمن بن محمد بن ابی نعم ہے، یہ نسخہ ۵۹۹ ہجری اتابک ابوبکر بن ابو المظفر سعد بن زنگی کے لئے لکھا گیا ہے، یہ بادشاہ وہی ہے جس کے دربار سے مشہور فارسی شاعر سعدی شیرازی منسلک تھے۔ لیکن اس سلسلے میں دشواری یہ ہے کہ ابوبکر ۶۲۳ میں تخت نشین ہوا ہے، ۵۹۹ھ میں اس کا باپ ابو المظفر سعد بن زنگی فرماں روائے فارس تھا،

(۲۲) دار الکتب میں ایک دوسرا نسخۂ قرآن مسعود بن محمد بن مسعود خطاط اصفہانی کے خط میں ہے، (شمارہ ۱۳۲) جس کی کتابت ختم ذی قعدہ ۶۰۷ ہجری میں ہوئی، اس کے ساتھ ترجمۂ فارسی بھی شامل ہے۔ اسی کاتب کا ایک اور نسخۂ قرآن اسی کتب خانے میں موجود ہے جو ۵۵۵ھ میں لکھا گیا ہے، گویا ۵۲ سال پہلے، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کاتب نے لمبی عمر پائی تھی، پہلا نسخہ اوائل عمر کا اور دوسرا اواخر کا ہے۔

(۲۳) قرآن مجید کا ایک نسخہ خط کوفی میں گنجینۂ قرآن مشہد (شمارہ ۱۳) میں ہے، اس کا کاتب ابو الحسن علی بن محمد بن محمد اور سنہ کتابت رمضان ۶۲۰ ہجری ہے، یہ نسخہ اپنے خط کی پختگی کے لحاظ سے نہایت قابل قدر ہے، محمد رضا استرآبادی نے ۱۰۱۱ ہجری میں روضۂ مشہد پر وقف کیا تھا،

(۲۴) دار الکتب المصریہ (شمارہ ۳) میں ایک نسخۂ قرآن ۶۳۵ ہجری کا مکتوب ہے، اس کا کاتب اسمٰعیل بن ابراہیم بن احمد اور خط ریحان ہے،

(۲۵) برٹش میوزیم میں قرآن مجید کا ایک نسخہ خط مغربی میں ہے، اس کی کتابت ۶۵۲ ہجری کے مکمل ہوئی تھی، اس نسخے پر مالک نسخہ کے لڑکے کی پیدائش کی یہ تاریخ درج ہے، مخطوط نمبر ۹۴۳۔

اب ذیل میں یاقوت مستعصمی کی کتابت کے نسخوں کی بابت ایک مختصر یادداشت پیش کی جاتی ہے۔ یاقوت ۶۱۰ھ کے قریب پیدا ہوا اور ۶۹۸ھ میں وفات پائی، اس کا نام جمال الدین ابو المجد عبداللہ تھا، مستعصم باللہ (۶۴۰ ـ ۶۵۶) کے زمانے میں اس کی بڑی ترقی ہوئی، وہ عالم وفاضل اور اعلیٰ درجہ کا خطاط تھا اور خطوط ستہ یعنی ثلث، محقق، توقیع، ریحان، رقاع، نسخ کو ماہرانہ استادی سے لکھتا تھا، اس کے نام سے قرآن مجید کے متعدد نسخے دنیا کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں، ان میں بعض یہ ہیں۔

کتاب خانہ ایا صوفیہ ترکی	۶۵۴	، کتاب خانہ حمیدیہ قسطنطنیہ	(۶۶۲)
کتاب خانہ سلطنتی تہران	۶۶۸	، کتاب خانہ آستان قدس	۶۷۴
موزۂ ایران باستان	۶۷۸	، کتاب خانۂ ملی ملک	۶۸۰
مجموعۂ مخطوطات بیتیل	۶۸۱	، کتاب خانہ نورالدین مصطفیٰ بک ترکی	۶۸۲
مقبرۂ سلطان سلیم عثمانی	۶۸۴	، کتاب خانہ آستان قدس	۶۸۶
کتاب خانہ ملی پیرس	۶۸۹	، دارالکتب المصریہ	۶۸۹
کتاب خانہ ملی پیرس	۶۹۰	، دارالکتب المصریہ	۶۹۰

اس فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مستعصمی نے ایک ایک سال میں دو دو نسخے لکھے ہیں جو ذرا مشکل سے قیاس کیا جاسکتا ہے، ظاہر ہے کہ قرآن کے نسخوں کے سلسلے میں جعل کیا گیا ہے، اس قسم کے متعدد واقعات موجود ہیں خود یاقوت مستعصمی کی طرف دو دو نسخے منسوب ہیں، ان میں آستانِ قدس مشہد کا ایک نسخہ ۶۰۴ کا مکتوبہ ہے یعنی کاتب کی پیدائش سے ۶ سال قبل کا ہے، دوسرا نسخہ

کتاب ......تہران کالج جو ۶۳۰ کا نوشتہ ہے، اس تاریخ میں مستعصمی کی عمر ۱۲ سال کی ہوگی، اتنی کم عمری میں اس نسخہ کی کتابت مشکل سے تسلیم کی جاسکتی ہے۔

(۱) قاضی محمد احسن قریشی جلالپور پیروالا کے مجموعہ میں قرآن کا ایک مطلا نسخہ ہے جو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت (۷۰۷ ــ ۷۸۰) کا مکتوبہ قرار دیا گیا ہے، کہتے ہیں مخدوم کے ہاتھ کا ایک دوسرا نسخہ سجادہ نشین صاحب اوچ بخاری کے پاس ہے۔ (سیارہ ڈائجسٹ ص ۸۶، کالم ۲)

(۲) آستان قدس مشہد میں عبداللہ صیرفی تبریزی کے ہاتھ کا ایک نسخۂ قرآن ہے (شمارہ ۴۷) یہ خط نسخ میں اور تاریخ کتابت ۷۲۰ھ ہے، عبداللہ صیرفی اپنے عہد کا مشہور خطاط تھا اور ایک رسالہ رسالۃ الخط کا مؤلف ہے، رسالۃ الخط کا ایک نسخہ کتاب خانہ آستان قدس میں موجود ہے (دک فہرست ج ۶، ص ۴۷۵)

(۳) آستان قدس کے کتاب خانے میں قرآن مجید کا ایک نسخہ بخط محمد بن شیخ یوسف الابار کی معروف بہ سید الخطاط موجود ہے، اس کی کتابت ۷۳۰ ہجری میں ہوئی، خط عربی شیوۂ ترکستانی ہے، متن کے ساتھ ترجمہ وتفسیر ترکی بھی ہے۔ (قرآن شمارہ ۸۴)

(۴) جزو قرآن بخط ثلث کاتب شیخ محمد طغرائی، تاریخ تحریر ۸۰۹ ہجری، مشہد آستان قدس (شمارہ ۵۸)

(۵) بایسنقر بن شاہ رخ (م ۸۳۷) کے زمانے میں خطاطی کو ترقی ملی ہے، وہ خود خطاط تھا چنانچہ آستان قدس مشہد میں اس کے نوشتہ قرآن کے سات ورق اور چھ ورق طلا گنجینہ اور ایک ورق موزۂ آستان قدس میں موجود ہیں۔

(۶) بایسنقر مرزا کا بھائی ابراہیم سلطان فاضل اور خطاط تھا، اس نے ایک قرآن مجید ۸۲۷ میں مرتب کرکے آستان قدس مشہد پر وقف کردیا تھا اس میں سے اب صرف ۱۱۱ ورق

ہیں، یہ خطِ ثلث کا بہترین نمونہ ہے، قرآن مجید کا ایک نسخہ ابراہیم سلطان کی طرف منسوب ہے جس
بت ۸۲۷ میں ہوئی لیکن مرتب رہنمائی گنجینۂ قرآن مشہد کا خیال ہے کہ یہ نسخہ جعلی ہے، اس کا
براہیم سلطان کے خط سے متفاوت ہے، یہ آخری نسخہ سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۰۲۰) شاہ
بیٹے عبداللہ قطب شاہ (۱۰۲۰ - ۱۰۸۳) کے کتاب خانے میں اور خواجہ ہلال کی تحویل میں
کا ہے، اور رسید علی الحسنی مرید عالمگیر بادشاہ کی مہر سے مزین ہے، (قرآن شمارہ ۶۲)

(۷) عبداللہ طباخ ہروی شاہ رخ بن تیمور کے دور کا مشہور خطاط تھا، اس نے ۸۴۵ ہجری
ن السلطنت علاء الدولہ بہادر خاں کے مشورے سے ایک قرآن سلطان حسین بیقرا کے خزانے
لکھا تھا، اس کا یہ نسخہ مرزا غیاث بیگ اعتماد الدولہ کے فرزند اعتقاد خاں نے آستان
مشہد پر وقف کیا، ایک مہر ہے جس پر یہ الفاظ کندہ ہیں:۔ مرید خاص بادشاہ جہاں
اد خاں (قرآن شمارہ ۶۳)

(۸) محمود سلطانی مکتب ہرات کا خطاط گذرا ہے، اس نے یاقوت مستعصمی کے خط کی
نقل ایک کلام مجید میں کی ہے جو ۸۴۶ میں مکمل ہوا، نسخہ کتاب خانۂ سلطنتی (قرآن شمارہ ۲)
وظ ہے،

(۹) زین العابدین بن محمد کاتب شیرازی نے جمادی الاولیٰ ۸۷۶ ہجری میں ایک قرآن مجید
مظفر الدین حسن بہادر خاں کے لیے لکھا تھا، اس نسخہ کی اہمیت اس طرح پر اور زیادہ
تی ہے کہ یہ نسخہ نور الدین جہانگیر بادشاہ کی ملک میں تھا اور اس نے آستان قدس مشہد
تاب خانے پر وقف کیا تھا، یہ قرآن شامل ترجمۂ فارسی ہے، ترجمہ خط نسخ اور متن خط ثلث
ہے (قرآن شمارہ ۶۴)

سطور بالا میں قرآن مجید کے صرف اہم تاریخی نسخوں سے بحث کی گئی ہے حالانکہ اس کی

تزئین وتہذیب کی نفست وفنکارانہ بصیرت صرف کی گئی ہے اور ایسے ایسے اعلیٰ نمونے کے قرآن کے نسخے مرتب ہوئے ہیں کہ ان کی بنا پر خطاطی وخوشنویسی مصوری سے کم دلکش نہیں رہ جاتی، یہ فن جمالیاتی حس کا ویسا ہی مظہر ہے جیسا اور کوئی فن لطیف، فن خطاطی اور اس کی فنکارانہ تزئین وتہذیب نے نئے نئے اسلوب پیدا کئے ہیں۔ جن پر قرار واقعی بحث کے لئے بڑی فنی بصیرت درکار ہے، قرآن مجید کے نسخے خطاطی اور نقاشی کی تاریخ کے لئے اہم ماخذ ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن مجید کے اہم نسخوں کی مکمل فہرست تیار کی جائے، پھر کوئی ادارہ ان اہم نسخوں سے ضروری عکسی اقتباسات حاصل کرے، اور متخصصین کے تعاون سے قرآن کے خط کی ایک تاریخ موجودہ مواد کے پیش نظر تیار کی جائے مخطوطے جس تیزی کے ساتھ تلف ہو رہے ہیں، خود موجود مخطوطے اس پر اپنی زبان بے زبانی سے گواہی دے رہے ہیں، امید کرتا ہوں کہ وقت کے اس شدید تقاضے کا احساس ہوگا اور جلد از جلد مؤثر عملی قدم اٹھایا جائیگا۔

کشمیر میں اسلام کی اشاعت (۴)

از

ڈاکٹر محمد فاروق بخاری شعبۂ عربی، امر سنگھ کالج (کشمیر)

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو معارف مئی ۱۹۸۶ء)

سید جلال الدین محدّث | سید موصوف بلند پایہ عالم دین بالخصوص علم حدیث کے مستند عالم تھے، سلطان قطب الدین کی درخواست پر میر سید علی ہمدانی نے انہیں کشمیر بھیجا، انھوں نے یہاں اصلاح و تبلیغ کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری کیا، یہاں کے اکابر علماء ان سے مستفید ہوئے تھے، بادشاہ بھی ملاقات کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، اور ان کو عمدۃ المحققین کا لقب دیا تھا، بعد میں ان کا محلہ بھی جو نخلہ دل (سرینگر) میں جہلم کے کنارے پر واقع ہے، اسی نام سے مشہور ہوا، اور بالآخر یہ نام بگڑ کر آرد گجن گیا، وہ یہیں آسودہ بھی ہیں، ان کے مقبرے میں کئی اور بزرگ دفن ہیں[1]۔ رشتہ کے لحاظ سے آپ میر سید علی ہمدانی کے خال تھے[2]۔

سید کبیر بیہقی | شیخ ہمدانی کے رفقاء اور مریدوں میں سے تھے، رات دن ان ہی کی خدمت میں

---

[1] تاریخ سید علی (قلمی)، [2] فتحات کبرویہ (قلمی)، نسخہ جات ریسرچ لائبریری سرینگر۔

رہتے تھے جن میں شیخ ہمدانی ہی کے حکم سے محلہ علاؤالدین پورہ (سرینگر) میں اقامت گزیں تھے اس سے متصل راجہ پرورسین کے عہد کا بنایا ہوا ایک بڑا بت خانہ تھا، خود سلطان قطب الدین شیخ ہمدانی کی صحبت سے مستفید ہونے سے قبل اس بت خانہ میں آیا کرتا تھا، یہاں ایک راہب بھی رہتا تھا جس کا نام شنابور تھا، وہ شیخ ہمدانی کی کوششوں سے مسلمان ہوا، اور انھوں نے اس کا نام محمد رکھا، اس نومسلم راہب کی تربیت اور سرپرستی بعد میں ایک دوسرے بزرگ حاجی محمد بلخی کے سپرد کی، غرض شیخ ہمدانی نے اس بت خانہ کی اہمیت ختم کرانے کے لیے اس کے آس پاس متعدد بزرگوں کو متعین کیا، جن میں ولی کامل سید کبیر بیہقی بھی ایک تھے[1]۔

مولانا میر محمد بلخی | بلند پایہ عالم، کلام اللہ کے حافظ، ہفت قرأت کے ماہر اور باطنی اسرار و معارف کے شناسائے کامل تھے، قرآن حکیم سے گہری محبت رکھنے کی بنا پر قاری کے لقب سے مشہور تھے، حضرت شیخ ہمدانی نے انھیں سلطان قطب الدین کی اصلاح کے لیے مقرر کیا، سلطان نے ان کے مطبخ اور لنگر وغیرہ کے اخراجات کے لیے دو پرگنوں کی آمدنی وقف کر رکھی تھی، مولانا موصوف یہاں کے اُن ائمہ مساجد اور مؤذنین کی نگرانی بھی کرتے تھے جنھیں حکومت کی طرف سے وظائف مقرر تھے، شیخ ہمدانی کی مراجعت کے بعد کافی وقت تک زندہ رہے، اور تبلیغی و اصلاحی خدمات انجام دیئے، ۲۰ رجب ۷۸۶ھ کو انتقال کیا، انتقال کے وقت یہ دو اشعار زبان پر تھے،

زیں جہاں رفتیم و دل برداشتیم | باجہان بانان جہان بگذاشتیم
ایمن جستیم از دست اجل، | وادریغا ما غلط پنداشتیم

انتقال کے دوسرے دن سلطان قطب الدین بہت سے لوگوں کے ساتھ آیا، خانقاہ معلیٰ (سرینگر) میں شیخ ہمدانی کے صفہ کے قریب نماز جنازہ ادا کی گئی، اور محلہ لنگرہٹہ میں دفن [?]

[1] تاریخ اعظمی: ص ۳۹۔

کیے گئے، ان کے مقبرے میں اور بھی سادات اور اولیا، سپردِ خاک کیے گئے، سلطان قطب الدین نے جب ۷۹۶ھ میں انتقال کیا تو اسے بھی یہاں دفنایا گیا، اب یہ مقبرہ سلطان قطب الدین ہی کے نام سے موسوم ہے۔[1]

سیّد محمد کاظم | موصوف حضرت شیخ ہمدانی کے ذاتی کتب خانہ کے لائبریرین تھے، علم و فضل کے ساتھ ولایت و روحانیت میں بھی بلند مقام کے حامل تھے،

پانپور سے متصل اللہ پورہ میں ایک بڑا بت خانہ تھا، وہ ویران تھا، شیخ ہمدانی نے سیّد محمد کاظم کو اسی جگہ قیام کرنے کا حکم دیا، انھوں نے یہاں آخری دم تک دینِ حق کا پرچار کیا، اور چھوٹے بڑے کی اصلاح کی، عوام میں سیّد قاضی کے نام سے مشہور تھے۔[2]

ان بزرگوں کے علاوہ شیخ ہمدانی کے رفقاء میں جن مبلغین نے کشمیر میں ناموری حاصل کی، ان میں سیّد محمد باقر، سیّد محمد بزرگ، سیّد رکن الدین، سیّد فخر الدین، سیّد محمد قریشی، سیّد محمد عبد اللہ، میر سیّد کمال، میر سیّد جلال عطائی، میر سیّد فیروز، میر سیّد حیدر، سیّد عزیز اللہ، سیّد محمد مراد، شیخ سلیمان، سیّد محمد بیہقی، سیّد محمد عین پوش، سیّد نعمت اللہ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔[3]

تیسری سیاحت | شیخ ہمدانی کی تیسری سیاحتِ کشمیر سے متعلق معلومات تاریخوں میں نہیں ہیں، اسی وجہ سے بعض معاصر اہلِ علم ان کی صرف دو سیاحتوں کے قائل ہیں، مورّخ غلام حسن نے ملا احمد علامہ کی تاریخ سے نقل کیا ہے کہ شیخ ہمدانی نے دوسری سیاحتِ کشمیر کے بعد

---

[1] فتحاتِ کبرویہ (قلمی)، از شیخ عبد الوہاب نوری، [2] ایضاً، [3] ان کے حالات کے لیے دیکھیے فتوحاتِ کبرویہ، تاریخ سیّد علی اور تاریخِ حسن ج ۳، یہ تینوں کتابیں ابھی غیر مطبوع ہیں، ملا سلطان زین العابدین کا درباری عالم، اس کی تاریخ کا نام واقعاتِ کشمیر ہے، جو اصل میں ایک

بھی ملکوں کی جانب سفر کا ارادہ کیا، بالخصوص ختلان کی ریاست کی، جو شہر ختلان میں (ختلان: ۔۔۔۔۔ مراد ہے) میں واقع ہے، واپسی پر کشمیر ایک اور مرتبہ تشریف لائے یہ ان کی تیسری اور آخری سیاحت تھی، یہاں مختصر مدت تک قیام کیا، جو لگ بھگ چھ ماہ پر مشتمل ہے، اس کے بعد پھر فارس کا ارادہ کیا مگر ابھی کنیز سوادی پہونچ پائے تھے کہ انتقال فرمایا،

تبلیغی کارنامے | کشمیر میں جو روحانی، فکری اور ثقافتی انقلاب آیا، وہ سراسر میر سید علی ہمدانی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے، شیخ ہمدانی نے ایک محتاط اور خیرخواہ مبلغ کی طرح یہاں نہایت احتیاط کے ساتھ اپنا کام شروع کیا، اور اسی احتیاط مگر انہماک کے ساتھ اسے پایۂ تکمیل تک پہونچایا، انھوں نے سب سے پہلے کشمیر کے تعلقات ان ممالک سے یک قلم منقطع کیے، جو بدھ مت اور ہندو ازم کے علمبردار بلکہ اس کے مرکز و محور تھے، اس کے برعکس انھوں نے کشمیر کا رابطہ ان ممالک سے جوڑا جو اسلام، اسلامی تہذیب، اسلامی فکر اور اسلامی فن و ادب کا سرچشمہ تھے، انھوں نے بے شمار کتابیں لکھیں، ان کے رفقاء وسط ایشیا سے بے شمار کتابیں ساتھ لائے، حکمران کشمیر ان کے قدموں پر گرنا اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتا تھا مگر وہ بدستور ہاتھ سے ٹوپیاں بنا کر کسبِ حلال سے اپنی زندگی گزارتے تھے، یہی درس انھوں نے اپنے رفقاء و متعلقین کو بھی دیا تھا، وہ خود مسلکاً شافعی تھے، وہ اگر چاہتے تو یہاں بھی بغیر کسی ادنیٰ مشکل کے اسی مسلک کو پھیلاتے، مگر چونکہ ان کے پیش رو مبلّغ سیّد شرف الدّین عبد الرّحمٰن نے حنفی ہونے کی وجہ سے یہاں اسی مسلک کے مطابق تبلیغ کی تھی، اس لیے شیخ ہمدانی نے اسی مسلک کو برقرار رکھا، اور اسی کے مطابق لوگوں کو عبادات و عقائد کی تعلیم دی، اس حکمتِ عملی سے انھوں نے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹ سنسکرت تاریخ "راج ترنگنی" کا فارسی ترجمہ ہے، کتاب نایاب ہے، مورخ حسن کو اس کا ایک نسخہ دستیاب ہوا تھا،

دین کی بڑی خدمت انجام دی، طبقۂ امراء و سلاطین کی اصلاح اور راہنمائی کے لیئے ایک اہم کتاب لکھی جو ذخیرۃ الملوک[1] کے نام سے مشہور ہے، اس میں سلاطینِ اسلام کو عموماً اور سلاطینِ کشمیر کو خصوصاً اپنی عظیم ذمہ داریوں اور منصبی فرائض کا عجیب و غریب انداز و اسلوب سے احساس دلایا، اس کتاب میں ان کی ایک خاص اصطلاح "سلطنتِ معنوی" ہے، یہ اصطلاح کتاب کے تمام مباحث کا محور و مرکز ہے، اس کی رو سے دنیادی بادشاہی مکمل طور پر "حقیقی بادشاہی" کے مطیع و منقاد ہونی چاہیئے، علامہ ابن خلدون کا مقدمہ اگرچہ اس موضوع پر ہر لحاظ سے محیط اور سائنٹفک ہے، مگر اس کے باوجود مقدمہ ابن خلدون اس اہم نکتے پر خاص روشنی نہیں ڈالتا ہے، میر سید علی ہمدانی نے ذخیرۃ الملوک میں اسی کمی کو پورا کیا، شیخ ہمدانی اور علامہ ابن خلدون دونوں ہم عصر تھے، کیا شیخ ہمدانی کی نظروں سے مقدمہ ابن خلدون گذرا تو نہ تھا؟

سلاطین کی اصلاح و تربیت کے لیۓ شیخ ہمدانی نے مکتوبات بھی لکھے، سلاطینِ کشمیر کے نام مکتوبات کا ایک مختصر مجموعہ بھی ان سے منسوب ہے، جو شائع بھی ہوا ہے، یہ خطوط شیخ ہمدانی کی ندرتِ فکر و بصر کا عمدہ نمونہ اور جذبۂ اعلاءِ کلمۃ الحق کا واضح ثبوت ہے، ہم ایک مکتوب کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، یہ مکتوب انھوں نے کشمیر کے ایک بادشاہ کو لکھا ہے، مکتوب رسمی آداب و القاب سے پاک و صاف ہے، درج ذیل آیتِ شریفہ سے شروع ہوتا ہے،

الذین ان مکنّاھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ و امروا بالمعروف و نھوا عن المنکر و للہ عاقبۃ الامور"

---

[1] ذخیرۃ الملوک کا تعارف اور اس کی اہمیت کے لیۓ ملاحظہ کیجیۓ، راقم کا مضمون "علم حدیث کی اشاعت میں علماءِ کشمیر کا حصہ" قسطِ اوّل ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند اگست ۱۹۷۰ء -

اہلِ علم حضرات اور حاملینِ نفوسِ قدسیہ پر یہ مخفی نہیں ہے کہ انسانی طبائع اپنی خصوصیات کے لحاظ سے جدا جدا ہیں، اس تباین سے اہلِ عالم کے اقوال و افعال میں بھی اختلافات ظاہر ہوئے، چونکہ بہت اخلاق اور گندے اوصاف (از قبیلِ ظلم و جبر، فتن و فساد) انسان کی فطرت میں داخل ہیں، اس لیے مخلوقات کے اغراض اور مقاصد بھی مختلف واقع ہوئے، پس اللہ کی حکمتِ بالغہ کا یہ تقاضا ہوا کہ حاکم بلند اوصاف سے متصف ہو جو اولادِ آدم کے حرکات و سکنات کو راہِ صواب اور منزلِ رشد و ہدایت پر ڈال دے نیز وہ شریعت کے نفاذ میں حتی الوسع کوشش کرے، مظلوموں اور ضعیفوں کو پنجۂ استبداد سے نجات دلائے ظالموں کو اپنی گرفت میں لائے، تاکہ عالمِ صوری کا نظام برقرار رہے، اور عوام و خواص کے مابین وحشیانہ حرکات صادر نہ ہونے پائیں، انبیاءؑ کی بعثت اور علماء کی معرفت کا مقصد بھی یہی ہے کہ حق باطل سے اور اصلاح فساد سے بالکل جدا اور ممیز رہے، اگر حاکم اس عمل پر گامزن ہے، تو محشر کے دن حاکم و محکوم دونوں جبّارِ حقیقی کی سطوت و صولت سے محفوظ اور مصئون رہیں گے، اگر ایسا نہ کیا تو اَلْیَوْمَ تُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ کے تحت ان سے باز پرس ہوگی، اس لیے بادشاہ اور حاکم کو چاہیئے کہ وہ اپنا منصب پہچانے بندگانِ خدا کے معاملات کی دیکھ بھال کرے، سلاطینِ اسلام اور خلفائے راشدین کی سیرتوں پر غور کرے، اپنے آپ کو شاہی آداب سے عاری نہ سمجھے، دنیا کی نعمتوں کو اپنی کج روی سے آخرت کی حسرت و ناامیدی کا ذریعہ نہ بنائے، فانی دنیا پر اعتماد نہ کرے، قیامت کی ذلت و گرفتاری سے غافل نہ رہے، ورنہ رخصت کے وقت

رکھتیں تھیں، والسلام علیٰ من تبع الہدیٰ[1]

کشمیر میں میر سید علی ہمدانی کے زمانے میں لوگ توہمات و طلسمات کے اسیر ہو گئے تھے، ان کے نزدیک بھی قدیم عرب جہلا، کی طرح انسان اور انسانیت کی فضیلت کا معیار کرتب بازی اور شعبدہ بازی بن گیا تھا، اس میں شک نہیں ہے کہ اس ذہن کو پیدا کرنے کے ذمہ دار کافی حد تک اُس وقت کے ہندو مذہبی رہنما تھے، للہ عارفہ اس جماعت سے سخت نالاں تھی اور ان پر کھل کر اظہارِ افسوس کرتی تھی، یہ کرتب ساز ابتدا، میں شیخ ہمدانی کی راہ میں بھی حائل ہوئے، مگر جلد ہی ناکام بھی ہوئے، کالی شوری مندر کے شعبدہ باز مجاور نے شیخ ہمدانی کو چیلنج بھی کیا، لیکن جب اس کرتب کا بھی وہی حال ہوا جو کسی زمانے میں عصائے موسیٰ کے سامنے ساحرین مصر کی بازی گری کا ہوا تھا تو یہ مجاور فوراً مسلمان ہوا، اور اس اثر سے دوسرے ہزاروں کشمیری باشندے بھی مسلمان ہوئے، تذکروں میں اس طرح کے کئی اور واقعات منقول ہیں،

میر سید محمد ہمدانی۔ شیخ ہمدانی نے چالیس سال کی عمر میں نکاح کیا تھا، اس طرح اُن کی تاریخِ ولادت مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ نکاح کم وبیش ۷۵۲ھ میں ہوا تھا، بہت دنوں کے بعد ان کے ہاں ایک فرزند پیدا ہوا جو تاریخ میں میر سید محمد ہمدانی بن میر سید علی ہمدانی کے نام سے مشہور ہیں، میر محمد ہمدانی کی تاریخِ ولادت کسی تذکرہ میں مذکور نہیں ہے، البتہ کئی تذکرہ نگاروں کے مطابق۔ شیخ ہمدانی کے انتقال کے وقت میر محمد ہمدانی کی عمر بارہ سال کی تھی، اس طرح۔ شیخ ہمدانی کی تاریخِ وفات ملحوظ رکھ کر میر سید محمد ہمدانی کی تاریخِ ولادت ۷۷۴ھ

---

[1] مکتوبات میر سید علی ہمدانی (قلمی) نسخہ ریسرچ لائبریری سرینگر بلہ اصول تصوف: دکتر احسان اللہ ص ۲۹۰، مطبوعہ طہران۔

ناشنہ متعین ہوئی ہے، میر ہمدانی اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے دس سال بعد ۷۹۶ھ یا ۷۹۷ھ میں کشمیر تشریف لائے، جبکہ اس وقت ان کی عمر ۲۲ سال کی تھی، کشمیر تشریف لانے کی وجہ والد بزرگوار کی وصیت تھی، جو انھوں نے اپنے رفقاء بالخصوص شیخ قوام الدین بدخشی کے ذریعہ پہونچائی تھی، جب میر سید محمدؐ ہمدانی کشمیر تشریف لائے تو یہاں سیکڑوں صلحاء اور غیر ملکی سادات موجود تھے، اس وقت وسط ایشیاء کے مزید تین سو اکابر آپ کے ساتھ تھے، یہ زمانہ سلطان قطب الدین کے بیٹے سلطان سکندر (۱۳۸۹ء تا ۱۴۱۳ء) کا تھا، سلطان سکندر بھی اپنے باپ کی طرح سخت مذہبی اور نو وارد مبلّغین کا غالی معتقد تھا، اس نے کشمیر میں اسلام کی اشاعت اور اسلامی شریعت کے نفاذ میں غیر معمولی دلچسپی لی، بلکہ اپنی مذہبی حمیت میں اس نے تشدد بھی اختیار کی، جس کی بنا پر وہ آج بھی ہندو مذہب کے پیروؤں میں معتوب و مغضوب ہے[1]، مگر حق بات یہ ہے کہ اس کی مذہبی پالیسی کو بیان کرتے میں، ہندو اور مسلمان دونوں مذاہب کے مورخوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر بڑی مبالغہ آمیزی کی ہے، اور اس کی شدت کا ذمہ دار اس کے مربّی اور مرشد میر محمد ہمدانی کو ٹھہرایا، جو ایک بے دلیل دعوی ہے، میر سید محمدؐ جب کشمیر تشریف لائے، تو سلطان سکندر نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا، اگرچہ میر سید محمدؐ ہمدانی کی عمر اس وقت صرف ۲۲ سال کی تھی، مگر کچھ اپنے نمایاں علم و فضل اور کچھ اپنے نامور والد بزرگوار کی شہرت و عقیدت سے انھیں عزت و احترام سے دیکھا گیا، معاصر مورخ جون راج تک معترف ہے کہ "محمد اپنے ساتھیوں میں ایسے ہیں جیسے تاروں میں چاند"[2] میر محمد ہمدانی تنہا تشریف نہیں لائے تھے، بلکہ شیوخ و اکابر کا

---

[1] ملاحظہ ہو راقم کا مضمون "کشمیر میں اسلامی عروج و زوال" "برہان"، دہلی نومبر ۱۹۶۹ء

ایک بڑا کارواں بھی ان کے ساتھ تھا، انھوں نے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چل کر ان مجاہدوں کو کشمیر کے مختلف اطراف و اکناف میں پھیلایا، وہاں کے لوگوں کی اصلاح و تربیت اور اسلام کی ترویج و اشاعت پر مامور کیا،

سلطانؒ سکندر کو حضرت میر محمدؒ کے ساتھ گہری عقیدت تھی، وہ ان کے علم اور روحانی کمالات سے استفادہ کرتا تھا، میر محمدؒ کو بھی سلطان کے اخلاص اور مذہبی حمیت کا احساس تھا، انھوں نے سلطان کے لیے تصوف میں ایک رسالہ لکھا، جسے بعد میں سلطان ہی کے نام پر الرسالۃ الاسکندریۃ سے موصوف کیا، اسی طرح اس زمانے میں سلطان سکندر کے وزیر اعظم سہہ بٹ کی وزارت عروج پر تھی، وہ مذہب ہندو کو چھوڑ کر سچے دل سے مسلمان ہوا تھا، حضرت میر محمدؒ نے اس کا نام ملک سیف الدین رکھا، نئے مذہب نے اس کے اندر سخت جوش اور ولولہ پیدا کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اسلام کا پرجوش داعی بنا، بلکہ وہ اس جذبۂ اشاعتِ اسلام سے اس قدر مغلوب ہوا کہ وہ ایک عادل وزیر اعظم کے بجائے میدانِ جنگ کا باجبروت مجاہد نظر آیا، میر سید محمدؒ کے عقد میں کشمیر کی دو نیک سیرت عورتیں تھیں، جب وہ کشمیر تشریف لائے تو ابھی تک ان کا نکاح نہیں ہوا تھا، چنانچہ ان کا پہلا نکاح حضرت سید حسن بہادر کی صاحبزادی تاج خاتون سے ہوا، مگر وہ شادی کے پانچ سال بعد انتقال کر گئیں، اس کے بعد نومسلم وزیر اعظم ملک سیف الدین نے اپنی بیٹی کا نکاح ان کے ساتھ کیا، مگر یہ رفیقۂ زندگی بھی بہت جلد داغِ مفارقت دے گئیں، دونوں بیویاں کشمیر ہی میں سپردِ خاک ہیں[1]،

میر سید محمدؒ نے کشمیر میں بارہ سال تک قیام کیا، یہ ان کی اٹھتی ہوئی جوانی کا عالم

---

[1] تاریخ اعظمی ص ۲۳ -

تھا، انھوں نے پورے جوش و ولولہ کے ساتھ کشمیر میں اسلام پھیلایا، کشمیر کا اصلی لوگوں کے ساتھ بھی ان کے گہرے تعلقات تھے، ان میں حضرت شیخ نورالدین ریشی کشمیری کا نام قابلِ ذکر ہے، حضرت شیخ ریشی ان کی خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضر ہوکر علمی راہنمائی اور روحانی فیوض و برکات حاصل کرتے تھے، حضرت شیخ اپنی زندگی کی ابتدا میں خلوت گزیں اور گوشہ گیر تھے مگر پھر ان پر اصلاح، تجدید اور تبلیغ کا رنگ غالب آیا، یہ بے شک حضرت میر محمد ہمدانی کی صحبت کا نتیجہ تھا۔[1]

---

[1] کہتے ہیں کہ میر سید محمد ہمدانیؒ نے شیخ نورالدینؒ کو خطِ ارشاد کے نام سے ایک اجازت نامہ دیا تھا، اس کی اصل بھی (بقول بعض لوگوں کے) موجود ہے، اس کی نقل صاحبِ فتوحاتِ کبرویہ نے اوّل سے آخر تک اپنی کتاب میں درج کی ہے، جس کی زبان عربی ہے، مگر تاریخی اعتبار سے یہ اجازت نامہ اس وقت بے اعتبار بن جاتا ہے، جب ہم اس کی تاریخِ تحریر یوں پڑھتے ہیں:-

قد حررت هذه الی لیلة	یعنی میں نے یہ اجازت نامہ ۲۵
الجمعة خامس من عشرین من	ماہ رجب ۸۱۴ھ بوقتِ شبِ
شهر رجب المرجب سنة	جمعہ کشمیر میں لکھا،
اربعة وعشر ثمانمائة فی	
بلد الکشمیر	

مختلف تاریخوں کو تطبیق دے کر ہم نے اوپر ثابت کیا کہ میر سید محمد ہمدانی ۸۰۸ھ میں کشمیر سے تشریف لے گئے تھے، مزید برآں اس اجازت نامے کے بعض الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ انھیں حضرت میر محمد ہمدانیؒ کی طرف منسوب کرنا ظلم ہے، اس میں جہاں اوراد و اذکار پر مداومت کرنے، مریدوں کی اصلاح و تربیت اور دلوں کو مکائد و مفاسد سے دور رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے،

میر سید محمدؒ اپنے نامور والد کی طرح صاحبِ تصنیف بھی تھے، علم منطق میں ان کا رسالہ شرح شمسیہ مشہور ہے، تصوف میں ان کے دو رسالے کتاب الاخلاق اور الرسالۃ المسکنیۃ آج بھی موجود ہیں۔ ان کا ایک اور رسالہ مولانا عبد الحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ (م [illegible]) کو دستیاب ہوا تھا، یہ رسالہ شاید آج بھی ندوۃ العلماء لکھنؤ کے شعبۂ مخطوطات میں محفوظ ہے، مولانا کے لکھنے کے مطابق اس کا نام جامع الفنون ہے، اور اس کا تعلق منطق اور حکمت کے ساتھ ہے۔ شیخ عبد الوہاب نوریؒ لکھتے ہیں کہ میر سید محمدؒ نے مکتوبات کا ایک مجموعہ بھی چھوڑا ہے، بلکہ بقول ان کے تصوف میں حضرت میر نے چھوٹے بڑے پینتالیس رسالے لکھے ہیں،

کشمیر میں بارہ سال قیام کرنے کے بعد میر سید محمدؒ نے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا، مگر بعض مورخین کے نزدیک کشمیر چھوڑنے کی اصل وجہ ایک دوسرے ہم نام بزرگ حضرت سید محمد حصاری کے ساتھ ٹکراؤ تھا، ممکن ہے یہ صحیح ہو، معاصرانہ چشمک بزرگوں میں بھی ہوا کرتی ہے، کشمیر چھوڑنے

(بقیہ حاشیہ ص۴۶) وہاں "نذر و نیاز" قبول کرنے کی بھی تلقین کی گئی ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی صاحبِ علم گر پیشہ ور مجاور کا وضع کیا ہوا ہے، پھر یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شیخ عبد الوہاب نوریؒ کی قابلِ قدر کتاب فتوحاتِ کبرویہ نہایت احتیاط سے پڑھنے کی مستحق ہے، اس کی تاریخیں اکثر غلط یا محلِ تحقیق ہیں، مورخ سید علی اور صاحبِ اسرار الابرار نے بھی حضرت شیخ نور الدین ریشی اور حضرت میر سید محمد ہمدانی کی صحبتوں اور محفلوں کا ذکر کیا ہے، مگر کسی خطِ ارشاد کا نام تک نہیں لیا ہے، شیخ داؤد مشکواتی لکھتے ہیں:-

بسیار مشائخ را دیدہ بود و با شیخ نور الدین قدس سرہٗ بسیار سوال و جواب زدے رفتہ

(اسرار الابرار (قلمی)

The coutribution of India to Arabic Literature

کے بعد حضرت میر محمد ہمدانی پھر کبھی کشمیر تشریف نہ لائے، وہ یہاں سے ٨٣٨ھ یا ٨٥٣ھ میں ختلان چلے گئے، اور اس کے بعد پینتالیس سال تک بقید حیات رہے، ٨٥٣ھ میں انتقال کیا، اور اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں بمقام ختلان دفن ہوئے، ان کی حیات کے آخری ۴۵ سال کے کارنامے اور دینی خدمات مکمل طور پر پردۂ خفا میں ہیں،

میر محمد ہمدانی کے رفقاء، جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا، حضرت میر کے ساتھ سیکڑوں بزرگ کشمیر تشریف لائے تھے، جن کے مشاغلِ علمی سے کشمیر سلطان سکندر کے زمانے میں خراسان اور عراق کا حریف بن گیا تھا، سلطان نے دل کھول کر ان بزرگوں کی پذیرائی کی، اور انھیں مختلف علمی اور تبلیغی مراتب و مناصب عطا کیے، سید محمد حسین سامانی نے علم فرائض و میراث کے مشہور رسالہ "سراجی"[1] کی شرح لکھی، جس کا نام تنویر السراج رکھا، سید محمد خاوری حدیث و قرآن کے بلند پایہ عالم تھے، انھیں قضا کا منصب عطا ہوا، خود سلطان سکندر، سید حسین خوارزمی سے معنوی فیوض حاصل کرتا تھا، اور اپنے دو[2] بیٹوں علی شاہ اور زین العابدین کو ان ہی کے دامنِ ارادت سے پیوستہ کیا، مولانا قاضی حسین شیرازی دینی علوم میں ماہر تھے، اور انھیں بھی محکمۂ قضا میں رکھا گیا، مولانا شیرازی قاضی ولی کے نام سے مشہور تھے، غرض یہ سب بزرگ اس زمانے میں کشمیر کی زینت بنے، جب کشمیر کے حالات مکمل طور پر ان کے موافق تھے، انھیں دینی خدمات انجام دینے میں کسی بھی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا، سید علی، مولوی غلام حسین، محمد اعظم اور شیخ

By. Dr. Zubaid Ahmad. P. 345 [1]

[1] دونوں رسالے مخطوطہ کی صورت میں ریاستی ریسرچ لائبریری سرینگر میں موجود ہیں،

[2] نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر ج ۳ ص ۱۴۲، ۱۴۳؛ [3] فتوحات کبرویہ (قلمی)،

شیخ عبد الوہاب نوری ص ۵ اسرار الابرار (قلمی)، شیخ بابا داؤد مشکواتی،

عبدالوہاب نے اپنی تاریخوں میں ان میں سے مشہور بزرگوں کے حالات بیان کیے ہیں۔

میر سید علی ہمدانی اور کشمیر | کشمیر کے عام باشندوں پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً میر سید علی ہمدانی کے جو احسانات اور برکات ہیں، اس کا اعتراف یہاں کے لوگوں نے ہر وقت کیا ہے یہاں کے صلحاء اور اکابر علماء نے نظم و نثر میں انھیں خراج عقیدت ادا کیا ہے، یہاں کے لوگ آج بھی اوراد و اذکار اور وظائف میں شیخ ہمدانی کی منقبتیں پڑھ کر سرور حاصل کرتے ہیں، وہ شیخ ہمدانی کو کشمیر میں اسلام کا بانی، امیر کبیر، علی ثانی، شاہ ہمدانی جامع الکمالات وغیرہ القاب سے یاد کرتے ہیں، اور کشمیر کے ساتھ ان کی گہری وابستگی کی بنا پر "ہمدانی کشمیری" سے یاد کرتے ہیں، شیخ ہمدانی نے کشمیر میں جس جس مقام پر قیام کیا، نماز پڑھی ہے، یا اذکار و وظائف پڑھے ہیں، کشمیر کے مسلمان اسے مقدس اور متبرک سمجھتے ہیں بالخصوص سرینگر کی خانقاہ معلّٰی کشمیر کا متبرک ترین مقام سمجھا جاتا ہے، ایک شاعر اس خانقاہ کی تعریف میں کہتا ہے،

خانقہ عرش نشان است این — معبد شاہ ہمدان است این
سید السادات عدیم العدیل — خاک درش سجدہ گہ جبریل
مردمک دیدۂ پیغمبر است — زہرۂ زہرا جگر حیدر ست

ایک دوسرا شاعر اس طرح رطب اللسان ہے:۔

خانقاہ است این مگر یا مسجد اقصیٰ است این — مسکن امن و اماں یا جنت الماویٰ ست این
سقف مرفوع است این یا قبۂ چرخ بریں — یا مگر از رحمت حق خیمہ برپا است این
حجرۂ خاص است این یا مشرق نور جلال — یا محل فیض حق یا وسعت دلہاست این
درمیان قندیل یا شمع ہدایت روشن است — یا مگر نور تجلی یا ید بیضا است این،

این شکوہ یا نخلِ ایمن یا کہ طوبائے بہشت — یا بزمِ اہلِ عرفان شاہدِ رعناست این
پیرِ ما سید علی یا جامعِ فضل و کرم — یا علیِ ثانی دریا و دلِ یکتاست این
وردِ اوراد او را یا بی شبہ اسمِ اعظم است — یا ز تسبیحِ ملائک بر زمین غوغاست این
حلقۂ اورادِ یا سررشتۂ جمعیت است — یا صفِ از قدسیانِ عالمِ بالاست این

علمائے کشمیر نے حضرت شیخ ہمدانیؒ کی کتابوں کو محفوظ رکھا، ان کی نقلیں پھیلائیں، بعض رسالوں کی شرحیں لکھیں، صاحبِ ذوق بزرگوں نے ان کی شان میں عمدہ عمدہ قصیدے لکھے، ہم یہاں کشمیر کے تین بزرگوں کے منتخب اشعار درج کرتے ہیں، یہ اشعار انھوں نے شیخ ہمدانی کی مدح و توصیف میں کہے ہیں، یہ تینوں بزرگ کشمیر کے صفِ اوّل کے علماء و مشائخ میں گنے جاتے ہیں، میری مراد شیخ یعقوب صرفی، شیخ مرزا اکمل الدین بدخشی اور شیخ حبیب اللہ نوشہری رحمہم اللہ سے ہے۔

شیخ یعقوب صرفی شیخ صرفی کے کمالات سے ہمارے قومی تذکرے بھرے ہیں، ملّا عبدالقادر بدایونی شیخ صرفی کے معاصر تھے، انھوں نے بڑی عزت اور فخر کے ساتھ منتخب التواریخ میں ان کے فضل و کمالات کا اعتراف کیا ہے، فیضی جیسے عالم نے اپنی تفسیر سواطع الالہام پر ان سے تقریظ لکھوائی، ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے اپنی کتاب "پاکستان میں فارسی ادب" میں بڑی تفصیل کے ساتھ ان کے حالات اور علمی کمالات بیان کئے ہیں، حضرت صرفی کو شیخ ہمدانی کے ساتھ گہری عقیدت تھی، انھوں نے ان کی شان میں دل آویز منقبتیں کہی ہیں اور اپنے آپ کو "گدائے کوچۂ امیری" سمجھنے پر فخر کیا ہے، انھوں نے ختلان جا کر حضرت امیرؒ کی آخری خوابگاہ کی زیارت بھی کی ہے، بلکہ وہاں چلہ بھی کیا ہے، فخر کے ساتھ کہتے ہیں؛

"مشرف شدہ این فقیرِ حقیر بطوافِ مزارِ امیرِ کبیر"

وہ انھیں علی ثانی اور سلطانِ اعظم کا نام دیتے ہیں، اور یقین رکھتے ہیں کہ وہ حضرت علی مرتضیٰؓ کے علوم و اسرار کے امین تھے، اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ وہ نسب کے لحاظ سے آپ ہی کے فرزند ہیں،

علی ثانی آں سلطانِ اعظم | علی نام زاولادِ علی ہم
چوں اسرارِ علی از وی عیاں شد | علی ثانی او را نام ازاں شد[1]

کہتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے روحانی مربی اور مرشد آپ ہی ہیں، آپ ہی کے عشق و محبت میں ہماری زندگی ہے، اور اسی میں ہمارا قیام و دوام ہے۔

بحمد اللہ کہ مارا پیشوا اوست | براہِ عشق ما را مقتدا اوست
بحمد اللہ بعشقش زندہ ام من | بعشقش تا ابد پایندہ ام من[2]

فرماتے ہیں کہ حضرت سید علی نہ صرف ہمدانی ہیں، بلکہ ہمہ داں بھی ہیں، ان کے علم و فضل اور روحانی کمالات سے ہمیں پوشیدہ حقائق کی معرفت نصیب ہوئی، اس لحاظ سے وہ عارفوں کے امام برحق ہیں،

ایں ہمدانی ہمہ دانی دہد | معرفتِ سرِ نہانی دہد
وہو امام العرفا ر بالیقین | زبدۂ اولادِ شہِ مرسلین[3]

شیخ صرفی نے اپنی ایک دوسری نظم میں بھی ان ہی جذبات و خیالات کو دہرایا ہے، وہ ان ہی کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں، ان ہی کے مسلک و مشرب کو خدا تک پہونچنے کا سب سے نزدیک راستہ سمجھتے ہیں، انھیں فخر ہے کہ وہ ان کے سلسلہ سے منسلک ہیں اور اتصال کے دوام کے لئے دعا گو ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو دیوانِ صرفی: مرتبہ میر حبیب اللہ کاملی، مطبوعہ سرینگر [2] ایضاً [3] ایضاً

گرچہ دو صد راہ سوئی مطلب ست   راہِ امام ہمدان اقرب است

وہ چہ نیکو راہی وخوش رہبری   رہبرِ ما در رہِ دیں حیدری

ہمچو علی دانشِ ربانیش   زاں لقب آمد علی ثانیش

چوں بعلی نسبتش آمد تمام   ہم بہ حسب ہم بہ نسب ہم بنام

از رہِ تعظیم نباشد عجب   گر علی ثانیش آمد لقب

ظاہر از و سرّ علی ولی   بل ہو سرلابیہ العلی

ہست بریں نکتہ دلیلِ قبول   الولد سرٌّ بقولِ رسول

سلسلۂ او کہ در آئینِ عشق   آمدہ زنجیرِ مجانینِ عشق

بستہ ایں سلسلہ اباۓ من   چوں دلِ دیوانہ وشیداۓ من

صرفیِ مسکین کہ ہوا خواہِ اوست   از دل وجاں بندۂ درگاہِ اوست

جانِ دلش خالی ازیں غم مباد   باد فزوں دمبدم وکم مباد[1]

مرزا اکمل الدّین خاں بدخشی | مغل دور کے نامور علماء اور مشایخ کشمیر میں سے تھے، ان کی ضخیم منظوم تصنیف "بحرالعرفان" مشہور ہے، یہ کتاب انھوں نے مثنوی مولانا روم کے طرز پر لکھی ہے، حضرت فریدالدّین عطّارؒ اور مولانا جلال الدّین رومیؒ کے ساتھ گہری عقیدت تھی، خود فرماتے ہیں:۔

از مریدانِ شیخ عطّارم   استعانت از مولوی دارم

حضرت مرزا صاحبؒ نے اس کتاب میں کئی مقامات پر حضرت میر سیّد علی ہمدانی کا ذکر خیر کیا ہے، اور ان کے ملفوظات و فرمودات کو بیان کیا ہے، نیز مناسب مواقع پر شیخ ہمدانی

---

[1] پارسی سرایانِ کشمیر: تالیف دکتر تکو، انتشاراتِ انجمن ایران وہند، طہران: ص ۹ تا ۱۱

سے صادر ہونے والی کراماتوں کا ذکر کیا ہے، ہم یہاں چند اشعار ذکر کرتے ہیں۔

این علی غوث اہل دین بودست   ہم بہر غوث جانشین بودست
درجہان او چو شاہ مردانست   ہر کہ از خویش راست مردانست
علی ثانیش ازاں نام است   کہ دلش فارغ از ہمہ کام است
قطب الاقطاب و مرشد و ہادیؒ   دستگیری ہمہ بہر وادیؒ
غوث ہر مستغاث در عالم   روح پاکش بنزد حق محرم
عالم ظاہر ست و باطن اوؒ   در ہمہ علماست فاطن اوؒ
ربع مسکون سہ نوبت آں سیاںؒ   دید ہر جاکہ دیر باد یاریؒ
یک ہزار و چہار صد مرشدؒ   دید ایں ابن مصطفیٰ از جد
اہل کشمیر را پناہ است اوؒ   رہبر خلق تا الہ است او
شکر للہ کہ از مریدانم   غیر از و دیگرے نمی دانم
ہر چہ در من ہمہ از ایشان ست   وقف عشقش مرا دل و جان ست
اندر آں آستان غلام منؒ   مدح خوانش بہ صبح و شام منؒ
غیر ازیں شاہ کس نمی دانم   ذکر یا شاہ ہر زماں خوانم[1]

__خواجہ حبیب اللہ نوشہریؒ__ شیخ نوشہری بھی مغل عہد کے عالم اور صوفی تھے، مشہور کشمیری عالم ملا حسین آفاقی سے دینی علوم کی تکمیل کے بعد شیخ یعقوب صرفی سے معنوی فیوض کی تحصیل کی، شیخ صرفی کے ساتھ جو عقیدت و محبت رکھتے تھے، اس کا اعتراف ایک جگہ اس طرح کیا ہے،

---

[1] بحر العرفان (قلمی)

نخلِ جانم بہ بار آرزو رسید — باغِ من میوۂ مراد از تو چید

نامِ من زندہ می‌کند نامت — کامِ من کام یابد از جامت[1]

بلند پایہ صوفی تھے، آخری زندگی میں استغراقی کیفیت غالب رہتی تھی، ایک بار جہانگیر بادشاہ ملاقات کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا، مگر میاں شیخ کو اسی سرور و مستی میں غرق پایا۔ انھوں نے منظوم فارسی میں کئی کتابیں لکھی ہیں، عربی میں بھی ایک رسالہ اور متفرق نظمیں ان کی یادگار ہیں۔ ان کی ایک عربی مثنوی مشہور ہے اس میں اگرچہ ادبی لطافت کا فقدان ضرور ہے، مگر چونکہ ہندوستانی عربی شاعری میں یہ مثنوی اپنی قدامت کے لحاظ سے اہم ہے، اس لیے اسے قدر و قیمت حاصل ہے، ہم اسی مثنوی سے چند اشعار نقل کرتے ہیں، اس میں کبروی مسلک بیان کرتے ہوئے کشمیر میں اس کے پہلے مبلغ جناب میر سید علی ہمدانی کی عظمت و بزرگی بھی بیان کی ہے، کہتے ہیں :-

كيف لا كيف لا لنا اولنا — فالامير الكبير[*] داخلها

ذاته كان مثل ذات ابيه — صفة الابن بالصفات شبيه

ظاهراً كان اعلم العلماء — باطناً كان اعرف العرفاء

فيضه ظاهر على العالم — فضله شائع بنى آدم

الممات الممات من حبه — الحياة الحياة مشربه

اشربوا منه ايها الحرفاء — اطربوا منه ايها الفقراء[2]

---

[1] احوال ومقامات حضرت ایشاں (قلمی)۔

[2] رسالۃ السلوک (قلمی)

[*] مراد میر سید علی ہمدانیؒ۔ اب سے مراد حضرت علی مرتضیٰؓ اور ابن سے شیخ ہمدانیؒ

حضرت اخی سراج کی آرام گاہ سعداللہ پور

از

جناب اکمل یزدانی صاحب ایم اے، ڈپ ان ایڈ۔ پورنیہ بہار

سعداللہ پور، جس سے تقریباً ایک میل پر حضرت سراج الدین اخی عثمانؒ کا مزار شریف ہے، ایک تاریخی مقام ہے، یہ جگہ مالدہ شہر کے انگلش بازار سے چھ میل جنوب مغرب پرانی بھاگیرتی کے کنارے واقع ہے، قدیم دستاویزوں میں بھی اس کا ذکر آتا ہے،

" پرانی بھاگیرتی کے کنارے، اس مقام پر مفصل (بھولاہاٹ) کے مقابل ایک بازار ہے جسے سعداللہ پور کہتے ہیں، یہ جگہ اس مقدس ندی کا خاص گھاٹ ہے جس میں ہندو اپنے مردوں کو دور دراز مقامات سے لاکر جلاتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ گوڑ کے مسلم حکمرانوں کے عہد میں بھی جو شاید عدم رواداری کا زمانہ تھا، ہندوؤں کو یہاں مردے جلانے کی اجازت تھی، یہ رسم آج تک (۱۸۰۹ء) جاری ہے، اشنان کے لئے بھی بڑی تعداد میں ہندو زائرین یہاں جمع ہوتے ہیں[1]"

میموائرس آف گوڑ اینڈ پنڈوہ میں عابد علی خاں نے سعداللہ پور کے اشنان گھاٹ کے متعلق

---

[1] بکانن، پورنیہ رپورٹ مرتبہ جیکسن ص ۱۲، ۱۰۰

لکھا ہے کہ یہ جگہ ہندوؤں کے مردے جلانے کی قدیم جگہ ہے، کہا جاتا ہے کہ گوڑ کے مسلم فرمانرواؤں نے اس جگہ کو ہندوؤں کی رسومات کی ادائیگی کے لئے خاص کیا تھا، پوس ماہ کی پورنماشی میں یہاں ایک بڑا میلہ لگتا ہے۔ (میمائرس ص ۱۶۵)

آج کا سعد اللہ پور | سعد اللہ پور ان دنوں ایک چھوٹا سا بازار ہے جو متذکرہ بالا گھاٹ کے مشرقی کنارے پر آباد ہے، یہاں چند دکانیں، کچھ قدیم عمارتیں اور مندروں کے کھنڈرات اب بھی باقی ہیں، اس کا راستہ مالدہ جنکشن سے ہے، سعد اللہ بستی سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر حضرت اخی سراج رحمۃ اللہ علیہ کی ابدی آرام گاہ تک پہونچنے میں ایک تاریخی مسجد بھی نظر آتی ہے، عوام میں یہ مسجد "جھنجھنیاں مسجد" کے نام سے مشہور ہے، لیکن جے، ایچ، راون شا نے اپنی کتاب "گوڑ اس کے کھنڈر اور کتبات" شائع شدہ ۱۸۷۸ء میں اس مسجد کو "جن جن میاں کی مسجد" کے نام سے ذکر کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نام "جہانیاں جہاں گشت" کی بدلی ہوئی شکل ہے، میموائرس آف گوڑ اینڈ پنڈوہ کے مؤلف کا یہی خیال ہے، یہ مسجد ۵۶ فٹ لمبی اور ۴۲ فٹ چوڑی ہے، تین محرابیں اور چار شکستہ مینار ہیں، اس مسجد کو ۹۳۱ھ / ۱۵۲۵ء میں بی بی مالتی نام کی ایک معزز خاتون نے تعمیر کرایا تھا، کننگھم کے قول کے مطابق ان خاتون کا تعلق محمود شاہ سوم کے خاندان سے تھا، مسجد کی درمیانی محراب پر یہ عبارت کندہ ہے،

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس
من بنی مسجدا للہ بنی اللہ	نے اللہ کے لئے کوئی مسجد بنائی تو اللہ
لہ بیتا مثلہ فی الجنۃ، بنی	تعالیٰ اس کے لئے جنت میں اسی طرح
ھذا المسجد الجامع فی	کا گھر بنائے گا، یہ جامع مسجد سلطان
عہد السلطان ابن السلطان	غیاث الدین والدنیا ابوالمظفر محمود شاہ

غیاث الدنیا والدین ابوالمظفر محمود شاہ السلطان بن حسین شاہ السلطان خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ بانیہ بی بی مالتی دامت سیادتہا ادام اللہ معالیہا فی سنۃ احدی (ترجمہ)

ابن حسین شاہ کے عہد میں تعمیر ہوئی اللہ ان کی سلطنت اور ان کے ملک کو ہمیشہ قائم رکھے، یہ مسجد بی بی مالتی نے ٩٤١ھ / ١٥٣٥ء میں بنوائی،

خواب گاہ حضرت اخی سراج اسی بی بی مالتی کی مسجد سے چند سو گز فاصلہ ہی سے وہ احاطہ شروع ہو جاتا ہے جہاں محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء کے محبوب مرید و مجاز حضرت اخی سراج آرام فرما ہیں، حضرت محبوب الٰہی ان کو "آئینۂ ہندوستان" کہا کرتے تھے،

حضرت اخی سراج کا مزار ایک بڑے یک گنبدی قبہ کے اندر ہے، اونچی جگہ پر واقع ہونے کی وجہ سے یہ گنبد دور سے ہی نظر آتا ہے، مزار شریف کی شرقی اور غربی سمتوں میں، ۱۲ فٹ گہرے تالاب ہیں، شمال میں بھی اسی قسم کا ایک تالاب تھا جو اب تقریباً برابر ہو چکا ہے، ان تالابوں کے کنارے کنارے اینٹوں کی مستحکم اور منقش دیواریں تھیں جو اب منہدم ہو چکی ہیں، ۱۹۲۴ء میں جبکہ عابد علی خاں نے انھیں دیکھا تھا تو صرف شمالی دیوار کم و بیش اصل حالت میں موجود تھی، باقی شرقی اور مغربی دیواریں شکستگی سے ہمکنار تھیں۔ بکانن نے بھی جب اس مزار کو دیکھا تھا تو گو مزار ایک حد تک مکمل تھا لیکن احاطے شکستہ حال تھے۔

حضرت اخی سراج کی قبر خاصی لمبی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دو قبریں ایک ہی صف میں ہوں لیکن اس میں حضرت کی درازقامتی کو دخل نہیں، اصلاً قبر کا شمالی حصہ ان تبرکات، کتب اور پارچہ جات کا مدفن ہے جو حضرت اخی سراج کو ان کے پیر طریقت حضرت محبوب الٰہی کی جانب

---

[1] سلطان غیاث الدین محمود سوم، سلطان حسین شاہ کا بیٹا تھا، اس کی حکمرانی کا زمانہ ۹۳۹-۹۴۴ھ / ۱۵۳۲-۳۷ء

[2] میموائرس آف گوڑ اینڈ پنڈوہ ص ۹۰ [3] بکانن رپورٹ مرتبہ جیکس ص ۱۰۰

ے مرحمت ہوئے تھے حضرت اخی سراجؒ نے اپنی حیات ہی میں ان کو دفن فرمایا تھا اور وصیت کی تھی کہ جب میرا انتقال ہو تو میرے شیخ کے تبرکات کے پائیں مجھے دفن کیا جائے، اس وصیت کا تذکرہ کتابوں میں موجود ہے، لطائف اشرفی میں ہے

"چوں وقت سفر آخرت ایشاں پیش آمد، در سواد لکھنوتی قدیم مدفن خود را تعین کردند وانواع لباس مشائخ و اصناف ملابس سلطان المشائخ کہ ہمراہ بودند بر سر مدفن و مقبرہ منورہ خود ساختند"[1]

اخبار الاخیار میں ہے

"نقلست کہ او بعضے جاہا را کہ از خدمت پیر یافتہ بود دفن کرد و بر آں گورے ساخت و در وقت رحلت وصیت کرد کہ مرا در پایاں گور جاہا دفن کنند بعد از نقل او ہمچنیں کردند"[2]

چنانچہ جب حضرت اخی سراجؒ کا انتقال ہوا تو اُن کی وصیت پر عمل کیا گیا۔

قبہ مزار شریف کی تعمیر صاحب ریاض السلاطین کے قول کے مطابق مقبرہ کا بانی نصرت شاہ ہے، جس کا عہد سنہ ۹۲۵-۳۹ کا ہے، اسٹوارٹ نے بھی یہی لکھا ہے لیکن اس نے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا، غالباً اس کو نصرت شاہ کے ایک کتبہ سے اشتباہ ہوا جسے نصرت شاہ کے حکم سے حضرت اخی سراجؒ کے روضہ کے دائیں دروازہ پر آویزاں کیا گیا تھا۔[3]

اس کتبہ کی عبارت یہ ہے

بنی ھذا الباب للروضۃ بامر السلطان   روضہ کے اس دروازہ کو سلطان

---

[1] لطائف اشرفی قلمی ۱۲۹۶ پٹنہ یونیورسٹی لطیفہ پانزدہم ص ۱۹-۱۸، [2] اخبار الاخیار قلمی ۳۵ ،پٹنہ یونیورسٹی، [3] اسٹوارٹ ہسٹری آف بنگال ص ۱۱۸،

المعظم المکرم السلطان بن السلطان	ناصر الدنیا والدین ابو المظفر نصرت شاہ
ناصر الدنیا والدین ابو المظفر نصرت شاہ بن حسین شاہ	ابن حسین شاہ کے حکم سے ۹۳۱ھ (۲۵-۱۵۲۴ء)
شاہ السلطان خلد اللہ ملکہ فی سنۃ احدی وثلثین وتسعمائۃ	میں بنایا گیا،

لیکن اس کتبہ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ روضہ کا بانی نصرت شاہ ہے درست نہیں، کیونکہ روضہ کے بائیں دروازہ پر ایک کتبہ اور کندہ ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے حسین شاہ نے ۹۱۶ھ میں تعمیر کرایا تھا، اس کتبہ کی عبارت حسب ذیل ہے،

قد بنی ھذا الباب لروضۃ المخدوم شیخ اخی	تحقیق کہ مخدوم شیخ اخی سراج الدین کے روضہ
سراج الدین السلطان المعظم المکرم علاء الدنیا	کے اس دروازہ کو سلطان المعظم علاء
والدین المظفر حسین شاہ السلطان بن سید اشرف	الدنیا والدین ابو المظفر حسین شاہ سلطان
الحسینی خلد اللہ ملکہ وسلطانہ سنۃ ست وعشر وتسعمائۃ	ابن سید اشرف حسینی نے ۹۱۶ھ میں تعمیر کیا،

اس کے علاوہ ایک اور کتبہ حضرت اخی سراج کے مزار کے قریب ہی ملا تھا، جس پر سنہ تعمیر ۹۱۰ھ بمطابق ۱۵۰۴ء درج ہے، اس کتبہ کی عبارت مندرجہ ذیل ہے،

قال اللہ تعالیٰ من جاء بالحسنۃ فلہ عشر	اللہ کا ارشاد ہے کہ جس نے کوئی نیکی
امثالھا بنی ھذہ السقایۃ السلطان المعظم	کی اس کو اس کا دس گنا اجر ملے گا،
المکرم علاء الدنیا والدین ابو المظفر حسین	یہ سقایہ سلطان معظم و مکرم علاء الدنیا
شاہ السلطان بن سید اشرف الحسینی خلد اللہ	والدین ابو المظفر حسین شاہ بن سید
ملکہ وسلطانہ فی سنۃ عشر وتسعمائۃ،	اشرف حسینی نے ۹۱۰ھ میں بنایا۔

ان کتبات کے سلسلہ میں انڈین میوزیم کلکتہ میں موجود ایک شکستہ کتبہ کی بھی اہمیت ہے، جنرل کننگھم کا خیال ہے کہ یہ کتبہ حضرت اخی سراج کے مقبرہ کے صدر دروازہ پر نصب تھا کیونکہ

اس خالی جگہ کو انہوں نے خود [illegible]ء میں دیکھا، جنرل کنگھم نے جب اس کتبہ کو پڑھا تو ایک اینٹ پر سبعمایہ (۷۰۰) دوسری پر غیاث الدین اور شہر محمد آباد لکھا دیکھا اس سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ غیاث الدین اعظم شاہ پسر سکندر شاہ (۸۱۳ - ۷۹۲ھ) نے حضرت اخی سراجؒ کے روضہ کی تعمیر کی ہوگی. لیکن مسٹر اسٹیپلٹن ایڈیٹر میموائرز آف گوڑ اینڈ پنڈوہ کا قیاس ہے کہ آخری اینٹ پر جو حروف ہیں وہ سبعمایہ کے بجائے تسعمایہ (۹۰۰) ہیں لہذا اس روضہ کا معمار غیاث الدین اعظم شاہ کے بجائے غیاث الدین محمود شاہ پسر سلطان حسین شاہ (۹۴۴ - ۹۳۹ھ) ہے، حضرت اخی سراجؒ کا انتقال ۷۴۳ھ یا ۷۵۸ھ میں ہوا، اس صورت میں اگر جنرل کنگھم کی رائے کا اعتبار کیا جائے تو قرین قیاس یہی ہے کہ اولاً روضہ کی تعمیر غیاث الدین اعظم شاہ نے کی، کیونکہ حضرت کے زمانۂ وفات سے قریب تر عہد اسی کا ہے،

عرس | حضرت اخی سراجؒ کا انتقال عید کے دن ہوا تھا، منشی الہی بخش مرتب خورشید جہاں نما کے مطابق " زود گو کاں روز عید الفطر بود " سے ۷۴۳ھ تاریخ وفات نکلتی ہے، چنانچہ عید اور بقرعید کے دن ساگردیگھی پر حضرت کا عرس منایا جاتا ہے، پنڈوہ سے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کا جھنڈا اور حضرت نور قطب عالم کا پنجہ بطور اعزاز یہاں بھیجا جاتا ہے،

ساگردیگھی | سعداللہ پور کا ذکر نامکمل رہے گا اگر ساگردیگھی کا ذکر نہ کیا جائے، ساگردیگھی حضرت اخی سراجؒ کے آستانہ سے تقریباً ایک فرلانگ فاصلہ پر ایک میل لمبا اور نصف میل چوڑا تالاب ہے، اس تالاب پر چھ گھاٹ موجود تھے جو ہر ایک کی چوڑائی ۲۰ گز تھی، مشرقی مغربی کناروں پر آمنے سامنے چار گھاٹ تھے اور شمالی جنوبی کناروں پر دو گھاٹ تھے،

اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ گھاٹ پختہ رہے ہونگے، اس تالاب کی موجودگی سے یہ خطہ بہت پُر فضا اور دلکش معلوم ہوتا ہے، بکانن لکھتا ہے کہ ایسا خوبصورت تالاب میں نے کہیں نہیں دیکھا، بکانن اور اسٹپلٹن کا خیال ہے کہ چونکہ تالاب کی ساخت شمالاً جنوباً ہے اس لئے غالباً یہ کسی ہندو راجہ کا بنایا ہوا ہے، رودن شا کا خیال ہے کہ اس کا عہد تعمیر لکھن سین (بارہویں صدی بعد مسیح) کا زمانہ ہے[1]، لیکن یہ دلیل درست نہیں، کیونکہ چھوٹا ساگر دیگھی جسے یقینی طور پر حسین شاہ نے تعمیر کرایا وہ بھی شمال و جنوب کے رخ پر ہی ہے، اسٹپلٹن کی ایک رائے یہ بھی ہے کہ تاریخوں میں حسین شاہ کا ۹۱۶ھ کے ایک بڑے تالاب بنوانے کا ذکر ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ اسی نے یہ تالاب بنوایا ہو یا دوبارہ صاف کرایا ہو، بکانن نے ۱۸۰۸-۱۸۰۹ء میں گور اور اس کے مضافات کا دورہ کیا تھا، ساگر دیگھی اسے بہت پسند آیا، اس نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی لکھا تھا کہ تالاب سے ذرا فاصلہ پر شمال مغرب کے رخ پر کملبلی نامی مقام پر ہندوؤں کی ایک اہم عبادت گاہ جسے دوار واسینی کہتے ہیں، جیٹھ کے مہینہ میں اب بھی یہاں ۵۰۰۰ زائرین، اس شہر کی دیوی گوریسوری یا خاتون گور کی پوجا کے لئے ہر سال جمع ہوتے ہیں، اب اسی جگہ مسلمانوں کی تعمیر کردہ عمارتیں ہیں جو شاید مندر کے ہی محل وقوع پر قائم ہیں، ان عمارتوں میں سب سے اہم شاہ جلال کا روضہ ہے جو قطب شاہ کے والد علاء الحق کے والد تھے، یہ تمام اشخاص غیر معمولی تقدس کے حامل متصور ہوتے تھے اور بنگال کے مسلم بادشاہوں کے دور حکومت میں بڑے اختیارات رکھتے تھے[2]۔

بکانن کی یہ رائے زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتی، مندر کی جگہ پر مسلمانوں کی

---

[1] رودن شا گور ص ۸ [2] بکانن: پورنیہ رپورٹ ص ۹۹، ۱۰۰

[illegible] کا [illegible] کی لفظ شاید سے ثابت کرنا، نا انصافی بلکہ تعصب کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اس کے علاوہ حضرت اخی سراج کے روضہ کو شاہ جلال کا روضہ بتانا تحقیقی مذاق سے عاری ہونے کی دلیل ہے پھر شاہ جلال اور مخدوم علاء الحق میں کوئی نسبی رشتہ نہ تھا، اس لئے یہاں ان کی شہادت نہ معتبر ہے نہ قابلِ قبول، بہرحال گمان غالب یہی ہے کہ اس مسجد کو بنوانے والا حسین شاہ ہی تھا۔

ایک خط اور اُس کا جواب

مکرمی جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب

زیدت حسناتکم، السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ، مزاج مبارک، میں ایک سفر سے واپس آیا تو آپ کا موقر رسالہ معارف اپریل و مئی کا یکجا ملا، شمارہ ماہ اپریل ۱۹۸۶ء میں مولانا اخلاق حسین صاحب دہلوی کا ایک ایسا مضمون بضمن ملفوظات چھپا ہے جس پر ہم جیسوں کو سخت حیرت ہوئی سید صاحبؒ یعنی علامہ سید سلیمان ندویؒ اگر زندہ ہوتے تو ایسی روایات کبھی چھپنے نہ دیتے، چشتی رسول اللہ کہلانے کی بات درایۃً بھی غلط ہے، کیونکہ خواجہ معین الدین اجمیری کے انتقال کے برسوں بعد چشتیہ سلسلہ قائم کیا گیا تو خود خواجہ معین الدین اجمیری اپنے عہد میں جب کہ چشتی کہنے کہلانے کا کوئی سلسلہ نہیں چلا تھا، کس طرح چشتی رسول اللہ کہلائیں گے، اگر یہ بھی روایت کرنے والا یوں کہتا کہ خواجہ معین الدین نے کہا کہو معین الدین رسول اللہ تو گویا عقل کی بات ہوتی، یہ اصول دروغ گو را حافظہ نباشد اس نے چشتی رسول اللہ کی بات گڑھ لی، ایسی روایات معارف کے علمی و تحقیقی معیار کے ایک دم خلاف ہیں، مزید افسوس اس بات پر ہے کہ دہلوی صاحب نے اس روایت مکذوبہ کی تائید و توثیق میں اپنا زور قلم صرف کیا ہے اور اس کے انکار کرنے والوں پر اعتراض کیا، بہتر ہوگا کہ اس مضمون کی اشاعت پر آیندہ شمارہ میں آپ کچھ لکھیں، جناب اخلاق حسین صاحب دہلوی سے میری ملاقات ہے، علیک سلیک بھی ہے، رمضان شریف کی شب قدر کے وعظوں میں پھاٹک حبش خاں کی مسجد میں وہ آتے ہیں، دوسری اہل حدیث مسجد میں میں ہوتا ہوں،

ان کی تقریر سننے میں کچھ آجاتی ہے، وہاں اپنے خلفۂ معتقدین میں سب کچھ کہہ سکتے ہیں مگر معارف جیسے پرچے کے لئے بڑی ژرف نگاہی کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کے زیر سایہ معارف کا مقام اور زیادہ محفوظ رہے، اس سلسلہ میں مولانا علی میاں مدظلہٗ کو بھی لکھ رہا ہوں، والسلام

ناچیز دعاگو خادم عبدالروف رحمانی، ناظم مدرسہ سراج العلوم، بڑھنی ضلع بستی، ۳۰ رمئی ۱۹۸۰ء

مکتوب نگار نے معلوم نہیں یہ کیسے لکھدیا کہ خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے انتقال کے برسوں بعد چشتیہ سلسلہ قائم ہوا، یہ ان کی سراسر عدم واقفیت کی دلیل ہے، شجرۂ طریقت کے لحاظ سے چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ آٹھویں پشت میں ہیں۔

"چشتی رسول اللہ" کا ذکر معارف کے صفحے میں پہلے کئی بار آچکا ہے، راقم نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ایک سوانح عمری معین الارواح مرتبہ خادم حسن زبیری پر ستمبر اور اکتوبر ۱۹۵۱ء کے معارف میں ایک طویل تبصرہ لکھا تھا، تو اس سلسلہ میں حسب ذیل تحریر قلمبند کی تھی،

"معین الارواح کے حصہ دوم میں سیرۃ مقدسہ کے عنوان سے حضرت خواجہ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ان کی تعلیمات کو بھی واضح طور پر پیش کیا گیا ہے، یہ تعلیمات حضرت خواجہؒ کے ملفوظات سے مرتب کی گئی ہیں، لیکن فاضل مؤلف نے جس تلاش و جستجو سے اپنی کتاب لکھی ہے اسی محنت و کاوش کے ساتھ یہ بھی دکھانے کی کوشش کرتے کہ ان ملفوظات میں سے کون صحیح اور کون الحاقی ہے تو یہ ان کا بڑا علمی کارنامہ ہوتا کیونکہ خواجگان چشت کے ملفوظات کے مجموعوں کو غور سے پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ بعض ملفوظات ان بزرگان دین کے ہرگز نہیں ہو سکتے، مثال کے طور پر حسب ذیل ملفوظات ملاحظہ ہوں جن کو فاضل مؤلف نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳۶ پر نقل کیا ہے

"حضرت قطب الاقطاب نے فرمایا کہ ایک مرتبہ شیخ الاسلام حضرت خواجہ معین الدین قدس

سرہ کی خدمت میں حاضر تھا، اہلِ صفہ بھی موجود تھے، اولیاء اللہ کا تذکرہ ہو رہا تھا اس درمیان میں ایک شخص بیعت ہونے کے لئے حاضرِ خدمت ہوا، اور آپ کے قدموں پر سر رکھا، غریب نواز نے فرمایا بیٹھو، اس نے کہا میں مرید ہونے کے لئے حاضر ہوا ہوں آپ اس وقت اپنے حال میں تھے، فرمایا اس شرط پر مرید ہو سکتے ہو کہ ایک مرتبہ کہو لا الٰہ الا اللہ چشتی رسول اللہ، چونکہ وہ راسخ العقیدہ تھا، اس نے فوراً اس طرح کہا اور غریب نواز نے اس کو مرید کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا، اور خلعت خاص سے سرفراز فرمایا۔

یہ روایت حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مجموعۂ ملفوظات فوائد السالکین سے لی گئی ہے، لیکن یہ کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی، گو فاضل مؤلف نے اس کی مدافعت میں یہ تاویل کی ہے کہ

"اگرچہ سرسری نظر سے دیکھنے میں مذکورۂ بالا الفاظ شرعاً قابلِ اعتراض معلوم ہوتے ہیں مگر لغوی معنی کے پیشِ نظر ہرگز قابلِ اعتراض نہیں، نیز صاحبانِ حال نے اس قسم کے کلمات اکثر فرمائے ہیں، چنانچہ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ وغیرہ کے حالات میں بھی ایسے واقعات موجود ہیں، بلکہ خود سرورِ عالمؐ نے بھی طواف میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سرگوشی کرنے کے موقع پر ارشاد فرمایا "میں نے ان سے سرگوشی نہیں کی بلکہ خدا نے کی" نیز ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے کہ جس نے مجھے دیکھا اس نے خدا کو دیکھا۔"

اس تاویل کی حیثیت عذرِ گناہ بدتر از گناہ سے زیادہ نہیں، اگر ہم مذکورۂ بالا ملفوظات کو الحاقی سمجھ لیں، تو پھر کسی تاویل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی، اسی قسم کے ملفوظات کے متعلق سیر العارفین میں ہے:-

"ایک شخص نے حضرت نصیر الدین محمود اودھی سے عرض کیا کہ میں نے خواجہ قطب الحق قدس سرہ کے ملفوظات میں ایسا کچھ لکھا ہوا دیکھا ہے، آپ نے جواب میں فرمایا کہ یہ بالکل غلط ہے، میں نے بچشم خود دیکھا ہے حاشا اللہ یہ کلام ان کا نہیں ہے، اکثر غلط غلط کلمات الحاقی ہیں جو مجاوروں نے بڑھا دیئے ہیں، کسی طرح قطب صاحب قدس سرہ کے حال و اعمال کے موافق نہیں ہیں" (جلد ۲ ص ۱۶۲)

"اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین کے بعض ملفوظات الحاقی ہیں جو ان کی علمی اور نظری تعلیمات کے بالکل منافی ہیں"

کچھ دنوں کے بعد راقم نے نومبر ۱۹۶۲ء کے معارف میں یہ لکھا،

فوائد السالکین کی حسب ذیل روایت علمائے ظاہر کی نظر میں کھٹکتی ہے، اس لئے راقم اس کو الحاقی سمجھتا رہا ہے

"فرمایا کہ حضرت شیخ معین الدین کی خدمت میں حاضر تھا، دوسرے درویش بھی تھے اولیاء اللہ کا ذکر ہو رہا تھا، اتنے میں ایک شخص باہر سے آیا اور بیعت کے لیے قدمبوسی کی حضرت خواجہ نے فرمایا، بیٹھ جاؤ، وہ بیٹھ گیا، اس نے کہا کہ آپ کی خدمت میں مرید ہونے کے لئے آیا ہوں، انہوں نے فرمایا میں جو کچھ تم سے کہوں، کرو، اور بجا لاؤ تو پھر مرید کر دوں گا، اس نے کہا جو حکم ہو فرمایا کہ تم تو کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھتے ہو لیکن ایک بار اس طرح پڑھو لا الہ الا اللہ چشتی رسول اللہ، وہ راسخ العقیدہ تھا، اس نے اسی طرح کلمہ پڑھ دیا حضرت خواجہ نے اس کو بیعت کر لیا، خلعت اور بہت کچھ نعمت عطا کی، لیکن اس آدمی سے کہا سنو میں نے تم سے اس طرح کلمہ پڑھایا تاکہ تمہاری عقیدت کا امتحان لوں، ورنہ میں جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں

اور کون ہوں، محمد رسول اللہ کا کمترین غلام ہوں اور کلمہ وہی ہے جو تم نے پڑھا، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، مرید کو صادق ہونا چاہئے، ص ۲۲۳۔۲۲۴

لیکن اس قسم کی روایت فوائد الفواد (ص ۲۳) سیر الاولیاء (۳۳۸) اور مفتاح العاشقین (ص ۴) میں بھی نظر سے گذری، صرف نام بدلا ہوا ہے فوائد السالکین میں شیخ معین الدین رحمۃ اللہ کا اسم گرامی ہے اور ان تینوں کتابوں میں شیخ شبلیؒ کا نام ہے، ان روایتوں کو دیکھ کر فوائد السالکین کی روایت کو الحاقی سمجھنے سے رجوع کیا اور خیال ہوا کہ متابعت پیر کے سلسلہ میں صوفیائے کرام کے حلقہ میں اس قسم کی روایتوں کا بیان کرنا عام تھا، گو علمائے ظاہر کی نظر میں یہ کھٹکتی رہیں۔

نومبر ۱۹۶۴ء کے معارف میں جو کچھ لکھا گیا تھا، وہ میری کتاب بزم صوفیہ میں بھی درج ہے (ص ۶۵۸۔۶۵۹)

اب ذرا فوائد الفواد کی روایت ملاحظہ ہو،

" اس کے بعد خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے زبان مبارک سے فرمایا کہ شیخ کا علم رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے برابر ہوتا ہے، اس وقت یہ حکایت بیان فرمائی کہ ایک روز ایک شخص شیخ شبلی کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے کہا کہ آپ کا مرید ہونا چاہتا ہوں، شیخ شبلی نے فرمایا کہ اس شرط پر تمہاری ارادت قبول کروں گا کہ جو کچھ میں کہوں تم کرو، اس نے کہا کہ ایسا ہی کروں گا، شیخ شبلی نے کہا کہ کلمہ طیبہ کس طرح پڑھتے ہو، اس نے کہا کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، شبلی نے کہا اس طرح کہو لا الہ الا اللہ شبلی رسول اللہ، مرید نے اسی طرح کہا، اس کے بعد شیخ شبلیؒ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ شبلی رسول اللہ کا ایک چاکر کمینہ ہے، میں نے تو صرف تمہارا

قان لیا تھا۔ (ص ۲۲۲)

سیرالاولیا ر میں بھی روایت دہرائی گئی ہے (ص ۲۳۸) خواجگان چشت کے ملفوظات کے تمام مجموعوں میں فوائد الفواد کا مجموعہ بہت ہی مستند سمجھا جاتا ہے، اس کی کسی روایت کو اب تک نہ غیر مستند، نہ الحاقی اور نہ ناقابل قبول قرار دیا گیا ہے، اسی طرح سیرالاولیار بھی بہت ہی مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ روایت حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی زبان سے بیان کی گئی ہے، جن کی پابندیٔ شریعت کے متعلق موجودہ دور کے علمار کو بھی پورا اتفاق ہے۔ ان کے بارہ میں یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کسی ایسی بات کی تعلیم دیتے رہے جو شریعت کے خلاف رہی، مذکورہ بالا نکات علمار کی نظر میں کھٹکتی ہے اور ضرور کھٹکنی چاہئے مگر اس کو کیا کیجیے کہ ایسی روایت صوفیائے کرام کے یہاں رائج رہی اور جب وہ خود کہتے رہے کہ مرید کا صرف امتحان لینا مقصود تھا، ورنہ اصلی کلمہ طیبہ وہی ہے جو رائج ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص کمترین غلام اور چاکر کمینہ ہیں، تو پھر ان کو ان کے اس حال اور مقام پر چھوڑ دینا چاہئے جہاں پہونچ کر وہ اپنے مریدوں کا امتحان لیا کرتے تھے، ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینا چاہیے، ہم ان کے احتساب سے گریز کریں۔ "ص ع"

بزم صوفیہ

یعنی عہد تیموری سے پہلے کے صوفیۂ کرام حضرت شیخ ابوالحسن ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بختیار کاکی، قاضی حمید الدین ناگوری، خواجہ نظام الدین اولیار، ابوعلی قلندر پانی پتی، شیخ فرید الدین عراقی، خواجہ گیسو دراز وغیرہ کے مستند حالات اور تعلیمات۔ بکثرت اضافوں کے ساتھ اس کا تیسرا ایڈیشن مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم۔ اے۔

ضخامت ۶۹۶ صفحے قیمت ۲۵ ـ ..

وفیات

قاضی محمد عدیل عباسی

از

ضیاء الدین اصلاحی

جناب قاضی محمد عدیل عباسی کے انتقال کو کئی مہینے ہوگئے، دار المصنفین سے ان کو جو اخلاص و تعلق تھا، اس کا تقاضا تھا کہ ان کے ذکر سے معارف خالی نہ رہے، اس لئے تاخیر کے باوجود اس تحریر کی اشاعت نامناسب نہ ہوگی۔

قاضی محمد عدیل صاحب کا تعلق ضلع بستی کے ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے سے تھا مگر ابتدا ہی سے ان کا رجحان قوم پروری اور حب الوطنی کی تحریک کی جانب ہوگیا تھا، اس لئے کالج کی تعلیم چھوڑ کر وہ عملی سیاست میں داخل ہوگئے، ان کو اس میدان میں پنڈت جواہر لال نہرو، رفیع احمد قدوائی، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا حفظ الرحمان وغیرہ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، خلافت، ترک موالات اور ہندوستان چھوڑ دو، تحریکوں میں سرگرم حصہ لینے کی بنا پر وہ کئی بار جیل گئے۔

قاضی صاحب کی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا، ان کو اس کا ذوق کانپور میں مولانا حسرت موہانی مرحوم کی صحبت میں پیدا ہوا، پھر وہ مشہور قوم پرور اخبار مدینہ بجنور اور زمیندار لاہور سے وابستہ ہوئے، زمیندار اس زمانہ کا سب سے مقبول روزنامہ تھا اور مولانا ظفر علی خاں مرحوم کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، قاضی صاحب کے قلم سے اس میں ایسے مضامین نکلے جن پر وہ

برطانوی حکومت کے زیر عتاب آگئے اور ایک سال تک لاہور سنٹرل جیل میں قید رہے۔

اس کے بعد وہ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنے کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے، ایم۔ اے۔ اور ایل۔ ایل بی کی ڈگری لی ۱۹۲۶ء سے بستی میں وکالت شروع کی، اس پیشہ میں بہت نیک نام اور کامیاب تھے، وکالت کے ساتھ ان کو پبلک کے کاموں سے بھی دلچسپی رہی، کئی برس تک بستی میونسپل بورڈ کے چیرمین رہے، ۱۹۳۷ء میں پہلی دفعہ صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، اور ۱۹۵۷ء تک برابر ممبر منتخب ہوتے رہے، اس کے بعد اس کوچہ کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔

اردو سے ان کو عشق تھا، اس کے لئے وہ عمر بھر جہاد کرتے رہے، آزادی کے بعد جب قومی حکومت نے اس کے ساتھ معاندانہ اور غیر منصفانہ رویہ اختیار کیا تو وہ اسمبلی کے اندر اور باہر اس کے لئے آئینی و دستوری لڑائی لڑتے رہے، کانگریس میں رہ کر بھی وہ اس کے تنگ نظر، متعصب اور فرقہ پرست عناصر سے نبرد آزما رہے اور بڑی جرأت و بیباکی کے ساتھ کانگریس کی اردو دشمن پالیسی کی مخالفت کرتے، وہ اردو کی دستخطی مہم میں بھی پیش پیش رہے، اور اس وفد میں شریک ہوئے جس نے صدر جمہوریہ ہند بابو راجندر پرشاد کو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کی قیادت میں اکیس (۲۱) لاکھ افراد کے دستخطوں سے میمورنڈم پیش کیا تھا، اردو کا حق منوانے اور اس کو علاقائی زبان تسلیم کرانے کے لئے ان کی جدوجہد آخر دم تک جاری رہی، اس سلسلہ میں انہوں نے بیشمار مضامین لکھے جن سے اردو تحریک کو بڑی قوت ملی تیس (۳۰) برس تک وہ انجمن ترقی اردو کی مجلس عام کے بڑے سرگرم اور فعال رکن رہے۔

دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کی تشکیل و تاسیس قاضی صاحب کا بڑا اہم کارنامہ ہے، اس کی بدولت اس صوبہ کے گاؤں گاؤں میں مکاتب قائم ہو گئے، ان مکاتب کے ذریعہ مسلمانوں کی نئی نسل کے دین و ایمان کی سلامتی، اسلامی تہذیب و روایات سے ان کی وابستگی اور اس کے ذہنی

ارتداد سے محفوظ رہنے کا سامان فراہم ہوا، انھوں نے مکاتب چلانے کے لیے بیسکی فنڈ اور کھلیانی جیسی اسکیمیں چلائیں اور سب سے پہلے اس کا تجربہ اپنے ضلع بستی میں کیا اور جب اس میں خاطرخواہ کامیابی ہوئی تو انہوں نے پورے صوبہ میں اس نظام کو بروئے کار لانے کے لیے بستی میں دسمبر ۵۹ء میں ایک دینی تعلیمی کانفرنس کی، جس میں تمام مختلف الخیال اشخاص اور جماعتیں شریک ہوئیں، بعد میں جمعیۃ علمائے ہند نے اس سے علاحدگی اختیار کرلی لیکن اب بھی اس میں مسلمانوں کی اور دوسری جماعتیں اور مختلف مکاتب فکر کے افراد شامل ہیں اور الحمدللہ اس وقت پورے صوبہ میں یہ تحریک کامیابی سے چل رہی ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے قیمتی متاع اور بیش بہا سرمایہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے، قاضی صاحب کو اس سے بڑا تعلق تھا، وہ یہیں کے تعلیم یافتہ تھے اور برسوں اس کی کورٹ کے ممبر بھی رہے تھے، اس کا اقلیتی کردار سلب کیا گیا تو قاضی صاحب کا خواب وخور حرام ہوگیا، اقلیتی کردار کو بحال کرنے کی جدوجہد شروع ہوئی تو وہ اس کے ہراول دستہ میں شامل ہوگئے اور اس کے متعلق بکثرت مضامین لکھے جن کا وزن پوری طرح محسوس کیا گیا۔

تصنیف وتالیف قاضی صاحب کا اصلی مشغلہ نہ تھا، لیکن وہ اچھے اہل قلم، ممتاز ادیب وانشا پرداز تھے، قلم برداشتہ لکھنے پر بھی قادر تھے، مضامین کے علاوہ حال ہی میں ان کی دو کتابیں بھی شائع ہوئیں (۱) اقبال فلسفہ حیات وشاعری (۲) تحریک خلافت دونوں کتابیں اہم ہیں مگر موخرالذکر بعض حیثیتوں سے متنازعہ فیہ ہوگئی ہے، ۶۸ء میں خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے گئے تو اس کا سفرنامہ بڑے والہانہ انداز میں لکھا جو کتابی صورت میں چھپا اور پُر از معلومات ہونے کی وجہ سے بہت پسند کیا گیا،

وہ بہت اچھے مقرر اور خطیب بھی تھے، ان کی تقریریں مربوط، مدلل، موثر اور قانونی ہوتی تھیں، دینی تعلیمی کونسل کے جلسوں میں (۱) ...

ایک دفعہ اعظم گڑھ کی ضلعی کانفرنس میں انہوں نے دینی تعلیم کی ضرورت و اہمیت کی وضاحت ایسے دل نشین انداز میں کی کہ اب تک اس کا چرچا ہوتا رہتا ہے۔

وہ دھن اور ارادہ کے پکے اور عملی آدمی تھے۔ وہ جس کام میں لگ جاتے اس میں تن، من، دھن سب کی بازی لگا دیتے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اردو اور دینی تعلیمی تحریک کے روح رواں تھے، ان کی سرگرمی اور قوت عمل نے ان تحریکوں میں بڑی حرکت و توانائی پیدا کر دی تھی۔ وہ بہت بے لاگ اور کھرے بھی تھے، حق کے معاملہ میں کسی قسم کی رو رعایت نہ کرتے، جس بات کو غلط سمجھتے اس کی برملا تردید کرتے۔

وہ بڑے قوم پرور تھے، ہندو فرقہ واریت کی طرح مسلم فرقہ واریت سے بھی برسر پیکار رہتے تھے لیکن ان کا دل دینی حمیت، ایمانی غیرت اور ملی درد سے معمور تھا۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کے طبقہ میں دین و ملت کا ایسا درد رکھنے والے بہت کم لوگ ہوں گے، انھوں نے قوم پروری کو ایمانی و ملی غیرت پر کبھی غالب نہ آنے دیا، انہوں نے ثابت کر دیا کہ ایک سچا مسلمان ہی سچا محب وطن ہو سکتا ہے۔ ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی عقیدت و محبت تھی، ۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین کی طلائی جوبلی کے ایک جلسہ میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر جناب افضل اقبال نے انگریزی میں تقریر کی جو عام طور پر پسند کی گئی مگر قاضی صاحب کو اس سے اس بنا پر سخت تکدر ہوا کہ فاضل مقرر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک جس عقیدت و احترام سے لینا چاہئے تھا نہیں لیا۔ اس کی شکایت انہوں نے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم دارالمصنفین سے بھی کی اور اس کے خلاف قومی آواز لکھنؤ میں مراسلہ بھی لکھا۔

انھوں نے کبھی اپنی خدمت کا کوئی صلہ اور معاوضہ نہیں حاصل کیا بلکہ ہمیشہ ٹھوس اور خاموش خدمت کو نام و نمود پر ترجیح دیا، ان کی موت سے اس دور کا خاتمہ ہوگیا جس میں سیاست داں ملک، قوم اور ملت کی خدمت محض خدمت و ایثار کے جذبہ سے انجام دیتے تھے اور اس میں کسی ذاتی مفاد اور غرض کو دخل

مطبوعات جدیدہ

روح القرآن :- مرتبہ مولانا عبد السلام قدوائی مرحوم، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۰۳ مجلد قیمت تیس (۳۰) روپئے پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دلی۔

مولانا عبد السلام قدوائی مرحوم کی ادارت میں تعمیر کے نام سے ایک اخبار "ادارۂ تعلیمات اسلام" لکھنؤ سے برسوں شائع ہوتا رہا، اس میں انہوں نے قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کا مفید سلسلہ شروع کیا تھا، جس کو انہوں نے وفات سے قبل کتابی صورت میں مرتب کر کے اشاعت کیلئے مکتبہ جامعہ کو بھیج دیا تھا مگر افسوس یہ جب شائع ہو کر آئی تو خود مولانا کی کتاب زندگی کا ورق آخر ہو چکا تھا، یہ کتاب سورۂ فاتحہ و بقرہ کے ترجمہ و تفسیر پر مشتمل ہے، اردو میں کلام مجید کی متعدد تفسیریں چھپ گئی ہیں، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں لغت، عربیت اور تفسیر کے دقیق علمی و فنی مباحث سے تعرض کئے بغیر آیتوں کا خلاصہ اور لب لباب پیش کیا گیا ہے، اس کی وجہ سے عربی سے ناواقف لوگ بھی قرآن مجید کی آیتوں کا اصل مدعا و منشا آسانی سے سمجھ سکتے ہیں، اس میں طوالت سے پرہیز کیا گیا ہے تاکہ قارئین کو اکتاہٹ نہ ہو، زبان سادہ، سلیس، عام فہم اور پیرایۂ بیان دلنشین ہے، اس لئے ہر استعداد کے لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، سورۂ بقرہ کو ہر جگہ بقر لکھا گیا ہے یہ احتیاط کے خلاف ہے، اس کی قیمت بھی زیادہ ہے، یہ قرآنی خدمت مصنف کی زندگی کی آخری یادگار ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ان کے لئے توشۂ

آخرت بنائے اور اس کے ناشر کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے۔

اسلامی تہذیب کے گہوارے مرتبہ جناب خواجہ جمیل احمد صاحب، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۳۷، مجلد مع گرد پوش، قیمت دس روپے

پتہ:۔ اردو اکیڈمی سندھ کراچی (پاکستان)

خواجہ جمیل احمد اردو اور انگریزی کے مشہور اہل قلم ہیں اس سے پہلے ان کی انگریزی کتاب "سو بڑے مسلمان" کا ان صفحات میں ذکر ہو چکا ہے، انہوں نے مسلمانوں کے زریں کارناموں کو اپنا خاص موضوع بنایا ہے، اس کا مقصد ان مغربی مصنفین کا جواب دینا ہے جو ان تمام کمالات کو اپنی جانب منسوب کرتے ہیں جن کی ایجاد کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے، زیر نظر کتاب میں مسلمانوں کے چھتیس ایسے بڑے اور اہم شہروں کا ذکر ہے جن کو دینی، علمی، تعلیمی، تہذیبی، تمدنی، سیاسی اور تاریخی حیثیت سے مرکزیت حاصل تھی، اس کی ابتدا بیت المقدس، مکہ اور مدینہ سے ہوئی ہے پھر عراق و شام کے کوفہ و بصرہ، دمشق و بغداد، مصر و سوڈان کے قاہرہ و خرطوم، مغرب کے قرطبہ و غرناطہ، ترکی کے استنبول (قسطنطنیہ) اور وسط ایشیا کے بخارا اور سمرقند کی قدیم شوکت و عظمت کی داستان بیان کی گئی ہے، ایران کے مرکزی شہروں میں اصفہان، شیراز، نیشاپور اور بلخ وغیرہ کا حال درج ہے، افغانستان، پاکستان، اور ہندوستان کے شہروں میں غزنی، کابل، ٹھٹھہ، ملتان، لاہور، ڈھاکہ، دہلی، آگرہ، بدایوں، علی گڑھ، اور لکھنؤ کا ذکر ہے، انڈونیشیا، چین اور شمالی مغربی افریقہ میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا ذکر کر کے ان کے بعض شہروں کی اہمیت و مرکزیت بھی دکھائی ہے، مصنف کی فراخدلی اور وسیع القلبی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اہل تشیع کے شہروں مشہد، طوس، قاہرہ اور لکھنؤ کے شان و شکوہ اور ان کے خلفا و سلاطین کی علم و ہنر پروری اور تمدنی و تعمیری کارناموں کا حال بھی بہت دلچسپی سے لکھا ہے ان کا علم و مطالعہ وسیع ہے اس لئے اختصار

کے باوجود کسی شہر کی قابل ذکر اور ضروری بات نظر انداز نہیں ہونے پائی ہے بلکہ ان شہروں میں اسلاف کے کارناموں، امراء و سلاطین کے جاہ و جلال اور مسلمانوں کی علمی، تمدنی اور سیاسی سرگرمیوں کے جو مناظر دیکھے گئے ہیں وہ پوری طرح سامنے آجاتے ہیں اور ان سے متعلق بہت سے اصحاب کمال اور ممتاز اشخاص کی تصویریں بھی دکھائی دینے لگتی ہیں، اس سے جہاں مسلمانوں اور ان کے فرماں رواؤں کے تدبر، عالی دماغی اور شکوہ و عظمت کا پتہ چلتا ہے وہاں خود مصنف کے ملی جذبہ اور گذشتہ اسلامی روایات سے دلچسپی کا بھی اندازہ ہوتا ہے جس کی بدولت انہوں نے بہت سلیقہ سے مسلمانوں کی قدیم عظمت کی مکمل تصویر کھینچ دی ہے، اگر وہ اسلامی تہذیب کے ان گہواروں کی قدیم خصوصیات کی طرح ان کی موجودہ حالت و کیفیت بھی بیان کر دیتے تو یہ کتاب اور زیادہ مفید ہو جاتی، اس کی تصحیح کی طرف پوری توجہ نہ کرنے سے اشخاص اور کتابوں کے نام غلط چھپے ہیں جیسے فرازدق (فرزدق) ابو اسود الدولی (ابو الاسود دولی) ابن خلقان (ابن خلکان) سیاویہ (سیبویہ) آل بویا (آل بویہ) ابو الفرح اصبہانی (ابو الفرج) حیکم (حاکم) معیض الی دیر اللہ (المعز لدین اللہ) الحوی (الحاوی) وغیرہ، ایک جگہ مبادا کا املا مبادی لکھا ہے. زبان کی بھی بعض غلطیاں ہیں جیسے، کوفہ کو مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی صحبت کا شرف رہا، (ص ۱۲)، لیکن برا ہو جدید تحقیق کا جس نے مغربی جھوٹ اور فریب کا پردہ چاک کر دیا، (ص ۱۵) پہلے جملہ میں صحبت کے بجائے قیام یا سکونت اور دوسرے میں برا کی جگہ بھلا لکھنا چاہئے تھا۔

مسعود حسن ادیب مرتبہ جناب سبط محمد نقوی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۴۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲۵ روپئے پتے (۱) کتاب نگر، دین دیال روڈ لکھنؤ (۲) دانش محل، امین آباد لکھنؤ۔

یہ کتاب اردو کے مشہور محقق و مصنف پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کے حالات و کمالات کا مجموعہ ہے جو متعدد اہل قلم کی نگارشات پر مشتمل ہے، مرزا جعفر حسین، ڈاکٹر محمد حسن اور خواجہ احمد فاروقی کے مضامین تاثراتی ہیں، نیر مسعود اور اظہر مسعود نے بالترتیب اپنے والد کے مختصر سوانح اور مرض موت کے حالات تحریر کئے ہیں، دوسرے مضامین میں مسعود صاحب کی ادبی و تحقیقی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے، لائق مرتب نے ادیب صاحب کو تیری محقق اور مجاہد اردو ثابت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مسعود حسن صاحب کی اردو زبان سے عشق و محبت کا حال لکھا ہے اور اردو اور اس کے رسم الخط کے متعلق ان کی مساعی کا ذکر کیا ہے، مضمون نگار نے اردو شاعری خصوصاً غزل اور محمد حسین آزاد کی آب حیات کے دفاع میں ادیب صاحب کا نقطۂ نظر مدلل طور پر پیش کیا ہے لیکن اس کے ضمن میں حالی اور ان کے مقدمۂ شعر و شاعری کی نسبت جو کچھ لکھا گیا ہے وہ محقق کی سخن گسترانہ بات ہو گئی ہے۔ اس کتاب میں وہ خطوط بھی درج ہیں جو مسعود حسن صاحب نے پروفیسر سید حسن (پٹنہ) اور لائق مرتب کو وقتاً فوقتاً تحقیقی و ادبی امور کے متعلق تحریر کئے تھے، آخر میں چند منظومات و قطعات بھی ہیں، لائق مرتب نے محض مضامین کی جمع و ترتیب پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان کو مفید و معلوماتی حواشی سے بھی مزین کیا ہے۔ لیکن خود ان ہی کے بقول "حاشیہ آرائی ذرا مبالغے کے ساتھ ہو گئی ہے" حالانکہ حاشیہ آرائی محض وضاحت طلب امور ہی کے بارہ میں ہوتی ہے، تاہم ان حواشی سے یہ کتاب وزنی ہو گئی ہے، فاضل مرتب کو تحریر و تصنیف کا اچھا تجربہ و سلیقہ ہے، علاوہ ازیں وہ مسعود حسن رضوی کے بڑے عقیدت مند اور قدر داں ہیں۔ اس لئے انہوں نے یہ کتاب بڑے ذوق و شوق سے مرتب کی ہے، امید ہے کہ یہ ذوق و شوق سے پڑھی بھی جائے گی،

"ض"

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰ — اگست ۱۹۸۰ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

قیمت پندرہ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

جلد ۱۲۶ ماہ رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۰ء عدد ۲

مضامین

مقالات

شذرات

ظہور اسلام کو چودہ سو سال گزر چکے، اس اثنا میں بہت سے ایسے عیسائی مصنفین اور مستشرقین ہوئے جو اسلامی علوم و فنون کے ماہرین ہونے کا دعوی کر کے اسلام کے مار آستین بنے، اور اپنی قلمی زہر چکانی سے مسلمانوں کی ایذا رسانی کرتے رہے۔

ان کی بڑی لمبی فہرست ہے، انھوں نے عربی زبان کی کتابوں کے ترجمے یورپی زبانوں میں کئے، عربی کی قلمی کتابوں کے کیٹلاگ مرتب کئے، قرآن مجید کے ترجمے کئے، اسکے الفاظ کی فہرستیں تیار کیں، ڈکشنری آف اسلام اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی تدوین کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھی، مسلمانوں کی تاریخیں لکھنے کا سلسلہ قائم کیا، فقہ اسلامی پر کتابیں لکھیں، السنۂ مشرقیہ کے مدارس اور کتب خانے کھولے وغیرہ وغیرہ، کیا یہ ساری علمی سرگرمیاں اسلام اور مسلمانوں کی ہمدردی میں عمل میں آئیں یا ان کا مقصد کچھ اور رہا؟ بظاہر طلب علم کی خاطر انھوں نے طبیعیات، کیمیا، فلکیات، طب اور فلسفہ میں مسلمان ماہرین کی کتابیں شایع کر کے ان کے انکشافات اور معلومات سے استفادہ کرنے کی کوشش کی، مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ انھوں نے ان سے جو کچھ حاصل کیا اسکو اپنی زبانوں میں ایسے ماہرانہ انداز میں پیش کیا کہ یہ ساری مستعار چیزیں ان ہی سے منسوب ہونے لگیں، اور اگر ان مسلمان فضلاء کا ذکر بھی کرتے ہیں تو ان کا نام کچھ ایسا بدل دیتے ہیں کہ ان ہی میں سے معلوم ہوتے ہیں، مثلاً ابن زکریا رازی کو Rhazes، ابن سینا کو Avicenna، ابو القاسم خلاف بن عباس کو Albucosis، ابو مروان ابن عبد الملک ابن زہر کو Avenzour، ابن رشد کو Averroes، اور عبد اللہ بن احمد ابن علی البیطار کو Aban Bethar لکھیں گے،

ان تصانیف کو سامنے رکھ کر یا ان کے ترجموں کی مدد سے کچھ مصنفین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ضخیم کتابیں لکھیں، مگر ان کا مقصد زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ آپ کی ذاتِ طیبہ سے نفرت پھیلائی جائے، مثلاً

اسپرنگر نے آپ کی سیرت لکھی تو لکھتا ہے (نعوذ باللہ) کہ اسلام محمد کی ایجاد نہیں ہے، وہ ایسے مکار کا نکالا ہوا مذہب نہیں ہو سکتا، مگر اس میں شک نہیں کہ اس مکار نے اپنی بد اخلاقی اور طبیعت کی برائی سے اس کو بگاڑا اور جو بہت سے مسائل اس میں قابل اعتراض ہیں وہ اسی کی ایجاد ہیں، ریفرنے ولیم میور نے اپنی کتاب لائف آف محمد میں لکھا کہ جب تک قرآن ہے، تعدد ازدواج، طلاق، غلامی، پردہ اور عدم رواداری سے عوام کے اخلاق کی تخریب ہوتی رہے گی، گھریلو زندگی میں زہرناکی اور سوسائٹی میں خلل پیدا ہوتا رہیگا، محمدؐ کی زندگی (نعوذ باللہ) تضاد سے بھری ہوئی ہے، وہ رحم کی تعلیم دیتے ہیں، لیکن کسی قبیلہ کا قتل عام ہوتا ہے، تو بڑی مسرت کا اظہار کرتے ہیں، اور معصوم بچوں کو دوزخ کی آگ میں جلائے جانے کی بھی خبر دیتے ہیں، ان کی زندگی کی ابتدا اشکلات اور شبہات سے شروع ہوتی ہے، اسلئے وہ تضاد اور تباین کا مجموعہ بن گئے،

بعض مصنفوں کی تحریریں تو اور بھی اشتعال انگیز ہوتی ہیں، مثلاً مارگولیتھ سیرت پاک کے سلسلہ میں روایتوں کی تحریف کرکے یہ شبہ ناظرین کے دل میں ڈال دیتا ہے کہ حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے جو لڑکا پیدا ہوا، وہ آپ سے تھا بھی کہ نہیں، کیونکہ اگر وہ پیغمبر کا لڑکا ہوتا تو اتنی جلد وفات نہ پاجاتا، ایسے کذب اور افترا پر جہاد بالقلم کے بجائے جہاد بالسیف کا حکم جاری ہو تو کوئی تعجب کی بات نہ ہونی چاہئے۔

کچھ ایسے خطاکار مصنفین بھی ہیں جو کلام پاک سے متعلق یاوہ گوئی کرتے ہیں، مثلاً نولدکی نے انسائیکلوپیڈیا بری ٹانیکا کے اپنے مضمون قرآن پاک میں لکھا کہ پیغمبر اسلام نے ایک ہی سورہ کو مختلف لوگوں کو مختلف طریقے سے لکھا یا کبھی جو کچھ لکھاتے اس کو بدل دیتے اور کچھ حصہ تو بالکل حذف کر دیا، ان کا خود بیان ہے کہ کلام پاک سات شکلوں اور عرب کی مختلف بولیوں میں نازل ہوا اگر قرآن کا اسٹائل مکمل ہوتا تو پھر اس کا نزول اعجاز میں شمار کیا جاتا، اس کا انداز بیان اعلیٰ درجہ کا نہیں، پھر پیغمبر اسلام کے زمانہ میں جتنے قرآن لکھے گئے وہ سب جلا دیئے گئے، عثمان نے جو ترتیب دیا وہی رائج ہے جس کی صحت پر شکوک ظاہر ہوتے رہے وغیرہ وغیرہ۔ گستاخ نولدکی تو مقصد آ طور پر قرآن مجید کے الفاظ کے مادے کچھ اس طرح بناتا ہے کہ اصل کا مفہوم کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے، گولڈزیہر نے

اس کی ترویج کی کہ ابتداً کلام پاک کے حروف پر نقطے نہیں دیے گئے، لوگوں نے نہ جانے کیا لکھا تھا، اور کیا پڑھا گیا، ایسے مصنف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ توراۃ اور انجیل کی طرح اصل قرآن بھی مفقود ہے،

طامس کارلائل نے اپنے زمانے کے ایسے مصنفین کے بارے میں لکھا تھا کہ ان کی تحریریں قطعاً ہماری روسیاہی کا باعث ہیں، مولانا شبلیؒ نے یہ لکھ کر ان کی تحقیر کی تھی کہ ان کا یہ حال ہے کہ

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

لیکن اس موجودہ دور میں بھی ان کو کچھ سوجھتا نہیں، اور اپنی روسیاہی کا برابر سامان کرتے جا رہے ہیں، مناظرانہ تحریروں، مجادلانہ استدلالوں گمراہ کن منطقیانہ مغالطوں، پھر تحریفات تلبیسات، دوراز کار قیاسات اور احتمالات سے معلولات کا سلسلہ پیدا کر کے اپنے تعصب کی چنگاریوں سے مستند معلومات اور واقعات کو جلانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں،

کچھ عیسائی مصنفین غیر مستند ماخذوں کا سہارا لے کر تل کو پہاڑ بنانے کی فکر میں رہتے ہیں مثلاً محمد بن عمر واقدی کی کتاب المغازی مسلمان ارباب تحقیق کے نزدیک بہت ہی غیر مستند ہے، اس کی حیثیت محض ایک داستان گو کی ہے، ایک بار استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مارگولیتھ سے زبانی گفتگو میں کہا کہ تاریخ و سیرت میں اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے، جیسے ملکہ الزبتھ کی سوانح عمری میں رینالڈس کا حوالہ دیا جائے، مگر مارگولیتھ کے ساتھ ڈرہم یونیورسٹی کے پروفیسر الفرڈ گولیم اسکو مستند اور معتبر قرار دینے کے لئے علمی مجادلہ پر اتر آئے۔

کچھ ایسے عیسائی مصنفین بھی ہیں جو اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی بہت سی خوبیاں بیان کر کے اپنے ناظرین کو اپنی غیر جانبدارانہ تحریر اور اصابت رائے سے متاثر کرنا چاہتے ہیں لیکن اسکا مقصد درپردہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ناظرین کو کچھ نہ کچھ تلخ گھونٹ بھی پینے پر مجبور کریں، مثلاً اچ۔ جی۔ ویلیس اسلام کی بڑی تعریف کرتا ہے کہ اس میں لطف و کرم کی جو تعلیمات ہیں، وہ اس کی

بڑی خوبی ہے، اس میں جو توحید کا تخیل ہے، وہ یہودیت اور عیسائیت کی مسخ شدہ توحید کے مقابلہ میں بہت اہم ہے پھر وہ اسلام کو یہودیت عیسائیت، مزدکیت اور مجوسیت سے زیادہ بہتر قرار دیتا ہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہرزہ سرائی کرتا ہے کہ وہ (نعوذ باللہ) چالباز، فریبی اور سفاک تھے، ان کی بادشاہت میں روحانیت نہیں، انھوں نے ایک مذہب کیا قائم کر دیا کہ انکو یسوع مسیح، گوتم اور مانی کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا جاتا ہے، دراصل وہ اس مٹی کے بنے ہوئے تھے جس سے ادنیٰ درجہ کے آدمی بنے ہوئے ہیں، وہ (نعوذ باللہ) خود پرست، ظالم اور خود فریبی تھے۔

منٹگمری واٹ کی کتابیں محمد ایٹ مکہ، محمد ایٹ مدینہ اور محمد دی پرافٹ اینڈ اسٹیٹسمین بہت پڑھی جاتی ہیں، موخر الذکر کتاب میں اس نے رسول اللہ ؐ کے کردار کی بہت تعریفیں کی ہیں، مگر اس کے پردے میں یہ اثر ڈالنا چاہتا ہے کہ عہد نبوی کے غزوات توحید، رسالت اور اسلام کی خاطر نہ تھے بلکہ تجارتی اور معاشی تھے، آخر میں کلام پاک سے متعلق وحی و الہام Revelation اور تکوینی خیالات Creative imagination کی ایک پر فریب بحث چھیڑ کر ناظرین کے دلوں میں یہ شک پیدا کر دیتا ہے کہ قرآن پاک وحی کا مجموعہ ہے، یا رسول اللہ ؐ کے تکوینی تخیلات کی پیداوار ہے، پھر ناظرین کو اپنے سے بدظن نہ ہونے کی خاطر یہ لکھتا ہے کہ اس میں جو خیالات پیش کئے گئے ہیں، وہ بڑی حد تک سچے اور بالکل صحیح ہیں لیکن اپنی تصنیفی عبارت سے کام لے کر فوراً یہ بھی لکھ جاتا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اس کے سارے خیالات سچے اور بالکل صحیح ہوں، اسی طرح رسول اللہ ؐ کا بظاہر مداح ہونے کے باوجود یہ بھی لکھتا ہے کہ انھوں نے جتنے خیالات کی ترویج کی وہ سب کے سب سچے اور اور صحیح نہیں ہیں۔

کینٹ ول اسمتھ آج کل بہت مشہور ہو رہے ہیں، بعض حلقوں میں وہ مسلمانوں کے ہمدرد بھی سمجھے جاتے ہیں، ان کو دکھ ہے کہ عربوں یعنی اسلام میں اب تک کوئی طامس پین یا والٹیر نہیں ہوا ہے،

وہ چاہتے ہیں کہ اسلام موجودہ دنیا کے موڈرنزم اور مغرب کے خیالات کے ہم آہنگ ہوکر بڑھے
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر یہ فرنگی تہذیب کہ جو ہے خود لبِ گور
اس قسم کے پیام کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر مسلمانوں نے مغرب کے موڈرنزم کی میٹریلزم
پریگمیٹزم اور سیکولرزم کے فلسفہ کو قبول کرلیا تو وہ اسلام سے بے نیاز ہوکر زندگی
بسر کرنے پر مجبور ہوں گے، ان کی زندگی اور اخلاق کا جو اپنا معیار ہے، وہ خود بخود ختم ہوجائیگا اسی لئے
مسلمانوں میں اگر انقلابی اور اصلاحی تحریکیں چلتی ہیں، تو ان کو ایسے مصنفین احیا نوازی، قدامت
پرستی، ظلمت پسندی اور رجعت قہقہری وغیرہ کی خودساختہ اصطلاحات کی آڑ لے کر ان کی مذمت
شروع کر دیتے ہیں، تاکہ یہ بارآور نہ ہوں۔

اسی تعصب کی بنا پر عیسائی دنیا میں افسانوں، ناولوں، اخباروں کے کارٹونوں اور سنیما کی
فلموں کے ذریعہ سے اسلام کے خلاف زہر چکانی برابر جاری ہے، اب تو ایسی تحریریں اور کتابیں بھی لکھی جارہی ہیں جن سے
عربوں، ترکوں، کردوں، افغانوں اور مسلمانوں کے مختلف مذہبی فرقوں میں باہمی منافرت اور کشمکش پیدا ہوتی رہے،
حال ہی میں قرامطہ پر امریکہ کی ایک خاتون کا مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا جس میں انھوں نے بہت ہمدردانہ
طور پر یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ ان کے صحیح عقائد سے متعلق بڑی غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں۔

ابھی ۱۹۶۹ء میں انگلستان سے جون لیفن کی ایک کتاب "دی ڈیگر آف اسلام" شائع ہوئی ہے، اس کے نام
سے ظاہر ہے کہ مصنف نے کیا کچھ نہیں لکھا ہوگا، اس کو خطرہ ہے کہ مسلمان دنیا میں ایک تیسری قوت بن کر جہاد کے
ذریعہ دنیا پر حاوی ہونے والے ہیں، وہ بغض و عداوت سے بھری ہوئی تحریروں میں پہلے تو مسلمانوں کے رسول کی بڑی
بری تصویر کھینچتا ہے کہ انھوں نے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے مذہب کو استعمال کیا، اور ہر قسم کے ذرائع کو
صحیح سمجھتے رہے، وہ فوجی حیثیت سے بہت ہی ظالم تھے قتل عام گوارا کر لیتے، سیاسی حیثیت سے وہ موقع پرست تھے،
مذہبی رہنما کی حیثیت سے وہ جارح اور بے صبر رہے، پھر قرآن مجید کی اہمیت یہ لکھ کر کم کرنا چاہتا ہے کہ رسول اللہ کے

زمانہ میں الہامی کتاب نہیں سمجھی گئی تھی، تیسری صدی ہجری سے یہ الہامی قرار دی گئی، اسی طرح حدیث کی اہمیت کو بھی زائل کرتا ہے کہ اس کی تدوین تو دو تین صدی کے بعد کی گئی، پھر قرآن مجید اور حدیث کی رو سے زنا، شراب نوشی، قمار بازی، چوری اور قتل کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں ان کا پورا تمسخر کیا ہے، قرآن کی آیتون اور حدیثوں کو توڑ موڑ کر اپنے کذب، افترا، تاویل اور تعصب کو صحیح قرار دینے کی کوشش کرتا ہے، جامعہ ازہر اور اسلامی ممالک کے تمام موجودہ سربراہوں کو اپنی زہریلی تحریروں سے مطعون کرتا ہے۔

آخر میں لکھتا ہے کہ مغرب کو اس وقت ایسے اسلام کا سامنا کرنا ہے جو خنجر نکال کر نشاۃ ثانیہ کی طرف مائل ہے، جس کے خلاف مغرب کو اپنی مدافعت کرنی ہے، اس کو اپنا دوسرا گال پیش کر کے سپر انداز نہیں ہونا ہے، اس کے یہ معنے ہیں کہ اس کی خواہش ہے کہ مغرب اسلام کو کچل کر رکھ دے، خواہ حضرت عیسٰی کی تعلیم کے خلاف عمل کیوں نہ کرنا ہو، اور کب ان کی تعلیم پر عمل ہوا، ستم ظریفی یہ ہے کہ مغرب مسلمانون کو صقلیہ اور اسپین سے نیست و نابود کر دے صلیبی جنگ چھیڑ کر لاکھوں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دے، ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کو ختم کر دے، دولت عثمانیہ کے حصے بخرے کر دے، صدیون اسلامی ممالک کو اپنی غلامی میں رکھے، مہلک ہتھیار بنا کر اسلام کے دشمنون کو مہیا کرے، ساری عیسائی دنیا اسلام کی بیخ کنی کی فکر میں رہے، پھر بھی یہ الزام رکھے کہ اسلام سخت اور متشدد قسم کی راسخ العقیدگی اور ناروا داری کی ترویج کرتا ہے، اور اس وقت مغرب کے خلاف خنجر نکالے ہوئے ہے،

ایسے مصنفین کو اپنے گریبان میں منہ دے کر یہ بھی سوچنا ہے کہ انھوں نے اپنی افترا پردازانہ اور اشتعال انگیز تحریرون سے اسلام کی اشاعت اور تبلیغ کو کس حد تک روکا۔ ان کے ہم مذہبوں نے اپنی سیاسی فریب کاریوں اور حربی چالبازیوں سے مسلمانوں کو مختلف ملکوں میں ضرور نقصان

پہونچایا، مگر دنیا میں ان کو پھیلنے سے روک نہ سکے، جوں لیبفین کو بادل ناخواستہ یہ اعتراف ہے کہ اس وقت مسلمان دنیا میں سات سو پچاس ملین ہیں، عیسائیوں کی آبادی نو سو پچاس ملین ہے، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ عیسائیت اسلام سے طاقتور ہے، عیسائیت اسلام کی آرٹری (Artery) کی محض دین (Vein) ہے، اسلام عیسائیت کی طرح ایک فرقہ کے اندر محض ایک چرچ نہیں، بلکہ یہ ایک ایسی کمیونٹی ہے، جو مذہب سے منسلک ہے، اور یہی اس کی مخصوص قوت ہے۔

خود مسلمانوں نے جو اعداد و شمار جمع کئے ہیں، اس لحاظ سے ۱۹۷۵ء تک دنیا میں ان کی آبادی نوے کروڑ تک ہو چکی تھی، اس وقت تک ان کے چھیالیس آزاد ممالک ہیں، جن کی آبادی تقریباً ساٹھ کروڑ ہے، تیرہ ممالک ایسے ہیں جن میں مسلمانوں کی آبادی کی اکثریت ہے مگر غیر مسلموں کے ماتحت ہیں، وہاں ان کی آبادی سات کروڑ اناسی لاکھ ہے، پھر دنیا کا شاید کوئی ایسا ملک نہیں جہاں کچھ نہ کچھ ان کی آبادی نہ ہو وہاں انکی تعداد بائیس کروڑ چھیانوے لاکھ ہے۔

اسلام نے جو تعلیم دی ہے، اس لحاظ سے اب تک

قسمت عالم کا مسلم کوکب تابندہ ہے ✽ جس کی تابانی سے افسون سحر شرمندہ ہے

ان سطروں کے چھپتے وقت حکومت ہند کے جناب وزیر تعلیم اور اس محکمہ کے سکریٹری نے تار کے ذریعہ سے اطلاع دی ہے، کہ راشٹر پتی نے ۱۵ راگست ۸۰ء کے یوم آزادی کے موقع پر اڈیٹر **معارف** کو فارسی ادب و زبان میں اس کی خدمات کو پسند فرماکر سرٹیفکیٹ آف آنر کے اعزاز سے نوازا ہے، اس کے لئے وہ حکومت ہند کا شکر گذار ہے کہ علم و ادب کے خاموش خدمت گذاروں اور عزلت پسندوں پر بھی اس کی نظر رہتی ہے۔

مقالات

قاضی صاعد الاندلسی اور اُن کی تاریخ علوم[1]

از

پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر خان، کلکتہ

موجودہ دور سائنس اور تکنیکی ترقی کا دور ہے، انسان چاند پر اتر چکا ہے، اور خلا میں پرواز کر رہا ہے، ظاہر ہے کہ اس دور میں لوگوں کو سائنس کی تاریخ سے کافی دلچسپی ہو رہی ہے، اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی جا رہی ہیں، مسلمانوں نے سائنس کی ترقی میں جو حصہ لیا ہے، اُس کی تاریخ مؤرخین لکھ رہے ہیں، لیکن اس حقیقت کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ سائنس کی تاریخ لکھنے میں بھی مسلمانوں نے کافی دلچسپی لی ہے، اور یہ کہنا صحیح ہے کہ علوم کی سب سے پہلی تاریخ ایک مسلمان نے اندلس میں لکھی تھی، ان کا نام ہے ابو القاسم صاعد الاندلسی اور اس تاریخ کا نام "طبقات الامم" ہے۔

حالات زندگی ابو القاسم صاعد بن محمد بن عبد الرحمٰن بن محمد بن صاعد الاندلسی ایک عرب قبیلہ بنو تغلب یا بنو ثعلبہ سے تعلق رکھتے تھے، جو قرطبہ میں بس گیا تھا، لیکن ان کی پیدائش المریہ میں

---

[1] یہ مقالہ آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس، اجلاس ہشتم، منعقدہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۶/۷/۸ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں پڑھا گیا تھا،

۴۲۰ھ مطابق ۱۰۲۹ء میں ہوئی تھی، ان کے دادا ابو المطرف عبد الرحمٰن سیدونیہ کے قاضی تھے، اور ان کے والد احمد بن عبد الرحمٰن بن محمد بن صاعد بھی قرطبہ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، ان کے حالات زندگی بہت کم ملتے ہیں[1]، اس لئے بالیقین یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے بچپن کا زمانہ کہاں گزرا اور انھوں نے ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی، البتہ ان کے پانچ اساتذہ کے نام "طبقات الامم" اور دوسرے مآخذ سے معلوم ہوسکتے ہیں، وہ تھے ابن حزم (المتوفی ۴۵۶/۱۰۶۴) ابوالولید ہشام بن احمد بن ہشام بن خالد الکنانی المعروف بہ ابن الوقشی (المتوفی ۴۸۹/۱۰۹۵) ابو محمد القاسم بن الفتح (المتوفی ۴۵۱/۱۰۵۹) طلیطلہ کے ابو جعفر احمد بن خمیس (المتوفی ۴۵۴/۱۰۶۳) اور ابو اسحٰق ابراہیم بن ادریس التجیبی (المتوفی ۴۵۴/۱۰۶۲)

ابن الوقشی اور ابن خمیس کے بارے میں قاضی صاعد نے واضح طور پر لکھا ہے کہ انھوں نے ان سے تعلیم حاصل کی[2]، لیکن ابن حزم کے بارے میں وہ ایسا بیان نہیں دیتے اور اس وجہ سے یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے کب اور کہاں ابن حزم سے پڑھا تھا، موجودہ تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچی ہے کہ ابن حزم کا قیام المسریہ میں تھا، اور یہ بھی کہ قرطبہ میں بھی انھوں نے سکونت اختیار کی تھی، جس کی تصدیق خود قاضی صاعد نے کی ہے[3]، ممکن ہے کہ ان دونوں شہروں میں سے کسی ایک میں قاضی صاعد نے ان سے پڑھا ہو، قاضی صاعد نے ان کے بارے میں طبقات میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے براہ راست ذاتی تعلق تھا، انھوں نے کتاب مذکور میں لکھا ہے کہ ابن حزم کے بیٹے نے ان کو اطلاع دی تھی کہ مختلف مضامین پر ابن حزم کی تصنیفات

---

[1] قاضی صاعد کے تفصیلی حالات زندگی کے لئے ملاحظہ فرمائیے، راقم الحروف کا مقالہ جو پروفیسر ہارون خاں شیروانی کے FELICITATION VOLUME میں شائع ہوا ہے، حیدرآباد ۱۹۶۸ء ص ۲۶۵-۲۸۹

[2] الاندلسی، طبقات الامم (بیروت ۱۹۱۲ء) ص ۹۰ – [3] ملاحظہ کیجئے آر۔ ارنالدیز کا مقالہ ابن حزم، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں نیا ایڈیشن، ج ۳، ص ۷۹۰-۷۹۹

چار سو کے قریب ہیں[۱]، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اطلاع زبانی دی گئی تھی، قاضی صاعد نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ابن حزم نے ان کو لکھ کر اپنی پیدائش کی تاریخ سے آگاہ کیا تھا[۲] جس سے پتہ چلتا ہے کہ جب، دونوں کا قیام ایک ہی شہر میں نہیں ہوتا تھا تو دونوں ایک دوسرے سے خط و کتابت کرتے تھے۔

قاضی صاعد بیان کرتے ہیں کہ ان کی ملاقات ابن الوقشی[۳] سے ۴۳۸/۱۰۴۶ میں طلیطلہ میں ہوئی تھی[۴]، ممکن ہے کہ اسی سال انھوں نے طلیطلہ کا سفر کیا تھا، جب کہ ان کی عمر صرف اٹھارہ[۱۸] سال کی تھی، ان کے شباب کا زمانہ اسی شہر میں گزرا اور اس میں انھوں نے جید عالموں سے مثلاً ابن الوقشی، ابن خمیس[۶]، التجیبی[۵] اور دوسروں سے بھی حدیث، منطق، ادب، فلسفہ، طب، علم الحساب، اسلامی فقہ، علم ہیئت و نجوم اور تاریخ پڑھی، خاص طور پر علم الہیئۃ والنجوم اور اسلامی فقہ میں مہارت حاصل کی اور ان میں ان کی کافی شہرت ہوئی، یقینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۴۳۸/۱۰۴۶ سے قاضی صاعد کا قیام مستقل طلیطلہ ہی میں رہا، مندرجۂ بالا اساتذہ و علماء کے علاوہ طلیطلہ اور سرقسطہ کے دوسرے مسلمان اور یہودی ادبا اور علماء سے بھی قاضی صاعد کے تعلقات تھے اور ان سے بھی انھوں نے استفادہ کیا ہوگا۔

۳۹۹/۱۰۰۹ میں غاصب عبد الرحمن شنجول العامری کا انتقال ہو گیا اور اسی کے بعد

---

[۱] ان کے بیٹے کا نام فقیہ ابو محمد تھا، ملاحظہ کیجئے طبقات، ص ۷۶، [۲] نفس المصدر، ص ۷۷، [۳] طبقات، ص ۷۴، [۴] ان کا پورا نام ابو جعفر احمد بن خمیس بن عامر تھا، دیکھیے نفس المصدر، ص ۷۴، ابن الآبار، تکملۃ الصلۃ، ج ۱، رقم ص ۷۵، ابن ابی اصیبعہ، عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ج ۲ ص ۴۱، [۵] ان کا پورا نام ابو اسحق ابراہیم بن لب بن ادریس تھا، طبقات، ص ۷۴، ابن الآبار، تکملۃ، ج ۱، رقم ۳۵۱۔

بنو امیہ کی سلطنت کا اندلس میں زوال بھی ہوا ۔ ۴۲۲/۱۰۳۱ء میں عیسائیوں نے قرطبہ کو فتح کر لیا اور اس کے زوال کے بعد اندلس میں عربوں اور بربر کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہو گئیں، ان میں اشبیلیہ، غرناطہ، مرسیہ، طلیطلہ، سرقسطہ اور بلنسیہ کی حکومتیں قابل ذکر ہیں، لیکن دو حکومتیں ابن عباد کی اشبیلیہ میں اور بنو ذوالنون کی طلیطلہ میں سب سے اہم تھیں[۱]، مؤخر الذکر کو ایک قدیم بربر خاندان نے ۴۲۲/۱۰۳۲ء میں قائم کیا تھا، عیسائیوں کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ۴۷۸/۱۰۸۵ء میں ہو گیا، بنو امیہ کے زوال کے بعد علوم و فنون کے مراکز بھی بدل گئے، اور چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں کے دار السلطنت علم و ادب کا گہوارہ بن گئے، اسی طرح بنو ذوالنون کا دار السلطنت طلیطلہ بھی علوم و ادب کا مرکز بن گیا، اور اس کے حکمراں نہ صرف شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کرتے تھے، بلکہ وہ منجموں، فلسفیوں اور طبیبوں کے بھی سرپرست تھے، قاضی صاعد جیسے ایک ادیب اور عالم کے لئے علمی و تحقیقی کام کرنے کی فضا طلیطلہ میں بڑی سازگار تھی، ان کے علم و فضل کی شہرت نے شاید طلیطلہ کے حکمراں خاندان بنو ذوالنون کے امیر ابو الحسین یحییٰ بن اسمٰعیل بن امیہ بن مطرف بن موسیٰ کی توجہ ان کی طرف مبذول کی تھی، انھوں نے قاضی صاعد کو طلیطلہ کے مالکی قاضی کے عہدے پر فائز کیا[۲]، یہ عین ممکن ہے کہ ان کے استاذ ابن الوقشی نے جن کا اثر امیر مذکور کے دربار میں بہت زیادہ تھا، ان کی سفارش کی ہو گی، ان کے مزید حالات زندگی معلوم نہ ہو سکے، لیکن

---

[۱] ملاحظہ کیجئے، انور شحنہ تاریخ الاندلس وثقافتہ، انگریزی میں (مینوسوٹا ۱۹۷۴ء) ص ۳۸، ۳۹،
[۲] انور شحنہ، نفس المصدر، ص ۴۲، ۴۳، د.م. ڈنلپ، بنو ذوالنون، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، (جدید ایڈیشن) ج ۲، ص ۲۴۲ - ۲۴۳، [۳] ابن بشکوال، الصلۃ، تصحیح کودیرا زبجریط ۱۸۸۲، ۱۸۸۳ء) ج ۱، ص ۲۳۲، رقم ۵۳۵۔

ان کی وفات کی متعین تاریخ مؤرخین نے لکھی ہے، جب وہ صرف ۴۲ سال کے تھے تو اُن کا ۳ شوال ۴۶۲ھ مطابق ۶/ جولائی ۱۰۷۰ء کو انتقال ہوگیا[۱]، ان کے جنازے کی نماز دربار کے ایک نہایت معزز عالم ابن الحدیدی نے پڑھائی تھی۔

اخلاق | ان کا کردار عیوب و اسقام سے پاک تھا، اور ان میں مذہبی عصبیت بالکل نہیں تھی، علم دوستی اور مروت ان کی فطرت میں تھی، دو عبرانی مآخذ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے[۲]، کہ وہ علوم و فنون خاص طور پر ہیئت نجوم کے بڑے شیدائی تھے، وہ بڑے سخی تھے، اور اپنی دولت ان لوگوں میں تقسیم کرتے، جو ان کو علم الہیئۃ والنجوم کے مطالعہ اور تحقیق میں مدد دیتے، وہ رصدگاہ میں کام کرنے والوں کی بھی سرپرستی کرتے، اور اس میں وہ مذہب و ملت کا کوئی فرق نہیں کرتے، طبقات کے ایک باب "العلم فی الہند" میں انھوں نے اہل ہند کی بڑی تعریف کی ہے، اگرچہ وہ جانتے تھے کہ وہ بت پرست ہیں، اسی طرح انھوں نے ایک باب علوم بنی اسرائیل بھی لکھا ہے، جس میں ایک یہودی عالم اسحٰق بن قسطار کے اخلاق و کردار نیز اس کی علمیت کی بڑی تعریف کی ہے[۳]، مسلمان اور یہودی منجمین کی معیت میں قرطبہ اور طلیطلہ کی رصدگاہوں میں انھوں نے ثوابت و سیارات، نجوم و افلاک نیز کواکب کے حالات معلوم کئے، وہ اسپین کے مشہور منجم الزرقالی[۴] کے ہم عصر تھے، اور یہ دونوں طلیطلہ کے منجمین میں امام کی

---

[۱] ابن بشکوال، نفس المصدر، حاجی خلیفہ کا یہ بیان کہ ان کا انتقال ۴۵۰/۸۶۵، میں ہوا، صحیح نہیں معلوم ہوتا، [۲] ان مآخذ کے لئے دیکھئے، مارٹن پلسنر کا مقالہ ۱۹۵۶ء،
[۳] طبقات ص ۹۰، اس باب کا نام ہے، العلوم فی بنی اسرائیل،
[۴] J. M. Millas. Vallicrosa esfidios sobre - azarcuiel (Madrid - granada, 1943, 1950

حیثیت رکھتے تھے، انہی دونوں کے کواکب و نجوم کے فلکیاتی مشاہدات اور تحقیق کے نتائج میں زیج طلیطلی تیار ہوا تھا، جو یورپ میں ازمنۂ وسطیٰ میں بہت مشہور رہا،

تصنیفات | قاضی صاعد نے اپنی تین اور کتابوں کا ذکر طبقات الامم میں کیا ہے، لیکن ان میں سے کوئی بھی اب تک دستیاب نہیں ہوسکی ہے، پہلی کتاب اصلاح حرکات النجوم ہے جو شاید متقدمین کے علم ہیئۃ و نجوم کے اصولوں پر مبنی رہی ہوگی، دوسری کتاب مقالات اہل الملل والنحل[1] ہے، شاید ابن حزم کی اسی موضوع پر ایک کتاب سے متأثر ہوکر قاضی صاعد نے یہ کتاب لکھی ہوگی، تیسری کتاب جوامع اخبار الامم من العرب والعجم ہے، جو شاید عالمی تاریخ تھی، کاسیری اور الزرکلی نے لکھا ہے کہ وہ تاریخ الاندلس کے مصنف تھے، انھوں نے ایک مختصر تاریخ اسلام[2] بھی لکھی تھی، لیکن طبقات الامم کے علاوہ ان کی کوئی اور کتاب ہم تک نہیں پہنچی ہے، یہ کتاب طلیطلہ میں ۴۶۰ھ/۱۰۶۸ء میں لکھی گئی تھی، مختلف مصنفین نے اس کتاب کا مختلف نام لکھا ہے، مثلاً التعریف بطبقات الامم، یا التعریف فی طبقات الامم، یا تاریخ الامم یا صرف طبقات، یاقوت (المتوفی ۶۲۶ھ/۱۲۲۸ء) نے ایک کتاب اخبار الحکماء سے چند اقتباسات نقل کئے ہیں، جو طبقات الامم ہی سے لئے گئے ہیں، ابن خلکان (۶۸۱ھ/۱۲۸۳ء) نے اس کا ذکر طبقات الحکماء یا طبقات الاطباء کے ناموں سے کیا ہے، لیکن ان میں سے کوئی نام بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا، حاجی خلیفہ نے اس کتاب کا ایک طویل نام صیوان الحکمۃ فی طبقات الحکماء دیا ہے، لیکن ازمنۂ وسطیٰ اور موجودہ دور کے بہت سے مصنفین نے اس کا نام صرف طبقات الامم لکھا ہے

---

[1] دیکھئے ابن حزم کی کتاب الفصل فی الملل والنحل،

[2] ملاحظہ کیجئے مارٹن پلسنر کا مقالہ،

جو صحیح معلوم ہوتا ہے۔

طبقات الامم کے ایڈیشن | اس کتاب کے صرف دو ایڈیشن پائے جاتے ہیں، لویس شیخو نے اس کا ایک مختصر متن مجلہ "المشرق" بیروت میں ۱۹۱۱ء میں شائع کیا تھا، اس کے بعد انھوں نے اس کا مکمل متن حواشی تعلیقات اور دو مختصر مقدمے، ایک فرانسیسی اور دوسرے عربی کیساتھ ۱۹۱۲ء میں شائع کیا[1]۔ یہ دونوں متون اٹھارہویں صدی عیسوی میں لکھے ہوئے ایک مخطوطہ پر مبنی تھے جسے لویس شیخو نے دمشق میں خریدا تھا، اس ایڈیشن کی دو نقلیں (REPRINT) قاہرہ سے طبع ہوئی ہیں، جن پر سنہ طباعت درج نہیں ہے[2]، ان میں کچھ ترمیم و تنسیخ اور تصحیح ضرور کی گئی ہے لیکن ان میں کچھ اور نئی نئی غلطیاں پائی جاتی ہیں، نجف کے حیدریہ پریس نے بھی ۱۳۸۷/۱۹۶۷ میں اس کا ایک متن ۱۱۸ صفحات پر شائع کیا ہے، جو اطمینان بخش نہیں ہے،

طبقات الامم کے محتویات | قاضی صاعد نے طبقات کے مقدمے میں لکھا ہے کہ نوع انسان قدیم زمانے میں صرف سات قوموں میں منقسم تھا، یہ قومیں بعد میں تین باتوں یعنی اخلاق، صورت اور زبان کی وجہ سے بہت سی مختلف قوموں میں تقسیم ہوگئیں، بعد ازاں انھوں نے دنیا کی قوموں کو دو طبقے میں تقسیم کیا ہے، پہلا طبقہ اُن قوموں کا ہے، جنھوں نے علوم کی ترقی و ترویج میں حصہ لیا ہے اور دوسرا طبقہ ان قوموں کا ہے، جنھوں نے علوم سے کوئی دلچسپی نہیں لی، اس سبب سے کہ پہلے طبقے نے علوم کی ترقی میں حصہ لیا ہے، اس پر خدا کی خاص عنایت ہے اور دوسرا طبقہ اس عنایت سے محروم ہے۔

---

[1] کتاب طبقات الامم، المطبعۃ الکاثولیکیۃ الآباء الیسوعیین، بیروت ۱۹۱۲ء، ۱۲۴ صفحات، اس میں پانچ فہارس ہیں، [2] ان میں سے ایک مطبعۃ التقدم (محمود علی صبیح) ۱۲۰ صفحات، اور دوسری مطبعۃ السعادۃ میں (صفحات ۱۳۶) کی چھپی ہوئی ہے۔

پہلے طبقے میں آٹھ اقوام مثلاً ہندی، ایرانی، کلدانی، یونانی، رومی، مصری، اسرائیلی اور عرب کو شامل کیا ہے[1]، دوسرے طبقے میں چینی، ترکی، حبشی، سوڈانی، صقالبہ، بربرہ اور دوسری قومیں شامل ہیں، اس طبقہ کے تحصیل علوم سے محرومی[2] کے اسباب بھی انھوں نے بیان کئے ہیں۔

پہلے طبقہ کے آٹھ اقوام میں سے ہر ایک کے علوم پر ایک باب لکھا ہے، اس میں ان کے ملل وادیان، منطق و فلسفہ، علم الہیئۃ اور علم النجوم اور تاریخ طبیعی سے بحث کی گئی ہے، ان آٹھ اقوام کی مختصر سیاسی تاریخ بھی لکھی ہے۔ قاضی صاعد کو اس علم سے خاص دلچسپی تھی، جس کو اصطلاح عام میں "تاریخ" کہتے ہیں، اس میں اُن قوموں کے ادبا، شعرا اور فقہا کے بارے میں بہت ہی کم لکھا گیا ہے، اور انھیں عام طور پر نظرانداز کر دیا گیا ہے، قاضی صاعد کے مآخذ کی وجہ سے یہ آٹھ ابواب یکساں طور پر پُر از معلومات اور اہم نہیں ہیں، اس کے پانچ ابواب جو ہندی، یونانی، عرب، اندلسی اور اسرائیلی علوم سے متعلق ہیں، نہایت اہم ہیں، اس کتاب کا سب سے پہلا باب ہندوستان کے علوم قدیمہ پر ہے اور یہ سب سے طویل اور اہم باب ہے[3][4] جس میں لکھا ہے کہ اس سبب سے کہ ہندوستانیوں نے علوم کی ترقی میں حصہ لیا ہے، اللہ کی مہربانی ان کے شامل حال ہے، راقم الحروف نے اس باب کا عربی متن اور اس کے متعلق ایک تفصیلی مطالعہ شائع کر دیا ہے[5]، اس کتاب میں علوم سے مراد چند خاص علوم ہیں جو مسلمانوں میں

---

[1] طبقات، ملاحظہ کیجئے، الباب الاول، "الامم القدیمۃ" والباب الثانی: اختلاف الامم وطبقاتہا بالاشتغال، ص ۵ - ۸ والباب الرابع: "الامم التی عنیت بالعلوم" ص ۱۰ - ۱۱ [2] الباب الثالث "الامم التی لم تعن بالعلوم" طبقات ص ۸ - ۹ [3] طبقات ص ۱۱ - ۱۵، باب کا عنوان ہے العلم فی الہند، [4] دیکھئے راقم الحروف کا مقالہ جس کا ذکر اوپر نوٹ نمبر ۱ میں کیا گیا ہے، اسی طرح راقم الحروف نے علوم فرس اور علوم کلدہ ان کا مطالعہ بھی شائع کر دیا ہے

علومِ اجنبیہ سمجھے جاتے ہیں، یعنی وہ علوم نہیں جن کا تعلق مذہب اسلام سے ہے، یہاں علوم کا مطلب سب سے پہلے تو فلسفہ اس کے بعد ریاضیات و فلکیات جن میں خاص طور پر علم ہیئت اور علم نجوم شامل ہیں، اس کے بعد طب کیمیا وغیرہ دوسرے علوم ہیں۔

اس کتاب کا ماخذ | قاضی صاعد نے اکثر جگہ اپنے ماخذ کا بھی ذکر کیا ہے، جو یہ ہیں[1]، کتاب الاکلیل وصفۃ جزیرۃ العرب للہمدانی، کتاب المعارف لابن قتیبہ الدینوری، کتاب التنبیہ والاشراف للمسعودی، کتاب الالوف وکتاب المذاکرات لابی معشر البلخی، کتاب الفہرست لابن الندیم، صلۃ التاریخ الطبری للفرغانی، زتیج ابن الآدمی معروف بہ نظام العقد، ابو حنیفہ الدینوری کی کتاب الانوار، بطلیموس کی المجسطی کا عربی ترجمہ، ابو جعفر الطبری کی تاریخ الرسل والملوک اور الوصفی کی اخبار مصر، اگر طبقات کا مقابلہ المسعودی کی کتاب التنبیہ والاشراف اور ابن الندیم کی کتاب الفہرست[2] سے کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ علاوہ اور ماخذ کے یہ دو کتابیں اُن کے نہایت اہم ماخذ رہے ہیں۔

طبقات کا پہلا ایڈیشن لوئیس شیخو نے سنہ ۱۹۱۲ء میں شائع کیا تھا، قاضی صاعد کے کئی ماخذ اس وقت تک طبع نہیں ہوئے تھے، اب گذشتہ ۸ ۷ سال میں کتاب الاکلیل[3] کے بہت سے حصے ابو معشر البلخی کی کتاب الالوف[4]، فردوس الحکمۃ لعلی بن ربن الطبری، تعلیل زیج الخوارزمی[5]

---

[1] اس کتاب کے اردو ترجمہ کرنے والے قاضی احمد میاں اختر نے انکی فہرست اپنے مقدمہ میں شائع کی ہے [2] ان دو کتابوں میں سے المسعودی کی کتاب التنبیہ سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے [3] دیکھئے آسکا لوفگرین (اپسالا، سویڈن) کی کتابیں الہمدانی پر، [4] ان کے تلمیذ شاذان بن بحر کی کتاب، المذاکرات جلد ہی شائع ہونے والی ہے، [5] اس کتاب کو GOLDSTEIN نے نیو ہیوین، امریکہ سے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا تھا۔

ریج البتانی، السندہند الکبیر للفزاری وغیرہ شائع ہو چکی ہیں، قاضی صاحب نے طبقات میں جو حوالے اپنے ماخذ کے دیئے ہیں، اُن کا تقابلی مطالعہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب صحیح ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان سب کتابوں سے ان کو اندلس ہی میں ستفادہ کرنے کا موقع ملا تھا[1]،

یہ بات یقینی طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ قاضی صاعد نے ابن جلجل کی طبقات الاطباء والحکماء سے استفادہ کیا تھا یا نہیں[2]، یہ ضرور ہے کہ دونوں مصنفوں کا تعلق اندلس سے تھا اور ابن جلجل کی کتاب ۳۷۷ھ ہجری مطابق ۹۸۷ عیسوی میں لکھی گئی تھی، جب کہ قاضی صاعد کی طبقات ۴۶۰/۱۰۸۶ کی تصنیف ہے، لیکن یہ ممکن ہے کہ دونوں مصنفوں کے ماخذ ایک ہی رہے ہوں، ایک طبیب کی حیثیت سے قاضی صاعد اُن سے واقف ضرور تھے،

اس کتاب کی خوبیاں طبقات سے پہلے چند ایسی کتابیں عربی میں لکھی گئی ہیں، جن میں فلاسفہ، حکماء اور علماء کے مختصر حالاتِ زندگی، ان کی کتابوں کے نام اور ان کے افکار و خیالات بیان کئے گئے ہیں، مثلاً کتاب التنبیہ للمسعودی، کتاب الفہرست لابن الندیم، طبقات الاطباء والحکماء لابن جلجل[3] اور صیوان الحکمۃ لابی سلیمان المنطقی السجستانی[4] لیکن طبقات اپنی خاص خصوصیت کی وجہ سے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، ان سب سے جدا ہے، ابن جلجل کی کتاب بھی مختصر اور اہم ہے، لیکن اگر اس کا مقابلہ طبقات سے کیا جائے تو یہ بات واضح

---

[1] انھوں نے کل ۱۷۵ کتابوں کا ذکر طبقات میں کیا ہے، [2] ابن جلجل کی طبقات کے مصحح فؤاد سید کا قول ہے کہ قاضی صاعد نے اس کتاب سے استفادہ کیا تھا، دیکھئے مقدمہ، ص مہ، [3] تحقیق فؤاد سید، مطبعۃ المعہد العلمی الفرنسی للآثار الشرقیہ بالقاہرہ، ۱۹۵۵ء، ۱۳۸ صفحات، [4] منتخب صیوان الحکمۃ کا جو ایڈیشن، ڈی. ام. ڈنلپ نے تیار کیا ہے، بہت جلد شائع ہو جائے گا، اس کا ایک ایڈیشن عبدالرحمٰن بدوی نے [illegible]

ہو جائے گی، کہ طبقات اس سے زیادہ اہم ہے، اس سبب سے کہ طبقات کے بعض ماخذ اب ناپید ہیں، اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے، مثلاً الہمدانی کی کتاب الاکلیل کے مکمل اجزا اب تک دستیاب نہیں ہوئے، نہ سلۂ تاریخ طبری للفرغانی کا اب تک کہیں پتہ چلا ہے، اسی طرح الوصفی کی اخبار مصر کا کوئی مخطوطہ ابھی تک نہیں ملا۔ اس میں اقوام عالم کی تقسیم جو دو طبقے میں کی گئی ہے، بالکل نئی اور انوکھی بات ہے کہ جو متذکرہ بالا کتابوں میں سے کسی میں بھی نہیں پائی جاتی، قاضی صاعد نے لکھا ہے کہ علم ہی کی وجہ سے انسان اور جانور میں فرق ہوتا ہے ورنہ بعض خصوصیات میں جانور انسان سے کچھ آگے ہے[2]

اس میں بہت سے مسلمان اور غیر مسلم علما اور فلاسفہ کی کتابوں کے نام اور ان کے افکار و خیالات کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں، اس کے علاوہ اس کتاب کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں اُن علوم کی مختصر تاریخ بھی موجود ہے، جن کو ہم آج بنیادی سائنس (FUNDAMENTAL SCIENCE) کہتے ہیں، ان ہی خوبیوں کی وجہ سے بعد کے بہت سے مصنفین نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے، مثلاً ابن القفطی نے تاریخ الحکماء میں اور ابن ابی اصیبعہ نے "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" میں طبقات کی بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں، ابن القفطی نے تو جا بجا حوالے بھی دیئے ہیں، لیکن ابن ابی اصیبعہ طبقات کی

---

[1] ملاحظہ کیجئے آر سکار لونگرن کا مقالہ، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام نیا جدید ایڈیشن، ج ۳ سنہ ۱۹۶۱ء ص ... [2] مثلاً جسمانی قوت میں شیر انسان سے زیادہ طاقتور ہے، دیکھئے طبقات ص ۱۰۔ [3] ایک جدید عالم جیسا کہ شیرز پیرس کی رائے ہے کہ اس کتاب کا چوتھائی حصہ قاضی صاعد کے طبقات الامم سے ماخوذ ہے۔ ملاحظہ کیجئے ان کا مختصر مقالہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مختصر پہلا ایڈیشن لائیڈن ص ۸۲۱

البتانی، السند ہند الکبیر للفزاری وغیرہ شائع ہو چکی ہیں، قاضی صاحب نے طبقات میں
...والے اپنے ماخذ کے دیئے ہیں، اُن کا تقابلی مطالعہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب
ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان سب کتابوں سے ان کو اندلس ہی میں
...ادہ کرنے کا موقع ملا تھا[۱]۔

یہ بات یقینی طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ قاضی صاعد نے ابن جلجل کی طبقات الاطباء والحکماء
...استفادہ کیا تھا یا نہیں[۲]۔ یہ ضرور ہے کہ دونوں مصنفوں کا تعلق اندلس سے تھا اور
...جلجل کی کتاب ۳۷۷ھ ہجری مطابق ۹۸۷ء عیسوی میں لکھی گئی تھی، جب کہ قاضی
...عد کی طبقات ۴۶۰ھ/۱۰۸۶ کی تصنیف ہے، لیکن یہ ممکن ہے کہ دونوں مصنفوں کے
...ند ایک ہی رہے ہوں، ایک طبیب کی حیثیت سے قاضی صاعد اُن سے واقف ضرور تھے۔

...کتاب کی خوبیاں | طبقات سے پہلے چند ایسی کتابیں عربی میں لکھی گئی ہیں، جن میں فلاسفہ
...اور علماء کے مختصر حالاتِ زندگی، ان کی کتابوں کے نام اور ان کے افکار و خیالات
...ن کئے گئے ہیں، مثلاً کتاب التنبیہ للمسعودی، کتاب الفہرست لابن الندیم، طبقات الاطباء
والحکماء لابن جلجل[۳] اور صیوان الحکمۃ لابی سلیمان المنطقی السجستانی[۴]، لیکن طبقات اپنی خاص
...صوصیت کی وجہ سے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، ان سب سے جدا ہے، ابن جلجل
...کتاب بھی مختصر اور اہم ہے، لیکن اگر اس کا مقابلہ طبقات سے کیا جائے تو یہ بات واضح

...انھوں نے کل ۶۵ کتابوں کا ذکر طبقات میں کیا ہے، ۲ے ابن جلجل کی طبقات کے مصحح فؤاد سید
...ول ہے کہ قاضی صاعد نے اس کتاب سے استفادہ کیا تھا، دیکھئے مقدمہ، ص مہ، ۳ے تحقیق فؤاد
...مطبعۃ المعہد العلمی الفرنسی للآثار الشرقیہ بالقاہرہ، ۱۹۵۵ء، ۱۳۸ صفحات، ۴ے منتخب صیوان الحکمۃ

ہو جائے گی، کہ طبقات اس سے زیادہ اہم ہے، اس سبب سے کہ طبقات کے بعض ماخذات ناپید ہیں، اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے، مثلاً الہمدانی کی کتاب الاکلیل کے مکمل اجزا اب تک دستیاب نہیں ہوئے[1]، نہ صلۂ تاریخ طبری للفرغانی کا اب تک کہیں پتہ چلا ہے، اسی طرح الوصفی کی اخبار مصر کا کوئی مخطوطہ ابھی تک نہیں ملا، اس میں اقوام عالم کی تقسیم جو دو طبقے میں کی گئی ہے، بالکل نئی اور انوکھی بات ہے کہ جو متذکرہ بالا کتابوں میں سے کسی میں بھی نہیں پائی جاتی، قاضی صاعد نے لکھا ہے کہ علم ہی کی وجہ سے انسان اور جانور میں فرق ہوتا ہے ورنہ بعض خصوصیات میں جانور انسان سے کچھ آگے ہے[2]۔

اس میں بہت سے مسلمان اور غیر مسلم علما اور فلاسفہ کی کتابوں کے نام اور ان کے افکار و خیالات کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں، اس کے علاوہ اس کتاب کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں ان علوم کی مختصر تاریخ بھی موجود ہے، جن کو ہم آج بنیادی سائنس (FUNDAMENTAL SCIENCE) کہتے ہیں، ان ہی خوبیوں کی وجہ سے بعد کے بہت سے مصنفین نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے، مثلاً ابن القفطی نے تاریخ الحکما[3] میں اور ابن ابی اصیبعہ نے "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" میں طبقات کی بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں، ابن القفطی نے تو جابجا حوالے بھی دیئے ہیں، لیکن ابن ابی اصیبعہ طبقات کی

۱؎ ملاحظہ کیجئے: آسکار لوفگرن کا مقالہ، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام نیا جدید ایڈیشن، ج ۳، ۱۹۷۱ء ص ۱۲۱۔ ۲؎ مثلاً جسمانی قوت میں شیر انسان سے زیادہ طاقتور ہے، دیکھئے طبقات ص ۱۰۔ ۳؎ ایک جدید عالم ریجس بلاشیر (Régis Blachère) کی رائے ہے کہ اس کتاب کا چوتھائی حصہ قاضی صاعد کے طبقات الامم سے ماخوذ ہے، ملاحظہ کیجئے ان کا مختصر مقالہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، پہلا ایڈیشن، ج ۴، ص ۱۲۱۸

عبارت تو نقل کرتا ہے لیکن اس کا حوالہ نہیں دیتا۔ ان کے علاوہ ابن العبری نے کتاب مختصر الدول، ابن خلکان نے وفیات الاعیان، المراکشی نے المعجب فی اخبار مغرب، ذہبی نے تاریخ الاسلام، المقری نے نفح الطیب اور حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اس کتاب کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے اندلس کے مصنفین میں سے ابن بشکوال (متوفی ۵۷۸/۱۱۸۳) الضبی (المتوفی ۵۹۹/۱۲۰۳) اور ابن الآبار (المتوفی ۶۵۸/۱۲۶۰) نے اس کتاب سے معلومات اخذ کئے تھے، الجزائر کے امیر عبدالقادر نے ذکری العاقل میں اور مشہور عرب ادیب کرد علی نے غابر الاندلس و حاضرھا میں بھی اس کتاب سے استفادہ کیا ہے[1]، اوپر لکھا جا چکا ہے کہ اس کتاب کے پانچ ابواب نہایت اہم ہیں، علوم یونان پر جو باب ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یونان کے علوم و فلسفہ سے مسلمان کس حد تک آشنا تھے اور وہ ان کے بارے میں کتنے زیادہ معلومات رکھتے تھے، اس کے دو ابواب جن کا تعلق علوم عرب اور علوم اندلس سے ہے، اسلامی تہذیب و تمدن کی تاریخ کے لئے نہایت اہم ہیں، خصوصاً علوم اندلس کے بارے میں ایسے نادر اور اہم معلومات جمع کئے گئے ہیں، جو دوسرے مآخذ میں نہیں پائے جاتے[2]، اس کی وجہ یہ ہے کہ قاضی صاعد نے یہ کتاب اندلس میں لکھی تھی، اور ان کا براہ راست تعلق یہاں کے بہت سے علماء سے تھا، موجودہ زمانے کا کوئی عالم اگر اندلس میں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی تاریخ لکھنا چاہے تو وہ اس باب کو نظر انداز نہیں کر سکتا[3]،

اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کا انداز فکر منصفانہ ہے، قاضی صاعد نے علوم اقوام

---

[1] دیکھئے طبقات کے فرانسیسی ترجمے کا مقدمہ، ص ۲۲ - ۲۵، [2] طبقات العلوم فی الاندلس ص ۶۲ - ۸۷، یہ اس کتاب کا ایک طویل باب ہے، [3] ملاحظہ کیجئے انور شحنہ کی کتاب تاریخ الاندلس و ثقافتہ (انگریزی)

کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ مذہبی عصبیت سے بلند ہو کر لکھا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ "طبقات" اُس زمانہ میں لکھی گئی تھی، جب کہ عیسائی حملہ آور اندلس کی اسلامی ریاستوں کو فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کرنے کے لئے بے شمار مسلمانوں کو قتل کر رہے تھے، ٹھیک اسی طرح جس طرح ان واقعات کے دو سو سال بعد مغل حملہ آوروں نے ایران، عراق، شام وغیرہ میں لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا تھا، ان حالات میں بھی اس کتاب میں مذہبی تعصب کا اثر بالکل نہیں پایا جاتا۔

اُمم قدیمہ کی مدت سلطنت کے بارے میں مؤرخین میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں، ان کا ذکر "طبقات" میں انھوں نے کیا ہے، اور ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے، مثلاً ملوک فارس کی مدت سلطنت جو قاضی صاعد کے خیال میں تین ہزار ایک سو چونسٹھ سال تھی،[1] تاریخ پر انھوں نے جو کتاب لکھی تھی، یعنی کتاب "جوامع اخبار الامم" وہ ہمیں دستیاب نہیں ہوئی ہے ورنہ اقوام قدیمہ کے بارے میں قاضی صاعد کے خیالات ہمیں معلوم ہو جاتے، انھوں نے اس کتاب میں کم از کم ایک جگہ تاریخ طبیعی یعنی (NATUR AL HISTORY) کے بعض نظریات سے بھی بحث کی ہے، جس میں وہ موجودہ زمانہ کے ایک محقق معلوم ہوتے ہیں، ان کا انداز وہی ہے جو البیرونی کا ہے، لیکن البیرونی کی کوئی کتاب شاید قاضی صاعد تک نہیں پہنچ سکی تھی، خاص طور سے ان کی آثار الباقیہ،[2] جس میں انھوں نے امم قدیمہ کی

---

[1] اس بحث کے لئے دیکھئے طبقات "العلم فی الفرس" ص ۱۵ - ۱۶، جس کا مطالعہ راقم الحروف نے ایران سو سائٹی کے سنور جوبلی VOLUME میں شائع کیا ہے، [2] ملاحظہ کیجئے، الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ للبیرونی، تصحیح اڈورڈ زخاؤ، برلین ۱۸۷۸ء XIII × LX × ، صفحات ۳۶۲، ۔

تاریخ لکھی ہے، طبقات کے اردو مترجم نے ایک مقدمہ بھی شائع کیا تھا، اس میں وہ اس کتاب کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں،

"اس کتاب نے اہل اندلس کے ہاں بڑی قبولیت اور شہرت حاصل کر لی تھی، وہ اس پر بجا طور پر فخر کرتے تھے، اور اہل مشرق کو یہ کتاب روایۃً سناتے تھے، چنانچہ جب اندلس کے ایک عالم ابو محمد عبد اللہ بن محمد بن رزق الیحصبی حج کو جاتے ہوئے اسکندریہ سے گزرے تو انھوں نے ابو طاہر سلفی (متوفی ۵۷۶ھ / ۱۱۸۰ء) کو یہ کتاب سنائی، یہ کتاب یحصبی نے ابن براّل سے اور ابن براّل نے خود صاعد سے پڑھی تھی[۱]۔"

جہاں اس کتاب میں بہت سی خوبیاں ہیں، وہاں چند خامیاں بھی ہیں، اس میں غیر مسلم علما اور فلاسفہ کی جائے سکونت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے، لیکن ان کے زمانہ کے تعین میں قاضی صاعد سے بعض غلطیاں سرزد ہو گئی ہیں، یہ غلطیاں عام طور پر ان ابواب میں نہیں پائی جاتیں، جن کا تعلق عرب اور اسلام سے ہے، ایسی غلطیاں یونانی علوم و فلسفہ کے باب میں زیادہ نظر آتی ہیں، قاضی صاعد نے لکھا ہے کہ ابندقلیس اور فیثاغورس حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہم عصر تھے، موجودہ تحقیق کے لحاظ سے فیثاغورس ۵۷۰ قبل مسیح اور ابندقلیس ۴۹۲ قبل مسیح میں پیدا ہوئے تھے، لیکن داؤد اور سلیمان علیہما السلام بنو اسرائیل کے پیغمبر ہیں، جو صدیوں پہلے گزرے ہیں[۲]، اس غلطی کو بعد کے مصنفین نے بھی مثلاً القفطی نے تاریخ الحکماء میں نقل کر دیا ہے، اسی طرح قاضی صاعد نے لکھا ہے، کہ

---

[۱] دیکھیے اردو ترجمہ طبقات الامم، طبع معارف پریس اعظم گڈھ، مترجم قاضی احمد میاں اختر نے عبارت ابن الآبار کی "التکملہ لکتاب الصلۃ" طبع میڈرڈ، جلد ۲ ص ۴۶۳، اور المقری کی نفح الطیب طبع مصر، ج ۲، ص ۲۲ سے نقل کی ہے۔ [۲] دیکھیے راقم کا مقالہ زیر طبع ہے۔

ارسطونیقوماخوس ابھراشی کے بیٹے ہیں، لیکن صحیح یہ ہے کہ ارسطو کے والد ایک دوسرے نیقوماخوس ہیں، جو جیراش کے باشندے نہیں تھے۔ اور وہ ایک بالکل مختلف شخص ہیں، اگرچہ دونوں کا نام ایک ہی ہے، میرا خیال یہ ہے کہ یہ غلطی سب سے پہلے یعقوبی[1] نے کی ہے، جن کی کتاب سے المسعودی نے استفادہ کیا تھا اور انھوں نے کتاب التنبیہ میں اس غلطی کو نقل کیا ہے[2]، جس کو قاضی صاعد نے بھی نقل کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور غلطی کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، اس میں لکھا ہے کہ جالینوس کا زمانہ بقراط سے ۶۰۰ اور اسکندر اعظم سے ۵۰۰ سال کے بعد کا تھا، یہ غلطی بھی دراصل المسعودی کی ہے، جس کو کتاب التنبیہ سے نقل کیا گیا ہے، موجودہ تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ بقراط کی وفات ۳۸۰ء قبل مسیح میں ہوئی اور جالینوس[3] نے ۱۹۹ء میں انتقال کیا۔

اندلس کے علماء کو چھوڑ کر اس کتاب میں اقوام عالم کے علماء و فلاسفہ کے جو حالات اور ان کی کتابوں کے بارے میں جو معلومات فراہم کئے گئے ہیں۔ وہ عام طور سے دوسری کتابوں میں پائے جاتے ہیں، علوم عالم کی تدریجی ترقی کی تاریخ جو اس کتاب میں ہے، وہ بہت مختصر اور ہلکی ہے، اور افکار و خیالات پر بہت کم تبصرہ کیا گیا ہے، اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ قاضی صاعد نے عام پڑھنے والوں کے لئے طبقات لکھی ہوگی، اور ان کا ارادہ کوئی اہم کتاب علماء کے مطالعہ کے لئے لکھنے کا نہیں تھا، قاضی صاعد نے المسعودی، ابن الندیم اور دوسرے عرب علماء سے استفادہ تو کیا ہے لیکن ان کے بیانات کو نقل کرنے سے پہلے ان پر

---

[1] دیکھئے تاریخ الیعقوبی، دار صادر بیروت ۱۹۶۰ء ج ۱ ص ۱۲۴، جس میں ان کو نیقوماخوس الحکیم الفیثاغورثی مصنف کتاب الارثماطیقی لکھا گیا ہے، جو غلط ہے۔ [2] ملاحظہ کیجئے خیاط بیروت ایڈیشن ۱۹۵۶ء ص ۱۱۶، [3] المسعودی، کتاب التنبیہ، ص ۱۲۱۔

تنقیدی نظر نہیں ڈالی، انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اسے عام طور سے بجنسہ نقل کر دیا ہے، بجز ایک دو مقام کے جہاں ان بیانات پر انھوں نے شک کا اظہار کیا ہے۔

اس کتاب میں ایک بیان بہت ہی افسوسناک ہے اور اگر قاضی صاحب ایسا نہ لکھتے تو اچھا تھا، انھوں نے العلوم عند العرب کے باب میں لکھ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علوم فلسفہ سے اہل عرب کو مستفید نہیں کیا، اور نہ ان کی طبیعتیں اس فن کی استعداد و مناسبت رکھتی تھیں[1] وہ خود عربی النسل تھے، اس لئے اور زیادہ تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے اتنی فاحش غلطی کس طرح کی ہے، مسلمان مشاہیر اور اکابر علماء و فلاسفہ کے حالات زندگی کا غور سے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ وہ نسلاً خالص عرب تھے، جہاں جہاں بھی غیر ملکوں میں عربوں نے سکونت اختیار کی وہ وہاں کے لوگوں میں گھل مل گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی عربی انفرادیت ختم ہوگئی، ایران میں ایرانیوں کے ساتھ اور اندلس میں ہسپانوی اور پرتگال کے لوگوں کے ساتھ عرب قبیلے شیر و شکر ہو گئے اور انھوں نے اپنی انفرادیت کھو دی، ابن خلدون کا یہ بیان کہ مسلمان علماء و فلاسفہ کا زیادہ تر حصہ غیر عرب تھا، قاضی صاعد کے بیان سے بھی زیادہ افسوسناک ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ ابن خلدون اپنے اس نظریئے میں قاضی صاعد کے اس بیان سے متاثر ہوئے ہیں، قاضی صاعد نے لکھا ہے کہ صرف دو فلسفی خالص عربی نسل کے تھے، پہلا ابو اسحٰق الکندی اور دوسرا الہمدانی[2] لیکن جس نقطۂ نگاہ سے ہم الکندی کو فلسفی کہتے ہیں، اس سے ہم الہمدانی کو کبھی بھی فلسفی نہیں کہہ سکتے، ان کا یہ بیان بھی کچھ عجیب وغریب معلوم ہوتا ہے، جس سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] واما علم الفلسفة فلم يمنحهم الله عز وجل شيئاً منه ولا هيئاً طباعهم للعناية به۔ یعنی فلسفہ، ملاحظہ کیجئے، طبقات، ص ۴۵، [2] نفس المصدر، ص ۴۵۔

اس قسم کی اور غلطیاں بھی اس کتاب میں موجود ہیں، لیکن اس پر موجودہ تحقیق کے نتائج کی روشنی میں تنقید کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، اس پر تنقیدی نظر صرف اُن معلومات کی بنا پر ڈالی جاسکتی ہے، جو گیارہویں صدی عیسوی کے وسط میں علوم اقوام کے بارے میں دنیا کے مختلف مصنفین کو حاصل تھے، خصوصًا ایک مسلمان مصنف کو جو شہر طلیطلہ کا باشندہ تھا، اور اس میں شک نہیں کہ مذکورۂ بالا خامیوں سے اس کتاب کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، یہ کتاب امم قدیمہ کے علوم کی سب سے پہلی مدون و مرتب تاریخ ہے، جیسا کہ حاجی خلیفہ نے لکھا ہے، یصغیر الحجم ہے لیکن کثیر النفع ہے۔

موجودہ زمانہ کے علماء میں سے جارج سارٹن[1] نے اپنی مشہور تاریخ سائنس میں اس کتاب کو سراہتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہونا چاہئے، رجیس بلاشیر نے اپنے فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ اس کتاب پر ایک طویل مقدمہ شائع کیا ہے[2]، جوشوا فنکل نے بنو اسرائیل سے متعلق باب کا مطالعہ ایک طویل مضمون میں پیش کیا ہے[3]، راقم الحروف نے العلم فی الہند، العلم فی الفرس، العلم عند الکلدان پر طویل مطالعے حواشی و تعلیقات کے ساتھ شائع کئے ہیں، ان کے علاوہ سائنس کے مؤرخ مارٹن پلسنر نے ایک طویل مقالہ اس کتاب پر لکھا ہے، جس میں قاضی صاعد کی تعریف کی ہے[4]،

---

[1] دیکھئے ان کی کتاب Introduction to the History of science جلد اول۔ بالٹیمور ۱۹۵۳ء ص ۷۷۶ ۔ ،،،، [2] یہ مقدمہ ۱۴ صفحات پر مشتمل ہے [3] An Eleve-nth century source for the History of jewish scientists in mohammadan lands ۔ The jewish quarterly review p. 45, 54, میں شائع ہوا ہے

طبقات کے ترجمے | اس کا اردو ترجمہ قاضی احمد میاں اختر نے ۱۳۴۶/۱۹۲۸ء میں دارالمصنفین، اعظم گڈھ سے شائع کیا تھا[1] اس کا فارسی ترجمہ جلال الدین طہرانی نے طہران سے ۱۳۱۰ھ شمسی میں شائع کیا[2]، پیرس یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رجیس بلاشیر کا فرانسیسی ترجمہ ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا، معلوم نہیں اس کا ترجمہ ہسپانوی زبان میں ہوا ہے یا نہیں،

اس کا بیروت ایڈیشن اطمینان بخش نہیں ہے، اور اس کتاب کے تین نئے اور اہم مخطوطات رام پور، استنبول اور ڈبلن میں پائے گئے ہیں، ان مخطوطات کا علم لوئیس شیخو کو نہیں تھا، ان کی مدد سے طبقات کا ایک اچھا اور صحیح ایڈیشن تیار ہو سکتا ہے، ان کی مدد سے میں طبقات کا ایک نیا ایڈیشن تیار کر رہا ہوں، جو انگریزی ترجمہ اور طویل مقدمہ، حواشی اور تعلیقات کے ساتھ جلد ہی شائع ہوگا، انشاء اللہ۔

---

[1] دیکھئے طبقات الامم مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۳۴۶ھ (۱۹۲۸ء) [2] ملاحظہ کیجئے گاہ نامہ ضمیمہ، مطبع مجلس، صفحات ۱۵۰/۲۳۹،

رومی و اقبال کا تصورِ انسان

از ۔ ڈاکٹر سید نعیم الدین امراوتی،

دیو جانس کلبی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دن دھاڑے ہاتھ میں چراغ لئے انسان کی تلاش کرتے ہوئے ایتھنز میں گھوم رہا تھا، رومی کو بھی انسان کی تلاش مقصود ہے، لیکن انسانوں کی بھیڑ میں حقیقی انسان کب اور کہاں ملتا ہے؛ ذرا رومی کی اس تلاش کے تیور ملاحظہ کیجئے:-

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می‌نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می‌نشود آنم آرزوست

یہ انسان کس قسم کا ہے جس کی تلاش میں مشرق و مغرب کے حکما رہ نورد ہوئے؟ اسکا خالق سے، نیز مخلوق سے اور کائنات سے کیا رشتہ ہے؟

رومی و اقبال نے اپنے اپنے طور پر اس کا جواب دیا ہے۔

رومی کے نزدیک اہلِ دنیا بیشتر اس دنیا کی الجھنوں میں گرفتار، حیوانی سطح پر جیتے ہیں، دنیا کے آخور کے لئے وہ کیا کیا جتن نہیں کرتے۔ البتہ ایک طبقہ پرہیزگاروں کا ایسا ہے جو آخرت کو پیشِ نظر رکھتا ہے، اور اپنی نجات کا خواہاں ہے۔ مگر ایسے برگزیدہ لوگ بہت کم ہیں

جو آغاز کو ملحوظ رکھتے ہوئے انجام کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، یعنی جنھیں اپنے الٰہی منبع و مصدر کا ہمہ وقت احساس ہے، یہ مستِ مئے الٰہی افراد اپنی روحانی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں مگن ایک اونچی عالم میں پہنچ گئے ہیں، انھیں نہ اس دنیا کی دھن ہے نہ اُس دنیا کی فکر، نہ وہ دیوانہ دنیا ہیں نہ فرزانہ عقبیٰ، کیا یہ ہر شخص کے بس کی بات ہے ؟ رومی اس کا جواب اثبات میں دیتے ہیں، ان کی رائے میں ہر انسان میں عیسےٰ پنہاں ہے، مگر جب تک دردِ زہ نہ ہو اس عیسےٰ کی ولادت ممکن نہیں جس میں عیسےٰ کا ظہور ہو گیا وہی زادۂ ثانی ہے، اور پورا انسان۔

بلاشک انسان کی تخلیق بہترین طریقے سے ہوئی ہے۔ (لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ سورۃ تین) اور وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔ اور اس کے اندر خدا نے اپنی روح پھونکی ہے۔ یعنی انسانیت کا چشمہ الوہیت کے منبع سے پھوٹا ہے، مگر انسان کی عظمت بھی قرآن حکیم اس طرح واضح کر دیتا ہے کہ وہی شخص کامران ہے جو صاحبِ ایمان ہے اور جس کے اعمال صالح ہیں۔ عزت کا معیار تقوےٰ ہے، دولت نہیں (اِنّ اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ حجرات) انسان اپنی جد و جہد سے تزکیۂ نفس کے ذریعہ انسانیت کے اعلیٰ مرتبے پر پہنچ سکتا ہے۔ اور خدا صفت بندہ بن سکتا ہے۔ پیغمبر صلعم کی ذات اسی قبیل کی تھی، قرآن کریم نے انھیں خلقِ عظیم کا حامل بتایا ہے، (انک لعلیٰ خلقٍ عظیم۔ ن) مسلمان ان کے اسوۂ حسنہ کو اعلےٰ اخلاق کا اور ان کی شخصیت کو کاملیت کا نمونہ سمجھتے ہیں خود رسول اللہؐ کا قول ہے۔ کہ وہ مکارمِ اخلاق کے فروغ کے لئے مبعوث ہوئے (بعثت لاتمم مکارم الاخلاق) اقبال رسولؐ کی جامع جلال و جمال ذات کے عاشق ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ رسولؐ ہی تھے جنھوں نے دین کی کنجی سے دنیا کا قفل کھولا۔ اور دنیا میں رہ کر دنیا سے بے نیاز زندگی گزارنے کا سبق دیا، یہ بالکل فطری ہے کہ انسان دولت و عزت

چاہتے اور شادان و کامران زندگی گزارنے کے لئے بے چین رہے لیکن تمام دنیائے روحانی پیشوا اس پر مصر ہیں کہ سکون و مسرت دل کا معاملہ ہے۔ اور مادی و نفسانی خواہشات کو قابو میں رکھنا ضروری ہے۔ جو اس سے بالا ہو کر جان و روح کی سطح پر ہی صحیح معنوں میں آسودگی تب میسر ہوتی ہے۔

قدیم صوفیوں میں بایزید بسطامی جیسے صوفی ہیں جنھوں نے مادی خواہشات سے بے نیاز خدا پرست صوفیوں کو "الکامل التام" کہا ہے۔ ان کے نزدیک یہ بزرگ ایسے انسان ہیں جن سے معمولی بشری صفات منقطع ہو چکی ہیں اور جو خدا سے شدید عشق کرتے ہیں۔ ایسا شدید کہ انہیں عرائس اللہ (اللہ کی دلہنیں) کہہ سکتے ہیں۔ انسان کامل کے تصور کی مزید تشریح ابن العربی (۱۲۴۰ء) صدر الدین قونوی (۱۲۷۳ء) اور الجیلی (۱۴۱۰ء) نے کی۔ بقول ابن العربی انسان آنکھ کی پتلی ہے جس سے خدا اپنی مخلوقات کو دیکھتا ہے، اور انسان کامل خلیفۂ الٰہی ہے، جس پر دنیا کی حفاظت کا دارومدار ہے۔ ابن العربی کے مشہور شاگرد صدر الدین قونوی انسان کامل کو خدا کا عظیم ترین وجود یا مظہر قرار دیتے ہیں اور اسے لاہوت اور ناسوت کے درمیان ایک رابطہ مانتے ہیں۔ اولیاء اور پیغمبر اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سب کے سرتاج حضرت محمدؐ ہیں (ملاحظہ ہو ایک نیک، "فلسفہ صدر الدین قونوی میں انسان، تقدیر اور اخلاق"، ریویو آف دی انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، استنبول جلد ۳، شمارہ ۲-۱، ۱۹۶۴ء)۔

مولانا روم کی ساری تصانیف انسان کامل کی مدح و ثنا سے معمور ہیں۔ رومی اسے واصل حق، بالغ، دوربیں، عاقل، کہیں صاحب دل، اور ولی کہتے ہیں۔ یہ بزرگ مستی

لہ روح انسانی کو دلہن قرار دینے کا [illegible] خصوصیت سے [illegible] راقم الحروف نے نوائے ادب میں شائع [illegible] (۱۹۰۷)

رومی کے نزدیک پیر ہے، یعنی اس کا کام رشد و ہدایت ہے، پیر کے معنی بوڑھے کے بھی ہیں۔ مثنوی کی تیسری جلد میں ان دو معنوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مولانا رومی نے کہا ہے کہ ایک آدمی خواہ وہ بوڑھا ہو یا نہ ہو۔ واقعی پیر اسوقت کہلاتا ہے جب اس کی ہستی نیست و نابود ہو گئی ہو۔ ایک عیسیٰ بچپن میں بھی پیر تھے۔ لیکن اگر ایک بوڑھے میں بال برابر بھی حیوانی صفات باقی ہوں تو اسے پیر نہیں کہا جا سکتا۔ ہوا و ہوس اور دولت کی لالچ روح کی اسیری کی علامتیں ہیں، ماسوا اللہ سے بے نیازی ہی صحیح معنوں میں فقر و آزادی سے عبارت ہے۔ روحانی طریقت کے تمام سالکین کا قول ہے کہ اہلِ فقر کی شان ہی نرالی ہے کہ آسمانی سلطنت ان ہی کی ہے، پیر کے پاس نہ مال و متاع ہے نہ اس کی خواہش۔ یہ فقیرانہ رویہ ہی قربِ خداوندی کا حقیقی ذریعہ ہے۔ قصہ طوطی و سوداگر کے پردے میں رومی نے فقر و درویشی کی کیفیت بڑے دلکش انداز میں بیان کی ہے۔

قصّہ یوں ہے کہ ایک سوداگر ہندوستان کے لئے روانہ ہوتا ہے تو اس کا طوطا اس کے ذریعہ ہندوستانی طوطوں کے لئے ایک پیغام بھجواتا ہے۔ پیغام سن کر ایک طوطا گر پڑتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مر گیا ہے۔ یہ دیکھ کر اس کا مالک اُسے پنجرے سے نکال پھینکتا ہے۔ ہندوستان سے واپسی پر تاجر اپنے طوطے کو یہ واقعہ سناتا ہے۔ یہ سن کر تاجر کا طوطا بھی بے جان ہو کر گر پڑتا ہے، اور تاجر اُسے پنجرے سے نکال پھینکتا ہے۔ لیکن کیا دیکھتا ہے کہ طوطا اڑ جاتا ہے، ظاہر ہے کہ طوطے نے دم سادھ لیا تھا۔ اور خود پر موت طاری کر لی تھی۔ رومی اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ موت یعنی فقر و درویشی ہی میں حیات مضمر ہے۔ یادِ الٰہی میں مگن۔ مادی ضروریات سے بے نیاز انسان ہی صحیح معنوں میں زندہ رہتا ہے۔ رومی اکثر ایسے زندہ افراد سے فیضیاب ہو کر نئی روحانی زندگی پانے کی تلقین کرتے ہیں۔ روحانی سطح پر اس طرح زندگی بسر کرنے والا مثالی انسان اس دنیا میں رہتا ہے۔ لیکن اس دنیا کا نہیں ہوتا۔ محبت الٰہی کے غلبے میں اسے مادی

وجود کا بھی احساس بہت کم ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے ایسا احساس بالکل فطری ہے۔ چنانچہ اقبال کو بھی اعتراف ہے کہ "صوفی کا حال ایک لمحہ ہے کسی ایسی فرید و وحید یکتا ہستی سے گہرے اتحاد کا جو اس کی ذات سے ماورا مگر اس کے باوجود اس پر محیط ہو گئی اور جس میں صاحب واردات کی شخصیت گویا ایک لحظہ کے لیے کالعدم ہو جاتی ہے۔"[1] وہ اس دنیا میں ایک معمولی انسان کی زندگی گزارتا ہے، بعض اوقات تھوڑی دولت اور کچھ اقتدار بھی حاصل کر لیتا ہے لیکن جیسا کہ رومی فیہ مافیہ میں واضح کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک ذریعہ ہے بمقصد لوگوں سے بظاہر ہم آہنگ ہو کر انھیں دنیا ئے دنی کے دام سے نکال کر عالم آخرت کے دام میں لانا ہوتا ہے کہ کسی کو اپنے دام میں لانے کے لیے اس کا ہم رنگ ہونا ضروری ہے،[2] مگر درویش کامل کو دولت و شہرت سے واقعی کوئی سروکار نہیں، وہ سماج کا ایک فرد ہے لیکن سماج کی غیر صحت مند لغو پابندیوں سے بے نیاز ہے۔ اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ سماج میں رہ کر سماج کی برائیوں اور بیکار بندھنوں میں اس کے اصلی جوہر کھلتے ہیں۔ رومی پوچھتے ہیں کیا عفت کے کوئی معنی ہیں۔ اگر حیوانی خواہشات کا کوئی موقع نہ ہو؟ درویش وہ ہے جو ہر قسم کی برائی اور حیوانی خواہش کے مقابلے میں پورا اترے۔ اور حرص، خشم، اور نفسانیت پر غالب ہو۔ اور ہوا و ہوس سے دور، ہو کر محبت میں مگن رہے۔ خدا کا ایسا عاشق بالآخر خدا کا معشوق بن جاتا ہے۔ اور کون عاشق ہے جو اپنے معشوق کی آرزو پوری نہ کرے؟ اس کی ہر آرزو پوری ہو کر رہتی ہے۔ اس لئے کہ اس نے اپنی مرضی کو مرضی حق میں گم کر دیا ہے انسانی سطح پر بھی محبت انسان کو نفسیاتی اعتبار سے صحت مند بناتی ہے۔ اور ماسلو اور ٹو لمین جیسے ماہرین نفسیات نفسیاتی طور پر صحت مند انسان ہی کو آئیڈیل انسان مانتے ہیں۔

---

[1] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۲۰ [2] فیہ مافیہ مرتبہ فروزانفر ص ۲۵

صوفیوں کو بھی سماج کے عام افراد سے محبت ہوتی ہے، مگر وہ اصل میں عاشقِ الٰہی ہیں عشقِ الٰہی کی کیمیا نے ان کی شخصیت کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے. صوفی اب گل نہیں دل ہے. جسم نہیں سراپا جان بن چکا ہے، وہ خود کو ہمیشہ محبوبِ حقیقی کے حضور میں محسوس کرتا ہے. اور اس کے احکام کو خوشی خوشی بجا لاتا ہے. ایسے عاشق کے لئے معشوق ہی اصل میں موجود ہے. جس کے لئے وہ کسی ذہنی دلیل کا محتاج نہیں. اس کے علم کا سرچشمہ دل ہے. تمام آلایشوں سے پاک برف کی طرح سفید، ایسا دل جب علم الیقین اور حق الیقین سے گذر کر عین الیقین کی منزل پر آتا ہے تو اس میں روحانی حقایق منعکس ہوتے ہیں. اس لحاظ سے وہ بڑی عظمت کا حامل ہوتا ہے. آدمی وہی ہوتا ہے، جس کی وہ طلب کرتا ہے.

جویاے ہر چہ ہستی می دانک عین آنی

مگر خدا کا عاشق خدا کے بندوں سے بے نیاز نہیں ہوتا، یہ کیسے ممکن ہے کہ خالق سے پیار کرنے والا اس کی مخلوق سے پیار نہ کرے. امیر و غریب کافر و مشرک سب خدا کی مخلوق ہیں. اور وہ سب سے پیار کرتا ہے. رسول اللہ صلعم رحمت للعالمین تھے. ان کی پیروی کرنے والے بھی سب کے لئے باعثِ رحمت ثابت ہوتے ہیں. بیشتر لوگ جزوی طور پر مہربان ہوتے ہیں، رومی ایسے کل سے وابستگی پر زور دیتے ہیں کہ وہی ایک فرد کی جزئیت کو دور کرکے اسے کلیت عطا کر سکتا ہے.

شخصیت کے مشہور نفسیات داں آل پورٹ کے نزدیک بالغ شخص وہ ہے، جس کی دلچسپیاں خود مختار ہیں. اور جو بصیرت، حسن ظرافت اور ایک وحدت آفریں فلسفۂ حیات رکھتا ہے. اس کے متوازی اہم روحانی سطح پر اس فرد کو بالغ کہہ سکتے ہیں جس نے اپنے آپ کو یکسوئی سے روحانی و اخلاقی مقاصد کی تکمیل کے لیے وقف کر دیا ہے.

اور جو محبتِ خداوندی میں مستغرق ہو کر ہر چیز رضائے الٰہی کی خاطر کرتا ہے، یہی اس کے تمام اعمال کا تنہا محرک ہے۔ اس کے طفیل اس میں وہ بصیرت پیدا ہو گئی ہے۔ جو انگوروں میں شراب دیکھ لیتی ہے۔ یعنی ہر چیز کی تہہ تک اس کی نظر پہنچ جاتی ہے، شخصیت میں اصل چیز نظر ہی ہے، باقی گوشت و فربہی کی طرح بیکار ہے، صاحبِ نظر صبغۃ اللہ میں رنگا ہوا ہے۔ اسے نیک نامی اور بدنامی سے کوئی غرض نہیں۔ وہ رابعہ بصری کی طرح جنت و دوزخ کے خیال سے بے نیاز ہے جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے اس کی عبادت، اس کی حیات اور اس کی ممات — ہر چیز اللہ کے لیے ہے، رومی و اقبال اس محبِ حق بہر حق کے خلوص اور صدق و صفا کی مدح و ثنا میں اکثر رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ وہی صحیح معنوں میں رومی کے لفظوں میں خداخو اور اقبال کے لفظوں میں بندۂ مولا صفات ہے۔

اقبال کے نزدیک مولا صفات بننے کے لئے خودی کو عشق کی مدد سے فروغ دے کر اپنی شخصیت کو استوار کرنا ضروری ہے۔ اس کے لیے آئیڈیل انسان کا نمونہ پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں قوتِ عمل، فکر و بصیرت کے بہترین مجموعہ ذاتِ رسولؐ سے بڑھ کر کونسی ذات ہو سکتی تھی، چنانچہ اقبال نے آنحضرت صلعم کو انسانِ کامل کی حیثیت سے پیش کیا، اور کہا کہ اگر ہم خود کو امتِ محمدیؐ کا رکن سمجھتے ہیں۔ اور محبتِ رسولؐ کے دعوے دار ہیں تو محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم خود کو سیرتِ رسولؐ کے سانچے میں ڈھالنے کی سعی کریں۔ اس طرح فکر و عمل کی صلاحیتوں کو اعلےٰ ترین طریقے سے ابھار کر نیابتِ الٰہی کا مقام حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسرارِ خودی میں اقبال نے بایزید کو اسی قبیل کے عاشقِ رسول کی حیثیت سے پیش کیا، اور شیخ میاں میرؒ کی بھی محبتِ رسول کی بنا پر مدح کی اسی نظم میں بو علی قلندرؒ اور ہجویریؒ کی جرأت دار آزادہ روی کی بھی تعریف کی ہے۔

بے خوفی و جرأتِ اعلیٰ انسان کا امتیازی وصف ہے۔ امام حسینؑ اس کی عمدہ مثال ہیں،
وہ خود قربان ہو گئے لیکن انھوں نے اپنے اصولوں کو قربان نہیں ہونے دیا۔ اس قسم کے عاشقِ
حق کا شکارِ بلا ہونے کا سوال ہی نہیں، وہ خود بلا شکار واقع ہوا ہے، بقول رومی، ہمہ کس
را نہ کار کرد بلا / عاشقاں را بلا شکار بود۔ رومی و اقبال کے مثالی انسان بلا کے دلیر اور
قیامت خیز واقع ہوئے ہیں:۔

رومی: مرا عاشق چناں باید کہ ہر باری کہ برخیزد — قیامت ہائے پُر آتش ز ہر موئے بر انگیزد

اقبال: اے حلقۂ درویشاں وہ مردِ خدا کیسا — ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستا خیز

اقبال نے ایسے ہی پیرانِ جوان ہمت کے آستانوں کی بوسہ زنی کی تلقین کی ہے، مگر وہ رومی
کی طرح کثرت سے اولیاء اللہ کا ذکر نہیں کرتے اور نہ انھیں "پیغمبرانِ وقت خویش" قرار دیتے ہیں،
رومی نے ایک جگہ کہا ہے:۔

بگسل از پیغمبرِ ایامِ خویش — تکیہ کم کن بر فن و بر گامِ خویش

اقبال نے رموزِ بیخودی میں اس شعر کو یوں نقل کیا ہے۔

مگسل از ختم الرسل ایامِ خویش — تکیہ کم کن بر فن و بر گامِ خویش

یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ اقبال نے رومی کے محولۂ بالا شعر کو اس طرح پیش کیا ہے
کہ اس سے مدحِ پیر کے بجائے مدحِ رسول کا پہلو نکلتا ہے[1] پیغمبر کے برخلاف پیر اکثر اس قدر
فنا فی اللہ ہو جاتا ہے۔ کہ اسے دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی۔
ایک صوفی نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر انھیں معراج نصیب ہوتی تو وہ کبھی دنیا میں واپس نہ آتے۔

---

[1] چناں چہ انگریزی مترجم آربری نے اپنے ترجمہ (نوٹ۔ ص ۹۰) میں صرف اتنا لکھا ہے کہ یہ
شعر رومی کا ہے یہ نہیں بتایا کہ اقبال نے پہلے مصرعہ میں تصرف کیا ہے۔

اپنے خطبات میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں، کہ پیغمبر اور ولی میں یہی فرق ہے۔ پیغمبر کی تقلید کرتے ہوئے مردِ مومن حرائے دل کی خلوتوں میں الوہی طاقت حاصل کر کے اس دنیا میں آتا ہے کہ یہاں اس سے کام لیتے ہوئے نیابت الٰہی کے فرائض انجام دے۔

حرائے دل میں الوہیت محسوس کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایمان تقلیدی نہ ہو بلکہ ذاتی تحقیق کا ثمر ہو، چنانچہ دونوں مفکرین اسلام نے شخصی دینی تجربوں پر زور دیا ہے، اقبال نے اپنے پیر کے مقابلے میں بلیغ تر پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہوئے کہا ہے کہ صاحب ایمان کو ایسا محسوس ہونا چاہیئے کہ گویا قرآن اس پر نازل ہوا ہے۔ تقلید کے مقابلے میں تحقیق کے ساتھ ساتھ رومی نے سکر کے مقابلے میں صحو کو اہمیت دی ہے کہ دوسروں کی اصلاح ہوش میں رہ کر ہی کی جاسکتی ہے، انھیں ست عناصر لوگوں سے نفرت اور شیر خدا جیسے فعّال افراد سے محبت ہے۔ جو صرف اپنے لئے نہیں جیتے بلکہ جنھیں دوسروں کی بھی فکر رہتی ہے، انھوں نے مثنوی جلد دوم میں ایسے شیر مردوں کی بھی مدح کی ہے۔ جو مظلوموں کی آہ سن کر رحمتِ حق بن کر فوراً مدد کے لئے دوڑ پڑتے ہیں۔ (ابیات ۴۴-۱۹۳۳) اقبال بھی باہوش مرشدانِ کامل کے قائل ہیں۔ انھوں نے اپنے خطوط میں ایک جگہ لکھا ہے۔ "حالتِ صحو جس کا دوسرا نام اسلام ہے، قوانینِ حیات کے عین مطابق ہے۔ اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا یہ تھا کہ ایسے آدمی پیدا ہوں جن کی مستقل حالت کیفیتِ صحو ہو" ...... ایسے ہی باہوش مردانِ حق کے بارے میں کہا جاسکتا ہے۔ کہ ان کا انحصار کائنات پر نہیں، کائنات کا انحصار ان پر ہے۔ وہ عالمِ اصغر ہیں۔ اور ان میں عالمِ اکبر کی ساری خصوصیات موجود ہیں۔ یہ دنیا ان کی شوخیٔ ادراک کا نتیجہ ہے۔ خدا نے انھیں منتخب کیا ہے۔ اور اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ یعنی ایسی امانت (آزاد شخصیت) سے سرفراز فرمایا ہے جسے زمین و آسمان نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

رانا عرضنا الامانتہ) انسانِ کامل کی ذات میں دنیا گم ہو جاتی ہے۔ وہ دنیا میں گم نہیں ہوتا۔ آنحضرتؐ کی دایہ حلیمہؓ ایک دفعہ آنحضرتؐ کے باہر چلے جانے پر پریشان ہو گئی تھیں، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے رومی کہتے ہیں کہ پیغمبر جیسا انسان دنیا میں گم نہیں ہو سکتا۔ یہ دنیا ہے جو اس میں گم ہو جاتی ہے۔ اسی خیال کو عمومی رنگ دیتے ہوئے۔ اقبال نے کہا ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

مطلب یہ ہے کہ صاحبِ ایمان اپنی مخفی قوتوں کو بر سرِ کار لا کر پورے آفاق پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہے۔ اور وہ اللہ ہی کی طرح غالب و کار آفریں کار کشا و کارساز ہے، اس میں قدرت کامل بھی ہے، اور اعجازِ عمل بھی۔ قدرت و طاقت کا یہ مطلب نہیں کہ اقبالی انسان نطشے کے فوق الانسان کی طرح سراپا جلال ہے، اس کے پاس رفیق دل بھی ہے پہاڑ کے نزدیک بہتے ہوئے چشمے کی طرح مشہور ہے کہ نطشے نرمی و محبت کا قائل نہیں تھا۔ اس کے نزدیک یہ معمولی انسانوں کی صفات ہیں۔ وہ حکمرانوں کے اخلاق یعنی اقتدار و شجاعت کا قائل ہے لیکن رومی و اقبال کے انسان قاہری و جلال کے ساتھ دلبری و جمال کے بھی حامل ہیں۔

رومی: در بزم چوں عفار دگہ رزم ذوالفقار در شکر ہچو چشمہ و در صبر خارہ ایم

اقبال: مصارفِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

رومی کے شیر مرد اور اقبال کے مرد مومن میں یہ مشترک وصف حیرت انگیز ہے۔ اصل میں اقبالی انسان میں بایزید و جنید کے ساتھ اردشیر کی شوکت بھی ہے۔ وہ بیک وقت افلاطون کا فلسفی بادشاہ، فارابی کا کامل منتظم اور رومی کا پیر واصل ہے۔ وہ خطرات میں زندگی بسر کرتا ہے۔ کسی کے لیے خطرہ بن کر نہیں اور اس کی شفقت عام ہے۔ اس میں خداوند تعالےٰ کی شان غفاری و کریمی نمایاں ہے۔ اس لحاظ سے کہ رومی و اقبال دونوں کے مثالی انسان ——

تخلقوا باخلاق اللہ کے مصداق خداوندی اخلاق سے متصف ہیں۔ اس حلقہ کا فرد عام انسانوں کے لئے ایک نمونہ۔ یا رومی و اقبال کے لفظوں میں ایک "میزان" کی حیثیت رکھتا ہے:

رومیؔ: من چو میزانِ خدایم در جہاں — وا نمایم ہر سبک را از گراں

اقبالؔ: قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

مگر رومی کے پیر کے مانند اقبالی انسان کا مقصد تنہا ہدایت ملت و اصلاح فرد ہی نہیں اسکی سب سے ممتاز خصوصیت "نہایت اندیشہ و کمال جنوں" یعنی فکر و عمل کا انتہائی درجہ ہے، یہ خودی کو عشق سے مستحکم کرنے اور جرأتِ رندانہ سے کام لینے سے عبارت ہے۔ تخلیق و تعمیر ہی کسی انسان کی صلاحیتوں کا سچا اشاریہ ہے۔ مشکل کاموں میں موانع پر غالب آنے میں آزادی کا احساس ہوتا ہے، اور یہی انسانی زندگی کا بہترین لمحہ ہوتا ہے۔ اقبال نے نکلسن کے نام ایک خط میں لکھا ہے: "اپنے راستے کے تمام موانع کو دور کر کے خودی کو آزادی نصیب ہوتی ہے، وہ کسی حد تک مختار، کسی حد تک مجبور ہے۔ وہ سب سے آزاد فرد یعنی خدا کے قریب جا کر پوری آزادی حاصل کرتی ہے۔" اقبال مردِ مومن کو تخلیقیت میں خدا کا شریک مانتے ہوئے اس لئے بالخصوص قوتِ ایجاد اس سے منسوب کرتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں اس حد تک جاتے ہیں کہ کارِ نادر اگر گناہ بھی ہو تو اسے ثواب سمجھتے ہیں:

گر از دستِ تو کارِ نادر آید — گناہے ہم اگر باشد ثواب است

اقبال کا انسان عام صوفیوں کی طرح اندیشہ ہائے افلاکی میں ہمہ وقت مستغرق نہیں، وہ خلوت میں اپنی توانائیاں مرتکز کرتا ہے۔ اور جلوت میں آکر ان سے کام لیتا ہے۔ وہ باہمہ بھی ہے اور بے ہمہ بھی۔ شمعِ محفل کی طرح تنہا بھی ہے۔ اور سب کا رفیق بھی، وہ بہرحال اسی دنیا کا عملی انسان ہے۔ اور معاشرے میں زبردست تبدیلی لانا چاہتا ہے، ساتھ ہی

تسخیر فطرت اور ایجاد اشیاء کا قائل ہے۔ مگر یہ مثال اسی وقت نمایاں ہوتی ہے جب سیاسی و ذہنی آزادی نصیب ہو۔ انسانی شخصیت کی نشو و نما کے لئے آزادی ضروری ہے۔ آزادی ہی میں خودداری، خود اعتمادی جیسی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ آزادی کا عاشق نہ کسی کے سامنے سر جھکاتا ہے۔ نہ یہ چاہتا ہے کہ دوسرے اس کے سامنے سر جھکائیں۔ وہ دوسروں کی خدمت کرنا لازمۂ انسانیت سمجھتا ہے لیکن اس کی خودداری یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ کسی کو زحمتِ خدمت دے حضرت عمرؓ گھر گھر جاکر بیواؤں کی خدمت کرتے تھے لیکن ایک دفعہ ان کے ہاتھ سے چابک گر گیا تو انھوں نے غلام سے چابک اٹھانے کے لئے نہیں کہا۔ بلکہ خود اٹھا لیا۔ آزادی پسند انسان کو دوسری قوموں کے شعار کی غلامانہ متابعت یا تقلید منظور نہیں، وہ اپنی روایات و معتقدات میں راسخ ہوتا ہے اپنی ثقافت کی سرزمین پر اس کے قدم مضبوطی سے جمے ہوئے ہوتے ہیں اگرچہ اس پر دیارِ غیر سے ہوائیں بھی چلتی رہتی ہیں۔ وہ آئینِ الٰہی کا پابند ہے۔ اور اس کی روشنی میں شاہراہِ حیات پر چلتا ہے لیکن اس نے دینی اصولوں کو اپنے باطن میں جذب کر لیا ہے۔ وہ اس کا جزو بن چکے ہیں۔ اس کے لئے "تو یہ کرے گا۔ اور تو یہ نہیں کرے گا" کی آواز باہر سے نہیں آتی۔ اسکے درونِ قلب سے آتی ہے۔ بالفاظِ دیگر نصب العین اس کے باطن میں سرایت کر گیا ہے اور اس کے تمام جسمانی، دماغی اور روحانی قویٰ ایک جاندار کل کا جزو ہیں۔ بقول رومی "وہ شکر کے مانند میٹھا نہیں، وہ خود شکر بن چکا ہے۔ اور اب مٹھاس اس سے کبھی علیحدہ نہیں ہو سکتی" اسطرح کے سراپا شیریں انسان کا مخصوص مشن لوگوں کو روحانی طور پر زندہ و تابندہ رکھنا اور ان میں صفاتِ خداوندی پیدا کرنا ہے۔ اس نے خود کو اخلاقی رذائل سے پاک و صاف کر کے گل کو دل میں اور جسم کو جان میں تبدیل کر لیا ہے۔ اور نئی زندگی پائی ہے۔ یعنی بقول رومی و اقبال وہ زادۂ ثانی ہے۔ پہلے زمینی تھا تو اب آسمانی ہے۔ حضرت علیؓ ایسے ہی آسمانی، زادۂ ثانی تھے،

انھوں نے اپنی کُل یعنی نفس کو پوری طرح مسخر کر لیا تھا۔ اور اس لئے ابو تراب کہلاتے تھے۔ ایسے علی صفت انسان کا علم ظاہری اور سطحی نہیں ہوتا۔ وہ ان کے دل و شخصیت کا جزو ہوتا ہے۔ رومی نے یہ جو کہا ہے کہ:-

علم را بر تن زنی مارے بود علم را بر دل زنی یارے بود

.... تو اس کا یہی مطلب ہے۔ اور اقبال اس خیال کے بہت دلدادہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے نہ صرف اس شعر کو ایک سے زیادہ جگہ اپنے کلام میں نقل کیا ہے۔ بلکہ ایک مقام پر تصریح بھی کی ہے کہ اپنے علم کو سوزِ دل سے مکمل کرنا ضروری ہے۔ عاشق اپنی نشوونما کے لیے خارجی ذرائع کا نہیں باطنی صلاحیتوں کا مرہونِ احسان ہے۔ بقول رومی وہ اپنی غذا اپنے باطن سے حاصل کرتا ہے۔ اور اقبال کہتے ہیں "لیکن اگر گرد و پیش کی قوتیں اس کا راستہ روک لیں تو اسے یہ قدرت حاصل ہے کہ اپنے اعماق وجود میں اس سے بھی ایک وسیع تر عالم تیار کرے جہاں اس کو لاانتہا مسرت اور فیضانِ خاطر کے نئے نئے سرچشمے مل جاتے ہیں"[۵]۔ دراصل اس کا دل ہمیشہ مسرور رہتا ہے۔ اُسے غضب کا سکونِ قلبی حاصل ہے خودی کے فروغ کے سلسلے میں وہ صبر و ضبط کے ساتھ مشکلات کا سامنا کرتا ہے۔ معمولی انسان ذرا سے نقصان سے پریشان ہو جاتا ہے۔ مگر ایک صاحبِ دل کے سکونِ قلبی کی انتہا نہیں۔ وہ کسی مادی بحران سے متاثر نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ خدا ہی فاعلِ حقیقی ہے، ہمارا کام صرف اس کی بنائی ہوئی صراطِ مستقیم پر چلنا اور چلتے رہنا ہے۔ رومی و اقبال جیسے صوفیوں کو یقین ہے کہ رات کے بعد دن آکر رہے گا۔ وہ غم کے نہیں خوشی اور رجائیت کے مبلغ ہیں۔ اقبال کہتے ہیں:

ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند

۵۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (ص ۱۸۰)

اور رومی کہتے ہیں:۔　چو غلامِ آفتابم ہمہ از آفتاب گویم
نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم
(کلیاتِ شمس جزو سوم / بیت نمبر ۱۶۹۶۶)

ان کا دل مسرت سے اس قدر لبریز ہے کہ وہ مرنا بدلنے کے لیے چاہتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے سہی ان کو دل تنگی نصیب ہو۔ ایسی خوش دلی ویکسوئی قلب کی وجہ یہ ہے کہ بقولِ رومی، عارف کو دو منزل ہیں آنکھیں ملی ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ انتشار خیالی کا شکار نہیں ہوتا اور یکسوئی سے رواں دواں اپنی منزل کی طرف چلا جاتا ہے۔ جو قرآن کی زبان میں ذاتِ باری ہے۔ (وان الیٰ ربک المنتھٰی)

رومی کے مقابلے میں قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ منزلِ کبریا کا اقبالی راہی خدا بین ہونے کے ساتھ ساتھ جہاں بین بھی ہے۔ اور تسخیر فطرت کا قائل ہے۔ رومی کے یہاں زیادہ زور خدا بیں بننے پر ہے، مگر اقبالی درویش نائبِ حق بن کر اس دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق بدلنے کی ہمت رکھتا ہے وہ واقعات وحادثات کا مخلوق نہیں، خالق ہے جیسا کہ اقبال نے لندن میں اپنے ایک لکچر میں کہا ہے:۔

"انسان کو شعور اور شخصیت ملی ہے۔ جو شمس وقمر کو نہیں ملی۔ ذی روح اور ذی شخصیت ہونے کی حیثیت سے انسان کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا کو اپنے فکر وعمل سے آباد کرے۔ اپنی ندرتِ فکر وعمل سے اس دنیا میں ہلچل ڈالنے والی ہستی موت سے بھی نہیں مرتی۔"

عہدِ اسلامی میں تعلیمی و علمی سرگرمیوں پر ایک نظر

از، جناب حافظ محمود احمد غازی، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اسلام آباد،

قرآن مجید میں رسول اللہ صلعم کے پیغمبرانہ فرائض بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اللہ کی کتاب مسلمانوں تک پہنچانے اور ان کا تزکیہ نفس کرنے کے ساتھ ساتھ رسول کا کام یہ بھی ہے کہ وہ مسلمانوں کو کتاب اللہ اور حکمت و دانائی کی تعلیم دے، یہ فرائض سہ گانہ قرآن مجید میں بار بار دہرائے گئے ہیں، اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ کتاب و حکمت کی تعلیم دینا نبی کا بنیادی اور اہم ترین فریضہ ہے، پھر چونکہ رسول اللہ صلعم کی نبوت تمام کائنات کے لئے ہے اس لیے لامحالہ آپ کی تعلیم بھی تمام کائنات کے لیے ہوگی، یہ بات کی تعلیم حکمت اور تعلیم کتاب پوری دنیا کیلئے تھی اور پوری دنیا کے لیے ہونی چاہئے تعلیمی دنیا کے لیے ایک بڑا انقلاب آفریں پیام تھا، جو رحمۃ للعٰلمین ہی کے ذریعہ سے تکمیل کو پہونچ سکتا تھا،

اسلام سے قبل دنیا میں یہاں اور بہت سی اجارہ داریاں قائم تھیں، وہاں تعلیم اور بالخصوص مذہبی تعلیم پر بڑی افسوس ناک اجارہ داری بھی قائم تھی، عرب میں جب اسلام آیا تو خود قبیلۂ قریش میں جو تمام عرب پر مذہبی اقتدار رکھتا تھا بقول بلاذری سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے، عرب سے باہر کے متمدن ممالک میں بھی عام آدمی کو لکھنے پڑھنے کی اجازت

نہ تھی، سینٹ پال نے مسیحیت کی ترویج کی تو اس نظام کے گرجاؤں میں ایک عام آدمی کا
ارپانا آسان نہ تھا، ہندوؤں کے طبقاتی نظام میں اگر کسی غریب شودر کے کان میں بلاارادہ بھی
وید کا کوئی اشلوک پڑجاتا تو اس بے گناہ کی سزا یہ ہوتی کہ اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسا بھر دیا جاتا
رحمۃ للعلمین نے جہاں اور ساری اجارہ داریوں کو ختم کیا، وہاں دنیا کے تمام انسانوں
میں خواہ وہ کالے گورے، عورت مرد، بچے بڑے ہوں سب ہی کو کتاب و حکمت کی تعلیم دینے
کی ہدایت دی، قرآن مجید نے ہر شخص کو نہ صرف یہ کہ علم حاصل کرنے کی دعوت دی، بلکہ ہر شخص کا
فرض قرار دیا کہ وہ علم حاصل کرکے انفس و آفاق پر غور کرے، نظام فلکیات، نظام شب و روز
باد و باراں، بحر و دریا، صحرا و کوہستان، غرض کون سی چیز ہے، جس کا مطالعہ کرنے اور اسکی
پوشیدہ حکمتوں کا پتہ چلانے کی ترغیب نہیں دی گئی ہے، قرآن نے صاف طور پر اعلان کیا کہ

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (فاطر:۲۸) — خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں۔ جو صاحب علم ہیں۔

قرآن نے واضح طور پر کہا کہ کیا علم رکھنے والے اور علم نہ رکھنے والے برابر ہو سکتے ہیں؟ قرآن مجید
دراصل ان لوگوں کے لیے ہے جو عقل رکھتے ہیں، جو سوچتے ہیں، جو سمجھ رکھتے ہیں، اس میں علم و عقل،
سمجھ، فہم اور اس کے مترادفات بار بار استعمال ہوئے ہیں شاید اسی لیے حصول علم کی خاطر مسلمانوں
کو دور دراز مقامات تک سفر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ان اہل علم پر سخت وعید فرمائی ہے جو اپنے علم کو اپنی ذات تک محدود
کیے بیٹھے رہتے ہیں، اور خلق خدا کو اس سے مستفید نہیں کرتے، ایک جگہ ایسے عالم کو جو
ضرورت مندوں کو اپنے علم سے مستفید نہ کرے گونگا شیطان قرار دیا گیا ہے، واضح طور پر یہ حکم ہے۔

ولا تمنع العلم اهله فتاثم — یعنی علم سے کسی کو نہ روکو ورنہ گنہگار ہوگے!

ایک جگہ ارشاد ہے :۔

إنَّ من اشر الناس عند الله منزلةً يوم القيامة عالم لا ينتفع به	قیامت کے دن اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک سب سے بدتر وہ عالم ہوگا جس کے علم سے لوگ فائدہ نہ اٹھا سکیں۔
(الدارمی بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العلم ص۲۹)	

مزید کہا گیا ہے۔

مثل علم لا ينفع كمثل كنز لا ينفق في سبيل الله	اُس علم کی مثال جس سے کوئی فائدہ نہ ہو، اس خزانہ کی سی ہے جس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کیا جائے۔
(احمد والدارمی بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العلم ص۲۹)	

اور وہ خزانہ جس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کیا جائے اس کی کیفیت خود اللہ تعالےٰ نے یوں بیان کی۔

والذين يكنزون الذهب والفضة ولا ينفقونها في سبيل الله فبشرهم بعذاب اليم يوم يحمى عليها في نار جهنم فتكوى بها جباههم وجنوبهم وظهورهم هٰذا ما كنزتم لانفسكم فذوقوا ما كنتم تكنزون۔	جو لوگ سونا اور چاندی سینت سینت کر رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو، ایک دن آئے گا جب جہنم کی آگ میں یہ سونا اور چاندی دہکایا جائے گا، اور پھر اس سے ان کی پیشانیاں پہلو اور پیٹھوں کو داغا جائیگا (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے
([illegible] ۳۴-۳۵)	

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہؐ نے بار بار نصیحت فرمائی کہ اللہ سے ایسا علم مانگو جو نفع بھی پہونچائے خود بھی حضورؐ جو دعائیں مانگا کرتے تھے اُن میں یہ دعا بھی ہوتی تھی۔

اللھم انی اسئلک علماً	اے اللہ میں آپ سے علم نافع طلب
نافعاً (جامع بیان العلم وفضلہ ص۳)	کرتا ہوں۔
اللھم انی اعوذ بک من	اے اللہ میں ایسے علم سے تیری پناہ
علم لا ینفع الخ (ابوداؤد وابن ماجہ	مانگتا ہوں جو بے فائدہ ہو (نفع نہ دے)
بحوالہ مشکوٰۃ کتاب الدعوات ص۵)	

اسلام میں جہاں طلب علم کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ وہاں اس فرضیت کی تفصیلات بھی واضح کردی گئی ہیں حصول علم کا ایک درجہ فرض عین یعنی ہر شخص پر ذاتی طور پر فرض ہے جب کہ دوسرا درجہ فرض کفایہ کا ہے، جو پوری ملت پر اجتماعی طور پر فرض کیا گیا ہے، اور اگر کچھ لوگ بھی اسکو پورا کردیں تو پوری قوم بری الذمہ ہوجاتی ہے۔ شریعت کا بنیادی اور ضروری علم حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے فرض عین ہے اور ایک اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام شہریوں کو اسلامی احکام کا ضروری اور بنیادی علم حاصل کرنے میں مدد دے۔ اگر کوئی شخص یہ بنیادی تعلیم حاصل نہ کرے تو سزا کا مستوجب ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے خاص طور پر اس کام کے لیے ایک شخص کو گشتی افسر مقرر کیا تھا۔ امام شافعیؒ نے لکھا ہے کہ ایک شخص کے لئے یہ فرض عین ہے کہ وہ اپنے پیشہ کے بارے میں تمام ضروری علم رکھتا ہو، مثلاً ایک تاجر کے لئے لازمی ہو کہ اسلامی اصول تجارت اور اس کے دوسرے طریقوں سے اچھی طرح آگاہ ہو اور ایک ڈاکٹر کا فرض ہوگا کہ فن طب کے بارے میں تمام ضروری علم حاصل کرے، اس کے علاوہ جتنے دوسرے علوم وفنون ہیں حتیٰ کہ خود اسلامی شریعت کا تفصیلی علم بھی فرض عین نہیں، بلکہ فرض کفایہ ہے،

اگر معاشرہ میں کچھ لوگ یہ علم رکھنے والے موجود ہیں تو ٹھیک ورنہ پورا معاشرہ قابل مواخذہ ہوگا۔ مسلم مفکرین نے ان تمام علوم سے بحث کی ہے جو فرض کفایہ کا درجہ رکھتے ہیں، امام غزالیؒ اور علامہ ابن تیمیہؒ نے ان میں سائنس، انجینیرنگ، اور صنعت و حرفت کو بھی شامل کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ فنون جہاں سے بھی حاصل ہوسکیں حاصل کرنے چاہییں، خود رسول اللہؐ اور خلفائے راشدینؓ کے مبارک دور میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ پوری رواداری اور بے تعصبی کے ساتھ جو مفید چیز جہاں سے ملی، اخذ کرلی گئی، لیکن اس افادیت کا تعین بہرحال قانون شریعت ہی کی روشنی میں کرنا چاہیے، اس مضمون کی بے شمار احادیث، کتب حدیث میں موجود ہیں، مثلاً

الحکمۃ ضالۃ المومن انی	حکمت اور دانائی کی بات مسلمان ہی
وجدھا فھو احق بہا	کی گم شدہ پونجی ہے، جہاں بھی اور
(جامع الترمذی کتاب العلم ص۴۲۳)	جیسے بھی اس کو ملتی ہے وہ اس کا زیادہ
	حقدار ہے۔

ایک اور جگہ ہے:۔

العلم ضالۃ المومن حثیما	علم مومن ہی کی گم شدہ پونجی ہے جہاں
وجدہ اخذہ	ملتی ہے لے لیتا ہے۔

حضرت علیؓ نے اس بات کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ فرمایا۔

العلم ضالۃ المومن فخذوہ	علم مومن ہی کی گم شدہ پونجی ہے اسلئے
ولو من المشرکین ولا یانف	اس کو حاصل کرکے، ہو چاہے مشرکین
احدکم أن یاخذ الحکمۃ	ہی سے حاصل کرو اور تم میں سے کوئی

ثمن سمعها منه ۔ (جامع بیان العلم و فضلہ ص۱۵۱)	شخص ہر اُس شخص سے جس سے تم حکمت کی کوئی بات سنو قبول کرنے میں عار نہ محسوس کرے ۔

خود رسول اللہؐ کے مبارک عہد میں نوجوان صحابۂ کرامؓ نے مکہ کے مشرک قیدیوں سے لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔ خود کاتب وحی اور صحابۂ کرامؓ میں علوم قرآن کے نمایاں ترین عالم حضرت زیدؓ بن ثابت نے انہی مشرکین سے لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔[۱]

علمی مشاغل اور مذاکرہ دن کو حضورؐ نے عام عبادت سے بڑھ کر درجہ دیا، یہ تو مشہور حدیث ہے کہ شیطان کے لیے ایک عالم، ایک ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے[۲]۔ یہ بھی بہت مشہور حدیث ہے کہ ایک دن رسول اللہؐ مسجد نبوی میں تشریف لائے تو دیکھا کہ صحابۂ کرامؓ کے دو گروہ الگ الگ دو محفلیں منعقد کئے بیٹھے ہیں، ایک محفل میں ذکر اللہ اور تسبیح و مناجات ہو رہی تھی، اور دوسری محفل میں علمی مذاکرہ ہو رہا تھا، حضورؐ نے دونوں کو دیکھا اور خوش ہو کر فرمایا، دونوں اچھا کام کر رہے ہیں، لیکن افضل اور برتر درجہ ان لوگوں کا ہے، جو علمی مذاکرہ کر رہے ہیں، اور حضورؐ یہ فرماتے ہوئے کہ انما بعثت معلماً کہ میں بھی تو معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں، علمی مذاکرہ کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو گئے[۳]، ایک اور موقع پر بھی یہی صورت تھی تو آپ پھر علمی محفل کے ساتھ شامل ہو گئے، اور فرمایا بھذا امرت مجھے بھی اسی کا حکم دیا گیا ہے ۔

اسی طرح ایک بار حضرت عمرؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ تمام رات علمی مذاکرہ اور گفتگو کرتے رہے، جب صبح کا وقت قریب ہوا تو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے یاد دلایا کہ امیرالمومنین

۱؎ التنبیہ والاشراف مسعودی ص۲۸۳ ۲؎ ترمذی و ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العلم ص۲۵

۳؎ دارمی بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العلم ص۲۶ و جامع بیان العلم ابن عبدالبر ص۲۵

نماز کا وقت ہونے والا ہے، حضرت عمرؓ نے جواب دیا یہ بھی نماز ہی ہے جس میں ہم اس وقت مصروف ہیں؛

اس میں شک نہیں حصول علم میں سب سے بلند اور اعلیٰ درجہ علم شریعت کا ہے، لیکن دوسرے مفید علوم و فنون کی تحصیل بھی رضائے خداوندی سے خالی نہیں، خود قرآن مجید میں بار بار کائنات اور مظاہر فطرت میں غور و فکر کرنے کی ترغیب دلائی گئی، متعدد احادیث میں یہ مضمون دہرایا گیا ہے، ایک حدیث میں ہے۔

خیر عباد اللہ الذین یراعون الشمس و القمر والنجوم والاھلۃ لذکر اللہ۔	وہ لوگ اللہ کے بہترین بندے ہیں جو چاند، سورج، ستاروں اور رویت ہلال وغیرہ کا مشاہدہ کرتے ہیں، اور اس سے اللہ کی قدرت انھیں یاد آتی ہے، یا اس سے ذکر اللہ کے لیے اوقات کے تعین میں مدد ملتی ہے۔

اس طرح کے ارشادات دوسرے علوم و فنون کے بارے میں بھی ہیں؛

تعلیم کی یہ اہمیت جاننے کے بعد اب ہمیں مختصر طور پر دیکھنا چاہئے کہ پیغمبر علیہ السلام نے تعلیم کو عام کرنے کے لئے عملاً کیا کیا اقدامات کئے اور کیا کیا تدابیر اختیار کیں، ہجرت سے قبل کا زمانہ اگرچہ نہایت پریشانی کا زمانہ تھا، اور مسلمانوں کو ایک لمحہ کے لیے بھی نہ امن نصیب تھا، اور نہ اطمینان اور نہ مکہ میں کوئی اجتماعی نظم قائم ہوسکا تھا، لیکن اس کے باوجود خود رسول اللہ صلعم نے خفیہ طور پر مشہور صحابی حضرت ارقم بن ابی الارقم کے گھر کو[1]

---

[1] اسد الغابہ ج ۱ ص ۸

اسلام کی پہلی درس گاہ کے طور پر استعمال کیا، یہیں حضور رسالت مآبؐ صحابہ کو قرآن مجید اور اسلام کی تعلیم دیتے، یہیں لوگ نمازیں ادا کرتے اور یہیں قرآن مجید کی مختلف سورتوں اور رکوعوں پر مشتمل کتابچے تیار کیے جاتے تھے، رسول اللہؐ کے حکم سے تعلیم یافتہ صحابہ دارارقم کے باہر بھی لوگوں کے گھروں میں جا کر ان کو تعلیم دیا کرتے تھے،[۱] چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ اسلام لائے اس وقت ان کی بہن کے گھر میں مشہور صحابی حضرت خبابؓ بن الارت، حضرت عمرؓ کی بہن اور بہنوئی کو قرآن مجید پڑھا رہے تھے، اور ان کے پاس ایک کتابچہ میں سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی موجود تھی، جس کو پڑھ کر حضرت عمرؓ بھی اسلام لائے[۲] جب مدینہ میں اسلام کا آغاز ہوا تو رسول اللہؐ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حضرت مصعبؓ بن عمیر کو مسلمانان مدینہ کی تعلیم کے لیے مدینہ بھیجا، مصعبؓ بن عمیر پہلے مسلمان تھے، جو مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ گئے،[۳] ہجرت سے قبل حضورؐ نے مدینہ کے اسلام قبول کرنے والے لوگوں میں جن بارہ نقیبوں کا تقرر کیا، ان میں بھی اُن کے تعلیم یافتہ ہونے کی صفت زیادہ نمایاں تھی ان میں متعدد ایسے اصحاب تھے، جو زمانہ جاہلیت میں کامل یعنی علامہ اور ہر فن مولا کے نام سے یاد کیے جاتے تھے، ہجرت کے بعد جب مدینہ میں اسلامی ریاست کی داغ بیل ڈالی گئی تو تمام داخلی اور خارجی خطرات اور ہنگاموں کے باوجود رسول اللہؐ نے تعلیم کی طرف اولین توجہ مبذول فرمائی، مسجد نبویؐ کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اسلام کی پہلی باقاعدہ درس گاہ صفہ کا قیام بھی عمل میں آیا، یہ مسجد نبویؐ میں ایک احاطہ تھا، جو مقیم طلبہ کے لیے اقامت گاہ اور درس گاہ دونوں کا کام دیتا تھا، اس درس گاہ کے نگران اعلیٰ خود رسول اللہؐ تھے، آپ کے علاوہ دوسرے اساتذہ میں حضرت عبادہؓ بن الصامت، حضرت جابرؓ بن عبداللہ، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ،

---

[۱] اسد الغابہ ج ۱ ص ۶۰ [۲] ایضاً [۳] طبقات ابن سعد قسم اول جزو ثالث ص ۸۳

حضرت معاذ بن جبل اور حضرت سعید بن العاص کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں، ان بزرگوں میں کچھ کے ذمہ قرآن مجید کی تعلیم، کچھ کے ذمہ فقہ کی اور کچھ کے ذمہ لکھنا پڑھنا سکھانا تھا۔ حضرت عبادہ بن الصامت لکھنے کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کی تعلیم بھی دیتے تھے، بچوں کو لکھنا سکھانے کے لئے الگ مکتب بھی قائم کیے گئے، جہاں وہ تختیوں پر لکھنے کی مشق کیا کرتے تھے۔

تفصیل کے لیے دیکھئے شمائل ترمذی بخاری باب سریۂ بیر معونہ، زرقانی، مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۱۳۷۔ اور رسالہ سیوطی در اصحاب صفہ۔

صفہ میں نہ صرف مقیم طلبہ تعلیم پاتے تھے بلکہ مدینہ میں رہنے والے لوگ بھی بلا لحاظ عمر وہاں علم سیکھتے تھے، مقیم طلبہ کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی، ان اصحاب کے اخراجات عموماً سرکاری مصارف سے پورے ہوتے تھے، لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب مدینہ کی ننھی سی ریاست مسلسل ہنگامی دور سے گزر رہی تھی، بعض اوقات سرکاری وسائل سے یہ اخراجات پورے نہ ہو پاتے تو اللہ کے غیور بندے کسی پر ظاہر نہ کرتے، اور جو کچھ گزرتی صبر و شکر سے جھیل لیتے، حضرت ابو ہریرہ نے جو فضلائے مدینہ کے سرخیل ہیں اپنی اس تنگدستی کی بہت سی تفصیلات بیان کی ہیں، جو صفہ میں قیام کے دوران ان پر گزریں، عموماً مختلف صحابہ کے ہاں رات کے کھانے پر دعوتیں ہوا کرتی تھیں، لوگ حسب استطاعت ایک ایک، دو دو اصحاب صفہ کو کھانے پر بلا لیتے تھے، اس معاملہ میں رئیس خزرج حضرت سعد بن عبادہ عموماً سب سے بازی لے جاتے تھے، وہ ایک وقت میں اسی اسی لوگوں کو بلاتے تھے[۱]، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصحاب صفہ کی تعداد ۹۰ اور ۱۰۰ کے قریب قریب رہتی تھی[۲]، ان مقیمی طلبہ کے علاوہ بیرون مدینہ سے مختلف وفود آتے تھے اور مختصر عرصہ قیام کر کے دینی معلومات حاصل کرتے ضروری

(۱) زرقانی ج ۱ ص ۱۸۰، ج ۱۔ (۲) علامہ سیوطی نے اصحاب صفہ کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے اس میں سو آدمیوں کے نام حروف ہجا کی ترتیب سے ذکر کیے ہیں۔

علم حاصل کرتے تھے۔

صفہ میں دی جانے والی تعلیم کی بنیاد، اساس اور روح قرآن مجید تھا، صحابہ کرامؓ نے قرآن مجید ہی کے مدرسہ میں پڑھا، قرآن مجید ہی سے تربیت پائی، اور قرآن مجید ہی ان کے سارے علم کی اصل تھا، خود قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس کو تمام علوم کا جامع بتایا گیا ہے ما فرطنا فی الکتٰب من شئی، ہم نے اس میں کسی چیز کی کمی نہ رہنے دی، وننزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شئی، ہم نے تم پر کتاب نازل کی ہے جس میں ہر چیز کا تفصیلی بیان موجود ہے، اسی مضمون کو حضورؐ نے یوں بیان فرمایا۔

تعلموا وعلموہ الناس تعلموا	علم حاصل کرو اور اس کو سکھاؤ قرآن
القرآن وعلموہ الناس۔	پڑھو اور اسکو پڑھاؤ۔

(دارمی، دارقطنی ص۵۹)

یعنی انسانیت کے وہ گر اس میں بتا دیئے گئے ہیں جن کو سامنے رکھ کر انسان ہر چیز کو پرکھ سکتا ہے۔ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے امام بیہقیؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہو کہ قرآن میں علم کے بنیادی اصول موجود ہیں، امام شافعیؒ کا کہنا ہے کہ سارا اسلامی لٹریچر رسول اللہؐ کی سیرت اور سنت کی بالواسطہ یا بلا واسطہ تشریح ہے اور خود سیرت وسنت قرآن مجید کی تشریح ہے، امام شافعیؒ کی اس رائے کی صداقت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید کو سمجھنے اور اس کے مختلف مطالب کا احاطہ کرنے کے لیے امت مسلمہ نے جو علوم وفنون ایجاد کیے ان کی تعداد قاضی ابو بکر بن العربیؒ نے ساڑھے چار سو سے زائد بتلائی

اب ظاہر ہے کہ یہ مقدس ہستیاں، خود صاحب قرآن اور معلم قرآن سے قرآن پڑھتی ہوں گی تو ان کو کتنے علوم حاصل ہوئے ہونگے جو اصحاب براہ راست رسول اللہؐ سے قرآن مجید کی

لی تعلیم حاصل کرتے تھے وہ دس دس آیات پڑھتے تھے اور جب تک معانی و مطالب خوب ذہن نشین نہ ہو جاتے تھے آگے نہ بڑھتے تھے، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے صرف سورۂ بقرہ کے موصی مطالعہ پر چودہ سال صرف کیے۔[1]

اس زمانہ میں درسی کتابوں کا رواج نہ تھا، قرآن مجید اور سنت رسولؐ ہی بنیادی درسی کتابیں تھیں، ان کے علاوہ مختلف موضوعات پر رسائل لکھے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً جب رسول اللہ صلعم نے حضرت عمرو بن حزمؓ انصاری کو فقہ کی تعلیم کے لیے نجران بھیجا تو ان کیلئے ایک کتاب لکھوائی جس میں فرائض، سنن اور زکوٰۃ کے تفصیلی احکام درج تھے[2] اس طرح کا ایک مجموعہ حضرت علیؓ کے بھی پاس تھا، عہد نبویؐ میں اس طرح کے مجموعوں اور ان کی درس و تدریس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جن کی کچھ تفصیل مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب تدوین حدیث[3] اور ترکی کے ڈاکٹر فواد سیزگین کی جرمن تصنیف اسلامی علمی ورثہ کی تاریخ میں مل سکتی ہے۔ بعض دوسرے علوم و فنون میں بھی کتابیں لکھے جانے کا ذکر ملتا ہے، آخر زمانہ میں زکوٰۃ کے متعلق رسول اللہ صلعم نے جو ہدایتیں دی تھیں اُن کو باضابطہ لکھ کر مرتب کر لیا گیا تھا اور یہ حضرت عمرؓ کے خاندان میں محفوظ رہا۔ اور وہیں سے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اس کی نقل لی تھی۔[4]

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلعم نے جو خطبہ دیا تھا، اس کو یمن کے ایک صحابی ابو شاہؓ نے باقاعدہ لکھوا لیا تھا۔ (ابوداؤد، کتاب المناسک، باب تحریم مکہ و بخاری: کتاب العلم) حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلعم سے جو کچھ سنتے تھے بیٹھ کر لکھتے جاتے تھے۔ (مسند احمد بن حنبل ج ۲ ص ۱۹۹) رسول اللہ صلعم کے مختلف فرامین کو بھی صحابۂ کرامؓ نے قلمبند کر لیا تھا تاکہ آگے

---

[1] موطا امام مالک [2] استیعاب، تذکرہ عمرو بن حزم انصاریؓ [3] تدوین حدیث ص ۱۵ ۱۰ [4] ابوداؤد

چل کر ان سے شرعی مسائل مستنبط ہو سکیں۔

حضورؐ کے زمانہ میں طلبہ کو باقاعدہ سند جاری کرنے کا رواج شروع نہیں ہوا تھا، لیکن مختلف صحابہ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ مختلف علوم میں ان کی مہارت کو زبانی سند دربارِ رسالت سے جاری ہوئی، اور حضورؐ نے لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ ان صحابہ سے ان کے اختصاصی علوم میں رجوع کریں، مثلاً حضورؐ نے حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی قرآن فہمی کی گواہی دی۔[۱] حضرت عمرؓ کے مجموعی علم کی تعریف کی۔[۲] علم فرائض و علیٰ ہذا علم حساب میں حضرت زید بن ثابتؓ کی مہارت اور عدالتی امور میں حضرت علیؓ کی صلاحیتوں کو سراہا۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کے بارے میں ارشاد ہوا کہ وہ حلال و حرام کا سب سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔[۳] اس طرح کی ایک تقریر ایک بار حضرت عمرؓ نے بھی کی تھی اور مختلف صحابہ کی جو علمی فضیلت تھی اسکو بیان کیا تھا، صرف اتنا اضافہ تھا کہ مالیات کی بابت معلوم کرنا ہو تو مجھ سے پوچھو،

خالص دینی علوم کے علاوہ حضورؐ نے اپنے زمانہ کے رائج الوقت مفید علوم کے سیکھنے کی نہ صرف ترغیب دلائی بلکہ ذرا ...[illegible] اس کا اہتمام فرمایا۔ حضورؐ کا حکم تھا کہ نشانہ بازی، پیراکی، حساب، علم میراث، طب، علم ہیئت، فلکیات، علم انساب اور علم تجوید کی تعلیم ضرور دی جائے۔[۴] نشانہ بازی کے مقابلے خود حضورؐ اپنی نگرانی میں کرایا کرتے تھے، نیز ایک

[illegible] بزبانِ شعر —

[illegible] دا ابناء کم السباحۃ　　　اپنے بچوں کو تیرنا اور نشانہ [illegible]

---

[۱] ... احمد بن حنبل ... صحیح مسلم، باب من فضائل عبد اللہ بن مسعود ... [۲] مشکوٰۃ باب مناقب عمرؓ [۳] مشکوٰۃ باب مناقب عشرہ ... [۴] سیوطی نے جمع الجوامع میں ... [illegible]

والد ماجد - (جامع صغیر، سیوطی بازی سکھاؤ۔

دوم ص ۲۵ بحوالہ بیہقی شعب الایمان)

ان چیزوں کے لیے جس چیز کی ضرورت پڑتی، حضورؐ اس کے سیکھنے کے لیے کسی مناسب آدمی کو مقرر کر دیتے تھے، حضرت زید بن ثابتؓ جنھوں نے صغر ہی میں علم حاصل کیا اور جنگ بدر کے مشرک قیدیوں سے لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔ نہایت ذہین اور خوش فہم تھے، علم حساب اور فرائض میں آپ کی مہارت کو خود سرور کونینؐ نے سراہا تھا، حضرت زیدؓ رسول اللہؐ کے گویا کاتب خاص تھے۔ معاہدات کا لکھنا اور دوسری راز دارانہ خط و کتابت آپ کے سپرد تھی، اپنے شوق سے مدینہ آنے جانے والے مسافروں سے فارسی اور حبشی زبانیں سیکھیں، ایک مرحلہ پر جب یہ محسوس ہوا کہ عبرانی جاننے والا کوئی قابل اعتماد شخص ہونا چاہیے، تو حضورؐ نے انکو عبرانی بھی سیکھنے کا حکم دیا، حضرت زید بن ثابتؓ نے چند ہفتوں کی قلیل مدت میں عبرانی زبان میں بھی مہارت حاصل کر لی۔[۱]

مدینہ منورہ میں صرف واحد درس گاہ نہ تھی بلکہ یہاں کم از کم نو مسجدیں خود عہد نبوی میں موجود تھیں۔ اور قرب و جوار کے لیے درس گاہوں کا کام انجام دیتی تھیں، مدینہ سے چند میل دور قبا کی مشہور مسجد میں بھی ایک درسگاہ قائم تھی، اور رسول اللہؐ وقتاً فوقتاً اسکا معائنہ کرنے بنفس نفیس تشریف لے جاتے تھے[۲]، ان سب درسگاہوں کا حضورؐ معائنہ فرماتے رہتے تھے، اور اگر کوئی نامناسب بات دیکھتے تو فوراً منع کر دیتے تھے[۳]۔ دور دراز کے مقامات پر بھی جوں جوں اسلام پھیلتا جاتا تھا حضورؐ معلمین مقرر فرماتے جاتے تھے مختلف قبائل کے وفود آکر اسلام قبول کرتے تو واپسی میں ان کے ہمراہ کسی نہ کسی تربیت یافتہ

---

[۱] التنبیہ والاشراف، مسعودی ص ۲۸۳ [۲] جامع بیان العلم ص ۹ [۳] جامع الترمذی، باب العلم

اور تجربہ کار صحابی کو بھیج دیا جاتا تھا، ایک بار نجد کے علاقہ میں تعلیم دینے کے لیے ستر اہل علم صحابہ کی ایک جماعت بھیجی گئی، جن کو مشرکین نے بیر معونہ کے مقام پر دھوکہ سے شہید کر دیا[۱] ان اہل علم صحابہ رضی اللہ عنہم کی شہادت کا حضورؐ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ آپ مسلسل ایک ماہ تک قنوت نازلہ پڑھتے اور دشمنوں کو بد دعا دیتے رہے[۲] بعض اوقات کسی کو گورنر یا حاکم مقرر کرتے تو تعلیم کی ذمہ داریاں بھی ذاتی طور پر اس کے سپرد کی جاتی تھیں، عمرو بن حزمؓ کو جب یمن کا گورنر مقرر کیا تو ان کو خاص طور پر تاکید کی کہ لوگوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ وغیرہ کی تعلیم کا بندوبست اور نگرانی کریں، طبری کے بیان کے مطابق یمن میں رسول اللہ نے ایک ناظر تعلیمات بھی مقرر کیا تھا، جس کا کام یہ تھا کہ مختلف اضلاع میں دورہ کر کے وہاں کی تعلیمات کی نگرانی کرتا رہے[۳] ممکن ہے دوسرے علاقوں میں بھی ایسے ناظر تعلیمات مقرر کئے گئے ہوں۔

غزوۂ بدر کے جو قیدی فدیہ ادا کرکے رہائی حاصل نہ کر سکتے تھے، ان کے لیے رسول اللہ نے یہ حکم دیا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں تو چھوڑ دیئے جائیں گے، حضرت زید بن ثابتؓ نے اسی طرح لکھنا سیکھا تھا، (مسند احمد بن حنبل ج ۱ ص ۲۴۷، طبقات ابن سعد ص ۱۴)

باہر سے جو مہاجر آتے رسول اللہؐ ان کو انصار کے حوالہ کر دیتے کہ وہ مہانداری کے ساتھ ان کو قرآن پاک کی تعلیم بھی دیں، وفد عبد القیس اور وفد بنی تمیم، مدینہ میں رہ کر قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ (مسند ج ۳ ص ۴۳۲، اسد الغابہ تذکرہ عمرو بن ہثیم)

رسول اللہؐ اپنے عہد کے امراء و عمال کو کتاب اور سنت کی تعلیم دینے کا حکم دیتے اور اس کو ان کے لیے فرض قرار دیتے۔ (استیعاب ابن عبد البر تذکرہ معاذ بن جبلؓ)

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الامارة، باب ثبوت الجنة للشہید [۲] مشکوۃ باب القنوت [۳] تاریخ طبری ص ۱۹۸۲،

رسول اللہؐ نے حضرت عبداللہ بن سعید بن العاص کو خاص طور سے حکم دیا کہ مدینہ کے لوگوں کو لکھنا سکھائیں۔ (اسد الغابہ تذکرہ حضرت عبداللہ بن سعیدؓ)

علامہ سمہودی نے وفاء الوفاء میں تقریباً چالیس ایسی مسجدوں کا ذکر کیا ہے جو عہد رسالت میں مدینہ منورہ میں موجود تھیں اور ان میں باقاعدہ تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔

رسول اللہؐ نے خواتین کی تعلیم کا بھی پورا پورا بندوبست کیا، ہفتہ میں ایک روز آپ نے خواتین کی خصوصی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مقرر فرمایا تھا، جس میں آپ خود ان کے اجتماع میں جاکر ان کو تعلیم دیتے تھے، خود ازواج مطہراتؓ کو رسول اللہؐ نے اپنی خصوصی نگرانی میں وہ تعلیم و تربیت دی جو اسلامی پردے کے احکام کی وجہ سے خود حضور دوسری عام خواتین کو نہیں دے سکتے تھے۔

علامہ ابن عبدالبر کی جامع بیان العلم ص ۶۹ پر ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جس شخص نے اپنی لونڈی کو اچھی تعلیم و تربیت دی، اور اسکو آزاد کرکے شادی کرلی تو اسے دوگنا ثواب ملے گا۔

حضورؐ کے بعد خواتین کی تعلیم کا یہ سلسلہ ازواج مطہرات نے جاری رکھا، ازواج مطہرات میں علمی اعتبار سے حضرت عائشہؓ کو بڑا مرتبہ حاصل تھا، ان کو قرآن، سنت، فقہ، ادب، شاعری اور علم طب میں بڑا ملکہ حاصل تھا، ازواج مطہراتؓ کو خود تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ حضورؐ اس کا بھی اہتمام کرتے تھے کہ دوسری پڑھی لکھی خواتین سے بھی ان کی تعلیم کا انتظام کرادیں، چنانچہ ازواج مطہرات میں حضرت حفصہؓ اور ام سلمہؓ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں، حضرت حفصہؓ کو خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ایک تعلیم یافتہ خاتون شفاء بنت عبداللہ عدویہؓ نے لکھنا اور پڑھنا سکھایا۔[۱]

ازواج مطہرات میں سے حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کی زندگی بڑی یادگار ... انہیں

---

[۱] صحیح بخاری کتاب العلم ۔ سنن ابوداؤد کتاب الطب۔

اور تجربہ کار صحابی کو بھیج دیا جاتا تھا، ایک بار نجد کے علاقہ میں تعلیم دینے کے لیے ستر اہل علم صحابہ کی ایک جماعت بھیجی گئی، جن کو مشرکین نے بیر معونہ کے مقام پر دھوکے سے شہید کر دیا[1]، ان اہل علم صحابہ رضی اللہ عنہم کی شہادت کا حضورؐ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ آپ مسلسل ایک ماہ تک قنوت نازلہ پڑھتے اور دشمنوں کو بد دعا دیتے رہے[2]۔ بعض اوقات کسی کو گورنر یا حاکم مقرر کرتے تو تعلیم کی ذمہ داریاں بھی ذاتی طور پر اس کے سپرد کی جاتی تھیں، عمروؓ بن حزم کو جب یمن کا گورنر مقرر کیا تو ان کو خاص طور پر تاکید کی کہ لوگوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ وغیرہ کی تعلیم کا بند و بست اور نگرانی کریں، طبری کے بیان کے مطابق یمن میں رسول اللہؐ نے ایک ناظر تعلیمات بھی مقرر کیا تھا، جس کا کام یہ تھا کہ مختلف اضلاع میں دورہ کر کے وہاں کی تعلیمات کی نگرانی کرتا رہے[3]۔ ممکن ہے دوسرے علاقوں میں بھی ایسے ناظر تعلیمات مقرر کئے گئے ہوں۔

غزوۂ بدر کے جو قیدی فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل نہ کر سکتے تھے، ان کے لیے رسول اللہؐ نے یہ حکم دیا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں تو چھوڑ دیئے جائیں گے، حضرت زیدؓ بن ثابت نے اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔ (مسند احمد بن حنبل ج ۱ ص ۲۴۶، طبقات ابن سعد ص ۱۴)

باہر سے جو مہاجر آتے رسول اللہؐ ان کو انصار کے حوالہ کر دیتے کہ وہ مہمانداری کے ساتھ ان کو قرآن پاک کی تعلیم بھی دیں، وفد عبد القیس اور وفد بنی تمیم، مدینہ میں رہ کر قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ (مسند ج ۳ ص ۴۳۲، اسد الغابہ تذکرہ عمرو بن ہثیم)

رسول اللہؐ اپنے عہد کے امراء و عمال کو کتاب اور سنت کی تعلیم دینے کا حکم دیتے اور اس کو ان کے لیے فرض قرار دیتے۔ (استیعاب ابن عبد البر تذکرہ معاذ بن جبلؓ)

---

[1] صحیح مسلم کتاب الامارۃ۔ باب ثبوت الجنۃ للشہید [2] مشکوٰۃ باب القنوت [3] تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۸۵۰

رسول اللہؐ نے حضرت عبد اللہ بن سعید بن العاص کو خاص طور سے حکم دیا کہ مدینہ کے لوگوں کو لکھنا سکھائیں۔ (اسد الغابہ تذکرہ حضرت عبد اللہ بن سعیدؓ)

علامہ سمہودی نے وفاء الوفاء میں تقریباً چالیس ایسی مسجدوں کا ذکر کیا ہے جو عہد رسالت میں مدینہ منورہ میں موجود تھیں اور ان میں باقاعدہ تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔

رسول اللہؐ نے خواتین کی تعلیم کا بھی پورا پورا بندوبست کیا، ہفتہ میں ایک روز آپ نے خواتین کی خصوصی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مقرر فرمایا تھا، جس میں آپ خود ان کے اجتماع میں جاکر ان کو تعلیم دیتے تھے، خود ازواج مطہراتؓ کو رسول اللہؐ نے اپنی خصوصی نگرانی میں وہ تعلیم و تربیت دی جو اسلامی پردے کے احکام کی وجہ سے خود حضور دوسری عام خواتین کو نہیں دے سکتے تھے۔

علامہ ابن عبد البر کی جامع بیان العلم ص ۶۴ پر ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جس شخص نے اپنی لونڈی کو اچھی تعلیم و تربیت دی، اور اسکو آزاد کرکے شادی کرلی تو اسے دوگنا ثواب ملے گا۔[1]

حضورؐ کے بعد خواتین کی تعلیم کا یہ سلسلہ ازواج مطہرات نے جاری رکھا، ازواج مطہرات میں علمی اعتبار سے حضرت عائشہؓ کو بڑا رتبہ حاصل تھا۔ ان کو قرآن، سنت، فقہ، ادب، شاعری اور علم طب میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ ازواج مطہراتؓ کو خود تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ حضورؐ اس کا بھی اہتمام کرتے تھے کہ دوسری پڑھی لکھی خواتین سے بھی ان کی تعلیم کا بندوبست کرادیں، چنانچہ ازواج مطہرات میں حضرت حفصہؓ اور ام سلمہؓ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں، حضرت حفصہؓ کو خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ایک تعلیم یافتہ خاتون شفاء بنت عبد اللہ عدویہؓ نے لکھنا اور پڑھنا سکھایا۔[2]

ازواج مطہراتؓ میں حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کی زندگی عرصہ دراز تک رہی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب العلم [2] ابوداؤد، کتاب الطب۔

ان دونوں امہات المومنین سے برابر علمی استفادہ کیا گیا، صحابہؓ کو جب بھی کسی معاملہ میں اشکال ہوتا تو وہ حضرت عائشہؓ سے دریافت کرتے، دوسری صحابیہ خواتین بھی ان سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھیں، ایک صحابی ایسے ہی ایک موقع کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم لوگ مشہور صحابیہ خاتون حضرت ام درداءؓ کے ہاں گئے اور وہاں علمی گفتگو کرنے لگے، کافی دیر گزر گئی تو ہم نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے آپ کا بہت سا وقت لے لیا، انھوں نے جواب دیا نہیں، بلکہ علمی مذاکرہ سے بڑھ کر تو کوئی چیز مجھے محبوب ہے ہی نہیں، علمی مذاکرے اور مباحثے صحابہؓ اور صحابیاتؓ میں نہایت پسندیدہ اور ضروری سمجھے جاتے تھے، حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ جب حضورؐ کے درس سے فارغ ہوتے تھے، تو آپس میں مذاکرہ ضرور کرتے تھے، کبھی کبھی ہم لوگ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ ہوتے تھے، اور ہر شخص باری باری دہراتا تھا، اس سے یہ کیفیت پیدا ہو جاتی تھی کہ جو کچھ پڑھا ہے وہ گویا دل پر لکھ گیا ہے خود رسول اللہؐ بھی اس کا لحاظ فرماتے تھے کہ تعلیم دینے میں تدریج اور سہولت سے کام لیں، ایک بار ہی اتنا نہ پڑھاتے کہ لوگ یاد نہ رکھ سکیں اور اکتا جائیں، جن لوگوں کو معلم بنا کر باہر بھیجتے ان کو بڑی تاکید فرماتے تھے کہ نرمی سے کام لینا، لوگوں کو مشکل میں مبتلا مت کرنا، لوگوں کو برگشتہ اور متنفر نہ کرنا بلکہ حوصلہ افزائی کرنا۔[1]

تعلیم کے ساتھ ساتھ رسول اللہؐ اور صحابۂ کرامؓ تفریح اور مردانہ کھیلوں کی طرف بھی پوری پوری توجہ دیتے تھے، گھوڑ سواری، دوڑ، تیرنا، نیزہ بازی کی مشق، کشتی، اور اس طرح کے کھیل جو ان دنوں رائج تھے، مدینہ میں حضورؐ کی نگرانی اور سرپرستی میں کھیلے جاتے تھے، اول آنے والوں کو خود دربار رسالتؐ سے انعامات بھی ملتے تھے، خود حضورؐ

---

[1] صحیح بخاری باب بعث معاذ الی الیمن ج دوم ص ۶۴۳۔

نے بھی ایک بار گھوڑ دوڑ میں حصہ لیا۔ گھوڑ دوڑ کا انتظام حضرت علیؓ کے سپرد تھا۔[۱]

عہد نبویؐ میں جس نظام تعلیم کی بنا ڈالی گئی تھی وہ خلافت راشدہ اور بالخصوص حضرت عمرؓ کے دور میں اپنی پوری ترقی کو پہونچا۔ حضرت عمرؓ نے تمام مفتوحہ ممالک میں بستی بستی گاؤں گاؤں، قرآن مجید کی تعلیم کا انتظام کیا، باقاعدہ تنخواہ دار اساتذہ مقرر کیے،[۲] بچوں کے لیے الگ مکتب یعنی پرائمری اسکول قائم ہوئے جہاں قرآن کے ساتھ ساتھ لکھنے پڑھنے شہ سواری وغیرہ چیزوں کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی، یہ تعلیم جبری تھی، اور ہر شخص کے لیے لازمی تھی، حتی کہ قیدیوں کو بھی جبراً پڑھایا جاتا تھا، ایسے ہی ایک صاحب ابو عامر سلیم نو عمری میں جنگی قیدی بن کر آئے تھے، جبری تعلیم پاکر بڑے محدث بنے۔ حضرت عمرؓ نے قرآن مجید کی بعض ضروری اور اہم سورتوں پر مشتمل ایک منتخب نصاب بھی مرتب کیا۔ جس کی بابت حکم دیا کہ اسکا تفصیلی مطالعہ ہر شخص کے لیے ضروری ہوگا۔ کیونکہ ان میں احکام و فرائض مذکور ہیں۔[۳] بڑے بڑے شہروں میں قرآن مجید کی اعلیٰ تعلیم کے مرکز قائم ہوئے، شام کے تین بڑے شہروں، دمشق، حمص اور فلسطین میں معاذ بن جبلؓ، عبادہ بن صامتؓ اور ابو درداؓ قرآن مجید کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مقرر کیے گئے۔ ابو درداؓ کے درس میں ہجوم کا یہ حال تھا کہ ایک روز شاگردوں کی تعداد شمار کرائی گئی تو سولہ سو طالب علم ان کے حلقۂ درس میں موجود تھے، وہ فجر بعد دس دس طالب علموں کی جماعت بنا کر اپنے کسی تجربہ کار اور فارغ التحصیل شاگرد کی نگرانی میں دیدیتے تھے، اور خود ٹہلتے جاتے اور پڑھنے والوں کی طرف کان لگائے رہتے تھے، جب کوئی طالب علم پورا قرآن مجید یاد کرلیتا تو براہ راست ابو درداؓ کی شاگردی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لگتا تھا۔[۴] حضرت عمرؓ کے زمانہ میں عربی زبان و ادب کو بھی لازمی مضمون کی حیثیت دی گئی، اسکے علاوہ

[۱] دارقطنی ج ۲ ص ۲۰۵، وجمع الجوامع سیوطی وغیرہ [۲] سیرۃ العمرین لابن الجوزی بحوالہ الفاروق دوم ص ۱۱۸

[۳] [illegible]

فقہ کی اعلیٰ تدریس کے لیے جید اہل علم صحابہ کی بڑی تعداد کو حضرت عمرؓ نے مختلف شہروں میں
میں مامور کیا، فقہ کی تدریس کے لیے بعض اصحاب کو باقاعدہ تنخواہیں بھی دی جاتی تھیں، ابومسلم
خولانی کا بیان ہے کہ حمص کی جامع مسجد میں تیس بڑے بڑے صحابہ فقہ کا درس دیتے تھے،
ان میں جب کوئی اختلاف یا شک پیدا ہوتا تھا تو حضرت معاذ بن جبلؓ کی طرف رجوع کرتے
تھے، جو گویا اس شریعت فیکلٹی کے سربراہ تھے۔

ان انتظامات کے ساتھ ساتھ حضرت عمرؓ نے یہ بھی حکم دیا کہ بازار میں کوئی ایسا شخص
کاروبار نہ کرے جو علم فقہ نہ جانتا ہو۔ حضرت عمرؓ ایسے لوگوں کو سزا دیتے تھے، جو فقہ نہ جاننے کے باوجود
بازار میں بیٹھیں، اس طرح آپ نے بازاروں کو تجارت گاہوں کے ساتھ ساتھ درسگاہیں بھی بنادیا جہاں
لوگ باتوں باتوں میں فقہ سیکھتے جاتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے دور میں علم جغرافیہ کی خصوصی تربیت کے بھی شواہد ملتے ہیں، وہ مختلف مفتوحہ ممالک کے
جغرافیائی سروے کرنے کے لیے ماہرین کی جماعتیں بھیجتے رہتے تھے، اس طرح کی ایک سروے رپورٹ حضرت
عمرو بن العاصؓ نے بھیجی تو وہ اس قدر جامع اور تفصیلی تھی کہ حضرت عمرؓ پکار اٹھے اے عاص کے بیٹے، خدا تم کو
جزائے خیر دے، تم نے تو ایسی رپورٹ بھیجی ہے جیسے میں خود مصر کو دیکھ رہا ہوں، عرصہ ہوا مشہور
فرانسیسی اخبار Gernaro نے اس رپورٹ کا ترجمہ شائع کیا تھا اور لکھا تھا کہ اسکو بلاغت، جامعیت
اور واقفیت کے ایک اعلیٰ نمونہ کے طور پر تعلیمی اداروں کے لازمی مطالعہ میں شامل کیا جائے، حضرت علیؓ کے
دور میں عربی گرامر کے اصول بھی آپ کی ذاتی نگرانی میں مرتب ہوئے اور غیر عرب طلبہ کے لیے نصاب تعلیم میں ایک
نئے مضمون کا اضافہ ہوا۔[1]

ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے زمانے کے نظام تعلیم کا یہ ایک مختصر کا ساخاکہ
ہے، اگر اور محنت کی جائے تو بہت کچھ مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

---

[1] فہرست ابن ندیم ص ۶۰ و مقدمہ ابن خلدون۔ ص ۲۲۲

فارسی زبان کی ایک اہم تاریخ

زین الاخبار گردیزی

از

ڈاکٹر ریحانہ خاتون علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

زین الاخبار ایران کی ایک مختصر عمومی تاریخ ہے جس میں ایران قدیم کے افسانوی بادشاہ طہمورث سے لے کر ساسانی خاندان کے آخری بادشاہ یزدجرد کے حالات اختصاراً پانچ ابواب میں بیان کئے گئے ہیں، اس کے بعد دو باب میں ابتدائے اسلام سے لے کر سلطان مودود غزنوی[1] کی جانشینی کے حالات نسبتاً کچھ تفصیل سے بیان ہوئے ہیں، آٹھویں باب میں رومی، ہجری اور ہندوؤں کی تقویم اور تاریخ کا ذکر ہوا ہے اور بعد کے آٹھ ابواب میں مختلف مذاہب یعنی مسلمان، یہودی، عیسائی، زرتشتی اور ہندوؤں کے تیوہاروں کی توضیح و تشریح ملتی ہے۔

اندر اسباب عیدہا، اندر عیدہاء جہودان، جدول عیدہاء جہودان، اندر اسباب عیدہاء جہودان، اندر عیدہای ترسایان بجدول، شرح و اسباب عیدہای ترسایان، اندر عیدہا و رسم ہای مغان بجدول، اندر شرح جشن ہا و عیدہای مغان، اندر عیدہای

---

[1] مودود بن مسعود اپنے باپ کے ۴۳۲ھ میں مقتول ہو جانے کے بعد تخت نشین ہوا، سلطان عبدالرشید جس کے دور میں زین الاخبار مرتب ہوئی وہ مودود کا چچا تھا اور اس کے بعد تخت پر بیٹھا۔

ہندوان بجدول، اندر شرح عیدھای ہندوان، آخری تین ابواب میں ترکوں، رومیوں اور ہندوؤں کے علوم و معارف کا ذکر ہے۔

دراصل ابواب کا یہ خلاصہ موجودہ مطبوعہ نسخے پر مبنی ہے اور یہ نسخہ ناقص ہے اور چونکہ اس کتاب کے دو ہی قلمی نسخے موجود ہیں جن میں دوسرا پہلے کی نقل ہے، اس لئے اصل کتاب کے نقص کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا ہے۔ کتاب کا اصل مقدمۂ مولف بھی موجود نہیں ہے اور درمیان سے بھی ابواب[1] کے غائب ہونے کا پتہ چلتا ہے اور دونوں موجودہ نسخوں میں ابواب کا شمار ترتیب سے نہیں ہے۔ ابواب کے شمار سے بھی واضح ہے کہ دونوں نسخوں میں سے کچھ حصے غائب ہیں۔

زین الاخبار کا مؤلف ابو سعید عبدالحیٰ بن ضحاک بن محمود گردیزی ہے جس نے ۴۴۲ھ۔ ۴۴۳ھ کے قریب یہ تاریخ مرتب کی، گردیزی کے متعلق کوئی بات معلوم نہیں، سوائے اس کے کہ وہ دربار غزنی سے وابستہ تھا اور نام کی نسبت سے واضح ہے کہ وہ گردیز کا رہنے والا تھا جو غزنی سے ۶۳ میل مشرق اور کابل سے ۲۵ امیل جنوب مغرب میں اب بھی ایک قصبہ موجود ہے۔

گردیزی نے اس کتاب کو سلطان عبدالرشید بن سلطان محمود کے دور میں (۴۴۱ھ۔۴۴۳ھ) میں لکھی اس لئے کہ اس نے سلطان عبدالرشید کو "ادام سلطانہ"[2] کے دعائیہ فقرہ سے یاد کیا ہے۔ کتاب کا نام زین الاخبار اسی بادشاہ کے ایک لقب "زین الملۃ" کی مناسبت سے رکھا گیا۔ کتاب کی تاریخ کے تعین کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس میں بیرونی کو

---

[1] باب ششم کے دونوں خطی نسخوں میں باب نہم شروع ہو جاتا ہے، البتہ مطبوعہ نسخے میں ترتیب قائم رکھنے کے لئے باب نہم اور اس کے بعد کے ابواب کو ہفتم، ہشتم وغیرہ لکھا گیا ہے،

[2] رک، زین الاخبار ص ۹۶، ۷۴، ۲۰۶۔

رحمۃ اللہ علیہ[1] کے فقرے سے یاد کیا ہے، اس سے واضح ہے کہ بیرونی اس وقت فوت ہو چکا ہے، بیرونی کی وفات ۴۴۰ھ کے بعد قرار دی گئی ہے۔

گردیزی نے سلطان محمود غزنوی کے حالات اور فتوحات کا جس طرح حال لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس دور میں موجود تھا۔

اگرچہ زین الاخبار کے سارے ماخذوں کا حال معلوم نہیں، البتہ اس کے بعض ماخذ اس طرح ہیں۔ مثلاً

گردیزی نے ابوریحان البیرونی سے ملاقات اور اس کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی کی دو[2] کتابیں "کتاب الہند" اور "آثار الباقیہ" اس کے پیش نظر رہی ہیں "جدول عیدھای" کے ضمن میں لکھا ہے

"من آنچہ یافتم بخاصہ از کتب خواجہ ابوریحان رحمہ اللہ بیاوردم۔" (ص ۱۵۰)

ہندوؤں کی عید کے سلسلہ میں پھر لکھتا ہے

"فراز آورندۂ ایں کتاب ابوسعید عبدالحیٰ بن الضحاک چنیں شنیدم از خواجہ ابوریحان محمد بن احمد البیرونی رحمہ اللہ (ص ۲۵۲)

۲۔ گردیزی کا دوسرا اہم ماخذ ابوعبداللہ[3] محمد بن احمد جیہانی کی ایک کتاب "المسالک والممالک"

---

[1] دیکھئے زین الاخبار ص ۲۱۰، [2] ۲۵۲، [3] ابوعبداللہ محمد بن احمد بن نصر جیہانی جمادی الاول ۳۰۲ھ میں وزیر ہوا، اس کی وفات ۳۳۰ھ میں ہوئی، وہ نہایت فاضل اور دانشمند تھا، متعدد کتابوں کا مؤلف تھا جن میں کتاب المسالک والممالک بہت مشہور تھی مگر منجملہ اور تصانیف کے یہ کتاب بھی مفقود ہے، البتہ اس کے اجزاء بعد کے مصنفین کی کتابوں میں مل جاتے ہیں، دیکھئے مینورسکی: شرف الزماں طاہر مروزی، مقدمہ ص ۶ ببعد۔ خود گردیزی نے جیہانی کی بابت لکھا ہے:۔

اگرچہ یہ کتاب مفقود ہے لیکن بعد کے مصنفوں نے اس سے کافی استفادہ کیا ہے اور ان کی تالیفات میں ابوعبداللہ جیہانی سامانی بادشاہ نصر بن احمد (۳۰۱ - ۳۳۱ م) کا وزیر صاحب تصانیفِ عدیدہ تھا مگر اب اس کی کوئی کتاب نہیں ملتی۔ زین الاخبار میں بھی جیہانی کا تین جگہ ذکر آیا ہے پہلی بار نصر بن احمد کے ذیل میں جس کے دربار میں اس کو وزارت کا عہدۂ جلیلہ عطا ہوا تھا۔ دوسری بار معارف ہندواں کے ذیل میں لکھتا ہے

"چنیں گوید: ابو عبداللہ جیہانی اندر کتاب تواریخ کہ او کردہ است کہ ایشاں ہفت گروہ اند، اوّل را ساکبتری گویند" الخ (ص ۲۸۶)

تیسری بار اسی ذیل میں پھر لکھتا ہے

"چنیں گوید ابو عبداللہ جیہانی کہ ہندواں را نود و نہ فرقہ است اندملت" الخ (ص ۲۸۸)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۳)، صاحب تدبیرش ابو عبداللہ محمد بن احمد الجیہانی بود، کارہا بر وجہ نیکوتر گرفت و ہمی راند، و ابو عبداللہ جیہانی مردے دانا بود و سخت ہوشیار و چابک و فاضل، و اندر ہمہ چیزہا بصارت داشت و او را تالیفہای بسیار است اندر ہر فنی و علمی، و چوں او بہ وزارت نشست بہ ہمہ ممالک جہاں نامہ نوشت و رسمہای ہمہ درگاہہا و دیوانہا بخواست تا نسخت کردند و بنزدیک او آوردند چوں ولایت روم و ترکستان و ہندوستان و چین و عراق و شام و مصر و زنج و زابل و کابل و سند و عرب، ہمہ رسمہای جہاں بنزدیک او آوردند و آں ہمہ نسختہا پیش نہاد الخ (زین الاخبار ص ۱۵)

ابو عبداللہ محمد جیہانی کا بیٹا ابو عبداللہ احمد ۳۶۵ھ میں منصور بن نوح کا وزیر مقرر ہوا، اسی سال منصور کا انتقال ہو گیا، اس لئے احمد کی وزارت بھی دیر تک قائم نہیں رہی (رک زین الاخبار ص ۱۶۴)

، دونوں اقتباسات میں گردیزی نے جیہانی کی کتاب کا اصل نام نہیں لکھا ہے البتہ معارف ترکان کے
ذیل میں اس کی کتاب مسالک و ممالک کا ذکر اسی طرح آیا ہے۔

"این بود تمامی معارف ترکان کہ یافتہ شد بعضی از مسالک[1] و ممالک جیہانی" (ص ۲۷۹)

۔ گردیزی نے عبید اللہ بن عبد اللہ معروف بہ ابن خرداذبہ[2] کی بعض کتابوں سے بھی استفادہ
ہے چنانچہ معارف ترکان کے ذیل میں "بعضے از کتاب عبید ۔ خرداذبہ" کا ذکر آیا ہے اور
ں سے پہلے بھی اس کی یہ عبارت ملتی ہے۔

"عبید اللہ بن خرداذبہ کہ ہر کس اندر چنیں شود بہ علم دانا و بزرگ گردد، الخ (ص ۲۶۹)

۔ مشہور دانشمند عبد اللہ بن المقفع[3] کی بعض تصانیف سے گردیزی نے استفادہ کیا ہے چنانچہ
ن الاخبار میں وہ لکھتا ہے

"و چنیں گوید: ابو عمرو عبد اللہ ابن المقفع اندر کتاب ربع الدنیا کہ چون نوح پیغمبر
علیہ السلام از کشتی بیرون آمد"، الخ (۲۵۶)

---

[1] یہ کتاب سات جلدوں میں تھی مگر اب ناپید ہے سوائے ان اجزا کے جو دوسری کتابوں میں منقول ہیں
[2] ابن خرداذبہ ۲۲۰ھ میں پیدا ہوا اور ۳۰۰ھ میں اس نے وفات پائی۔ وہ مختلف کتابوں کا مصنف ہے
ایں سب سے اہم المسالک والممالک ہے جو ۲۳۲ھ کے قریب تالیف ہوئی۔ یہ کتاب ۱۸۷۹ء میں لائیڈن
سے طبع ہو چکی ہے۔ اس کی دوسری کتاب "مختار من کتاب اللھو والملاھی" بھی موجود ہے۔ مرحوم استاد سعید
ہی کا خیال ہے کہ زین الاخبار میں ان دونوں کتابوں سے استفادہ نہیں ہوا بلکہ ایسا معلوم ہوتا
ہے اس کی ایک دوسری کتاب "جمہرۃ انساب الفرس" سے استفادہ کیا گیا ہے۔
[3] عبد اللہ ابن المقفع عظیم
مصنف گذرا ہے، اس کے ذریعہ متعدد کتابیں یونانی سے عربی میں منتقل ہوئیں۔ اس کی تصانیف میں کتاب التاج
بلاغ الکبیر، ادب الصغیر، ترجمہ کلیلہ و دمنہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ۱۴۵ھ میں مقتول ہوا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے لغت

ایک اور جگہ ایک کتاب توضیح الدنیا کا نام ملتا ہے (ص ۲۷۹)

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ توضیح الدنیا ربع الدنیا کے بجائے غلط درج ہوگیا ہو، استاد حبیبی نے توضیح کی ایک دوسری شکل توزیع درج کی ہے (زین الاخبار ص ج)

۵۔ استاد نفیسی نے لکھا ہے کہ ظاہراً امرای خراسان کا باب ابوعلی سلامی متوفی ۳۰۰ھ کی کتاب ولاۃ خراسان[1] سے ماخوذ ہے حبیبی صاحب بھی اس رائے سے متفق ہیں لیکن گردیزی نے اس ماخذ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ (مقدمہ ص ج)

۶۔ گردیزی نے ابوزید[2] حکیم بلخی مشہور جغرافیہ نویس (۲۳۵۔ ۳۲۲ھ) کی تصنیف سے استفادہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے

"ابوزید حکیم چنین گوید کہ ترکان غزچگاں چینیان اند" الخ (ص ۲۷۹)

اگرچہ ابوزید ۶۰ کتابوں کا مؤلف بتایا جاتا ہے منجملہ ان کے صور الاقالیم ہے لیکن معلوم نہیں گردیزی نے یہ قول کس کتاب سے نقل کیا ہے۔

۷۔ گردیزی نے ایک واقعہ اپنے ایک ہم وطن اور معاصر احمد بن ودک گردیزی سے نقل کیا ہے، لیکن معلوم نہیں کہ یہ واقعہ اس نے اس سے سن کر یا اس کی کتاب سے لکھا ہے (ص ۲۸۷)

۸۔ استاد عبدالحی حبیبی نے بعض شواہد کی بنیاد پر یہ ثابت کیا ہے کہ گردیزی نے ابن رستہ (متوفی ۲۹۰ھ[3]) کی کتاب "الاعلاق النفیسہ" سے بھی استفادہ کیا ہے۔

---

[1] التاریخ فی اخبار ولاۃ خراسان ناپید ہے لیکن اس کے بعض اجزاء بعد کے مصنفین کی تحریروں میں مل جاتے ہیں،

[2] ابوزید احمد بن سہیل بلخی کا شمار نوابغ روزگار میں ہوتا ہے۔ اس دور کے علوم و فنون کے جملہ شعبوں پر اس نے قلم اٹھایا ہے، اس کی تصانیف کی ایک طویل فہرست لغت نامہ دہخدا میں ملتی ہے۔ [3] ابوعلی احمد بن عمر بن رستہ اصفہانی جغرافیہ نویس، قرن سوم۔ اس کی کتاب ۱۸۹۱ء میں لیڈن سے طبع ہو چکی ہے۔

زین الاخبار اپنی اہمیت کے اعتبار سے ایک بے نظیر تصنیف ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کے بعض مندرجات ترکوں اور ہندوؤں کے علوم[1] و فنون وغیرہ سے متعلق صرف اسی کتاب میں تفصیل سے ملتے ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوؤں کے علوم کا بڑا ماخذ ابوریحان کی کتاب الہند ہے لیکن ترکوں کے علوم کا کوئی اپنا قدیم ماخذ سوائے ابن خرداذبہ کی کتاب کے باقی نہیں رہا ہے۔ ہندوؤں کے علوم کا یہ تیسرا اہم[2] ماخذ قرار پائے گا، قابل ذکر بات یہ ہے کہ ابوریحان اور ابن خرداذبہ کی کتابیں عربی میں ہیں اور زین الاخبار فارسی میں، گویا فارسی میں ہندوؤں کے علوم پر یہ سب سے قدیم ماخذ ہے۔

اس کتاب کی زبان بھی خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔ اس کی زبان سادہ اور رواں ہے اور بعض لحاظ سے تاریخ بیہقی سے زیادہ قابل قدر ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کے بارے میں سعید نفیسی صاحب کا حسب ذیل بیان نہایت درجہ قابل توجہ ہے۔

"چہ از حیث روش فارسی نویسی بسیار بلند و بسیار سادہ و روان، وھم از حیث نکات تاریخی کہ در ہیچ کتاب دیگر نیست برای ایرانیان بیش از ہر تاریخ نامۂ دیگری اہمیت دارد" (ص ۳۱۳)

زین الاخبار گردیزی کے نسخے کمیاب ہیں، اس کے صرف دو نسخے موجود ہیں ایک کنگز کالج (Kings College) کیمبرج میں جس کی کتابت شاید ۱۰۳۰ھ میں ہوئی اور

---

[1] ہندوؤں کے علوم سے گردیزی کو خصوصی دلچسپی تھی چنانچہ زین الاخبار میں لکھتا ہے

"بدان کہ تاریخہای کہ مستعمل است و ہمہ منجمان و اہل حساب آن را استعمال کنند سہ تاریخ است، چون رومی و عربی و فارسی و من باین ہر سہ تاریخ ہندوان فہم کردم الخ (ص ۲۸۷)

[2] گردیزی کے نصف صدی شرف الزمان طاہر مروزی گذرا ہے۔

دوسرا نسخہ کتاب خانہ بادلیان آکسفورڈ میں ہے جو ۱۲ ذی الحجہ ۱۱۹۶ھ میں لکھا گیا۔ یہ دونوں نسخے ہندوستان میں تحریر ہوئے اور ایک دوسرے کی ہوبہو نقل ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اس اہم کتاب کا فقط ایک ہی نسخہ اور وہ بھی ناقص حالت میں باقی رہ گیا تھا اور اسی سے یہ دونوں نسخے تیار ہوئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ گردیزی کے ہم عصر یعنی ابوالفضل بیہقی کی تاریخ بیہقی[1] کے نسخے بھی ناقص حالت ہی میں دستیاب ہیں اور جس طرح زین الاخبار کے نسخوں کی بنیاد محض ایک ناقص نسخے پر ہے جس میں درمیان سے بھی سیکڑوں اوراق غائب ہیں اسی طرح تاریخ بیہقی میں بھی شروع اور درمیان سے پچاسوں اوراق غائب ہیں۔ عالم اسلام کو منگولوں سے جو بڑے نقصانات ہوئے ان میں سے اہم کتابوں کی بربادی بھی ہے۔ اسی بربادی میں زین الاخبار، تاریخ بیہقی اور لباب الالباب وغیرہ کو نقصان پہونچا۔

زین الاخبار اور اس کے مصنف کا نام ایک نسخے پر خط شکستہ میں اس طرح لکھا ہوا ہے۔

ھو اللہ اکبر جل جلالہ

تاریخ زین الاخبار، من تصنیف ابوسعید عبدالحیٔ ابن الضحاک بن محمود گردیزی، واقع

---

[1] تاریخ بیہقی تین جلدوں میں لکھی گئی تھی جو دولت غزنوی کی ابتدائے سلطان ابراہیم بن مسعود (۴۵۱ھ – ۴۹۲ھ) کے اوائل تک کے واقعات پر مشتمل ہے لیکن اب اس کے چند حصے ہی باقی ہیں جو سلطان مسعود بن محمود (م: ۴۳۲ھ)، آل خوارزم حکومت التون تاش کے حالات میں ہیں۔ یہ باقی ماندہ تاریخ دفعتہً شروع ہو جاتی ہے گویا ابتدا، درمیان اور آخر سے سیکڑوں صفحے غائب ہیں اور اسی ناقص حالت میں تین بار طبع ہو چکی ہے، اس اہم تاریخ کی دریافت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

چہاردہم شہر ربیع الثانی روز پنجشنبہ سنہ ۲۷ محمد شاہی ابتیاع نمودہ امانت از سبحانہ تعالیٰ است

اس کتاب کی اہمیت کی وجہ سے عرصہ سے فضلا اس کی طرف متوجہ رہے لیکن اچھے نسخے کی نایابی اس کی اشاعت میں مانع رہی ہے۔ ۱۸۹۳ - ۱۸۹۴ - ۱۸۹۷ء میں پیٹرس برگ میں روسی ترجمہ کے ساتھ مشہور روسی دانشمند بارتھلڈ نے اسباب و معارف ترکان کے حصہ کو شائع کیا۔ اس کے بعد اسی حصہ کو ۱۹۰۳ء میں خاورشناس گزاکون نے دوبارہ شائع کیا۔ بارتھلڈ نے ۱۸۹۸ء میں تاریخ خراسان سے متعلق حصہ پیٹرس برگ میں شائع کیا۔ ۱۹۲۴ء میں اسی حصہ کو جس کو بارتھلڈ شائع کر چکے تھے، مرزا عبداللہ غفاروف نے نشر کیا۔ اس کا ایک حصہ جا امرائے خراسان سے لے کر باب ہفتم کے خاتمہ تک ڈاکٹر محمد ناظم استاد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تصحیح سے ۱۹۲۸ء میں برلن سے شائع ہوا اور یہی حصہ دوبارہ ۱۳۱۵ شمسی (۱۹۳۷ء) میں تہران میں چھپا جس پر مرزا محمد قزوینی کا مقدمہ تھا۔ ۱۳۲۵ فروردین (۱۹۵۰ء) میں جشن نامۂ مغاں سے متعلق حصہ یغما میں شائع ہوا۔ مرحوم سعید نفیسی نے ۱۳۲۷ شمسی (۱۹۶۲ء) میں طبقۂ چہارم سے لے کر باب ہفتم کے خاتمہ تک کتابی شکل میں ایک اچھے دیباچے کے اضافے کے ساتھ شائع کیا۔ آخر میں استاد عبدالحئی حبیبی نے ۱۳۴۷ھ (۱۹۶۹ء) میں پوری تاریخ زین الاخبار دونوں موجودہ نسخوں اور شائع ہوئے حصوں کی مدد سے بنیاد فرہنگ ایران کی طرف سے شائع کیا جس کے مندرجات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مقدمہ مصحح الف ـ د، متن کتاب ۱ ـ ۲۹۹؛ فہرست و تعلیقات ۳۰۱ ـ ۳۵۱)

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مشہور مستشرق مینورسکی نے اس کتاب کا ۱۹واں باب جو ہندوؤں کے علوم سے متعلق ہے انگریزی میں ترجمہ کر کے ۱۹۴۸ء میں لندن سے شائع کیا۔ اس ترجمہ اور اس کے تعلیقات سے اسلامی تاریخ اور جغرافیہ پر مترجم کی غیر معمولی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے مینورسکی کے تحفۂ ارمغان ہندی

کی طبائع حیوان کو اسی طرح انگریزی کے قالب میں ڈھالا تھا، اس سے زین الاخبار کے ترجمے اور تحشیہ میں مدد لی گئی ہے۔

زین الاخبار کے مطبوعہ نسخے کی خصوصیت ہے کہ استاد حبیبی نے اس کی تصحیح میں بڑی توجہ صرف کی ہے۔ خصوصاً وہ حصے جو ترک، چین اور ہندوستان کے علوم وغیرہ سے متعلق تھے، ان کی تعلیم میں انھوں نے اس موضوع پر جتنے مواد ملے اُن سب کا احاطہ کیا ہے، ان کی فہرستیں بھی بڑی سودمند ہیں، ایک فہرست میں نوادر لغات جمع کر دئے گئے ہیں، اور دوسری میں چند لغت کے بارے میں مفصل بحث ملتی ہے۔ آخر میں نفیسی اور قزوینی کے مقدمات بھی درج ہیں، جن سے کتاب کی افادیت میں خاصی مدد ملتی ہے، لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ چونکہ زین الاخبا کے نسخے ناقص اور نامکمل ہیں، اس لئے مطبوعہ نسخہ بھی ناقص اور نامکمل ہی ہے اور جب تک کوئی دوسرا نسخہ اور نہ مل جائے، اس کے نقائص دور نہیں ہو سکتے لیکن اس کی ابھی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

خیّام

خیام کے سوانح، تصنیفات اور فلسفہ پر تبصرہ، فارسی رباعی گوئی کی تاریخ، اور خیام کی رباعیات پر مفصل بحث، آخر میں خیام کے چھ نایاب عربی و فارسی فلسفیانہ رسالوں کا ضمیمہ اور اسکی رباعیات کے ایک مستند ترین قلمی نسخہ کی نقل شامل ہے، خیام پر یہ سب سے مفصل، مکمل، جامع اور محققانہ سب سے پہلی کتاب لکھی گئی ہے، وہ اپنے عہد میں ایک رباعی گو شاعر سے کہیں زیادہ ایک فلسفی، منجم، هیئت دان حکیم اور طبیب کی حیثیت سے مشہور تھا، اس کتاب میں اسکی انہی حیثیتوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ از مولانا سید سلیمان ندوی طبع دوم عکسی، معارف پریس اعظم گڑھ

قیمت ۔۔۔ ۶۵ منیجر

امامِ زعفرانی

از ۔ حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی، رفیق دار المصنفین،

امام شافعی کے بغدادی تلامذہ میں سب سے نمایاں، ان کی فقہ قدیم کے سب سے بڑے راوی اور اپنے ہم عصروں اور ہم سروں میں سب سے زیادہ ممتاز نام امام زعفرانی کا ہے، جو فصیح اللسان اور بہت بڑے زبان دان تھے۔ ان کا پورا نام حسن بن محمد بن صباح ہے، ابو علی کنیت ہے، بغدادی اور زعفرانی دونوں نسبتوں سے معروف ہیں، سنہ ولادت کا ذکر کہیں نہیں ملتا، لیکن ایک اندازہ کے مطابق وہ ۱۷۵ھ یا اسی سے قریب تر برسوں میں پیدا ہوئے ہونگے کیونکہ جب امام شافعی ۱۹۵ھ میں بغداد تشریف لائے تو خود امام زعفرانی کے بقول انکے چہرہ پر ابھی خط سبزہ کا نمو بھی نہ ہوا تھا۔[1] زعفرانی کی نسبت ایک گاؤں زعفرانیہ کی جانب ہے اس نام کے دو گاؤں ہیں، ایک تو ہمدان سے چند میل کے فاصلہ پر ہے، جہاں کے ابو العلاء اور ابن ابی شیبہ کے استاد ابو یسرہ زعفرانی مشہور ہیں، اور دوسری بستی بغداد کے جوار میں ہے، امام زعفرانی کا تعلق اسی گاؤں سے ہے،[1] امام ذہبی کا خیال ہے کہ امام زعفرانی کی نسبت محلہ زعفران سے متعلق ہے، لیکن امام ابن سبکی اس کی تردید کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ امام زعفرانی

---

[1] وفیات:۔ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۲۹۔ نیز ملاحظہ ہو معجم البلدان :۔ یاقوت حموی ج ۴ ص ۳۹۰، ومراۃ الجنان :۔ یافعی مالکی ج ۲ ص ۱۱۱،

حصول علم کی غرض سے بغداد آئے، اور ایک محلہ میں جو باب الشعیر سے کرخ تک پھیلا ہوا تھا[1] قیام کیا یہاں تک کہ وہ محلہ امام زعفرانی کی شہرت کے ساتھ ان سے منسوب ہو کر مشہور ہو گیا[2]
اس باب میں قول فیصل خود امام زعفرانی کا بیان ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب امام شافعیؒ کی مجلس میں پہلی بار میں نے کتاب الرسالہ کی قرأت کی تو امام شافعی نے دریافت کیا تم عرب کے کس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہو میں نے عرض کیا کہ میں عرب نہیں ہوں، زعفرانیہ دیہات کا رہنے والا ایک دیہاتی ہوں، امام شافعی یہ سن کر خوش ہوئے اور فرمایا، تب تو تم اس گاؤں کے گل سر سبد ہوئے[3]

امام زعفرانی کے اساتذہ و شیوخ میں جلیل القدر محدثین فقہا اور اصحاب کمال مثلاً سفیان بن عیینہ، عبدہ بن حمید، عبد الوہاب ثقفی، وکیع بن جراح، ابن عطار، ابن علیہ، عفان بن مسلم، یحییٰ بن عباد، شبابہ بن سوار، سعید بن سلیمان واسطی اور یزید بن ہارون کے سے اساتذہ فن نظر آتے ہیں،[4] اور اس سلسلۃ الذہب میں سب سے زیادہ درخشاں امام شافعی کی ذات گرامی ہے، وہ بغداد ۱۹۵ھ میں تشریف لائے اور یہاں تقریباً دو برس قیام کیا، اس عرصہ میں انھوں نے عبد الرحمٰن بن مہدی کی خواہش پر مشہور زمانہ کتاب الرسالہ کی تالیف اور کتاب الحجۃ کی تصنیف کی، ابن عبد البر لکھتے ہیں کہ اسی دور میں امام زعفرانی نے امام شافعی سے تقریباً تیس رسالوں پر مشتمل ان کی کتاب پڑھی، اور ان کا املا کیا، ابن عبد البر کا خیال ہے کہ یہ رسالے کتاب البغدادی یا کتاب قدیم کے نام سے مشہور ہیں،[5] امام زعفرانی فرماتے ہیں کہ تب ہم امام شافعی کے رسالوں کو ایک ہی دن میں لکھتے، اور

۱؎ طبقات کبریٰ، سبکی ج ۱ ص ۲۵۰، تاریخ بغداد، خطیب بغدادی ج، ص ۴۰۰ ـ ۲؎ ایضاً

.... ۳؎ تاریخ بغداد: خطیب بغدادی ج، ص ۴۰۰، معجم البلدان ج ۳ ص ۹۰۳ ۴؎ ایضاً و طبقات کبریٰ ج ۱ ص ۲۵۱ ۵؎ الانتقاء، ابن عبد البر ص ۹۹،

پڑھتے تھے، اس وقت ہم ان کی اہمیت کے بارہ میں زیادہ سنجیدہ نہ تھے اور نہ ہمارے سان دگمان میں یہ بات تھی کہ ایک دن ان کی اہمیت بہت زیادہ ہو جائے گی، ان کی اہمیت اس وقت ان کی نظر میں اس لیے نہ تھی کہ وہ اس وقت کوفیوں (حنفیوں) سے مرعوب تھے،[1] بغداد میں امام شافعی کی تشریف آوری پر یہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور علم فقہ میں اس درجہ مہارت دکاملیت حاصل کی کہ امام شافعی کے مصر تشریف لے جانے کے وقت وہ عراق میں ان کے طرز اجتہاد اور طریق استنباط کے نمایاں ترین ترجمان ونمایندہ ہو گئے۔

بغداد اس وقت حجاز ومصر کے برعکس حنفی مکتب فکر کا سب سے بڑا مرکز تھا، اور یہاں کثرت سے علماء امام ابو حنیفہؒ کے علم اور فقہ سے متاثر تھے، امام زعفرانی بھی ان طالب علموں میں تھے جو حنفی المسلک تھے لیکن شاید فطری میلان اور علم حدیث سے خاص شغف کی بنا پر جس کا اندازہ ان کے مذکورۂ بالا اساتذہ کے ناموں سے ہوتا ہے، امام شافعیؒ کی آمد کے موقع پر وہ کشاں کشاں ان کی خدمت میں سب سے پہلے پہونچے اور نوعمری کے باوجود اپنی ذہانت، لیاقت اور غیر معمولی فہم وادراک کی وجہ سے امام شافعی کے مقرب خاص ہو گئے، بغداد میں امام شافعیؒ کی مجلس میں شریک ہونے والوں میں امام احمد بن حنبل، امام ابو ثور، اور کرابیسی کی سی عظیم ہستیاں تھیں، امام احمد بن حنبلؒ تو امام شافعیؒ کی مجلس کے مستقل شرکاء میں سے تھے، امام زعفرانی فرماتے ہیں کہ میں جب بھی امام شافعیؒ کی مجلس میں حاضر ہوا یا جب بھی کچھ بھی پڑھا تو امام احمد بن حنبلؒ کو موجود پایا،[2] سب سے پہلی مرتبہ امام شافعیؒ کی مجلس علم میں یہ سب ہی حضرات موجود تھے،

---

[1] تاریخ بغداد خطیب ج ۷، ص ۴۰۸ [2] طبقات شیرازی ص ۸۸

اور جب امام شافعیؒ نے قرأت کتاب کے لئے دریافت کیا کہ تم لوگوں میں سے کون کتاب خوانی کرے گا؟ تو یہ حضرت باوجود اپنی وجاہت علمی کے خاموش رہے، امام شافعیؒ کی جلالتِ شان، ان کے علمی دبدبہ اور بے مثل زبان دانی کے سامنے کتابوں کی قرأت یوں بھی آسان نہ تھی، لیکن امام زعفرانی نے اس پر لبیک کہا، وہ کہتے ہیں کہ میرے علاوہ کسی نے یہ جرأت نہ کی، حالانکہ میں سب سے نوعمر تھا، اور میرے چہرہ پر ابھی خط سبزہ تک کا ظہور نہ ہوا تھا[۱]۔ بعد میں اس واقعہ کو یاد کرکے وہ فرماتے کہ وانی لا عجب من انطلاق لسانی وجسارتی بین یدیہ ۔ کہ اب میں خود امام شافعیؒ کے حضور اس جسارت لسانی پر تعجب کرتا ہوں اور اس کے بعد وہ مستقل ان کی مجلس میں کتاب خوان ہوگئے، انھوں نے ان سب ہی رسالوں کی قرأت کی سوائے دو رسالوں کے کتاب المناسک اور کتاب الصلوٰۃ کے، جنھیں امام شافعیؒ نے خود ہی پڑھا، ابن حبان لکھتے ہیں کہ احمد بن حنبلؒ اور ابو ثورؒ امام شافعیؒ کی مجلس میں حاضر ہوتے لیکن قرأت کا امتیاز امام زعفرانی کو حاصل ہوتا[۲]۔ امام شافعیؒ کو ان پر مکمل اعتماد تھا، چنانچہ ۱۹۸ھ میں جب وہ دوبارہ چند مہینوں کے لئے بغداد تشریف لائے تو امام کرابیسی نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی کتابوں کی اجازت انھیں دیدیں لیکن انھوں نے انکار کیا اور فرمایا کہ زعفرانی کی کتابوں کو لو اور انھیں لکھ لو میں ان کتابوں کی اجازت تمھیں دیتا ہوں[۳]۔ لیکن امام زعفرانی کی جس صلاحیت نے امام شافعیؒ کو سب سے زیادہ متاثر کیا تھا، وہ ان کی عربی زبان میں مہارت وقدرت تھی، بغداد سے مصر تشریف لے جانے کے بعد بھی وہ اپنے اصحاب مصر کے سامنے امام زعفرانی کی اس صلاحیت کو مدح

---

[۱] تہذیب الاسماء، نووی ج ۱ ص ۱۶۰ و تاریخ بغداد و طبقات کبری۔ [۲] وفیات، ابن خلکان ج ۱ ص ۲۲۵ [۳] الانتقاء، ابن عبد البر ص ۷۶۔

وستائش کے الفاظ سے یاد کیا کرتے تھے، امام مزنی فرماتے ہیں کہ ایک بار ہمارے سامنے امام شافعیؒ نے فرمایا کہ میں نے بغداد میں ایک غیر عربی ایسا پایا جس کی زبان دانی اور سخن فہمی پر مجھے اتنا ہی اعتماد ہے، جتنا کسی عربی الاصل پر ہو سکتا ہے، بسا اوقات تو یہ گمان ہوتا کہ اصلاً عربی تو وہ ہے اور میں نبطی وعجمی ہوں، کسی نے دریافت کیا کہ حضرت اس درجہ کامل و ماہر شخص کون ہے، فرمایا، زعفرانیؒ[۱] بعد کے تذکرہ نگاروں نے بھی انھیں لغت کا امام، اپنے دور کا سب سے فصیح اللسان[۲] اور اہل زبان تسلیم کیا[۳]، اس کے ساتھ ہی ان کی منزلت علمی کا بھی اعتراف اعلیٰ الفاظ میں ہوا، امام سبکی انھیں امام جلیل، فقیہ، محدث، فصیح، بلیغ اور ثقہ کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، امام ماوردی کا قول ہے کہ قدیم فقہ شافعی کے چار اہم راوی امام احمد بن حنبلؒ، ابو ثور، کرابیسی اور امام زعفرانی ہیں، ان میں زعفرانی کا شمار ثابت ترین راوی کی حیثیت سے ہوتا ہے، امام یافعی مالکی انھیں ذہین ترین علماء میں شمار کرتے ہیں، وہ ان کی حدیث وفقہ میں مہارت تامہ اور ان کی تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے فقہ شافعی کی مقبولیت میں ان کے اثرات کا اعتراف کرتے ہیں[۴]، امام نسائی انھیں ثقہ اور ابن المنادی انھیں احد الثقات قرار دیتے ہیں[۵]۔

امام شافعی کو اللہ تعالیٰ نے ایسی کشش اور جاذب قلب دلنواز شخصیت عطا کی تھی کہ ان کے آستانۂ علم پر باریاب ہونے والے طالب علم سے زیادہ ان کے عاشق و فدائی کی حیثیت رکھتے، یہ وصف ان کے ہر شاگرد کی سیرت میں کم وبیش مشترک نظر آتا ہے، امام زعفرانی کی مجلسوں میں بھی عام طور سے امام شافعی کا ذکر رہتا، وہ فرماتے کہ میں نے

---

[۱] طبقات کبریٰ، سبکی ج ۱ ص ۲۵۰ [۲] طبقات الشافعین ہدایۃ اللہ [۳] اعلام، زرکلی ج ۱ ص ۲۳۸ [۴] تاریخ بغداد، خطیب ج ۷ ص ۴۰۸ [۵] طبقات کبریٰ، سبکی ج ۱ ص ۲۵۱ [۶] مرآۃ الجنان، یافعی مالکی ج ۲ ص ۱۶۲ [۷] طبقات، سبکی ص ۲۵۱۔

یحییٰ بن معین سے جب امام شافعیؒ کے بارہ میں اظہار رائے کی خواہش کی تو انھوں نے فرمایا اگر جھوٹ بھی امام شافعیؒ پر حملہ آور ہو تو امام شافعیؒ کی شرافت نفس اس کو شکست دیدیگی[1] وہ فرمایا کرتے کہ اصحاب حدیث عالم خواب میں تھے، امام شافعیؒ نے انھیں بیدار کیا، اور اب جس کے ہاتھوں میں بھی قرطاس وقلم ہے، اس کی گردن پر امام شافعی کا احسان ہے،[2]

فتنہ خلق قرآن کے سلسلہ میں ان کے ابتلاء وآزمایش کا گو کوئی ذکر نہیں، تاہم بغداد میں جہاں ان کے ہم سبق امام احمد بن حنبل سخت شدائد ومحن کا نشانہ بنے ہوئے تھے، اور جہاں اہل کلام کے خلاف آواز بلند کرنا گویا آزمایشوں کو دعوت دینا تھا، امام زعفرانی اپنے موقف حق پر قائم رہے، وہ فرماتے کہ میں نے خود امام شافعی کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اہل کلام کے بارہ میں میرا یہ فیصلہ ہے کہ انھیں زدوکوب کیا جائے، اونٹوں پر بٹھا کر بازاروں میں ان کی تشہیر کی جائے، اور کہا جائے کہ یہ سزا ہے تارکین کتاب وسنت کی۔[3] اس قول کی تقریر وتصویب سے گویا خود امام زعفرانی اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔

امام سبکی دوسرے اصحاب شافعی کی طرح امام زعفرانی کے سب سے بڑے سوانح نگار ہیں، انھوں نے امام زعفرانی سے امام شافعی کی مروی کئی تفسیری اور حدیثی روایتیں اور مسائل نقل کئے ہیں، آیت کریمہ ما جعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ کی تفسیر تو یہ ہے کہ ایک آدمی بیک وقت مومن ومنافق، بدکار، ونیکوکار نہیں ہوسکتا، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ ایک ہی وقت میں ایک عورت کو بیوی اور باندی، اور ایک مرد کو ایک ہی وقت میں حقیقی اولاد اور متبنیٰ اولاد کا درجہ نہیں دیتا یا یہ کہ منافقین حضورؐ کے بارے میں کہتے تھے، کہ آپ کے دو دل ہیں ایک ہمارے ساتھ اور دوسرا صحابہ کے ساتھ ہے،

---

[1] طبقات کبری وتاریخ بغداد [2] وفیات الاعیان ابن خلکان ج ۱ ص ۲۲۹ [3] الانتقاء حافظ ابن عبدالبر ص ۸۰،

ان کے اس قول کی اللہ تعالےٰ تکذیب فرماتا ہے[۱] لیکن امام زعفرانیؒ، امام شافعیؒ سے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے کہ من قلبین سے مراد من الابوین ہے یعنی ایک بیٹا دو باپوں سے نہیں ہو سکتا، امام سبکی اسی قول کی تحسین کرتے ہیں[۲]۔

امام زعفرانی ہی سے ایک رافضی کے بارہ میں جو جنگ میں شریک ہوا تھا، یہ قول نقل ہے کہ اس کو مالِ غنیمت میں سے کچھ نہ ملے گا۔ اس لیے کہ اللہ تعالےٰ نے آیت فئے کے ذکر کے بعد فرمایا

والذین جاءوا من بعدھم یقولون ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ربنا انک رؤف رحیم۔ (حشر-۲)

(اور وہ [مال غنیمت] [ان لوگوں کے لیے بھی ہے) جو ان اگلوں کے بعد آئے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمارے اور ہمارے ان سب بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں، اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے بغض نہ رکھ، اے ہمارے رب تو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔

چونکہ رافضی نہ اس کا قائل ہے، اور نہ اس پر عامل، اس لیے وہ مال فئے (غنیمت) کا مستحق بھی نہیں[۳] امام سبکی لکھتے ہیں کہ امام شافعی، عبداللہ بن مبارک اور حضرت انسؓ کے سلسلہ سے منقول یہ روایت۔ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یتعوذ من البخل، امام زعفرانی ہی سے مروی ہے، اس کے علاوہ شبابہ بن سوار، حضرت معاویہؓ اور ابوبکر بکراوی

---

۱ مدارک التنزیل، نسفی ج ۳ ص ۲۲۲ ۲ طبقات کبری ص ۲۵۱ ۳ ایضاً

اور حضرت منکدر بن جابرؓ کے سلسلوں سے کئی اہم روایتیں بھی امام زعفرانی سے مروی ہیں، ایک اور روایت امام زعفرانی سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں منقول ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے سات کنکریوں سے رمی جمار کیا، اور اس طرح کھڑے ہوتے کہ کعبہ بائیں جانب اور عرفہ بائیں جانب تھا، پھر آپ نے فرمایا۔[1]

هذا المقام الذی انزلت علیه سورة البقرة۔ — یہی وہ جگہ ہے جہاں سورہ بقرہ نازل کی گئی تھی،

ان کے علاوہ عوالی کی بہت سی حدیثیں ایسی ہیں جنہیں سفیان بن عیینہ سے روایت کرنے میں وہ اور امام شافعیؒ شریک سلسلہ ہیں۔[2] امام بخاری نے بھی اپنی صحیح میں ان سے روایت حدیث کی ہے۔[3]

امام زعفرانی کے شب و روز حدیث و فقہ کی دقیقہ رسیوں اور نکتہ سنجیوں میں گزرتے تھے لیکن اسی کے ساتھ امام شافعیؒ کے اثر صحبت اور خود زبان پر ان کی بے مثل مہارت کی وجہ سے شعر و سخن کا ستھرا ذوق بھی ودیعت ہوا تھا، کبھی کبھی وہ خود بھی داد سخن دیتے، ان کے ایک شاگرد ابن مسروق ذکر کرتے ہیں، کہ ایک بار جب کہ امام زعفرانی کی نشست جاری تھی، ان کے ہم عصر، ہم درس اور ممتاز فقیہ ابو ثور تشریف لائے، کچھ دیر تبادلۂ خیال کے بعد جس میں کچھ نوک جھونک اور دلچسپ چوٹیں تھیں، وہ واپس چلے گئے، ان کے جانے کے بعد امام زعفرانی نے فرمایا، لو چند شعر ہو گئے ہیں، سنو یہ کہہ کر مندرجہ ذیل اشعار سنائے[4]

اسد آبین المجتبین جدال وقتال

---

[1] تاریخ بغداد ج، ص ۴۰۷، ۴۰۸۔ [2] توالی التاسیس عسقلانی ص ۴۰ [3] طبقات کبریٰ ص ۲۵۱ [4] تاریخ بغداد ج، ص ۴۰۷،

فاذا ما عز یا من ذالک فالحب محال

لا یطیب حب اذا ما لم یکن فیہ جدال

وامتناع من حبیب عندہ عز الوصال

ترجمہ:- محبت کرنے والے دلوں میں چھیڑ چھاڑ رضامندی و ناراضی رہتی ہی ہے، اگر ان میں یہ بات نہیں تو محبت دشوار ہے، محبت وہی اچھی ہے جس میں کچھ چوٹیں اور چشمکیں ہوں، محبوب کے وصل کی لذت اس کے بغیر مشکل ہے

ان اشعار کی سلاست، برجستگی اور خیال کی شوخی سے امام زعفرانی کے حسن ذوق کی ترجمانی ہوتی ہے، اچھے اشعار کی داد وہ ان کو گنگنا کر دیتے تھے، ایک موقع پر وہ یہ اشعار گنگنا رہے تھے۔

لا والذی تسجد الجباہ لہ مالی بما دون ثوبہا خبر

ولا بفیہا ولا ھممت بہ ما کان الا الحدیث والنظر

ترجمہ:- خدا کی قسم مجھے اس کے بدن اور چہرہ کی خبر نہیں، مجھے تو یار کی دید و شنید سے مطلب ہے

اشعار کی شوخی نے شاید مجلس کے کسی زاہد خشک شریک کو حیرت میں ڈالدیا، وہ پوچھ بیٹھے کہ یا ابا علی ان ھذا الیغنی بہ۔ اے ابو علی کیا یہ اشعار گنگنانے کے لائق ہیں، امام زعفرانی نے برجستہ فرمایا۔ ثکلتک، وھل یغنی الا بالشعر الجید برا ہو، ارے نفیس شعر ہی تو پڑھے جاتے ہیں۔[1]

تفسیر، حدیث، فقہ اور ادب کی اس جامع و باکمال ہستی نے رمضان المبارک ۲۶۰ھ میں وفات پائی[2] سنہ وفات کے بارہ میں تذکرہ نگاروں میں اختلاف ہے۔ سمعانی کی روایت ہے کہ

لہ تاریخ بغداد ج ۷، ص ۴۰۰، سلہ ایضاً و طبقات کبریٰ ج ۱ ص ۲۵۲

ربیع الآخر ۲۴۹ھ میں انتقال ہوا، ابن خلکان نے شعبان ۲۶۰ھ کا ذکر کیا ہے[۱] ایک روایت کے مطابق شعبان کے آخری دن انتقال ہوا[۲] عسقلانی سال وفات ۲۵۹ھ یا ۲۶۰ھ قرار دیتے ہیں، لیکن راجح روایت اول الذکر ہی ہے کہ امام نووی بھی اسی کی تصدیق کرتے ہیں[۳]

امام زعفرانی کو اللہ تعالیٰ نے سیرت کی پاکیزگی کے ساتھ بے نظیر حسن صورت کی نعمت سے بھی نوازا تھا، ان کی خوش خوئی و خوش روئی کے بارے میں طبقات سبکی میں ہے۔

لم یکن فی عصر الزعفرانی	امام زعفرانی کے زمانہ میں ان سے
احسن صورۃ منہ وانہ لم	بڑھ کر کوئی اور خوبصورت نہ تھا،
یتکلم فیہ احد لسوء[۴]	نیز ان کے بارے میں کسی نے کوئی
	نازیبا بات نہ کہی۔

اخلاق کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی کے باب میں امام احمد بن حنبلؒ کی یہ رائے بھی لائق ذکر ہے، جو انھوں نے اپنے برادر زادہ کو مخاطب کرتے ہوئے ظاہر کی تھی، کہ مابلغنی عنہ الا بالخیر۔ یعنی ان (امام زعفرانی) کے بارے میں تو مجھے خیر کی خبر ہی ملتی رہی[۵]

امام زعفرانی کی عظمت و اتقی اور جلالت علمی کا اندازہ ان کے شاگردوں کی فہرست سے ہوتا ہے، جس میں امام بخاری، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ جیسے عظیم المرتبت محدثین کے اسمائے گرامی شامل ہیں، یعنی سوائے امام مسلم کے باقی ائمہ صحاح ان کے سرچشمۂ علم سے فیضیاب ہوئے۔ ان حضرات کے علاوہ ابو القاسم بغوی، ابن صاعد، زکریا ساجی، ابن خزیمہ، ابوعوانہ، محمد بن مخلد، ابوسعید بن الاعرابی، اسماعیل بن عباس، ابوعبید بن حربویہ اور

---

[۱] وفیات ج ۱ ص ۲۲۹ [۲] تاریخ بغداد ج ۷، ص ۴۱۰ [۳] تہذیب الاسماء: نووی ج ۱ ص ۱۶۰
[۴] طبقات السبکی ج ۱ ص ۲۵۱ [۵] تاریخ بغداد ج ۷، ص ۴۱۰

محدثین وفقہاء کا ایک پورا طبقہ ان کے سلسلۂ تلمذ میں نظر آتا ہے[۱] یہ وہ تلامذہ ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی ذات کے لحاظ سے انجمن اور علم وعمل کی آبرو اور اپنے استاد وشیخ کے لیے متاع ناز ہے، البتہ تصنیفات کا ذکر نہیں ملتا، وہ امام شافعیؒ کے اقوال قدیم کے راوی ہیں، اور امام شافعیؒ کے مصر تشریف لے جانے کے بعد ان کے قدیم اقوال و آرار پر مشتمل ان کی فقہ کا بیشتر حصہ متروک ہوگیا، اس لیے امام زعفرانی کے املا کردہ رسالوں کے مقبول اور رائج ہونے کا امکان بھی زیادہ نہ رہا، انھوں نے امام شافعیؒ سے تیس رسالوں پر مشتمل ایک کتاب پڑھی تھی جس کا املا بھی کیا، یہ کتاب کتاب البغدادی یا کتاب قدیم کے نام سے مشہور ہوئی[۲] ابوعاصم کا قول ہے کہ کتاب عراقی یعنی کتاب الام کا حصۂ قدیم امام زعفرانی ہی سے منسوب ہے[۳] لیکن اب یہ رسالے نایاب ہیں، امتداد زمانہ اور رد وقبول کے عمل کے نتیجہ میں اب صرف ان کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے، امام زعفرانی کے ایک قول سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید ان کی چند کتابیں اور بھی تھیں، ابومحمد بن بنت الشافعی، ان کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ لوگ میری کتابوں میں کتاب وسنت کے مفاہیم کا مطالعہ کریں، اور انھیں عام کریں۔ خواہ وہ ان معانی ومطالب کو مجھ سے منسوب کریں یا نہ کریں، ان کی یہ خواہش، ان کے استاد امام شافعیؒ کی خواہش کے عین مطابق ہے، امام شافعیؒ نے اپنے مرض الموت میں تقریباً انہی الفاظ میں اپنی آرزو کا اظہار کیا تھا۔

---

[۱] طبقات السبکی، شیرازی، ابن ہدایہ، تاریخ بغداد و وفیات الاعیان وغیرہ۔ [۲] الانتقاء: ابن عبدالبر ص ۱۰۰۔ [۳] طبقات کبری ۱: ۲۵۱ [۴] ایضاً۔

ربیع الآخر ۲۴۹ھ میں انتقال ہوا، ابن خلکان نے شعبان ۲۶۰ھ کا ذکر کیا ہے[۱]، ایک روایت کے مطابق شعبان کے آخری دن انتقال ہوا[۲]۔ عسقلانی سال وفات ۲۵۹ھ یا ۲۶۰ھ قرار دیتے ہیں، لیکن راجح روایت اول الذکر ہی ہے کہ امام نووی بھی اسی کی تصدیق کرتے ہیں[۳]۔

امام زعفرانی کو اللہ تعالےٰ نے سیرت کی پاکیزگی کے ساتھ بے نظیر حسن صورت کی نعمت سے بھی نوازا تھا، ان کی خوش خوئی وخوش روئی کے بارے میں طبقات سبکی میں ہے۔

لم یکن فی عصر الزعفرانی	امام زعفرانی کے زمانہ میں ان سے
احسن صورۃ منہ وانہ لم	بڑھ کر کوئی اور خوبصورت نہ تھا،
یتکلم فیہ احد لسوء[۴]	نیز ان کے بارے میں کسی نے کوئی
	نازیبا بات نہ کہی۔

اخلاق کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی کے باب میں امام احمد بن حنبلؒ کی یہ رائے بھی لائق ذکر ہے، جو انھوں نے اپنے برادر زادہ کو مخاطب کرتے ہوئے ظاہر کی تھی، کہ ما بلغنی عنہ الا بالخیر۔ یعنی ان (امام زعفرانی) کے بارے میں تو مجھے خیر کی خبر ہی ملتی رہی[۵]۔

امام زعفرانی کی عظمت واقعی اور جلالت علمی کا اندازہ ان کے شاگردوں کی فہرست سے ہوتا ہے، جس میں امام بخاری، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ جیسے عظیم المرتبت محدثین کے اسمائے گرامی شامل ہیں، یعنی سوائے امام مسلم کے باقی ائمہ صحاح ان کے سرچشمۂ علم سے فیضیاب ہوئے، ان حضرات کے علاوہ ابو القاسم بغوی، ابن صاعد، زکریا ساجی، ابن خزیمہ، ابوعوانہ، محمد بن مخلد، ابوسعید بن الاعرابی، اسماعیل بن عباس، ابوعبید بن حربویہ اور

---

۱ وفیات ج ۱ ص ۲۲۹ ۲ تاریخ بغداد ج ، ص ۰۰، ۳ تہذیب الاسماء: نووی ج ۱ ص ۱۶۰

۴ طبقات: سبکی ج ۱ ص ۲۵۱ ۵ تاریخ بغداد ج ، ص ۰۰،

محدثین و فقہاء کا ایک پورا طبقہ ان کے سلسلۂ تلمذ میں نظر آتا ہے[1] یہ وہ تلامذہ ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی ذات کے لحاظ سے انجمن اور علم و عمل کی آبرو اور اپنے استاد و شیخ کے لیے متاع ناز ہے، البتہ تصنیفات کا ذکر نہیں ملتا، وہ امام شافعیؒ کے اقوال قدیم کے راوی ہیں، اور امام شافعیؒ کے مصر تشریف لے جانے کے بعد ان کے قدیم اقوال و آرا پر مشتمل ان کی فقہ کا بیشتر حصہ متروک ہوگیا، اس لیے امام زعفرانی کے املا کردہ رسالوں کے مقبول اور رائج ہونے کا امکان بھی زیادہ نہ رہا، انھوں نے امام شافعیؒ سے تیس رسالوں پر مشتمل ایک کتاب پڑھی تھی جس کا املا بھی کیا، یہ کتاب کتاب البغدادی یا کتاب قدیم کے نام سے مشہور ہوئی۔[2] ابو عاصم کا قول ہے کہ کتاب عراقی یعنی کتاب الام کا حصۂ قدیم امام زعفرانی ہی سے منسوب ہے[3] لیکن اب یہ رسالے نایاب ہیں، امتداد زمانہ اور رد و قبول کے عمل کے نتیجہ میں اب صرف ان کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے، امام زعفرانی کے ایک قول سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید ان کی چند کتابیں اور بھی تھیں، ابو محمد بن بنت الشافعی، ان کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ لوگ میری کتابوں میں کتاب و سنت کے مفاہیم کا مطالعہ کریں، اور انھیں عام کریں۔ خواہ وہ ان معانی و مطالب کو مجھ سے منسوب کریں یا نہ کریں، ان کی یہ خواہش، ان کے استاد امام شافعیؒ کی خواہش کے عین مطابق ہے، امام شافعیؒ نے اپنے مرض الموت میں تقریباً انہی الفاظ میں اپنی آرزو کا اظہار کیا تھا۔

---

[1] طبقات السبکی، شیرازی، ابن ہدایہ، تاریخ بغداد و وفیات الاعیان وغیرہ۔ [2] الانتقاء: ابن عبد البر ص ۱۰۰۔ [3] طبقات کبری ۱: ۲۵۱ [4] ایضاً۔

مطبوعات جدیدہ

شرح علی کتاب النفقات: تصحیح و تحشیہ مولانا ابوالوفا افغانی، تقطیع متوسط، کاغذ

عمدہ طباعت ٹائپ قیمت تحریر نہیں، ناشر:- مجلس احیاء المعارف النعمانیہ ۶۵-۱۴ جلال کوچہ حیدرآباد

کتاب النفقات تیسری صدی ہجری کے ایک ممتاز عالم ابوبکر احمد بن عمرو بن مہیر خصاف بغدادی کی تصنیف ہے، وہ دو واسطوں سے امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد تھے، ان کی یہ کتاب شرعی نان و نفقہ پر بہت قدیم ہے، اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں، جو سب ناپید ہیں، صرف صدر شہید عمر بن عبد العزیز بن مازہ بخاری (م ۵۳۶ھ) کی شرح کا ایک نسخہ مدینہ منورہ کے کتبخانہ شیخ الاسلام عارف حکمت بے میں اور دوسرا آستانہ میں موجود تھا، مولانا ابوالوفا افغانی نے ان دونوں کا عکس حاصل کرکے مقابلہ و تصحیح کے بعد ۱۳۶۶ھ میں پہلی دفعہ مجلس احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد سے شائع کیا، اب مجلس نے اس کا دوسرا اڈیشن شایع کیا ہے، پہلے اڈیشن کی طرح یہ بھی خصاف کے متن، صدر شہید کی شرح اور مولانا ابوالوفا کے مقدمہ و حواشی پر مشتمل ہے، نفقات کو اسلامی قانون میں بڑی اہمیت حاصل ہے، یہ ایک مسلمان پر خدا کے بندوں کا بڑا اہم اور ضروری حق ہے، قرآن مجید میں نکاح، طلاق، رضاع، اور وراثت کے ساتھ ساتھ اس کے احکام بھی بیان ہوئے ہیں، اس لحاظ سے بھی یہ کتاب بڑی اہم ہے، مقدمہ میں نفقات کی اہمیت، کتاب و شرح کی خصوصیات اور مصنف و شارح کے مختصر حالات دئے گئے ہیں، قدما کی نادر و کمیاب کتابوں کی تلاش و اشاعت مجلس احیاء المعارف کا خاص امتیاز اور بڑا کارنامہ ہے، اس کتاب کی اشاعت بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کے لئے اہل علم کو مجلس کا شکر گذار ہونا چاہئے۔ "ض"

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰ ستمبر ۱۹۸۰ء

معارف

مجلس دار المصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتّبہ

سیّد صباح الدّین عبد الرحمٰن

قیمت پندرہ ۱۵ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنّفین اعظم گڈھ

(کتابت سید اقبال احمد)

جلد ۱۲۶ ماہ شوال المکرم ۱۴۰۰ھ مطابق ستمبر ۱۹۸۰ء عدد ۳

مضامین

شذرات

اسلام کو چودہ سو سال ہو گئے، ذرا پیچھے مڑ کر یہ دیکھنا ہے کہ اس مدت میں اس کے پیرووں نے مختلف علاقوں میں کتنی حکومتیں قائم کیں اور کب تک برسراقتدار رہ کر ختم ہو گئیں،

خلافت راشدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد قائم ہوئی، لیکن اس کی مدت کل تیس برس رہی، اس عہد میں اس کے حدود حکومت ایران، عراق، شام، ایشیائے کوچک، فلسطین، مصر، لیبیا، طرابلس، بارقہ اور قبرص وغیرہ تک پھیلے ہوئے تھے، اس کے بعد بنو امیہ برسراقتدار ہوئے ان کی حکومت سنہ ۴۱ھ سے شروع ہو کر اکیانوے سال کے بعد سنہ ۱۳۲ھ میں ختم ہو گئی، اس دور میں حکومت کا دائرہ جتنا وسیع ہوا، وہ بعد میں نہ ہو سکا، یورپ میں ان کی فوج فرانس کے جنوب تک پہنچی، پورے اندلس پر ان کا قبضہ ہو گیا، بحر قلزم میں مجورکہ، منورکہ، ادیکہ، کارسیکہ، سارڈنیہ، کریٹ روڈس اور سائپرس پر ان کا پرچم لہرایا، صقلیہ اور یونان کا کچھ حصہ بھی ان کے زیر نگیں تھا، افریقہ میں جبرالٹر سے نہر سویز تک ان کا استیلا رہا، ایشیا میں سینائی کے صحرا سے منگولیا تک ان کی حکومت پھیلی ہوئی تھی، اڈورڈ گبن کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں عرب کا امپائر دو سو دن میں طے ہوتا تھا اس کی سرحد ہندوستان اور تاتاری کے علاقہ سے پھیل کر بحر اوقیانوس کے ساحل تک تھی،

بنو امیہ کو بنو عباس نے ختم کیا، لیکن بنو امیہ اندلس میں آٹھ سو برس تک حکومت کرتے رہے، اندلس کی

فتح ان کا ایک بڑا شاندار کارنامہ ہے، موسیو لیبان کا بیان ہے کہ "مورخین لکھتے ہیں کہ اندلس کو فتح کرنے کے بعد موسیٰ کا ارادہ تھا کہ فرانس اور جرمنی سے ہوتا ہوا قسطنطنیہ کو لیتا ہوا شام پہونچے اور اس تمام خطۂ عالم میں اسلام کا نور چمکائے، لیکن وہ دمشق طلب کر لیا گیا، جس کے بعد وہ اپنے اس ارادہ کو پورا نہ کر سکا، اس میں شک نہیں کہ وہ تمام یورپ کو مسلمان بنا لیتے اور ایک ہی دلہ میں کل متمدن اقوام میں اتحاد مذہبی پیدا کر دیتا، اور یورپ کو اس زمانہ تاریک سے بچا لیتا، جس سے اندلس عربوں کی بدولت محفوظ رہا"، اندلس کی حکومت شروع میں دمشق کے بنو امیہ کے ماتحت رہی، مگر پھر یہاں ایک علحدہ خلافت قائم ہو گئی، جو خلافت قرطبہ کہلائی، تین صدیوں تک اس حکومت کا بڑا عروج رہا، لیکن اس میں خانہ جنگیاں شروع ہوئیں، تو یہ بیسیوں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گئی، ملاگا اور الجزائر پر بنو حمود نے قبضہ کر لیا، غرناطہ پر بربریوں کا استیلا ہو گیا، سویل پر بنو عباد قابض ہو گئے، طلیطلہ پر ذوالنون حاوی ہو گئے، مرگوسہ پر بنو ہود چھا گئے، اسی طرح بنو عامر، بنو ذوالقوی، المورادی، موحدی، بنو حمار اور دوسروں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں، انکے اس اختلاف سے عیسائیوں نے پورا فائدہ اٹھایا، بالآخر ان سے لڑ کر آٹھ سو برس کے بعد پورے اندلس کو عربوں سے خالی کرا لیا،

بنو عباس کی حکومت ۱۳۲ھ سے شروع ہو کر ۶۵۱ھ تک یعنی پانچ سو برس سے زیادہ چلی، بنو امیہ کے مقابلہ میں ان کی فتوحات کم رہیں، مگر انھوں نے جابجا فوجی اڈے اور قلعے بناکر اپنے امپائر کو ہر طرح مستحکم بنانے کی کوشش کی، سواحل شام پر فوجی چھاؤنیاں قائم کیں قلعے بنوائے، طرطوس، عین زربہ اور ہارونیہ جیسے شہر بسائے، مصیصہ کو از سر نو مستحکم کر کے وہاں مسلمان آباد کئے اور دلسہ کے شورش پسندوں کو جلاوطن کیا، اس خاندان کے بہت ہی نامور فرمانروا ہارون رشید نے

رومن امپائر سے ٹکر لے کر مسلمانوں کی عزت و ناموس میں اضافہ کیا، اس نے رومن فرمانروا انیسی فورس سے بہادرانہ معرکہ آرائیاں کر کے اس کے امپائر کے مقابلہ، دلسہ، مصطاف، هلونیه قونیہ، اناطولیہ، اور بحر روم کے علاقے حاصل کئے، جزیہ اور خراج ادا کرنے کی شرط پر اس کو صلح کرنے پر مجبور کیا، مورخوں کا بیان ہے کہ اس وقت ہارون رشید کو ایسا موقع بھی میسر آگیا تھا کہ وہ قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیتا، مگر اس نے اپنی فراخدلی سے ایسا کرنا پسند نہیں کیا، اگر اسوقت اس پر اس کا قبضہ ہوگیا ہوتا تو آج یورپ کی تاریخ بدلی ہوئی ہوتی،

بنو عباس کے خلفاء میں تھوڑی سی بھی کمزوری پیدا ہو جاتی تو پھر دور دراز کے علاقوں میں خود مختاری کا جذبہ پیدا ہو جاتا ۱۴۲ھ میں ادریسیون نے مغربی موریتانیہ میں بربری قبیلے کی مدد سے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا لیکن ڈیڑھ سو برس کے بعد ۳۱۳ھ میں یہ حکومت ختم ہوگئی اسکے علاقے اندلس اور مصر کے زیر نگیں ہوگئے ۱۸۴ھ میں اغلبیون کی حکومت افریقیہ میں قائم ہوئی تو اس خاندان نے صقلیہ پر بھی اقتدار جما لیا لیکن دو سو برس کے بعد عیسائیوں نے یہاں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا، ۱۹۴ھ میں طاہریوں نے خراسان میں اپنی آزادی کا اعلان کیا لیکن پچاس برس کے بعد ان کی یہ آزادی صفاریون کے ہاتھوں جاتی رہی، صفاریوں نے ۲۵۳ھ میں سیستان اور ایران کے بڑے حصے پر قبضہ کر کے اپنی حکومت بنالی مگر ۴۵ برس کے بعد ۲۹۸ھ میں انکی حکومت کا بھی قلع قمع ہوگیا

۲۵۴ھ میں مصر میں دولت طولونیہ کی بنیاد احمد بن طولون نے ڈالی جو ایک ترکی غلام زادہ تھا مگر اسکی حکومت کا چراغ صرف ۳۹ برس تک روشن رہا، ۲۶۱ھ میں سامانیوں نے ماوراءالنہر اور خراسان میں اپنی حکومت کا پرچم لہرایا، مگر ۱۲۵ برس کے بعد اسکو غزنویوں نے ختم کیا جن کی حکومت افغانستان وسط ایشیا

اور ہندوستان کے حصوں پر ۵۸۲ھ تک رہی، ۳۲۵ھ میں بنوحمدان نے موصل اور حلب میں اپنی علیحدہ ریاست بنائی لیکن بیاسی سال کے بعد اس کا چراغ بھی گل ہوگیا، آل بویہ نے ۳۲۰ھ میں عراق میں اپنی حکمرانی کی بنا ڈالی، مگر ان کے اقتدار کو سلجوقیوں نے ۴۴۷ھ میں ختم کیا۔

اب تک جتنی خودمختار حکومتیں قائم ہوئی گئیں، مثلاً طاہری، صفاری، سامانی اور طولونی وغیرہ تو وہ سب خلافت بغداد کے ماتحت تھیں، اسکی دینی سیادت کو تسلیم کرتی رہیں، مگر مصر میں فاطمیوں کی حکومت ۲۹۷ھ میں قائم ہوئی تو یہ بنوعباس کی حریف بن گئی، اور یہ تین سو چھیاسی سال تک چلی، ۳۱۹ھ میں جرجان میں زیاری کی حکومت بنی ۳۲۳ھ میں ایک ماہی گیر عمران بن شاہین نے بطیحہ میں ایک علحدہ ریاست بنالی، موصل میں محمد بن مسیب عقیلی نے بھی ایک الگ ریاست کا اعلان کیا لیکن یہ سب حکومتیں عارضی طور پر بنیں اور بگڑیں، ۴۲۹ھ میں سلجوقیوں کا اقتدار خوارزم، خراسان، بلخ، طبرستان اور گرجستان میں شروع ہوا لیکن ۵۵۲ھ تک یہ بھی بے جان ہوگئی، گو اس کے فرمانرواؤں میں سے طغرل بک، الپ ارسلان اور ملک شاہ نے اپنی حکمرانی سے مسلمانوں کے وقار کو بہت بلند کیا۔

خوارزمی حکومت کی تاسیس ۴۹۰ھ میں ہوئی مگر خلافت بغداد کے ساتھ تاتاریوں کے ہاتھوں یہ بھی برباد ہوئی، سلجوقی خاندان کا ایک آتابک یعنی اتالیق عماد الدین زنگی، اتارب حماۃ، موصل، حلب اور بارین میں اپنا اثر بڑھا کر وہاں کا فرمانروا بن گیا، اس نے اور اسکے جانشین نورالدین زنگی نے عیسائیوں کے خلاف صلیبی جنگ میں غیرمعمولی فتح و کامرانی حاصل کرکے مسلمانوں کا سر اونچا کیا، پھر اسی زنگی خاندان کے بعد ایوبی خاندان ابھرا جس میں صلاح الدین ایوبی کا نام یورپ اور ایشیا کی تاریخ میں ایک دل آویز افسانہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس نے مصر کی بے جان فاطمی حکومت کو ختم کردیا، مگر ایوبی خاندان بھی زیادہ دنوں تک نہیں چلا۔

۶۵۶ھ میں ہلاکو نے بغداد پہونچ کر اسکو لاشوں کا شہر بنادیا، جس کے بعد بنو عباس کا خاندان بغداد میں ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا، مصر میں فاطمی حکومت کے خاتمہ کے بعد خاندان مملوک فرمانروا تھا، لیکن خلافت عباسیہ کو نئی زندگی مصر میں دی گئی جو ۶۵۹ھ سے ۹۲۳ھ تک چلتی رہی، اسکو دولت عثمانیہ کے فرمانروا سلطان سلیم اول نے ختم کیا،

ہندوستان میں سندھ میں بنو امیہ کے زمانے میں عربوں کی حکومت قائم ہوئی لیکن ۲۴۰ھ کے بعد یہ بھی جاتی رہی، اس کے بعد خاندان ہباری کی حکومت شروع ہوئی جسکو اسماعیلیوں نے ختم کیا، ان اسماعیلیوں کا خاتمہ شاہان سومرہ سے ہوا،

جب سندھ میں یہ حکومتیں ختم ہوئیں تو شمالی ہند میں مسلمانوں کا عروج ہوا، غوریوں نے غزنویوں کو ختم کر کے ۶۰۲ھ میں غلام خاندان کی حکومت قائم کرائی، یہ حکومت ۶۸۹ھ میں ختم ہوگئی، اسکے بعد خلجیوں نے تیس سال تک حکومت کی پھر تغلقوں کا دور شروع ہوا جو ۹۴ سال تک چلا پھر سادات آئے، جو صرف ۳۷ سال تک حکومت کر سکے، اس کے بعد لودیوں کا زمانہ شروع ہوا، جو اپنی حکومت کو ۷۵ سال تک قائم رکھ سکے، لودیوں کو بابر نے پانی پت کے میدان میں ۱۵۲۶ء میں ختم کیا، جس کے بعد مغلوں کی حکومت ۱۸۵۷ء تک چلی، مگر سلاطین دہلی اور مغلوں کے دور میں مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم ہوتی رہیں، سلاطین دہلی کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں نے مالوہ، گجرات، دولت آباد، خاندیش، بنگال اور جونپور میں اپنی اپنی ریاستیں قائم کرلیں، مغلوں کے عہد میں سوری خاندان انکے حریف بن گئے، پھر گولکنڈہ، احمد نگر، بیجاپور، گجرات اور بیدر میں مغلوں کے خلاف سلطنتیں قائم ہوتی رہیں، مگر یہ سب تہس نہس ہوگئیں،

ثانیہ نے تقریباً ساڑھے پانچ سو سال تک اپنے امپائر کو قائم رکھ کر مسلمانوں کی ساکھ کو
طان سلیمان اعظم کے نام سے یورپ بھی لرزہ براندام رہا، سلطان محمد فاتح نے رومن
، کر قسطنطنیہ پر قبضہ کیا جس کے بعد رومن امپائر بے جان کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، سلطان
نپولین سے ٹکر لی، سلطان عبدالحمید کے زمانے میں ترک روس سے بھی متصادم ہوئے، انکے
ن وسطی کے علاوہ یورپ میں سردیہ، بلغاریہ، سلونیکا، البانیہ، روڈس، ہنگری اور
کے علاقے شامل تھے، عیسائیوں کو یہ شاق گزرتا رہا، بالآخر ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم اول میں
ا تیا پانچہ کر دیا اور عربوں کی قومیت کو ابھار کر ترکوں سے متصادم کرا دیا جس کے بعد
تم ہو گیا، عربوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں مثلاً نجد، حجاز، عسیز، یمن، لحج، امارت نواحی تسعہ
، عراق، فلسطین، شام اور مصر وغیرہ علیحدہ علیحدہ بن گئیں، مگر وہ سب فرنگی سیاست
ان کی غلامی میں رہیں، اب جا کر آزاد ہوئی ہیں،

د سال کی اس اجمالی تاریخ سے مسلمانوں کے اختلافات کی تفصیل ظاہر ہو گی وہ اپنی چھوٹی
قائم کر کے اپنے اقتدار کی ہوس کو تو ضرور پورا کرتے رہے مگر مسلمانوں کے سواد اعظم ملتِ اسلام کی
کو نقصان پہونچاتے رہے، عبرت اور بصیرت کا تقاضا تو یہ تھا کہ مسلمان اپنی تاریخ کی نااتفاقی
ی کے نقصانات سے سبق لیتے، مگر وہ سبق حاصل کرنے کے بجائے اب بھی چھوٹی چھوٹی ریاستوں
، ذاتی، قبائلی، اور علاقائی اقتدار کی ہوس کو پورا کر رہے ہیں، اپنے قبلہ اول بیت المقدس
ہیں،

، بنو امیہ، بنو عباس اور دولت عثمانیہ کے امپائر کو کھو کر اب بھی مختلف علاقوں میں حکومت
ا رہیں، اس وقت (۱) افغانستان (۲) الجیریا (۳) بحرین (۴) بنگلہ دیش (۵) کیمرون
، داہومی (۸) مصر (۹) گیمبیا (۱۰) گینی (۱۱) گینی بساؤ (۱۲) انڈونیشیا (۱۳) ایران

(۱۴) عراق (۱۵) آئیوری کوسٹ (۱۶) اردن (۱۷) کویت (۱۸) لبنان (۱۹) لیبیا (۲۰) ملیشیا (۲۱) مالدیپ (۲۲) مالی (۲۳) موری ٹانیا (۲۴) مراکش (۲۵) نائجر (۲۶) نائجیریا (۲۷) عمان (۲۸) پاکستان (۲۹) قطر (۳۰) سعودی عرب (۳۱) سینی گال (۳۲) سائرالیون (۳۳) صومالیہ (۳۴) جنوبی یمن (۳۵) یمن (۳۶) سوڈان (۳۷) شام (۳۸) تنزانیہ (۳۹) ٹوگو (۴۰) ٹیونس ترکی (۴۲) امارات عرب (۴۳) اپر ولٹا وغیرہ جیسی ریاستوں میں علٰحدہ علٰحدہ حکومتیں کر رہے ہیں۔

یہ حکومتیں خود سوچیں کہ کیا وہ دنیا کی سیاست پر موثر قوت بنی ہوئی ہیں، اگر نہیں ہیں تو ڈ کیسے بن سکتی ہیں، اقبال نے مسلمانوں کی گذشتہ تاریخ کو سامنے رکھ کر بہت ہی درد دل سے کہا تھا،

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک ؛ ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی، قرآن بھی ایک ؛ کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

تمام مسلمان فرمانرواؤں کو اپنی فکری انارکی، ذاتی مفاد پرستی، اور علاقائی تعصب کو چھوڑ کر سوچنا ہے کہ وہ زمانہ میں ایک ہو کر کس طرح پنپ سکتے ہیں، علٰحدہ علٰحدہ ریاستوں کے ذریعہ سے پنپنے کا تجربہ تو ناکام ہو چکا ہے۔

کرے یہ کافر ہندی بھی جرأت گفتار ؛ اگر نہ ہو امرائے عرب کی بے ادبی،
یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو ؛ وصال مصطفوی افتراق بولہبی،
نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا ؛ محمد عربی سے ہے عالم عربی،

مقالات

فاتحِ علم

از جناب شبیر احمد خاں غوری ایم اے۔ ایل ایل بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش)

جرمن مستشرق فرانز روزنتھال کی کتاب Knowledge Triumphant پر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے فاضل اڈیٹر کا تبصرہ نظر سے گذرا۔

فاضل تبصرہ نگار نے محتویات کتاب کا جو خلاصہ دیا ہے اُس کے مطالعہ سے کتاب کی زیارت کا شوق دامنگیر ہوا۔ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری علوم اسلامیہ کے باب میں ملک کی ایک عظیم لائبریری ہے، کارڈ دیکھا تو معلوم ہوا کہ کتاب یہاں ہے مگر اسٹیک پر تلاش کیا تو ندارد۔ بڑی چھان بین کے بعد پتہ چلا کوئی صاحب issue کرا کے لے گئے ہیں اور پھر واپس نہیں کی۔ لہذا کتاب کی زیارت سے مایوس ہو کر فاضل تبصرہ نگار کے تبصرے ہی سے استفادے کی کوشش کر رہا ہوں۔

محتویات کتاب کا تجزیہ حسب تصریح فاضل تبصرہ نگار کتاب میں آٹھ باب ہیں:۔

پہلا باب:۔ تقابلی لسانیات (Comparative Philology) کے نقطہ نظر سے لفظ "علم" کی تحقیق پر ہے۔

دوسرا باب:۔ ایک طرح سے لغوی بحث پر مشتمل ہے، بقول تبصرہ نگار "فاضل مصنف

کی تحقیق کے مطابق لفظ علم (معہ اشتقاقات) سات سو پچاسّی بار . .
قرآن مجید میں آیا ہے۔ یہ استقصار ایک عظیم علمی کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔
مگر علمائے سابقین نے شکر اللہ سعیہم تخریج آیات اور مفردات قرآن کے موضوع پر کافی کتابیں
لکھی ہیں، اور عہد حاضر کے ریسرچ ورکر کو یہ تاب و سامحنت نہیں کرنا پڑتی کہ قرآن مجید کو کھول کر
بیٹھا رہے، اور "الحمد" سے "والناس" تک ہر سورہ میں اُس آیت یا اُس کے نمبر کو نوٹ کرتا رہے
جس میں لفظ "علم" (یا اور کوئی لفظ اور اُس کا مشتق) آیا ہے۔

اسی باب میں حسب تصریح تبصرہ نگار "انسانی علم اور خدائی علم کے درمیان فرق ظاہر
کیا گیا ہے، اس پر میری معروض آگے آرہی ہے۔ باقی ابواب علم پر ہیں بتفصیل ذیل :-

باب سوم :- لفظ "علوم" کی تحقیق۔

باب چہارم :- علم (بالخصوص اس کی تعریف) کے باب میں متکلمین، حکماء اور ارباب تصوف
کے اقوال۔

باب پنجم :- علم ہی اسلام ہے (غالباً قرآن وحدیث اور علمائے شریعت کے افادات)

باب ششم :- علم ہی نور ہے (غالباً اس باب میں صوفیائے کرام کے ارشادات)

باب ہفتم :- علم ہی حکمت ہے۔ مباحث "علم" کے باب میں معقولیوں کے نتائج فکر۔

باب ہشتم :- علم ہی معاشرہ ہے۔ یعنی اسلامی معاشرہ میں علم اور عالم کا مقام اور اُن کی
جلالت قدر۔

اب جب تک اصل مصنف کی کتاب سامنے نہ ہو مختلف ابواب کے عنوانوں سے اُنکے
محتویات کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ مثلاً چوتھے باب میں متکلمین، حکماء اور ارباب تصوف کے
اقوال وتصانیف کی روشنی میں علم کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ اور باب ہفتم میں مسلم مناطقہ، فلاسفہ

متکلمین اور اصولیین کے نتائج فکر پیش کئے گئے ہیں۔ کیا ان نتائج فکر میں "علم کی تعریف" کا بحث شامل نہیں ہے؟ اس کی ضروری وضاحت صرف اصل کتاب ہی کے مطالعہ سے ہوسکتی ہے۔

مباحث متعلقہ مسئلہ علم کی تقسیم

مسئلۂ علم کی دو حیثیتیں ہیں ایک اجتماعی (Social) یعنی انسانی معاشرے میں علم کی کیا اہمیت ہے؟ اور دوسری مابعد الطبیعیاتی (Metaphysical) یعنی علم کی حقیقت و ماہیت اور دیگر مسائل، جیسے "علم کا امکان" اس سلسلے میں ادعائیت (Dogmatism) اور سوفسطائیت یا لاادریت (Scepticism) آتی ہیں۔ "علم کے مآخذ" جو اس (تجربیت (Empirecis) عقل۔ عقلیت (Rationalism) وجدان وجدانیت اور ماورائیت (Transcendentalism) مسئلۂ نظر و استدلال" وغیرہ۔

علم کی اجتماعی حیثیت کی دو ذیلی حیثیتیں ہیں۔ دینی اور دنیوی۔

دینی ذیلی حیثیت کی دو قسمیں ہیں۔ آں جہانی اور ایں جہانی۔

آں جہانی حیثیت میں علم کے وہ آخروی فضائل آتے ہیں، جو قرآن کریم اور حدیث شریف میں بیان ہوئے ہیں۔

ایں جہانی سے مراد اس مسئلہ سے متعلق شرعی احکام ہیں، یعنی کونسا علم اور اس کو کس قدر سیکھنا چاہیئے، اس غرض سے علم کی دو قسمیں کی جاتی ہیں، علم نافع اور علم غیر نافع، اول الذکر میں اصولی طور پر علوم دینیہ آتے ہیں، یعنی قرآن (تفسیر) حدیث (و اصول حدیث) فقہ و اصول فقہ اور علم کلام (یا اصول الدین) فقہ و فتاوی اور اخلاق و تصوف کی کتابوں میں علماء نے اس بات کی تفصیل دی ہے کہ ان علوم کا کس قدر حصہ فرض عین ہے اور کس قدر فرض کفایہ

اور کتنا مستحب۔ دیگر علوم مثلاً طب میں کس قدر سیکھنا واجب ہے، حساب، ہندسہ اور ہیئت کے باب میں بھی یہی اصول مرعی رکھا گیا ہے۔ اسی طرح یہ تفصیل بھی ملیگی کہ غیر نافع اور مفید علوم سے واقفیت اشناسائی کی کہاں تک اور کن حالات میں اجازت ہے اور ان میں انہماک و مشغولیت کب حرام اور مکروہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

اہمیتِ علم کی دنیوی حیثیت سے ہماری تاریخ بھری پڑی ہے، اور قرآن وسنت کی تعلیم کا یہی نتیجہ ہونا بھی چاہئے تھا۔ تاریخ ومحاضرات کی کتابوں میں اس کی تفصیل ملتی ہے، مثلاً یاقوت نے "معجم الادبار" میں عباسی خلیفہ المعتضد باللہ (۲۷۹-۲۸۹ھ) کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ وہ ثابت بن قرہ کے ساتھ باغ میں گلگشت کر رہا تھا۔ جو ایک غیر مسلم، ستارہ پرست اور صابئی النحلہ حکیم تھا۔ اتفاق سے خلیفہ کا ہاتھ غیر ارادی طور پر ثابت کے ہاتھ کے اوپر آگیا، مگر خلیفہ نے فوراً اپنا ہاتھ جھٹکے کے ساتھ کھینچ لیا۔ ثابت ڈر اکہ کیا خلیفہ ناراض ہو گیا۔ مگر المعتضد نے فوراً معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"کانت یدی فوق یدک والعلم	میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ کے اوپر تھا۔
یعلو ولا یعلی"	اور علم بلند ہو کر رہتا ہے نہ کہ ادنیٰ[5]

طاشکبری زادہ نے ابن کمال پاشا کی زندگی کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ سلطانِ روم بایزید خاں کے وزیر اعظم ابراہیم پاشا کے یہاں ایک امیر کبیر احمد بیگ کو بیٹھے دیکھا، اتنے میں ایک بوسیدہ حال عالم مولی لطفی دربار میں آئے اور امیر احمد بیگ سے زیادہ بلند مقام پر بیٹھ گئے۔ ابن کمال پاشا نے اپنے ساتھی سے پوچھا کہ یہ کون اہم شخصیت ہیں جو اتنے عظیم الشان امیر سے بھی زیادہ بلند مقام پر بیٹھ گئے، اور کسی نے انھیں روکا تک نہیں۔ رفیق نے اُن کا نام بتایا، آدمی فطرتاً دوسرے کے مرتبہ (Status) کا اندازہ اُس کے قول سے لگاتا ہے۔

ابن کمال پاشا بھی سمجھے کہ یقیناً مولی لطفی کی تنخواہ امیر احمد بیگ سے زیادہ ہو گی، لہذا ساتھی سے پوچھا کہ ان کی تنخواہ کتنی ہے، جواب ملا تیس درہم۔ ہکا بکا ہو کر رہ گئے کہ پھر یہ امیر سے بلند تر مقام پر کیوں بیٹھتے ہیں۔ ساتھی نے جواب دیا علماء کی قدر و منزلت اُن کے علم کی بنا پر ہوتی ہے۔ اگر یہ امیر سے فروتر مقام پر بیٹھتے تو اسے نہ تو وزیر پسند کرتا اور نہ امیر احمد بیگ ہی برداشت کرتے، ابن کمال پاشا کہتے تھے میں نے دل میں سوچا کہ میں جاہ و ثروت میں تو اس کبیر الشان امیر کے درجہ تک نہیں پہونچ سکتا۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ علم میں اس عالم کے رتبہ تک پہونچ جاؤں اس واقعہ نے ان کی زندگی کا رخ ہی موڑ دیا، اور امیر کبیر بننے کے بجائے ہمہ تن تحصیل علم میں مشغول ہو گئے، اور انجام کار اپنے زمانہ کے ترک علماء کے گل سرسبد بن گئے۔

دور کیوں جائیں پچھلی صدی تک، حالانکہ معاشرہ بگڑ چکا تھا۔ علم و علماء کی قدر و منزلت کا یہ عالم تھا کہ اکابر علمائے شہر تو بڑی بات ہے۔ معمولی مدرس بھی جب سڑک پر چلتا تھا تو مسلمان عوام و خواص کے علاوہ ہندو لکھپتی سیٹھ ساہوکار بھی اُس کی تعظیم کے لئے سر دقد کھڑے ہو کر سلام مولوی صاحب کہنا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔

علم کے مابعد الطبیعیاتی مباحث فلسفہ اور کلام کی کتابوں میں بڑی شرح و تفصیل سے بیان ہوئے۔ مثلاً امام فخر الدین رازیؒ کے "محصل افکار المتقدمین والمتاخرین" کا رکن اول یا قاضی ناصر الدین بیضاوی کی "طوالع الانوار" کا مقدمہ مگر جس منظم انداز میں ان کا "شرح المواقف" میں بیان ہوا ہے وہ اس قابل ہے کہ اُس کا خلاصہ یہاں بیان کر دیا جائے۔

"شرح المواقف" میں چھ موقف ہیں۔ پہلا موقف انہی مباحث پر مشتمل ہے۔ اس موقف میں چھ مرصد ہیں بتفصیل ذیل:۔

مرصد اوّل۔ علم کلام کی تعریف، موضوع، فائدہ و شرف وغیرہ۔

مرصد ثانی ۔ مطلق علم کی تعریف ۔ مرصد ثالث ۔ علم کی اقسام ۔ مرصد رابع ۔ علوم
ضروریہ کا اثبات ۔ مرصد خامس ۔ نظر (فکر) مرصد سادس ۔ طریق موصل الی المطلوب
(اس انداز فکر کی کیفیت جو مطلوب تک پہونچا دے۔)

اسلامی فکر کی علمیات | مذکورالصدر مراصد ششگانہ میں سے پہلا مرصد ہمارے نقطۂ نظر سے غیراہم
ہے، کیونکہ یہ ایک مخصوص علم (کلام) سے متعلق ہے، باقی پانچ مرصدوں میں قدیم و جدید "علمیات"
(Epistemology) کے بیشتر مسائل آگئے ہیں۔ انہیں دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا
جاسکتا ہے۔

(۱) مباحث متعلقہ علم (دوسرا تیسرا اور چوتھا مرصد) اور (۲) مباحث متعلقہ "نظر"
فکر و استدلال (پانچواں اور چھٹا مرصد)

(۱) مباحث متعلقہ علم تین جماعتوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔
(پہلا مرصد) علم کی تعریف۔ (دوسرا مرصد) علم کی منطقی اقسام (تیسرا مرصد) اور علم کا امکان،
(چوتھا مرصد)

(الف) علم کی تعریف | علم کی تعریف (Definition) سے پہلے قاضی عضدالدین
ایجی نے اس بارے میں کہ کیا علم کی تعریف کی جاسکتی ہے، مفکرین کا اختلاف بیان کیا ہے۔ اس باب میں
تین مذہب ہیں۔

پہلا مذہب یہ ہے کہ علم کا تصور ضروری ہے، لہٰذا اس کی منطقی تعریف کا جسے آج کل کی
اصطلاح میں Definition per genus et differentia
کہا جاتا ہے، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسرا یہ کہ علم کا تصور ضروری (a priori) تو نہیں ہے، ہے تو نظری ہی۔ مگر

اس کی تعریف مشکل ہے، یہ امام الحرمین اور امام غزالی کی رائے ہے۔

تیسرا یہ کہ اس کی تعریف مشکل نہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں قاضی صاحب نے سات تعریفیں نقل کی ہیں۔ پہلی بعض معتزلہ کی طرف منسوب ہے۔ دوسری قاضی ابو بکر باقلانی، تیسری امام اشعری، چوتھی ابن فورک اور پانچویں امام رازی کی طرف منسوب ہے، چھٹی حکماء کی متداول تعریف ہے کہ علم عقل میں کسی چیز کی صورت کے حاصل ہونے کا نام ہے (خواہ وہ کلی ہو یا جزئی، موجود ہو یا معدوم) ساتویں تعریف کے بارے میں قاضی عضد نے لکھا ہے "وہو المختار" یعنی خود ان کے نزدیک یہ علم کی تعریف ہے۔

انہ صفۃ امر قائم بغیرہ	علم ایک صفت (امر) ہے جو کسی دوسرے
یوجب تلک الصفۃ لمحلہا	(موصوف) کے ساتھ قائم ہو اور جس
وموصوفہا تمیزاً۔	محل کے ساتھ قائم ہو اس کے مختلف
	معانی میں ایسی تمیز کو واجب کر دے
	جس میں اس تمیز کی نقیض کا احتمال نہو

(ب) علم کی تقسیم | ان مباحث کو قاضی عضد نے چار مقصدوں میں بیان کیا ہے۔

پہلا مقصد۔ علم کی تصور (Concept) اور تصدیق (Judgement) میں تقسیم (اسی بحث سے منطق کی درسی کتابوں کا افتتاح ہوا کرتا ہے)

دوسرا مقصد: "علم حادث" (یا انسانی علم) کی "ضروری" (A priori) اور "نظری" (Posteriori) میں تقسیم

تیسرا مقصد:۔ اس بحث میں کہ تصورات ہوں یا تصدیقات ان میں سے بعض ضروری ہوتے ہیں، اور کچھ "نظری"،

اس مقصد میں باقی مذاہب مرجوحہ میں سے چار مذہبوں کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے، پہلا مذہب یہ ہے کہ تمام علوم ضروری و بدیہی ہیں۔

دوسرا جسے امام رازی اپنا ابتکار فکر بتاتے ہیں، یہ ہے کہ تصورات سب کے سب "ضروری ہیں"،

تیسرا مذہب یہ ہے کہ جن امور پر ایمان واجب ہے (جیسے باری تعالےٰ اور اس کی صفات کا اثبات یا نبوت پر یقین) وہ "ضروری" ہیں، اور

چوتھا مذہب (جو پہلے مذہب کی ضد ہے) یہ ہے کہ تمام علوم "نظری" و "کسبی" (Acquired) ہیں۔ یہ بعض جہمیہ کا مذہب تھا۔

(ج) حصول علم کا امکان | اس مسئلہ سے قاضی عضد نے "علوم ضروریہ کے اثبات" کے زیر عنوان چوتھے مرصد میں بحث کی ہے۔ پہلے انھوں نے "علوم ضروریہ" کی تین قسمیں کی ہیں۔ "وجدانیات" (جیسے اپنی ذات یا بھوک پیاس وغیرہ کا علم) "حسیات" (جن کا علم بذریعہ حواس ہوتا ہے)، اور "بدیہیات"۔ ان میں سے آخری دو قسمیں اہم ہیں۔ ان کے اثبات و انکار کے بارے میں لوگوں کے چار گروہ ہیں۔

۱۔ جمہور "حسیات" اور "بدیہیات" دونوں کی افادیت کے قائل ہیں۔

۲۔ بعض مفکرین (جن میں سر فہرست افلاطون کا نام ہے) "حسیات" کے منکر ہیں۔ قاضی عضد نے ان کے جو دلائل گنائے ہیں تقریباً وہی ہیں، جو قدیم یونانی متشککین اینسیڈیموس (Aenisedemus) وغیرہ دیتے تھے۔

۳۔ بعض لوگ صرف "حسیات" کے قائل ہیں۔ مگر "بدیہیات" کے منکر ہیں۔

۴۔ چوتھا گروہ سوفسطائیہ کا ہے، جو پہلے گروہ کی ضد ہے، (یعنی "حسیات" اور "بدیہیات"

دونوں کا سکر ہے) جب ادعائیت" (Dogmatism) اپنی انتہا کو پہونچ جاتی ہے تو اس کا ردعمل "سوفسطائیت" کی شکل میں نمودار ہوا کرتا ہے۔ یہی قدیم یونانی فکر میں ہوا تھا یہی آج جدید یورپی فکر میں ہو رہا ہے، اور کبھی کبھی بعض مسلمان منکرین بھی اس کا شکار رہے ہیں۔

سوفسطائیت کی تین شکلیں ہیں۔

عنادیت (Nihilism) یعنی کچھ نہیں ہے۔ یا حقائقِ اشیاء کا سرے سے انکار بقولِ غالب۔

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

عندیت (Subjectivism) یا یہ عقیدہ کہ علم تابع اعتقاد ہوتا ہے، جیسا کہ غالب کہتے ہیں

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

لاادریت۔ (Scepticism) ہر بات میں شک۔ اسی لئے بقول قاضی عضد علماء نے سوفسطائیہ کے ساتھ مناظرے سے منع کیا ہے۔

واضح رہے کہ "امکان علم" (اثبات علوم ضروریہ) کا مسئلہ دینی حلقوں میں اولین اہمیت کا حامل رہا ہے۔ عرصۂ دراز سے "شرح عقائد نسفی" ہمارے یہاں نصاب میں داخل رہا ہے شارح (علامہ تفتازانی) کے زمانہ سے پہلے اس کا متن "عقائد نسفی" درس میں داخل تھا جبھی تو انھوں نے اس کتاب کی شرح لکھی اور پھر تو اسے یہ قبول عام نصیب ہوا کہ تقریباً ہر دور میں اس شرح پر حواشی لکھے جاتے رہے، ان میں سب سے اہم ترک عالم مولیٰ خیالی کا حاشیہ ہے، (جو اُن کے نام پر "خیالی" کہلاتا ہے اور درس میں داخل ہے)

بہر حال "عقائد نسفی" کا افتتاح اسی "اثبات علم" اور "رد سوفسطائیت" سے ہوتا ہے،

حقائق الاشیاء ثابتۃ العلم حقائق اشیاء نی نفسہا ثابت ہیں۔

چوتھا مقصد :- جمہور کا مسلک مختار، تیسرے مقصد میں بیان کرنے کے بعد قاضی عضد نے اس مقصد میں باقی مذاہب مرجوحہ میں سے چار مذہبوں کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ پہلا مذہب یہ ہے کہ تمام علوم ضروری و بدیہی ہیں۔

دوسرا جسے امام رازی اپنا ابتکار فکر بتاتے ہیں، یہ ہے کہ تصورات سب کے سب "ضروری" ہیں۔

تیسرا مذہب یہ ہے کہ جن امور پر ایمان واجب ہے (جیسے باری تعالیٰ اور اس کی صفات کا اثبات یا نبوت پر یقین) وہ "ضروری" ہیں، اور

چوتھا مذہب (جو پہلے مذہب کی ضد ہے) یہ ہے کہ تمام علوم "نظری" "کسبی" (Acquired) ہیں۔ یہ بعض جہمیہ کا مذہب تھا۔

(ج) حصول علم کا امکان | اس مسئلہ سے قاضی عضد نے "علوم ضروریہ کے اثبات" کے زیر عنوان چوتھے مرصد میں بحث کی ہے۔ پہلے انھوں نے "علوم ضروریہ" کی تین قسمیں کی ہیں۔ "وجدانیات" (جیسے اپنی ذات یا بھوک پیاس وغیرہ کا علم) "حسیات" (جن کا علم بذریعہ حواس ہوتا ہے۔) اور "بدیہیات" ان میں سے آخری دو قسمیں اہم ہیں۔ ان کے اثبات و انکار کے بارے میں لوگوں کے چار گروہ ہیں۔

۱۔ جمہور "حسیات" اور "بدیہیات" دونوں کی افادیت کے قائل ہیں۔

۲۔ بعض مفکرین (جن میں سرفہرست افلاطون کا نام ہے) "حسیات" کے منکر ہیں۔ قاضی عضد نے ان کے جو دلائل گنائے ہیں تقریباً وہی ہیں، جو قدیم یونانی متشککین اینسیڈیموس (Aenisedemus) وغیرہ دیتے تھے۔

۳۔ بعض لوگ صرف "حسیات" کے قائل ہیں۔ مگر "بدیہیات" کے منکر ہیں۔

۴۔ چوتھا گروہ سوفسطائیہ کا ہے، جو پہلے گروہ کی ضد ہے، (یعنی "حسیات" اور "بدیہیات"

دونوں کا سنگم ہے) جب ادعائیت" (Dogmatism) اپنی انتہا کو پہونچ جاتی ہے تو اس کا ردعمل "سوفسطائیت" کی شکل میں نمودار ہوا کرتا ہے۔ یہی قدیم یونانی فکر میں ہوا تھا، یہی آج جدید یورپی فکر میں ہو رہا ہے، اور کبھی کبھی بعض مسلمان مفکرین بھی اس کا شکار رہے ہیں۔

سوفسطائیت کی تین شکلیں ہیں۔

عنادیت (Nihilism) یعنی کچھ نہیں ہے، یا حقائقِ اشیاء کا سرے سے انکار بقولِ غالب۔

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

عندیت (Solipsism) یا یہ عقیدہ کہ علم تابع اعتقاد ہوتا ہے، جیسا کہ غالب کہتے ہیں

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

لا ادریت۔ (Scepticism) ہر بات میں شک۔ اسی لئے بقول قاضی عضد علماء نے سوفسطائیہ کے ساتھ مناظرے سے منع کیا ہے۔

واضح رہے کہ "امکان علم" (اثبات علوم ضروریہ) کا مسئلہ دینی حلقوں میں اولین اہمیت کا حامل رہا ہے۔ عرصۂ دراز سے "شرح عقائد نسفی" ہمارے یہاں نصاب میں داخل ہی تھا، شارح (علامہ تفتازانی) کے زمانہ سے پہلے اس کا متن "عقائد نسفی" درس میں داخل تھا، جبھی تو انھوں نے اس کتاب کی شرح لکھی اور پھر تو اسے یہ قبول عام نصیب ہوا کہ تقریباً ہر دور میں اس شرح پر حواشی لکھے جاتے رہے، ان میں سب سے اہم ترک عالم مولیٰ خیالی کا حاشیہ ہے، (جو اُن کے نام پر "خیالی" کہلاتا ہے اور درس میں داخل ہے)

بہرحال "عقائد نسفی" کا افتتاح اسی "اثبات علم" اور "رد سوفسطائیت" سے ہوتا ہے،

حقائق الاشیاء ثابتۃ العلم حقائق اشیاء فی نفسہا ثابت ہیں۔

بھا محقق۔ خلافاً للسوفسطائیۃ — اور اُن کا علم حقیقتاً ہوتا ہے۔ البتہ سوفسطائی فرقہ اس کھلی ہوئی حقیقت کا منکر ہے۔

۲۔ مباحث متعلقہ نظر و استدلال کو قاضی عضد نے پانچویں اور چھٹے مرصدوں میں بیان کیا ہے۔

پانچواں مرصد "نظر" کے مباحث پر ہے۔ اس میں دس مقاصد ہیں۔

پہلا مقصد "نظر" کی تعریف پر ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے پہلے قاضی ابوبکر باقلانی کی دی ہوئی تعریف نقل کی ہے کہ

"النظر ھو الفکر الذی یطلب بہ علم او غلبۃ الظن" — نظر وہ فکر ہے جس کے ذریعہ کسی امر کا علم یا اُس میں غالب ظن مطلوب ہوتا ہے۔

پھر اس پر چار اعتراض کر کے اُن کے جواب دئے ہیں، زاں بعد او رمذاہب نقل کر کے اُن کے مالہ و ماعلیہ کو بیان کیا ہے۔

دوسرا مقصد: "نظر" کی "صحیح" اور "فاسد" میں تقسیم۔

تیسرا مقصد: اس باب میں ہے کہ "نظر صحیح" "مفید علم" ہوتی ہے، اس ضمن میں پہلے عمل "نظر" کے اجزاء اربعہ بیان کئے ہیں۔ پھر ان لوگوں کے دلائل کا اور زاں بعد ان دلائل کا ابطال کیا ہے جو نظر صحیح کے مفید علم نہ ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔ یہ تین گروہ ہیں۔

پہلا گروہ مطلقاً افادۂ نظر کا منکر ہے۔ یہ فرقہ سمنیہ کا مسلک ہے جو بقول شارح سومنات کے مندر کے پجاری تھے، اور بقول سخاؤ (مرتب کتاب الہند للبیرونی) بدھ مذہب کے ایک فرقہ کا نام

کا نام ہے۔ قاضی عضد نے ان کی طرف منسوب دس دلائل کو بیان کر کے ان کا رد کیا ہے۔

دوسرا گروہ اُس زمانہ کے مہندسین کا تھا، جن کا خیال تھا کہ نظر صرف "ہندسیات" میں مفید ہو سکتی ہے۔ مگر "الٰہیات" میں نہیں۔

[عہد حاضر میں اوگسٹ کومٹے اور اُس کے پیرو "ایجابیین" (Logical Positivists) کا بھی یہی خیال ہے۔

تیسرا گروہ ملاحدۂ باطنیہ کا تھا۔ جن کا خیال تھا کہ بغیر معلم (امام برحق) کے نظر معرفت باری تعالےٰ میں مفید نہیں ہو سکتی۔

چوتھا مقصد:۔ اس باب میں ہے کہ نظر صحیح کس طرح مفید علم ہوتی ہے۔ اس باب میں تین رائیں ہیں:

امام اشعری کا کہنا ہے کہ ایسا عادۃً ہوتا ہے۔

معتزلہ کہتے ہیں کہ نظر صحیح کے بعد علم کا حصول بطریق "تولید" ہوتا ہے۔

["تولید" معتزلہ کا ایک مخصوص اصول ہے کہ فاعل کا ایک فعل خود بخود دوسرے فعل کو پیدا کر دیتا ہے، مثلاً اگر انگوٹھی پہن کر ہاتھ ہلایا جائے تو انگوٹھی خود بخود حرکت کرے گی، خواہ انسان اس کا ارادہ کرے یا نہ کرے۔]

اور حکماء کے قول کے مطابق ایسا بسبب "اعداد" ہوتا ہے کیونکہ مبدأ عام الفیض ہے۔

[اس رائے کی زیادہ بہتر توجیہ قاضی ناصر الدین بیضاوی نے "طوالع الانوار" میں کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ نظر صحیح ذہن کو مستعد کر دیتی ہے، اور نتیجہ کا فیضان وجوباً ہوتا ہے، جب کہ امام ابوالحسن اشعری کے نزدیک "عادۃً" ہوتا ہے۔]

پانچواں مقصد:۔ نظر صحیح کے شرائط۔

چھٹا مقصد:۔ اس بحث میں کہ معرفت باری تعالےٰ واجب ہے، اور اثبات وجوب میں

مختلف مسالک (اشاعرہ و معتزلہ) کی تفصیل۔

ساتواں مقصد۔ اس باب کے تعین میں کہ انسان پر سب سے پہلے کیا چیز واجب ہے۔ امام اشعری کے نزدیک وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔ جمہور معتزلہ کے نزدیک معرفت باری تعالیٰ میں نظر (و فکر) اور (ابو ہاشم جبائی کے نزدیک "شک")

آٹھواں مقصد۔ تیسرے مقصد کا تتمہ ہے، اگر نظر صحیح مفید علم ہوتی ہے تو پھر کیا "نظر فاسد" مستلزم جہل ہے۔ اس باب میں تین رائیں ہیں۔

پہلی رائے امام رازی کا مختار ہے کہ وہ مطلقاً مفید ہوتی ہے، خواہ فساد جہت مادہ سے ہو یا جہت صورت سے۔ دوسری رائے جمہور کا مختار ہے کہ وہ مطلقاً مفید نہیں ہوتی خواہ مادہ کی بنا پر فاسد ہو یا صورت کی بنا پر۔ تیسری رائے کا کہنا ہے کہ اگر فساد مادہ کی بنا پر ہوا تو مستلزم جہل ہوگی (اس میں بھی قیل و قال ہے۔)

نواں مقصد۔ پانچواں مقصد کا تتمہ: شرائط نظر کے باب میں علماء کا کیا اختلاف ہے۔

دسواں مقصد ایک منطقی مسئلہ ہے کہ کیا دلیل کی مدلول پر دلالت کا علم مدلول کے علم کے مغائر ہوتا ہے۔

چھٹا (اور آخری) مرصد: "طریق موصل الی المطلوب" کے بیان میں، یہ گویا "تطبیقی منطق" ہے۔

(Logic as applied to Scholastic Theology)

یعنی منطق کے وہ مباحث جن سے علم کلام میں کام لیا جاتا ہے۔ ان مباحث کی فہرست حسب ذیل ہے:

پہلا مقصد: "طریق موصل" کی تعریف اور تقسیم

دوسرا مقصد: اس باب میں کہ معرَّف (بالفتح) (یعنی جس چیز کی تعریف درکار ہے) کی معرفت سے پہلے معرِّف (بالکسر) (یعنی جو چیز تعریف کرتی ہے) کی معرفت ضروری ہے۔

تیسرا مقصد:۔ استدلال کی اشکال ثلثہ۔

قیاس یعنی کلی (Universals) سے جزئی (particulars) پر استدلال جسے "استخراج" (Deduction) کہتے ہیں۔

استقرار:۔ جزئی سے کلی پر استدلال (جدید اصطلاح (Induction)

تیسری شکل:۔ جزئی سے جزئی پر استدلال۔ اسے منطق میں "تمثیل" (Analogy) اور فقہ میں قیاس کہتے ہیں۔ منطق میں تمثیل کی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ مگر فقہا نے اس کی (قیاس فقہی" یا "تمثیل منطقی کی) تحقیقات پایۂ تکمیل تک پہونچادیں۔

چوتھا مقصد:۔ قیاس (Syllogism) کے مباحث

پانچواں مقصد:۔ استدلال کے ضعیف طریقے:۔ منطقی قیاس کے علاوہ بعض متکلمین کچھ اور طرق استدلال کے قائل تھے جیسے۔

۱۔ اگر کسی امر پر کوئی دلیل نہو تو اس کی نفی واجب ہے۔

۲۔ قیاس الغائب علی الشاہد یعنی سامنے کی چیز پر اُس چیز کا قیاس کرنا جو نظروں سے اوجھل ہے۔ (اس کی مثال ہے انسان کے احوال پر باری تعالےٰ کی صفات کو قیاس کرنا)

چھٹا مقصد:۔ مقدمات یقینیہ:۔ ان کی دو قسمیں ہیں:۔ قطعیہ اور ظنیہ۔

مقدمات قطعیہ سات ہیں۔ اولیات، قضایا قیاسات، مشاہدات، مجربات، حدسیات، متواترات۔

مقدمات ظنیہ چار ہیں:۔ مسلمات، مشہورات، مقبولات، مقرونتہ بالقرائن۔

ساتواں مقصد:۔ دلیل کی تین شکلیں ہوتی ہیں۔ یا اس کے تمام اجزا عقلی ہونگے۔ یا اُس کے تمام اجزا نقلی (منقول) ہونگے۔ یا عقلی اور نقلی دونوں سے مرکب ہونگے۔

آٹھواں مقصد:۔ اس سوال کی تحقیق میں کہ کیا دلائل نقلیہ مفید یقین ہو سکتے ہیں۔

آج قدیم سے ہمارا ناطہ ٹوٹ چکا ہے، اس لیے مذکورۂ بالا ابحاث غیر مانوس معلوم ہونگی بلکہ نئی روشنی والوں کو ان میں ملایانہ دقیانوسیت جھلکتی نظر آئے گی۔ مگر ایسا نہیں ہے، بلکہ جیسا سابق میں عرض کیا گیا ہے، یہ ابحاث عہد قدیم بلکہ عہد جدید کی علمیات (E p i s t e m o l o g y) کے بیشتر مباحث پر مشتمل ہیں۔ لیکن جگہ کی قلت اور خوف تطویل جدید ابحاث کے ساتھ ان کے تقابلی مطالعہ سے مانع ہے۔

لیکن اس سے ہمیں اپنے اسلاف کی ثروت فکر اور اس سے زیادہ اُس فکر کی عظمت کا اندازہ ضرور ہو جائے گا۔ قاضی عضد الدین ایجی کا زمانہ جن کی "المواقف فی الکلام" سے مذکورہ الصدر فہرست مباحث دی گئی ہے، آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی مسیحی) کا نصف اول ہے، مگر ان ابحاث پر غور و فکر اسلام کی فکری سرگرمیوں میں اس سے کہیں پہلے سے شروع ہو گیا تھا، اور اگر زیادہ تلاش و تفحص سے کام لیا جائے تو دوسری صدی ہجری (آٹھویں صدی مسیحی) کے آغاز میں اُن کے مصرحہ حوالے مل جائیں گے۔ اور یہ وہ زمانہ ہے کہ ابھی مسلمان اہل علم یونانی منطق و فلسفہ سے آشنا بھی نہیں ہوئے تھے، مثلاً "ابو ہلال عسکری" کتاب الاوائل" میں واصل بن عطاء کے بارے میں لکھتا ہے،

وھو اول من قال:۔ الحق یعرف من وجوہ اربعۃ: کتاب ناطق وخبر مجتمع علیہ وحجۃ عقل واجماع من الامۃ"

واصل (مسلمان فضلاء میں) پہلا شخص ہے جس نے یہ کہا کہ حق چار طرح پہچانا جاتا ہے۔ قرآن کریم سے، ایسی حدیث سے جس کی صحت پر اتفاق ہو عقل کی دلیل و حجت سے،

(طبع مصر ۱۳۱۴ء)

پھر مذکورالصدر تصورات اور اصولوں میں سے اکثر آج بھی جدید فلسفہ کے معرکۃ الآرا مسائل بنے ہوئے ہیں۔ عرصہ ہوا ایک بنگالی پروفیسر کی کتاب عہد حاضر کے علمیاتی مسائل پر نظر سے گذری تھی۔ جس میں اُس نے ہر ہر مسئلہ میں عہد حاضر کے اساطین فلسفہ کے مواقف کے استقصا کے ساتھ ان کے دوش بدوش قدیم ہند و فلاسفی کے نظری مواقف بھی پوری شرح وبسط کے ساتھ بیان کئے تھے۔ اس طرح اپنی "پراچین سبھیتا" کی عظمت کو واضح کرنے کی کوشش کی تھی، معاً خیال آیا کاش امت مرحومہ میں بھی کوئی سر پھرا کسی ایسے ہی پروجکٹ پر کام کرتا۔ مگر ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

کیونکہ یہاں یہ حال ہے کہ ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اپنے اسلاف کی ان علمی کاوشوں کو کوہ کندن وکاہ برآوردن سے بھی کمتر (بلکہ عفونت میں سنڈاس سے بدتر) سمجھنے پر مصر ہے۔

دیکھ مسجد میں شکست رشتۂ تسبیح شیخ　　بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

(باقی)

سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم

سید صاحب نے سیرت کی شروع کی دو جلدوں جن کا بڑا حصہ مصنف الفاروق کے قلم کا ہے۔ ان کی جمع و ترتیب اور بعد کی چار جلدوں کی تصنیف و تالیف کے بعد معاملات والی جلد بھی لکھنی شروع کر دی تھی ابھی اس موضوع پر چند ہی مضامین آپ کے قلم سے نکلے تھے، کہ ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو خود آپ کی کتاب زندگی کا ورق آخر ہو گیا، اور آپ انتقال کر گئے۔ اور یہ جلد ناتمام رہ گئی۔ یہ انہی چند متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ شروع میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کا پیش لفظ ہے۔　　قیمت:- ۱۲—۰۰

اقبال کا فکری ارتقاء

پر تعاقب و تصحیح اور اقبال کی ابن سینا کے مزعومہ فلسفۂ عشق کی تشریح

از، مولانا عبد السلام خاں، سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور،

میں نے معارف جنوری ۱۹۸۰ء اپنے مقالے "اقبال کا فکری ارتقاء" میں اقبال کی ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۰ء تک کی افکار کے تحت "عشق کی کائناتی اہمیت" کے ذیل میں لکھا تھا کہ "غالباً یہ فارسی کی صوفیانہ شاعری کا اثر تھا کہ اقبال پر عشق کی کائناتی عظمت کا انکشاف ہوا" میرے قدیم محترم اور فاضل کرم فرما جناب شبیر احمد خان صاحب غوری نے اسی زمانے میں اپنے ایک مکتوب گرامی میں تعاقب فرمایا تھا کہ "اس صوفیانہ شاعری سے تو وہ بہت پہلے سے متاثر تھے، سوال یہ ہے کہ اس کا ظہور یورپ جانے سے پہلے کیوں نہیں ہوا۔ قیام یورپ ہی کے دوران کیوں ہوا؟" موصوف نے توجیہ فرمائی کہ "قیام یورپ کے دوران جو اہم اور سنجیدہ کام اقبال انجام دے رہے تھے وہ فارس میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء، تھا" اس کتاب میں انھوں نے بو علی سینا کے فلسفے کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہ شیخ کے متعارف فلسفے (مبنی بر شفاء و نجاۃ) کے بجائے اس کے خصوصی فلسفے کا خلاصہ ...... قلمبند کر رہے ہیں۔ اس خصوصی فلسفے کا لُبِّ لباب "کائنات میں عشق کی کارفرمائی کی توضیح و تبیین ہے، موصوف کا گمان ہوا

کو عشق کی کائناتی اہمیت شیخ کی مزعومہ کتاب الحکمۃ المشرقیہ سے تاثر کا نتیجہ ہے، موصوف کا یہ گمان میرے نزدیک بہت زیادہ قرین صحت ہے، اقبال پر عشق کی کائناتی عظمت کا انکشاف براہ راست ابو علی ابن سینا سے تاثر ہے، خواہ مزعومہ الحکمۃ المشرقیہ کے ذریعہ سے خواہ اس کے رسالۃ فی العشق کے ذریعہ سے۔ میں محترمی غوری صاحب کی بالغ نظری کا معترف اور اُن کے اس تعاقب کا ممنون اور شکر گزار ہوں۔

اقبال کا "فلسفۂ عجم" میرے سامنے رہ چکا تھا، لیکن تحریر مقالہ کے وقت اس سے ذہول ہو گیا، اور ابن سینا کے بجائے اقبال کے کائناتی عشق کا ماخذ فارسی کی صوفیانہ شاعری کو قرار دیدیا۔ اس غفلت پر میں قارئین مقالہ سے معذرت خواہ ہوں۔

اس تعاقب کی تقریب سے فلسفۂ عجم میں شیخ کے تصور عشق کی توضیح کو پڑھا اور ماخذوں سے مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ شیخ کے اصل حوالوں کے سمجھنے میں اور انکی تشریح میں اقبال نے کافی تسامح سے کام لیا ہے۔

اقبال نے یہ کتاب اپنی طالب علمی کے زمانے میں لکھی، اُس زمانے میں فلاسفۂ اسلام کے خیالات اور اُن کے ماخذوں پر انہیں پورا عبور نہ تھا، پھر اس تحقیق و تشریح میں انھوں نے میہرن (M. A. F. Mehren) کے مرتب کئے ہوئے "رسائل شیخ" کے رسالۃ فی العشق پر اعتماد کیا جو کافی ناقص تھا، مزید براں وہ عربی حوالوں سے براہ راست پورا پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے، خصوصاً اس ابتدائی عہد میں، اس لیے یہ تسامح غیر اغلب نہیں۔ خود اقبال نے ۱۹۲۶ء میں The Development of Metaphysics in Persia یا "فارس میں مابعد الطبیعیات کا نشو و نما" کے مترجم کو ترجمے کی اجازت دیتے ہوئے لکھدیا تھا کہ "یہ کتاب اب سے اٹھارہ سال پہلے لکھی گئی تھی، اس وقت سے نئے

اقبال کا فکری ارتقاء

پر تعاقب و تصحیح اور اقبال کی ابن سینا کے مزعومہ فلسفۂ عشق کی تشریح

از، مولانا عبد السلام خان، سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ رام پور،

میں نے معارف جنوری ۱۹۸۰ء اپنے مقالے "اقبال کا فکری ارتقاء" میں اقبال کی ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کی افکار کے تحت "عشق کی کائناتی اہمیت"، کے ذیل میں لکھا تھا کہ "غالباً یہ فارسی کی صوفیانہ شاعری کا اثر تھا کہ اقبال پر عشق کی کائناتی عظمت کا انکشاف ہوا"میرے قدیم محترم اور فاضل کرم فرما جناب شبیر احمد خان صاحب غوری نے اسی زمانے میں اپنے ایک مکتوب گرامی میں تعاقب فرمایا تھا کہ" اس صوفیانہ شاعری سے تو وہ بہت پہلے سے متاثر تھے، سوال یہ ہے کہ اس کا ظہور یورپ جانے سے پہلے کیوں نہیں ہوا۔ قیام یورپ ہی کے دوران کیوں ہوا؟" موصوف نے توجیہ فرمائی کہ "قیام یورپ کے دوران جو اہم اور سنجیدہ کام اقبال انجام دے رہے تھے وہ فارس میں مابعد الطبیعیات کا ارتقار، تھا" اس کتاب میں انھوں نے بو علی سینا کے فلسفے کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہ شیخ کے متعارف فلسفے (مبنی بر شفار و نجاۃ) کے بجائے اُس کے خصوصی فلسفے کا خلاصہ...... قلمبند کر رہے ہیں۔ اس خصوصی فلسفے کا لُبّ لُباب، کائنات میں عشق کی کار فرمائی کی توضیح و تبیین ہے، موصوف کا گمان ہے

کو عشق کی کائناتی اہمیت شیخ کی مزعومہ کتاب الحکمۃ المشرقیہ سے تاثر کا نتیجہ ہے، موصوف کا یہ گمان میرے نزدیک بہت زیادہ قرینِ صحت ہے، اقبال پر عشق کی کائناتی عظمت کا انکشاف براہ راست ابوعلی ابن سینا سے تاثر ہے، خواہ مزعومہ الحکمۃ المشرقیہ کے ذریعہ سے خواہ اس کے رسالۃ فی العشق کے ذریعہ سے میں محترمی غوری صاحب کی بالغ نظری کا معترف اور اُن کے اس تعاقب کا ممنون اور شکرگزار ہوں۔

اقبال کا "فلسفۂ عجم" میرے سامنے رہ چکا تھا لیکن تحریرِ مقالہ کے وقت اس سے ذہول ہوگیا، اور ابن سینا کے بجائے اقبال کے کائناتی عشق کا ماخذ فارسی کی صوفیانہ شاعری کو قرار دیدیا اس غفلت پر میں قارئینِ مقالہ سے معذرت خواہ ہوں۔

اس تعاقب کی تقریب سے فلسفۂ عجم میں شیخ کے تصورِ عشق کی توضیح کو پڑھا اور ماخذ سے مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ شیخ کے اصل حوالوں کے سمجھنے میں اور انکی تشریح میں اقبال نے کافی تسامح سے کام لیا ہے۔

اقبال نے یہ کتاب اپنی طالب علمی کے زمانے میں لکھی، اُس زمانے میں فلاسفۂ اسلام کے خیالات اور اُن کے ماخذوں پر غالباً انھیں پورا عبور نہ تھا، پھر اس تلخیص و تشریح میں انھوں نے مہرین A. F. Mehren کے مرتب کئے ہوئے "رسائل شیخ" کے رسالہ فی العشق پر اعتماد کیا جو کافی ناقص تھا، مزید براں وہ عربی حوالوں سے براہ راست پورا پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے، خصوصاً اس ابتدائی عہد میں، اس لیے یہ تسامح غیر اغلب نہیں۔ خود اقبال نے ۱۹۲۶ء میں The Development of Metaphysics in Persia یا "فارس میں مابعد الطبیعیات کا نشو و نما" کے مترجم کو ترجمے کی اجازت دیتے ہوئے لکھ دیا تھا کہ "یہ کتاب اب سے اٹھارہ سال پہلے لکھی گئی تھی، اسوقت سے نئے

امور کا انکشاف ہوا ہے، اور خود میرے خیالات میں بھی بہت سا انقلاب آ چکا ہے، جرمن زبان میں غزالی، طوسی وغیرہ پر علیحدہ کتابیں لکھی گئی ہیں، جو میری تحریر کے وقت موجود نہ تھیں، میرے خیال میں اب اس کتاب کا صرف تھوڑا سا حصہ باقی ہے جو تنقید کی زد سے بچ سکے۔ معلوم نہیں ان نئے امور میں ابن سینا کے فلسفے کی صحیح تلخیص و تشریح شامل ہے یا نہیں اور آیا اقبال کے خیالات کے انقلاب کا دائرہ شیخ کے مزعومہ خصوصی فلسفے کی توضیح پر بھی حاوی ہے؟

اس تعاقب، تصحیح اور تبصرے کو بہت پہلے لکھا جا چکنا چاہئے تھا لیکن اس زمانے میں اول تو مجھے دلجمعی میسر نہیں ہوئی، اور دوسری وجہ یہ ہوئی کہ میں "فلسفۂ عجم" پر جو ترجمہ ہے، اعتماد نہیں کرنا چاہتا تھا، اور میرا اعتماد نہ کرنا صحیح ثابت ہوا، جہاں تک اصل کا تعلق ہے اس کے مہیا ہونے میں بہت زیادہ وقت لگ گیا، پھر شیخ کے "رسالۃ العشق" کی نقل حاصل کرنے میں اور میہرین کے نسخے سے مقابلہ کرنے میں بھی وقت صرف ہوا، اور سب کچھ حاصل ہو چکنے کے بعد جب کہ بہت کچھ لکھ لیا تھا، کچھ ناگزیر مشغولیتیں آ گئیں کہ مسودہ نامکمل پڑا رہا، بہر حال اس غیر معمولی تاخیر کے لیے میں معافی چاہتا ہوں۔

ابن سینا کے فلسفے کیلئے اقبال کے مآخذ

اقبال نے شیخ ابو علی ابن سینا کے فلسفے کی دو حصوں میں تلخیص کی ہے، ایک حصے میں ابن سینا کے عشق کا تصور اور کائنات میں اس کے اثرات، جامد اور غیر جامد مادے میں ان اثرات کی تفصیل وغیرہ ہے، یہی حصہ گویا شیخ کے خصوصی اور منفرد فلسفے کا لب لباب ہے۔ دوسرے حصے میں نفس، روح کا بیان، نفس روح کی خصوصیات، اجرام فلکیہ، انسان، حیوان و نباتات پر اس کے عمل کی تفصیلات وغیرہ ہیں، یہ اس عہد کی عام نفسیاتی بحثیں ہیں، ان میں شیخ کی کوئی تخصیص نہیں۔

پہلے حصے کے لئے اقبال کا غالباً واحد ماخذ شیخ کا "رسالۃ فی العشق" ہے۔ یہ رسالہ

ہ نے اپنے ایک شاگرد ابوعبداللہ الفقیہ المعصومی کی فرمائش پر لکھا تھا نصیر الدین طوسی نے شرح ارات میں اس کا ذکر کیا ہے۔[1] شفاء، نجاۃ، اشارات، حکمت علائی میں جستہ جستہ عشق ہی کی ناتی تاثیر اور اس کے عامل کا تذکرہ ہے لیکن اقبال نے جن تفصیلات کا حوالہ دیا ہے وہ ، میں نہیں ہیں۔

"الحکمۃ المشرقیہ" نامی کتاب جس کی موجودگی کا اقبال نے ذکر کیا ہے۔ شیخ کی تصنیف ہے اپنے نام کی بنیاد پر اسکو مشرقی فلسفے سے مشتق کرنا، اور لفظ مشرقیہ کو جغرافیائی اشارہ قرار ا مشتبہ ہے، اقبال نے اس سے فائدہ اٹھانے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وہ موجود ، نہیں ہے منطق المشرقیین کے عنوان سے جو کتاب موجود ہے اور چھپ چکی ہے بظاہر وہی الحکمۃ مشرقیہ کا بقیہ باقیہ اور اس کا منطقی حصہ ہے دوا یا صوفیہ کے کتاب خانے میں طبیعیات الحکمۃ المشرقیہ کے نام سے جو ٹکڑا محفوظ ہے، یہ مشرقیہ نہیں بلکہ شفاء شیخ کی طبیعیات کی تلخیص ہے اور بظاہر شیخ کی اپنی تصنیف نہیں۔

الحکمۃ المشرقیہ کا اصل نسخہ بقول اسماعیل باخرزی سلطان مسعود بن سلطان محمود ، کتاب خانے میں غزنی میں محفوظ تھا اور ۵۴۵ھ میں غزنی کے جلائے جانے کے موقعہ پر جل گیا۔[2] تب بھلا تعجب ہے کہ فارسی ۔۔ مابعد الطبیعیات کا نشو ونما لکھتے وقت اقبال کو یہ معلومات ، نہوں اور انہیں کتابخانوں کی فہرستوں یا مستشرقین کے بیانوں نے انکی غلط رہنمائی کر دی ہو اور ہ اسکو موجود سمجھنے لگے ہوں۔

نفس و روح سے متعلق حصہ قدیم طبیعیات کے عام مسائل ہیں، اور اشارات، نجاۃ ، شفا وغیرہ شیخ کی کتابوں میں اپنے اپنے موقعوں پر مذکور ہیں۔ کسی خاص ماخذ کی تعیین دشوار ہے

---

[1] شرح اشارات از طوسی مطبوعہ مصر جزء دوم ص۔۔ [2] تتمہ صوان الحکمہ ص ۔۔ فہرست نسخہا مصنفات ابن سینا ص ۵۵ ایضاً صدم ۔۔

تاہم بعید نہیں کہ اشارات، اقبال کے سامنے رہی ہو، ہو سکتا ہے کہ شفاء شیخ سے بھی فائدہ اٹھایا ہو۔ شیخ کے رسالے علم النفس میں بھی قریب قریب یہ سب تفصیل ہے لیکن اقبال کے سامنے شاید یہ نہیں رہا۔

عشق کے کائناتی اثرات اور ابن سینا، اقبال نے فارس میں مابعد الطبیعیات کا نشوونما میں شیخ ابوعلی ابن سینا کے ذکر میں کہا ہے کہ "فارس کے ابتدائی فلسفیوں میں تنہا ابن سینا ہی ایسا شخص ہے جس نے خود اپنے (خاص) فکری نظام کی تشکیل کی کوشش کی۔ اس کی تصنیف 'مشرقی فلسفہ' نامی ابتک موجود ہے۔ اس کا ایک رسالہ بھی ہم تک پہنچا ہے جس میں اس فلسفی نے عالم طبیعت میں عشق کی قوت کے عالمگیر عمل پر اپنے خیالات پیش کئے ہیں یہ ایک طرح کا کسی نظام فکر کا خاکہ جیسا ہے اور اغلب ہے کہ اس میں جو خیالات پیش کئے گئے ہیں ان سے اس نے کبھی آیندہ مکمل فکری نظام کی تشکیل کر لی ہو۔[۱] ابن سینا کی جدت فکر اور اس کے رسالہ عشق کی خاص حیثیت کے متعلق اقبال کا یہ بیان حقیقت سے دور اور مبالغہ آمیز ہے عشق کی کائناتی اہمیت کا خیال نہ ابن سینا کا فکری کارنامہ ہے اور نہ کسی خاص فلسفیانہ نظام کی تشکیل کی کوشش۔ یہ رسالہ کسی نئے فکری نظام کا خاکہ نہیں بلکہ متقدمین و متاخرین کے خیالات کی بازگشت اور کائنات میں عشق کے اثرات کی یکجائی تفصیل ہے، شیخ نے اپنی دوسری تصنیفوں شفاء، نجات، اشارات، دانشنامہ علائی وغیرہ کتابوں اور دوسرے رسالوں میں کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیلاً ان کو اپنے اپنے موقعوں پر پیش کیا ہے۔ اور یہ سب کتابیں اور رسالے اسی عام فلسفہ سے تعلق رکھتے ہیں جو یونان کا ورثہ ہے۔

عشق اور فلاسفہ قدیم عشق کی کونیاتی اہمیت کی جڑیں یونان کے قدیم فلسفے میں پیوست ہیں اور وہیں سے آگے پھیلی ہیں۔ ایمپیڈوکلس نے جو تقریباً ۴۵۰ ق م کا فلسفی ہے۔ آپ ا

---

[۱] فارس میں مابعد الطبیعیات کا نشوونما ص ۳۲۔

باد، آتش وخاک کو ازلی ابدی ترکیبی عناصر اور عشق ونفرت کو ازلی ابدی عامل ومحرک مان کر اجسام کی ترکیب، تحلیل اور تغیر کی علت مانا تھا۔[1] افلاطون کے نزدیک آب، باد، آتش وخاک کائنات کے اجزائے ترکیبی ہیں، اور کائنات ان اجزا کے باہم اور مسلسل تناسب کی وجہ سے کامل توافق کی حالت میں قائم ہے، یہ توافق کامل ان میں معاشقے اور دوستی کو جنم دیتا ہے، جسکی وجہ سے اُن کی ترکیب منتشر نہیں ہونے پاتی۔ یہ ترکیب اتنی پائیدار ہوتی ہے کہ خدا کے علاوہ اس کو بکھیرنا کسی کے بس کا نہیں۔[2] ارسطاطالیس نے مادے کے متعلق کہا ہے کہ وہ کبھی بغیر کسی قسم کی فعلیت یا وجود کے استعداد محض کی حیثیت میں نہیں رہ سکتا۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں پیوست ہو کر دوسرے لفظوں میں، کوئی نہ کوئی چیز ہو کر ہی رہتا ہے، اسکی طبیعت میں صورت سے پیوست ہو کر کوئی نہ کوئی حقیقت بنے رہنے کی فطری خواہش ہے؛ گویا صورت سے اس کو فطری عشق اور لگاؤ ہے۔[3]

اشراقیین کا فلسفہ بھی اس قدیم ورثے سے خالی نہیں۔ ایک قسم کے عالمگیر عشق کے وہ بھی قائل اور مبلغ رہے ہیں۔[4] یہ نیکا اور اس کے پیروؤں میں یہ تصور برابر موجود تھا۔ اسلاف کا یہ عقیدہ نوفلاطونیت میں بھی کسی نہ کسی شکل میں قائم رہا۔ فلاطینوس نے جسم وجان کے تعلق کی توجیہ جان کی ایسی خواہش سے کی ہے جس کو جنسی جذبہ ہی کہا جا سکتا ہے لیکن شریف تر اور عالی تر۔ اس کو عشق کے سوا کیا کہا جائے گا۔[5]

عشق اور مسلم فلاسفہ

قدیم یونانی فلسفے کے ضمن میں مسلمانوں کو عشق اور اس کی تکوینی تاثیر کا خیال متقدمین فلاسفہ سے ترکے میں ملا، انھوں نے رفتہ رفتہ اسکو اس کے قدیم ڈھب پر

---

[1] تاریخ فلسفہ مغرب، از رسل ص ۶۲، ۶۴، [2] ایضاً ص ۱۶۶ [3] مختصر تاریخ فلسفہ از اسکندر ص ۱۰۱ [4] تاریخ فلسفہ مغرب ص ۱۰۱ [5] ایضاً ص ۳۱۶، ۳۱۷۔

آگے بڑھایا۔ اس کی منطقی تشریح کی، اس کے افرات کو موجودات میں واضح کیا اور عاشق و معشوق کی تعیین کی، اس پر مستقل رسالے لکھے، چنانچہ مشہور اصحابِ فکر کی جمعیت اخوان الصفا نے جہاں دوسرے فلسفیانہ مباحث پر رسالے مرتب کئے وہاں ۔ ۔ ۔ رسالۃ فی العشق بھی لکھا اور علت و معلول کے باہم ارتباط کی عشق سے توجیہ کی۔

ان الحکمۃ الالٰہیۃ والعنایۃ	حکمتِ ایزدی و عنایت ربانی نے موجودات
الربانیۃ قد ربطت اطراف	کے سرے ایک دوسرے سے ایک بندش
الموجودات بعضہا ببعض	میں باندھ دیئے ہیں اور ان کو ایک
رباطاً واحداً ونظمہا	سلسلے میں گوندھ دیا ہے، چنانچہ کچھ
نظاماً واحداً۔ وذالک	موجودات علت ہیں اور کچھ معلول،
ان الموجودات ماکان	کچھ بلا واسطہ اور کچھ بالواسطہ،
بعضہا علاۃ وبعضہا	معلول کی فطرت میں علت کی
معلولات ومنہا اوائل	طرف میلان اور شوق ودیعت کیا
ومنہا ثوانی۔ جعلت فی	اور علت کی طبیعت میں معلول
جبلۃ المعلولات نزوعاً	سے شفقت اور مہر و محبت۔
نحو علاتہا واشتیاقاً	
الیہا وجعلت ایضاً فی	
جبلۃ علاتہا شفقۃ و	
رأفۃ وتحنناً علی معلولاتہا[1]	

---

[1] رسائل اخوان الصفا، رسالۃ فی العشق، مخطوطہ رضا لائبریری، ص ۲۵۴

معلم ثانی فارابی نے اپنے مختلف رسائل میں عشق کی تاثیر معشوق اول معشوق دوم یا بلا واسطہ خیر کی طرف اجمالی اور تفصیلی اشارے کئے ہیں۔ تعلیقات میں کہتا ہے۔

الخیر ما تشوقہ کل شئی فی	ہر چیز اپنی بساط کے موافق جس کی شائق
حدہ و یتم وجودہ ای رتبتہ	ہو اور جس سے اسکی ہستی کی یعنی سلسلہ
وحقیقتہ من الوجود کالانسان	ہستی میں اس کے اپنے درجے اور اپنی
والفلک مثلاً فان کل واحد	حقیقت کی تکمیل ہو، خیر ہے مثلاً انسان
منہما انما یتشوق من الخیر	اور فلک کہ ہر ایک اس درجہ خیر کا
ما ینبغی لہ و ما ینتہی الیہ	شائق ہے جو اسکے مناسب اور اس کے
حدہ ثم سائر الاشیاء	مبلغ حد میں ہے بقیہ چیزیں بھی یوں ہی ہیں
علی ہذا الحد[1]	

شیخ نے شفا میں جو عام فلسفے سے تعلق رکھتی ہے، اس خیال کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہے، پہلے خیر محض کی تعیین کی ہے کہ۔

واجب الوجود بذاتہ ہو خیر	بذات خود واجب الوجود ہی خیر محض
محض، فالخیر بالجملۃ ما	ہے خلاصہ یہ کہ خیر وہی ہے جسکی ہر شے
یتشوقہ کل شیئی و ما یتشوقہ	شائق ہے، اور جسکی ہر شے شائق ہے،
ہو الوجود او کمال الوجود[2]	وہ وجود یا کمال وجود ہے۔

یہ فلاسفہ واجب تعالیٰ کی حقیقت وجود ہی وجود مانتے ہیں۔ اور بس، چنانچہ اس سے عشق کے معنی وجود سے عشق ہے۔

---

[1] التعلیقات از فارابی ص ۱۲　[2] شفاء الالٰہیات مخطوطہ رضا لائبریری ص ۳۲

فیکون المتشوق بالحقیقة
هو الوجود، فالوجود خیر محض
وکمال محض. والخیر بالجملة
هو ما یتشوقه کل شیء فی
حده ویتم به وجوده.
والشیئ لا ذات له بل هو
اما عدم جوهر او عدم
صلاح لحال الجوهر، فالوجود
خیریة[1]

حقیقۃً وجود ہی معشوق ہے، اسی لئے
وجود خیر محض اور کمال خالص ہے۔
خلاصہ یہ کہ اپنی بساط بھر ہر چیز خیر ہی
کی شائق ہے، اور اسی سے اسکی ہستی
کی تکمیل ہے (ہستی کو الگ کر کے)
چیز کی اپنی تو کوئی حقیقت ہی نہیں
وہ تو خود مادے کا عدم ہے یا مادے
میں ہر چیز کی صلاحیت کا فقدان
اس لئے ہستی کی خیر وجود ہی ہے۔

کچھ لوگوں نے صورت کو نر جیسا اور مادے یا ہیولی کو مادہ جیسا مان کر صورت کو ہیولی کا معشوق قرار دیا ہے۔ شیخ نے شفا میں اس خیال کی بہت تفصیل اور دلائل سے تردید کی ہے، اور اس کو فلسفیانہ کے بجائے صوفیانہ انداز قرار دیا ہے۔ اور عشق کا حامل صرف صورت کو مانا ہے[2]۔ مزید برآں عشق کو صورت تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ وضع اور این یا مکان سے بھی عشق تسلیم کیا ہے، اور جبری حرکت کو چھوڑ کر ارادی اور طبیعی حرکتوں کی توجیہ بھی عشق سے ہی کی ہے۔

غرض یہ کہ عشق اور اسکی کائناتی تاثیر شیخ کے رسالہ فی العشق سے خاص نہیں اور نہ یہ اس کی جدت فکر ہے۔ یہ قدیم اور موروثی خیال کی روایتی تشریح ہے، نہ دوسرے مسلم فلسفیوں سے جدا نہ شیخ کی دوسری کتابوں سے علحدہ۔

---

۱ شفا، الٰہیات، مخطوطہ رضا لائبریری ص ۳۲ ۲ شفا، طبیعیات، مقالہ اولیٰ، ورق ۳ ب

خیر، کمال یا حُسن | کائنات میں ہر شے کا اپنے وجود کے لحاظ سے ایک درجہ اور مرتبہ ہے۔ اپنے اس درجے کے مناسب اسکی اپنی خاص صورت، خاص صفت، خاص وضع اور خاص مکان ہے۔ اس کے نشوونما کا ایک خاص انداز اور خاص حد ہے، اس نشوونما کے لیے اس میں مخصوص صلاحیتیں اور منفرد استعدادیں ہیں۔ ان استعدادوں کے ہونے کے معنی ذی استعداد شے کا ہونا ہے نہ کہ بذات خود استعدادوں کا ہونا۔ شے اپنی ان استعدادوں کے مطابق طبعاً یا ارادۃً نشوونما پاتی ہے، اور استعدادیں حقیقت بننے لگتی ہیں حتی کہ شے آہستہ آہستہ دوسری مناسب صورت، مناسب صفت، مناسب وضع اور مناسب مکان اختیار کرکے دوسرا نیا وجودی درجہ حاصل کرلیتی ہے، اب نئے درجے سے مناسبت رکھنے والی نئی استعدادیں آتی ہیں، اور واقعیت اختیار کرنے لگتی ہیں۔

خیر، کمال یا حُسن شے کی وہ آنے والی صورت، صفت، وضع یا مکان ہے جو اس کے موجودہ درجے سے میل کھاتی ہوئی اور مناسبت رکھتی ہوئی ہے، اور جس کی صلاحیتیں اور استعدادیں اس میں ہیں۔ مثلاً سلسلۂ موجودات میں وجود کے لحاظ سے انسانی علقے کا ایک درجہ ہے، انسانی علقے سے مناسبت رکھنے والی اور میل کھاتی ہوئی، انسانی صورت ہے، اس کی مکمل صلاحیت اُس میں ودیعت ہے۔ چنانچہ انسانی صورت اس کے لیے خیر اور اس کا کمال ہے، اور یہی اس کے لیے حُسن ہے۔ یہ علقہ طبعاً اُس کی طرف حرکت کر رہا ہے۔ علوم ومعارف کی تحصیل اور نیک کرداری انسانی صورت سے مناسبت رکھتے ہیں۔ اور انسان میں ان کے حاصل کرنے کی کامل استعداد ہے۔ یہی اس کے لیے حُسن، خیر اور کمال ہیں، اسلئے انسان کو ارادۃً اُن کی طرف بڑھنا چاہیے اور ان استعدادوں کو حقیقتوں میں بدلنا چاہیے، کیونکہ یہ استعدادیں اور صلاحیتیں استعدادوں اور صلاحیتوں کی حد تک عدم ہیں کوئی ہستی نہیں رکھتیں،

فیکون المتشوق بالحقیقة	حقیقةً وجود ہی معشوق ہے، اسی لئے
هو الوجود، فالوجود خیر محض	وجود خیر محض اور کمال خالص ہے۔
وکمال محض. والخیر بالجملة	خلاصہ یہ کہ اپنی بساط بھر ہر چیز خیر ہی
هو ما یتشوقه کل شیء فی	کی شائق ہے، اور اسی سے اسکی ہستی
حده ویتم به وجوده.	کی تکمیل ہے۔ (ہستی کو الگ کرکے)
والشیء لا ذات له بل هو	چیز کی اپنی تو کوئی حقیقت ہی نہیں،
اما عدم جوهر او عدم	وہ تو خود مادے کا عدم ہے یا مادے
صلاح لحال الجوهر فالوجود	میں (چیز کی) صلاحیت کا فقدان
خیر به[1]	اس لئے بس کی خیر وجود ہی ہے۔

کچھ لوگوں نے صورت کو نر جیسا اور مادے یا ہیولیٰ کو مادہ جیسا مان کر صورت کو ہیولیٰ کا معشوق قرار دیا ہے۔ شیخ نے شفاء میں اس خیال کی بہت تفصیل اور دلائل سے تردید کی ہے، اور اس کو فلسفیانہ کے بجائے صوفیانہ انداز قرار دیا ہے۔ اور عشق کا حامل صرف صورت کو مانا ہے[2] مزید براں عشق کو صورت تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ وضع اور این یا مکان سے بھی عشق تسلیم کیا ہے اور جبری حرکت کو چھوڑ کر ارادی اور طبیعی حرکتوں کی توجیہ بھی عشق سے ہی کی ہے۔

غرض یہ کہ عشق اور اسکی کائناتی تاثیر شیخ کے رسالہ فی العشق سے خاص نہیں اور نہ یہ اُس کی جدت فکر ہے۔ یہ قدیم اور موروثی خیال کی روایتی تشریح ہے، نہ دوسرے مسلم فلسفیوں سے جدا، نہ شیخ کی دوسری کتابوں سے علٰحدہ۔

۱؎ شفاء، الٰہیات، مخطوطہ رضا لائبریری ص ۳۲ ۲؎ شفاء، طبیعیات، مقالہ اولیٰ، ورق ب

خیر، کمال یا حُسن کائنات میں ہر شے کا اپنے وجود کے لحاظ سے ایک درجہ اور مرتبہ ہے۔ اپنے اس درجے کے مناسب اسکی اپنی خاص صورت، خاص صفت، خاص وضع اور خاص مکان ہے۔ اس کے نشو و نما کا ایک خاص انداز اور خاص حد ہے، اس نشو و نما کے لیے اس میں مخصوص صلاحیتیں اور منفرد استعدادیں ہیں۔ ان استعدادوں کے ہونے کے معنی ذی استعداد شے کا ہونا ہے نہ کہ بذات خود استعدادوں کا ہونا۔ شے اپنی ان استعدادوں کے مطابق طبعاً یا ارادۃً نشو و نما پاتی ہے، اور استعدادیں حقیقت بننے لگتی ہیں حتیٰ کہ شے آہستہ آہستہ دوسری مناسب صورت، مناسب صفت، مناسب وضع اور مناسب مکان اختیار کرکے دوسرا نیا وجودی درجہ حاصل کرلیتی ہے، اب نئے درجے سے مناسبت رکھنے والی نئی استعدادیں آتی ہیں، اور واقعیت اختیار کرنے لگتی ہیں۔

خیر، کمال یا حُسن شے کی وہ آنے والی صورت، صفت، وضع یا مکان ہے جو اس کے موجودہ درجے سے میل کھاتی ہوئی اور مناسبت رکھتی ہوئی ہے، اور جس کی صلاحیتیں اور استعدادیں اس میں ہیں۔ مثلاً سلسلۂ موجودات میں وجود کے لحاظ سے انسانی علقے کا ایک درجہ ہے، انسانی علقے سے مناسبت رکھنے والی اور میل کھاتی ہوئی، انسانی صورت ہے، اس کی مکمل صلاحیت اُس میں ودیعت ہے۔ چنانچہ انسانی صورت اس کے لیے خیر اور اس کا کمال ہے، اور یہی اس کے لیے حُسن ہے۔ یہ علقہ طبعاً اُس کی طرف حرکت کر رہا ہے۔ علوم و معارف کی تحصیل اور نیک کرداری انسانی صورت سے مناسبت رکھتے ہیں۔ اور انسان میں ان کے حاصل کرنے کی کامل استعداد ہے۔ یہی اس کے لیے حُسن، خیر اور کمال ہیں اسلئے انسان کو ارادۃً اُن کی طرف بڑھتا چلا جانا چاہیے اور اِن استعدادوں کو حقیقتوں میں بدلنا چاہیے، کیونکہ یہ استعدادیں اور صلاحیتیں استعدادوں اور صلاحیتوں کی حد تک عدم ہیں، کوئی ہستی نہیں رکھتیں،

اور خیر و کمال یا حسن وجود ہے ان کی اپنی ہستی ہے، استعداد تاریکی ہے اور کمال روشنی ہے عدم اور تاریکی سے گریز، وجود اور روشنی کی خواہش فطری ہے۔

شیخ کا تصورِ عشق و شوق | کسی شے کو اس کے کمال کی طرف انگیز کرنے والا خود اس کا کمال کی طرف میلان اور اس کی رغبت ہے، اسی میلان اور رغبت کا نام عشق و شوق ہے۔ جبری حرکتوں کو چھوڑ کر جو حرکتیں ہیں۔ اور جس جس طرف ہیں طبیعی ہوں، ارادی ہوں کسی صورت کی طرف ہوں، کسی وضع کی طرف ہوں، کسی مکان کی طرف ہوں۔ سب کا محرک اور باعث عشق و شوق ہے۔ ان حرکتوں کی غایت اور ان کا مقصد جسم کا اپنے ذاتی کمالات کو حاصل کرنا ہے۔

ان کل محرک حرکۃ غیر قسریۃ
فهو الی امر ما وتشوق امر ما[عہ]
حتی الطبیعۃ ایضاً فان
معشوق الطبیعۃ امر طبیعی
وهو الکمال الذاتی للجسم
اما فی صورتہ واما فی
اینہ ووضعہ ومعشوق
الارادۃ امر ارادی[لہ]

جبری حرکت کے علاوہ ہر حرکت کا محرک
تو وہ کسی نہ کسی شے (یا غایت و مقصد)
کی طرف ہوتا ہے۔ اور اشتیاق ہوتا ہے
کسی نہ کسی کا حتیٰ کہ طبیعت بھی کسی کی
طرف اشتیاق رکھتی ہے) چنانچہ طبیعت
کا معشوق طبیعی شے (سے متعلق) ہے،
اور یہ طبیعی شے جسم کا ذاتی کمال ہے،
صورت کے لحاظ سے ہو یا مکان و وضع
کے لحاظ سے، اور ارادے کا معشوق ہے

(ترجمہ از مصنف)

موجودات بسیط ہوں یا مرکب، اجسام ہوں یا نفوس، حیوانی ہوں یا نباتی سب کی خیر

لہ نجاۃ ص ۲۶۲ و شفاء ورق ب ۳۳ عہ فهو کذا فی النجاۃ ص ۲۶۲

وکمال کا آخری سرچشمہ واجب تعالےٰ کی مقدس ذات ہے۔ یہ ذات ہمہ خیر، ہمہ جمال وکمال اور ہمہ آب وتاب ہے۔

فالواجب الوجود لہ الجمال و	چنانچہ جمال اور خالص آب وتاب
البھاء المحض وھو مبدأ	واجب الوجود کے ہی لیے ہے، وہی
جمال کل شیئ وکمال کل شیئ	ہر شے کے جمال اور ہر چیز کے کمال وآب
وبھائہ[1]	وتاب کا سرچشمہ ہے۔

چنانچہ تمام موجودات خیر محض سے عشق کے باعث اپنے کمالات اور اپنی خیرات کی طرف مائل ہیں حتیٰ کہ ان کا مشترک کمال، خود وجود بھی اسی عشق کا نتیجہ ہے۔ نباتی، حیوانی، انسانی بلکہ سماوی نفوس بھی اس عشق سے خالی نہیں، یہ سب اپنے مناسب کمال کے عاشق اور خواہاں ہیں۔ یہ مناسب کمال خود خیر محض کی دین ہے۔ ساتھ ساتھ اپنی تعمیری خرابی اور بنیادی نقص سے متنفر اور گریزاں ہیں۔ یہ تعمیری نقص اور بنیادی خرابی مادے کی شومی ہے۔ ہیولیٰ اور مادہ استعداد محض ہے؛ ایک طرح کا عدم جو ان کے وجود میں مضمر اور شامل ہے۔ اور ہر موجود کی نظرت ہے کہ وہ وجود کا شائق ہو اور عدم سے متنفر۔

کل واحد من الھویات	حقائق مدبرہ (یا نفوس) میں سے ہر
المدبرۃ لما کان بطبعہ	حقیقت نظرۃً اپنے کمال کی عاشق ہے؛
نازعاً الی کمالہ الذی	یہی کمال اس حقیقت کی خیر باشی
ھو خیریۃ ھویتہ المنسیلۃ[2]	ہے جو خیر محض کا عطیہ ہے، اور اپنے مخصوص
عن ھویتہ الخیر المحض	نقص سے گریزاں ہے۔ یہ نقص اس کی

---

[1] شفار، ورق ص ۳۳ [2] المنبعث

نافرۃ عن النقص الخاص به الذی هو شر یتعلق بالهیولیۃ والعدم میتۃ۔ اذ کل شر من علائق الهیولے والاشیاء فیتنۃ ان لکل واحد من الموجودات عشقاً بالخیر شوقاً طبیعیاً او عشقاً غریزیاً۔ ویلزم ضرورۃ ان یکون العشق فی هذہ الاشیاء سبباً للوجود لها۔[1]

ہیولانی اور عدمی شر نصیبی ہے۔ شر جتنے ہیں ہیولے اور عدم کے رشتے سے ہیں۔ اب ظاہر ہے، کہ ہر حقیقت موجود میں طبیعی شوق اور فطری عشق ہے اور یہ تو خود بخود لازم ہو جاتا ہے کہ ان کا عشق ہی ان کے وجود کا سبب ہے۔

کوئی موجود حقیقت صرف وجود نہیں ہے؛ ہر کمال سے خالی، ہر وصف اور ہر صورت سے عاری۔ حقائق کی دنیا میں ایسے موجود کا کوئی وجود نہیں۔ حقائق کی دنیا میں ہر موجود کچھ دوسرے اوصاف و کمالات بھی رکھتا ہے، گویا کسی حقیقت کا وجود ان کمالات و اوصاف کے مجموعی وجود کا نام ہے؛ یہ کمالات اس وجود میں پیوست ہیں اور یہ وجود ان کمالات میں؛ یہ موجود وحدت ہے ان کمالات کی، اور یہ کمالات وحدت ہیں اس موجود کی۔ کوئی موجود، مثلاً حیوانی، نباتی یا جمادی وجود سے الگ ہو کر کوئی موجود حقیقت نہیں حقیقتیں تو یہ ہیں، اور یہی موجود ہیں' نہ کہ وجود صرف جو کچھ موجود نہیں۔ جہاں تک ان خاص وجودوں یعنی حیوانی، نباتی یا جمادی وجودوں کا تعلق ہے، یہ حسب استعداد اپنے خاص خاص کمالات و اوصاف کے حامل اور ان کی وجودی اکائی ہیں۔ ان خاص خاص کمالات سے موجود کی یگانگی کی وجہ موجود کا ان کمالات سے

[1] رسالۃ فی العشق۔ طبع لیڈن، ص ۲ ۔ ۔ تو قاً

عشق اور ان کی طرف اس کا طبعی میلان ہے۔ کسی خاص موجود کو اپنے مخصوص کمالات و اوصاف سے عشق نہ ہوتا تو یہی مخصوص کمالات و اوصاف اس میں کیوں سرایت کیے ہوتے! لوہے کا مادہ لوہا ہی کیوں بنتا، انسانی علقہ درخت کیوں نہیں ہوجاتا۔

عشق کے ثبوت کا یہ بیان موجودات کے اپنے موقف سے تھا، اسی کو علت اور مبدء فیض کے رُخ سے اس طرح واضح کیا جا سکتا ہے کہ یہ تو واقعہ ہے کہ موجودات، وہ نفوس مرتبہ ہی کیوں نہوں، اپنی جگہ کچھ نہ کچھ کمالات ضرور رکھتے ہیں ورنہ موجود ہی کیسے ہوتے، تو وجود بھی تو کمال ہی ہے، چونکہ یہ اپنے کمالات کا سرچشمہ خود نہیں ہیں اسلئے اپنے کمالات کو خود وجود دینے کے لیے کافی نہیں، ان کے کمالات کا سرچشمہ وہی ذات ہے جو اپنی ذات سے کامل اور خود بخود خیر ہے، ہمہ کمال اور ہمہ واقعیت۔ ہمہ کمال اور ہمہ واقعیت ذات کے لیے یہ نقص اور عیب ہے، اور اس کی ہر جہتی واقعیت کے خلاف ہو کہ وہ اپنی عطا اور بخشش میں موجودات کو فرداً فرداً اور الگ الگ سامنے رکھے۔ ایسی حالت میں اس کی حکمت و مصلحت کا ایک ہی تقاضا ہو سکتا ہے کہ وہ موجودات کی اپنی فطرت میں اپنے اپنے کمالات کی طرف عام میلان اور رغبت ودیعت کر دے جس کی وجہ سے وہ اپنے کمالات کی طرف خود بڑھیں، موجودہ کمالات کا تحفظ کریں اور جاتے رہیں تو واپس لائیں۔ اس عام میلان اور رغبت کا نام عشق و شوق ہے۔

فاذ جملة الموجودات (الغير)	تو اب تمام موجود حقیقتیں کسی نہ کسی
عن ملابسة کمال تام	کمال سے خالی نہیں، اور ان کا اس
فلا ینفك لها عشق و نزوع فی	کمال سے تعلق، جو ان کے ساتھ،
طبیعتها الی ما توحد متاخر	ایک ہے اور وہ اپنے اس کمال کے
بکمالها ملازمة لها۔	ساتھ ایک دوامی ملزوم ہیں،

وما یوضح ذالک من جهة	طبعی عشق اور میلان کی وجہ سے ہے
العلة والِلمّیة ان کل واحد	علت ولِم کے موقف سے اس کی
من الهویات المدبرة	وضاحت یوں ہے کہ حقائق مدبرہ
لمّا لا یخلو عن کمال خاص	میں سے کوئی حقیقت اپنے مخصوص
به ولم یکن مکتفیا بذاته	کمال سے خالی نہیں، اور اپنے کمالات
لوجود کمالاته، اذ کمالات	کی وجود بخشی میں خود کافی نہیں کیونکہ
الهویات المدبرة مستفاضة	حقائق مدبرہ کے کمالات تو کامل بالذات
عن فیض الکامل بالذات۔	کا فیض ہیں۔ اور یہ تو وہم بھی جائز
ولم یجز ان یتوهم ان	نہیں جیسا کہ فلاسفہ واضح کر چکے ہیں۔
هذا المبدأ المفید للکمال	کہ مبدء فیاض اپنے فیض میں موجودات
یقصد بالافادة واحدا	کے ایک ایک فرد کو سامنے رکھے گا،
واحدا من جزئیات	اب اُس کی مصلحت اور حُسنِ تدبیر
الهویات علی ما اوضحته	کا یہی تقاضا رہ جاتا ہے کہ ان کی
الفلاسفة، فمن الواجب	فطرت میں عام عشق ودیعت کرے
فی حکمة وحُسن تدبیره	تاکہ انھوں نے کمالات کلیہ کے فیض
ان یغرز فیه عشقا	سے جو حاصل کیا ہے۔ اس کا تحفظ
کلیا حتی یصیر بذالک	کریں، نہ ہونے پر اُن کو وجود میں
مستحفظا بما نال من	لانے کا شوق ہو تاکہ حکیمانہ نظام
فیض الکمالات متناهیة	پر انتظام چلتا ہے بہر حال تمام حقائق

ونازعاً الی الایجاد لہا	مدبرہ میں اس عشق کا زوال ناپذیر
عند فقدانہا لیجری بہ	وجود قطعی ضروری ہے۔
امر السیاستہ علی النظام	
الحکمی، فواجب اذن وجود	
ھذا العشق فی جمیع الموجودات	
المدبرۃ وجوداً غیر مفارق	
البتۃ [1]	

خیر و کمال سے عشق کا باعث خود خیر و کمال ہیں، یہ خود مقصد اور غرض ہیں، ان سے عشق کی کوئی دوسری غرض نہیں، ہر غرض، ہر مقصد اور ہر نصب العین صرف اس لیے حاصل کیا جاتا ہے کہ وہ خیر و کمال ہے، خواہ واقعۃً یا محض اس کے خیال میں۔

ان الخیر بذاتہ معشوق ولولا	خیر بذات خود معشوق ہے ورنہ کوئی
ذلک لما نصب کل واحد	اپنی رغبت، طلب یا عمل کا مقصد
ما یشتہی او یتوخی او یعمل	صرف اسی شے کو نہ بناتا جس کے
عملاً غرضاً اماماً یتصور	خیر ہونے کا اسے خیال ہوتا ہے، خود
خیریتہ. فلولا ان الخیریۃ	خیر ہونا ہی محبوب نہ ہوتا تو ہر عمل میں
بذاتہا معشوقۃ لما اقتصرت	ہمت خیر کو اختیار کرنے پر مرکوز
الھمم علی ایثار الخیر فی جمیع	نہ ہوتی۔ اسی لئے خود خیر، خیر کی
التصرفات، ولذالک الخیر	عاشق ہے۔
عاشق للخیر [2]	

---

[1] رسالۃ فی العشق ص ۲، ۳ [2] ایضاً ص ۴۔

خیر کے عاشق خیر ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے اسی سیاق میں شیخ نے عشق پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ عشق درحقیقت خوب و مناسب کی پسند کا نام ہے، اور خوب و مناسب کی طرف کشش کا باعث یہی عشق ہے۔

لان العشق لیس فی الحقیقة	کیونکہ عشق، درحقیقت ہے ہی خوب
الا استحسان الحسن والملائم	اور بہت مناسب کی پسند، یہ (خوب)
جداً۔ وھذا العشق ھو مبدء	فرقت پذیر ہے تو یہی عشق اس کی
النزوع الیہ عند غیبوبتہ	غیر موجودگی میں اُس کی طرف کشش
ان کان مما یباین والتوحد بہ	کا اور اس کی موجودگی میں اس کے
عند وجودہ۔[1]	ساتھ یگانگی کا باعث ہے۔

اسی سے ہو سکتا ہے استحسان یا خوب و پسند کی مزید تشریح کر دی ہے کہ خوب سے مقصود مناسب و ملائم اور پسند کا مطلب میلان و کشش ہے، جمال اور جمال کی قدر دانی جیسا انفعالی تاثر نہیں۔

ثم کل واحد من الموجودات	مزید یہ کہ ہر موجود وہی پسند کرتا ہو
یستحسن ما یلائمہ وینزع	جو اس کے مناسب ہو اور نہ ہونے کی
الیہ مفقوداً۔ والخیر الخاص	صورت میں اُس کی طرف کھنچتا ہے اور
المنیل للشئی فی الحقیقة	یہ اگر ... ہے کہ شے کی خاص خیر
والحسبان فیما ظن ھو	یعنی اس کا نصیب وہ ہے جو (شے کے)
الملائم بالحقیقة ثم	مناسب ہو، خواہ واقعی خواہ خیالی۔
الاستحسان والنزوع و	علاوہ ازیں موجود کی پسند و میلان

---

[1] رسالۃ فی العشق ص [illegible]۔

والاستقباح اوالنفرۃ فی　　کراہیت و نفرت خیر سے رشتے

الموجود من علائق خیریتہ[1]　　کی وجہ سے ہے۔

یہ ہے ابن سینا کے عشق کا تصور جو اس کی دوسری کتابوں اور خود اس کے رسالۃ فی العشق سے ماخوذ ہے، خیر، کمال، حسن فلسفیانہ اصطلاحات ہیں، جن کی تفسیر خود شیخ نے بیان کر دی ہے، یہ تفسیر دوسرے قدیم مسلم فلسفیوں کی تفسیر سے الگ اور نئی تھیں۔

شیخ کا تصور اور اقبال شیخ کے عشق کا جو تصور اقبال نے پیش کیا ہے، اس میں غلط فہمی کی گنجایش ہے، وہ کہتے ہیں کہ "ابن سینا عشق کی قدر دانی جمال (Appreciation of Beauty) سے تعریف کرتا ہے"[2] لیکن ابن سینا کے نزدیک جیسا کہ میں بہت وضاحت سے بیان کر چکا ہوں، عشق صرف قدر دانی (Appreciation) نہیں بلکہ شوق، میلان اور تحریک ہے طبعی غایات کی طرف طبیعت کو انگیز کرنے والا اور ارادی مقاصد کے لئے قصد و ارادہ کو مہمیز کرنے والا۔ یہ انفعالی اور تاثری کیفیت نہیں بلکہ تاثیری اور فعلی قوت ہے۔ شیخ نے اس کو پہلے "مبدء نزوع" یا باعث کشش سے اور پھر دو سطروں بعد ہی "نزوع" یا کشش کو ساتھ ذکر کر کے "استحسان" کی حقیقت اور اس کی تاثیری خصوصیت کو واضح کر دیا ہے۔

اقبال نے حسن کو (Beauty) یا جمال سے تعبیر کیا ہے اور عین کمال قرار دیا ہے تاہم یہ تعبیر زیادہ واضح نہیں، شیخ نے "حسن" کے ساتھ "الملائم جداً" (یعنی بہت مناسب) کے اضافے سے پھر "خیر" کے ساتھ "ہو الملائم بالحقیقۃ" (یعنی درحقیقت مناسب ہی خیر ہے) سے حسن اور خیر کی اصل حقیقت بالکل متعین کر دی ہے۔ لیکن اقبال نے ان اصطلاحات کی اہمیت کو

---

[1] رسالۃ فی العشق ص ۴　[2] ایضاً

محسوس نہیں کیا، اور عشق کی تحریک کی تشریح و تفصیل میں یہ اصطلاحی نصب العین سامنے نہیں رکھا، چنانچہ اقبال کی تشریح شیخ کی تشریح سے بہت دور اور بنیادی طور سے مختلف ہو گئی،

شیخ کے نزدیک خاص ممکن کے مدارج،	ارواح و نفوس یا موجوداتِ مدبّرہ کے وجود کا باعث عشق و شوق ہے، اس کے ثبوت کی تمہید میں شیخ نے خاص ممکنات کے وجودی مدارج بیان

کئے ہیں۔

لان کل واحد مما یعبر عنه	کیونکہ ہر ایسی شے جو بیان میں آسکتی ہے،
مرتب تحت امور ثلاثة	تین درجوں میں مرتب ہے، اپنے مخصوص
اما ان یکون فائقاً بخاص	کمال میں غالب، نقص کامل میں مبتلا،
الکمال او ممنوعاً بغایة النقص	دونوں درجوں کے بیچ میں گردان یعنی
او متردداً بین الحالتین،	دونوں کے درمیان کے مرتبوں پر فائز
حاصل الذات علی مرتبة	جو نقص کامل کے درجے میں ہے وہ عدم
التوسط بین الامرین۔ ثم	مطلق سے لگی ہوئی ہے اور اسی کے رشتے
ان البالغ فی النقص غایته	اس پر چھائے ہوئے ہیں۔ اسکو تو معدوم
فهو المنتهی الی مطلق العدم	مطلق ہی کہلانا چاہئے۔ یہ معدوم مطلق
والمستوفی لجمیع علائقه	کہلائے جانے کے لائق جس کو اگرچہ تقسیم
فبالحری ان یطلق علیه	کی حد تک یا وہم کے درجے میں موجودات
معنی العدم المطلق ثم الحقیق	زمرے میں شمار ہونے کا حق ہو گیا ہے
باطلاق العدمیة علیه	وجودی لحاظ سے ذاتی وجود کی حد میں
وان استحق ان یعدّ فی عداد الموجودات	شمار نہیں ہو گی، اس کو موجود کہنا تو

عند تقسیم او توهم فلن یُعدّ
وجوده وجوداً ذاتیاً بل لن
یستجاز علیه اطلاق الموجود
الا بالمجاز ولن یتعرض لاعتدال
من جملة الموجودات الا
بالعرض، فاذاً الموجودات
الحقیقیة إمّا ان تکون
موجودات مستعدة لنهایة
الکمال او موصوفة بالتردد
بین نقص عارض من جهة ما
وکمال موجود فی الطبع۔[1]

مجاز ہے؛ موجود کی حیثیت سے اُس کو
تعرض کرنا محض بالواسطہ ہے، چنانچہ
حقیقی موجودات یا وہ ہیں جن میں
اپنے آخری کمال پر پہنچنے کی استعداد
ہے یا وہ ہیں جو کسی لحاظ سے عارضی نقص
اور طبعی کمال کے درمیان میں ہیں۔

شیخ کا مقصد یہ ہے کہ نقص محض اور کمال غالب، خاص ممکن کی دو سری حدیں ہیں؛ ایک استعداد ہی استعداد ہے تو دوسری واقعیت فائقہ جہاں تک کمال خالص اور واقعیت محض کا تعلق ہے ممکن خاص کی سرحد سے خارج اور بالاتر ہے، یہ واجب تعالیٰ کی ذات ہے؛ وجود مطلق اور خیر مجرد۔ اس کے مقابلے میں ممتنع بالذات ہے؛ معدوم مطلق اور محض عقلی فرض۔ عام موجودات نقص محض اور کمال غالب کے درمیان کے مدارج ہیں۔

خاص ممکن کی سب سے پست سطح یا آخری سرحدی سرحد جو نقص محض ہے؛ ابتدائی مادہ اور بے صورت جوہر ہے، یہ مادیات کی مستقل یا آنی جانی تمام صورتوں کا محل ہے، اور خود

---

[1] رسالۃ فی العشق۔ ص۲۔

بے صورت ہے، ہر قسم کے نقوش کی لوح ہے، اور خود بے نقش ہے۔ حقائق کی دنیا میں اس سادہ؛ بے صورت اور بے نقش جوہر کا کوئی وجود نہیں۔ یہ عقل کی مخصوص تجرید ہے؛ مادّے کو اس کی تمام تی جالی صورتوں سے خالی مان لینا، لوح کو ہر قسم کے نقوش سے سادہ قرار دے لینا موجودات کی دنیا میں تو جو مادہ ہے وہ صورت سے قرین ہے، جو لوح ہے اس کی نقش سے تزیین ہے۔ بے صورت مادہ اپنی جگہ عقلی تصور ہے، جو ممکن کی تقسیم کے موقعے پر بکار آمد ہے اور وہم کی حد تک موجود ہے۔ اصل موجود تو باصورت جوہر ہے، اس کا وجود تو مجازی اور صورت کے واسطے سے ہے نہ کہ بطورِ خود۔ ممکن کی بالاترین سطح اور فوقانی سرحد کمالِ غالب ہے یونانی فلسفے کی عقول مجردہ اسی سطح کی موجود ہیں۔ یہ مادے سے قطعی بے تعلق ہیں۔ روزمرہ کے موجودات اس سطح سے نیچے اور نقصِ محض کی سطح سے اوپر ہیں۔ یہ صورت اور مادے کا مرکب ہیں۔

اس تقسیم کے مطابق شیخ کے نزدیک خاص ممکن کے ان درجوں میں سے قطب کمال یا بالاترین سطح پر واقع اور اس سطح سے نیچے یعنی قطب نقصان یا پست ترین سطح سے اوپر واقع درجے حقیقی وجود رکھتے ہیں۔ بالاترین سطح کے موجودات اپنی صلاحیتوں اور استعدادوں کے آخری درجے پر ہیں، کون و فساد سے بری، اپنے کمالات پر فائز، زیرین سطح کے موجودات کون و فساد کے چکر میں مبتلا، مناسب کمالات کو حاصل کرنے کی دھن میں سرگرداں۔ اس سلسلے کی سب سے آخری سطح یا قطب نقصان استعداد محض ہے، جو ناکام وجود رکھتی ہے، اس کا حقیقی وجود سے بے واسطہ اور تعلق ہے کہ وہ وجود کی منزل، صورت کا پردہ اور جوہر موجودات ہے؛ مادیات کی ہستی اُس پر موقوف ہے، اُس کو تہہ میں مانے بغیر نہ جمادات کا وجود نہ نباتات و حیوانات کا۔

اقبال کی تلخیص و تشریح | اقبال نے کہا ہے کہ شیخ اپنی اس تعریف کے موقف سے بیان کرتا ہے کہ وجود کی تین جنسیں، (catagoris) ہیں" حالانکہ شیخ نے اس تقسیم کو اس پر

استدلال کا پیش خیمہ بنایا ہے کہ نفوس مدبرہ کے وجود کا باعث عشق و شوق ہے، علاوہ ازیں شیخ کی تقسیم نقص و کمال کے لحاظ سے ہے اور وجود کے ساتھ عدم کو بھی شامل ہے،

اقبال نے یہ واضح نہیں کیا کہ جمال حسن کی طرف میلان کا نام عشق ہے، اصل میں خود وجود[1] اس وضاحت کے بغیر تقسیم کا جمال سے اور پھر عشق سے کوئی ربط نہیں رہتا جب کہ وجود کو عشق کی کی تاثیر قرار دینے کی بنیاد شیخ کے نزدیک ہی تقسیم ہے۔

اقبال نے شیخ کی تقسیم یا بیانِ مدارج کو وجود کی تقسیم سمجھ لیا حالانکہ شیخ نے ممکن کی تقسیم کی ہے جو موجودت عام اور معدوم کو شامل ہے، چنانچہ شیخ نے " مایُعبّرُ عنہ " (یعنی جسکو عبارت اور لفظوں میں بیان کیا جا سکے) کے وجودی درجوں؛ حقیقی موجود اور نوہماتی موجود کو بیان کیا ہے، اقبال سے اتنا ہی تسامح نہیں ہوا بلکہ شیخ کا مفہوم سمجھنے میں بھی غلطی ہوئی، اور تقسیم، اقسام اور ان کے درجے سب بدل گئے، اقبال کی تشریح شیخ کے اپنے بیان سے الگ ہی نہیں ہو گئی بلکہ بے معنی اور محض ادّعا ہو کر رہ گئی۔

اقبال نے شیخ کے " سہ گانہ مدارجِ ممکن " کی وجود کی اجناس سہ گانہ سے ترجمانی کر کے کہا ہے: لیکن تیسری جنس کا کوئی حقیقی وجود نہیں۔ کیونکہ کچھ چیزیں کمال کی انتہا پر پہنچ چکی ہیں، اور (بقیہ) دوسری کمال کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ نصب العین کے لیے یہ تگ و تاز، جمال کی طرف جو شیخ کے نزدیک عین کمال[1] ہے۔ عشق کی تحریک[2] ہے۔ صورت کے مرئی ارتقاء کے نیچے عشق کی قوت ہے، جو اس ساری تگ و تاز، حرکت اور ترقی کو واقعیت دے رہی ہے، چیزوں کی ساخت ہی ایسی ہے کہ وہ عدم سے نفرت کرتی ہیں اور مختلف

---

[1] اقبال نے Identical with Perfection لکھا ہے، مترجم "فلسفۂ عجم" نے کمال کے مماثل، ترجمہ کیا ہے۔ [2] اقبال کے Movement کا ترجمہ فلسفۂ عجم میں حرکت سے کیا گیا ہے۔

پیکر دن میں انفرادیت کی مسرت سے عشق رکھتی ہیں[1]۔ میں ذیل میں سہولتِ مقابلہ کے لیے اقبال کے سمجھے ہوئے وجود کے اجناسِ سہ گانہ کے ساتھ شیخ کے بیان کئے ہوئے ممکن کے مدارجِ سہ گانہ بھی پیش کئے دیتا ہوں۔

شیخ کے مدارج ممکن	اقبال کے اجناس وجود
۱۔ کمالِ خاص میں فائق مثلاً یونانی فلسفے کی عقولِ مجردہ	۱۔ اشیا جو کمال کے بر ترین نقطے پر ہیں۔
۲۔ نقصِ کامل میں مبتلا مثلاً مادۂ مجرد،	۲۔ اشیا جو کمال کے زیریں نقطے پر ہیں۔
۳۔ دونوں کے بیچ میں گردان مثلاً عام موجودات،	۳۔ اشیا جو قطبینِ کمال کے درمیان قائم ہیں۔

اقبال نے شیخ کی سند پر وجود کی سہ گانہ جنسیں بیان کی ہیں وہ شیخ کے پیش کئے ہوئے ممکن کے سہ گانہ مدارج سے بالکل الگ ہیں، شیخ کی اصل عبارت سے جس کو میں نقل کر چکا ہوں اس تشریح کا کوئی تعلق نہیں۔

چیزوں کا اپنے مختلف پیکروں میں انفرادیت سے فطری عشق، شیخ کے بیان سے ماخوذ نہیں، بلکہ اقبال کی اپنی فکر ہے۔ شیخ کے نزدیک موجودات کو صرف ان پیکروں سے عشق ہے، جو اُن کی موجودہ حالت سے مناسبت رکھتے ہیں اور بس۔ (باقی)

---

[1] فارس میں مابعد الطبیعیات کا نشوونما، ص ۳۲، ۳۳۔

فارسی میں تاریخ نویسی[1]

مترجمہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

فارسی زبان میں تاریخ نویسی، شاہناموں سے شروع ہوتی ہے۔ خود شاہنامے، ایران کی عمومی تاریخ کا حکم رکھتے ہیں۔ ہم نے شاہناموں کو ملی داستانوں کا جزو قرار دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مطالب، ملی روایات اور داستانوں کے ایک بڑے حصے پر مشتمل ہیں۔ اور یہ وجہ بھی ہے کہ یہ روایات اور داستانیں ہماری اولو العزمانہ اور پرشوکت داستانوں کا سرمایہ رہی ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ اس قبیل کی تمام کتابیں مفقود ہو گئیں، اس لیے انکے بارے میں اظہار خیال اب ضروری نہیں۔

ہم جب اس قسم کی مفقود کتابوں سے صرف نظر کرتے ہیں تو کتابوں کے ایک ایسے گروہ سے ہمارا سابقہ پڑتا ہے جنھیں حقیقت میں تاریخ کی کتابیں کہا جا سکتا ہے۔ یہ کتابیں یا تو عمومی تاریخ کے مسائل پر مشتمل ہیں۔ یا بادشاہوں کے کسی مخصوص سلسلے کی تاریخ سے مختص ہیں

---

[1] زیر نظر مضمون ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کی ایک اہم تالیف "نثر فارسی" کے دوسرے باب کے ایک حصے کا ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر صفا، موجودہ ایران کے ایک فاضل استاد اور معروف مصنف ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر صفا کی کتاب "تاریخ ادبیات در ایران" ایک بنیادی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے بیشتر فارسی ادب کی تاریخ پر توجہ دی ہے اور ان کی مختلف تصانیف اسی موضوع کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتی ہیں۔ (بقیہ حاشیہ ص)

جب ہم فارسی کی عمومی تاریخ کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ اُن میں تمام دنیا کی بہت وسیع معلومات مہیا کی گئی ہوں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں لکھنے والوں کے لیے جامع اور وسیع اطلاعات فراہم نہ تھیں۔ اگر فارسی لکھنے والے مسلمان مورخوں نے عمومی تاریخ لکھی ہو تو عام طور پر انہوں نے [illegible] قبل اسلام ایران کی داستانوی اور افسانوی تاریخ سے شروع کیا ہے۔ قدیم انبیا کی تاریخ جو مبہم طور پر بابلیوں، مصریوں اور یونانیوں کی تاریخ سے خلط ملط ہے اور اسی طرح بعض حکمار کی تاریخ کا ذکر بھی اس میں شامل کیا ہے۔ اس کے بعد یہ مورخ پیغمبر اسلام صلعم کے ظہور، خلافت عباسیہ کے خاتمہ تک اسلامی تاریخ، ایران کے مختلف علاقوں میں متعدد ایرانی بادشاہوں کے خاندانوں کی تشکیل، سلاطین کا ذکر، خود سلاطین اور ان کے عہد کے وزرا،..... شعرا اور برگزیدہ شخصیتوں کے حالات پر توجہ دیتے ہیں۔ اسلامی دور کے ایرانیوں نے عمومی تاریخ لکھنے کے لیے سب سے پہلے عربی زبان کا سہارا لیا۔ اس کے نتیجہ میں محمد بن جریر الطبری (متوفی ۳۱۰ھ/۹۲۲ء) کی معتبر کتاب "تاریخ الامم والملوک" وجود میں آئی۔ اس کتاب نے اپنی تالیف کے زمانۂ اوایل ہی میں بہت شہرت حاصل کر لی، سامانی دربار میں اس کتاب کا ایک ایسی کتاب کے طور پر استقبال ہوا جس کا فارسی میں ترجمہ ہونا چاہیئے۔ لہٰذا اس کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ بہرصورت اس کتاب کا مترجم امیر منصور ابن نوح سامانی کے وزیر ابوالفضل محمد بلعمی (متوفی ۳۳۰ھ/ ۹۴۱ء) کا لڑکا ابوعلی محمد ہے۔ امیر منصور کے حکم سے، ابوعلی محمد نے اس کتاب کے ترجمے کا کام (۳۵۲ھ) ۹۶۳ء میں شروع کیا۔ مترجم نے اصل کتاب کے کچھ حصوں کو حذف کر دیا اور

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۵) ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ فارسی ادب کی تاریخ پر جب بھی کوئی ایرانی قلم اٹھاتا ہے تو وہ ہندوستانی فارسی ادب کو یا تو سرے سے شامل ہی نہیں کرتا اور اگر اس موضوع پر کوئی گفتگو کی جاتی ہے تو وہ نامکمل، مختصر اور سطحی ہوتی ہے۔ اس افسوسناک صورت حال کے اسباب سے بحث کا یہ موقع نہیں، بہرحال ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر صفا کی تصنیفات بھی اس خلل سے پاک نہیں۔ زیر نظر مضمون [illegible] ایک مثال ہے۔

تاریخ طبری کے علاوہ، ایران کے بارے میں دوسرے منابع سے بھی استفادہ کیا۔ اس طرح ایک نئی کتاب جو در اصل "تاریخ الامم والملوک" پر مبنی اور مستند ہے، وجود میں آئی۔ لیکن یہ کتاب بذات خود ایک مستقل کتاب شمار کی جاتی ہے۔ اس وجہ سے بہتر یہ ہے کہ اسے "تاریخ بلعمی" کے نام سے موسوم کیا جائے۔

غزنویوں کے دور میں عمومی تاریخ پر ایک دوسری کتاب "زین الاخبار" کے نام سے لکھی گئی ہے۔ اس کا مؤلف، غزنوی سلاطین کا معاصر، عبدالحئی بن ضحاک گردیزی غزنوی ہے۔ اس کی کتاب میں ابتدائے آفرینش سے مودود بن مسعود غزنوی (متوفی ۴۴۲ سے ۴۴۴ھ/۰-۱۰۴۸ء تک حکومت کی) کے زمانے تک کے واقعات شامل ہیں۔ اسمیں ملتوں کی تاریخ، تہوار و رسوم اور حوادثات عالم کے بارے میں مفید اطلاعات ملتی ہیں۔ اس کی نثر روان اور سادہ ہے۔ اس کتاب کے وہ حصے جن میں قبل اسلام کے ساسانی دور اور اسلامی دور کے طاہری، صفاری، سامانی اور غزنوی عہد کا ذکر ہے، قابل توجہ ہیں۔ اسی وجہ سے ان میں سے ہر ایک جداگانہ طور پر شائع ہوا ہے اور یہ مکمل کتاب ازسرنو آقای حبیبی کی تصحیح اور بنیاد فرہنگ ایران کی کوشش سے شائع ہو گئی ہے۔

ایک دوسری نہایت اہم اور قابلِ استفادہ کتاب جس کا ذکر یہاں ہونا چاہیے، "مجمل التواریخ والقصص" ہے۔ یہ کتاب ایران، عرب، خلفا اور قبل اسلام اور اسلامی عہد کے ایرانی سلاطین کی تاریخ پر ایک معتبر کتاب ہے، اور ایران سے متعلق نہایت سودمند اطلاعات پر حاوی ہے۔ اس کے مؤلف کا نام معلوم نہیں۔ لیکن شاید یہ ہمدان یا اسدآباد ہمدان کا رہنے والا تھا۔ اس نے اپنی کتاب ۵۲۰ھ (۱۱۲۶ء) میں سلطان سنجر اور محمود بن ملک شاہ سلجوقی کے عہدِ سلطنت میں لکھی ہے، مجمل التواریخ کے مولف نے

اپنی کتاب کی تالیف میں اوایل میں حمزۃ بن الحسن اصفہانی کی "تاریخ سنی ملوک الارض والانبیاء" پر توجہ کی لیکن صرف اسی کتاب سے استفادہ پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ دیگر ماخذ سے بھی بہت سے مطالب اخذ کیے۔ یہ ماخذ خاص طور پر وہ معتبر کتابیں ہیں، جو تاریخ یا ملی داستانوں پر لکھی گئی تھیں، مثلاً ابوالمؤید بلخی کی کتابیں، محمد بن جریر کی تاریخ، تاریخ اصفہان، اسکندرنامہ اور ابن المقفع کی سیر الملوک، شاہنامۂ فردوسی، کوشنامہ اور گرشاسپنامہ وغیرہ، اسی وجہ سے یہ کتاب ایسی اطلاعات پر حاوی ہے جو صرف اسی میں ملتی ہیں۔[۵]

گذشتہ دور کے مقابلے میں مغول عہد اور اس کے بعد کے زمانے سے عمومی تواریخ کی تالیف پر زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمانے کے بعد کی لکھی ہوئی کتابوں نے ان مفصل کتابوں کی جگہ لے لی جو اس سے پہلے یا اس دور تک عربی زبان میں لکھی گئی تھیں۔ اس نوعیت کی اہم ترین کتابوں میں ایک جامع التواریخ ہے۔ چونکہ یہ کتاب خلفاء اور ایرانی سلاطین کے سلسلوں کے حالات اور خاص طور پر مغولوں کے بارے میں وسیع اطلاعات فراہم کرتی ہے، دوسرے یہ کہ فاطمیون، اسماعیلیوں اور نزاریوں کی مفصل تاریخ پر اس میں توجہ دی گئی ہے، اور یہ کہ مؤلف اور اس کے ہمکار متعدد اور مختلف منابعوں اور اسناد تک رسائی رکھتے تھے، اس لئے یہ کتاب فارسی کی ایک مستند اور عزیز الوجود کتاب ہے۔ اس معتبر کتاب کا مؤلف، مغولی ایلخانیوں کے عہد کا ایرانی دانشمند وزیر، رشید الدین فضل اللہ ہمدانی ہے جسے ۷۱۸ ہجری (۱۳۱۸ء) میں قتل کر دیا گیا تھا۔ جامع التواریخ سات جلدوں پر مشتمل ہے اور ۷۱۰ ہجری

---

[۵] مجمل التواریخ کے بارے میں مزید اطلاع کے لیے رجوع کریں۔ مجمل التواریخ، مطبوعہ تہران، ۱۳۱۸، پر ملک الشعراء بہار کا مقدمہ اور تاریخ ادبیات در ایران، ڈاکٹر صفا، ج ۲، طبع اول ص ۹۳۵-۹۳۶

(۱۳۱۰ء) میں مکمل ہوئی۔

ایک دوسری مشہور کتاب جس کا ذکر تاریخی تقدم کی رعایت سے "جامع التواریخ" سے پہلے ہونا چاہیے، "طبقات ناصری" ہے۔ اس کتاب میں انبیاء، خلفا، ظہور اسلام تک عجمی بادشاہوں، یمن کے بادشاہوں، طاہریوں، صفاریوں، سامانیوں، دیلمیوں، غزنویوں، سنجریوں (اتابکوں کے مختلف سلسلے) نیمروزیوں، کرد بادشاہوں، خوارزمشاہیوں، غوریوں اور ہندوستانی سلاطین (غوری، مملوک اور خاص طور پر ہندوستان کے شمسیہ بادشاہوں) اور چنگیزیوں کے اکیس[۲۱] طبقوں کا ذکر ہے، اس کتاب کا مولف قاضی ابو عمر و منہاج الدین بن سراج الدین جوزجانی معروف بہ منہاج سراج ہے، جو ساتویں صدی کا ایک عظیم مصنف ہے، اس نے یہ کتاب ۶۵۸ ہجری (۱۲۵۹ء) میں مکمل کی۔ وہ اطلاعات جو منہاج سراج، خصوصاً غوریوں، غوری مملوک، چنگیز اور اس کی اولاد کے بارے میں بہم پہنچاتا ہے، بہت پر ارزش ہیں، اور بعض اطلاعات تو صرف اسی کتاب پر منحصر ہیں۔

ساتویں صدی کے ایک عظیم دانشور قاضی ناصرالدین بیضاوی نے ۶۷۴ ہجری (۱۲۷۵ء) میں اپنی کتاب "نظام التواریخ" تالیف کی۔ یہ کتاب ابتدائے آفرینش سے ایک عمومی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ اس کے بعد تقریباً ۶۹۴ ہجری (۱۲۹۴ء) تک مطالب کا اس میں اضافہ کیا گیا ہے۔

ان تالیفات کے چند سال بعد، حمداللہ بن ابی بکر بن احمد مستوفی قزوینی نے ۷۳۰ ہجری (۱۳۲۹ء) میں دنیا کی عمومی تاریخ پر اپنی مشہور کتاب "تاریخ گزیدہ" لکھی۔ چونکہ اس میں پرمایہ اور گوناگوں تاریخی اطلاعات اور مطالب کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس لیے قابل توجہ ہے۔ اور ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ حمداللہ نے اپنی کتاب پیامبروں کے احوال سے شروع

کی ہے، اس کے بعد قبل اسلام ایرانی بادشاہوں پر توجہ دی ہے اور پھر پیامبروں، خلفائے راشدین،
ائمہ اثنا عشری، چند صحابہ، بادشاہان بنی امیہ اور خلفائے بنو عباس کے حالات سپرد قلم کئے ہیں،
اس کے بعد اسلامی عہد کے اوایل سے اپنے عہد تک ایرانی سلاطین کے خاندانوں کا ذکر کیا ہے۔
کتاب کے آخر میں ایک باب احوال ائمہ سنت، قراء، مشایخ، علمائے دین، شعرا اور دوسرا
باب قزوین کے واقعات کے بیان کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

ان لوگوں میں جنھوں نے تیموری عہد کے متذکرۂ بالا مورخوں کی پیروی کی ہو شہاب الدین
عبداللہ بن لطف اللہ معروف بہ حافظ آبرو کا ذکر سب سے پہلے ہونا چاہئے۔ یہ ۸۳۳ ہجری (۱۴۲۹ء)
میں فوت ہوئے۔ حافظ آبرو دو معتبر کتابوں "زبدۃ التواریخ" اور "مجمع التواریخ سلطانی" کے
مولف ہیں۔ مجمع التواریخ چار جلدوں میں لکھی گئی ہے۔ اس کی پہلی تین جلدوں میں مغول عہد تک
تاریخی واقعات شامل ہیں۔ اور چوتھی جلد میں آخری مغول ایلخانی بادشاہ سلطان ابوسعید
بہادر خاں کے عہد سے ۸۳۰ ہجری (۱۴۲۶ء) تک کے واقعات ملتے ہیں۔ حافظ آبرو کو
ایران کے معروف اور قابل اعتماد مورخوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ان کی تالیفات بھی
بہت قابل توجہ اور قابل اعتبار ہیں۔

اسی دور کا ایک دوسرا اہم مورخ احمد بن جلال الدین محمد معروف بہ فصیحی خوافی ہے
یہ مجمل التواریخ کا مولف ہے۔ جو ۸۴۹ ہجری (۱۴۴۵ء) میں مکمل ہوئی اور مولف نے اسے
تیمور کے لڑکے شاہرخ کو تقدیم کیا۔ اس کتاب میں چونکہ بہت سے شعراء اور دانشوروں
کا ذکر ہے، ادبی مسائل پر توجہ کی گئی ہے۔ اور اس کا طرز نگارش سادہ ہے اس لئے بہت
زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں ابتدائے آفرینش سے ۸۴۵ ہجری
(۱۴۴۱ء) تک کی تاریخ اجمال اور ایجاز کے ساتھ اور ایک مخصوص باب میں ہرات کی تاریخ

بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں میں محمود فرخ کی تصحیح اور مقدمے کے ساتھ ۱۳۳۹ھ سے ۱۳۴۱ شمسی کے درمیانی عرصے میں شایع ہوئی ہے۔

تیموری عہد کے اختتام پر ایک مشہور مورخ محمد بن خاوند شاہ بن محمود معروف بہ "میرخواند" (۸۳۶ - ۹۰۳ ہجری / ۱۴۳۳ - ۱۴۹۸ عیسوی) بقید حیات تھا۔ اس نے اپنی معروف کتاب روضۃ الصفا "چھ" جلدوں میں تالیف کی اور اس کے نواسے "خواند میر" نے اس پر ایک جلد کا اضافہ کیا۔ یہ آخری جلد سلطان حسین بایقرا اور اس کے لڑکے بدیع الزمان میرزا کے عہدِ سلطنت کے واقعات پر مشتمل ہے۔ روضۃ الصفا میں قبل اسلام اور مولف کے زمانے تک اسلامی عہد کے اہم تاریخی واقعات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

لیکن غیاث الدین خواند میر (متوفی ۹۴۱ھ / ۱۵۳۴ء) نے اپنی معروف کتاب "دستور الوزراء" کے علاوہ جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ ایک دوسری معتبر کتاب حبیب السیر لکھی۔ اس میں شاہ اسمٰعیل صفوی کی تاریخ وفات تک عمومی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔[1] "روضۃ الصفا" اور "حبیب السیر" متاخر ایرانی مورخوں کی دو اہم ترین اور عمومی تاریخ کو خاص طور پر ایران کی عمومی تاریخ پر کثیر اطلاعات پر حاوی کتابوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ایک دوسری کتاب جو ان کتابوں کی جانشین بنی، "تاریخ الفی" ہے اس میں اسلام اور اسلامی ممالک کے ہزار سالہ واقعات سپرد قلم کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی تالیف شاہنشاہ اکبر کے حکم سے ۹۹۳ ہجری (۱۵۸۵ء) میں شروع ہوئی۔ اور اس کے بعد ۱۰۰۰ ہجری (۱۵۹۱ء) اور ۱۰۲۱ ہجری (۱۶۱۲ء) میں اس پر نظرثانی کی گئی۔ اکبر شاہ کے معاصرین میں ایک دوسرا مولف "قوعی نیشاپوری" ہے۔ اس کی کتاب مجامع الاخبار ہے۔ جس میں ہجرت سے ایک ہزار سال تک کے واقعات کا ذکر

کیا گیا ہے۔

قاچاری عہد میں رضا قلیخان ہدایت (متوفی ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء) نے میر خواند کی روضۃ الصفا پر ضمیمہ لکھا اور اسے "روضۃ الصفای ناصری" کا نام دیا۔ اس کے علاوہ میرزا تقی خان سپہر اور اس کے لڑکے عباس قلی سپہر نے مشہور اور مفصل کتاب ناسخ التواریخ لکھی۔

عمومی تاریخ پر ان معروف تالیفات کے علاوہ جن کا ذکر ہم نے کیا ہے، ہم ذیل میں اسی قسم کی چند دوسری تواریخ کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

تاریخ بناکتی (روضۃ اولی الالباب فی تواریخ الاکابر والانساب) تالیف ابو سلیمان داؤد بن محمد بناکتی۔ یہ غازان خان کا معاصر ہے اور ۷۳۰ ہجری (۱۳۲۹ء) میں فوت ہوا۔ یہ کتاب ۷۱۱ھ / ۱۳۱۱ء میں تالیف ہوئی۔

فردوس التواریخ مؤلفہ معین ابرقوہی۔ یہ تاریخ ۸۰۸ھ (۱۴۰۵ء) میں لکھی گئی۔

"منتخب التواریخ" میں معین الدین نطنزی نے عہد آدم سے عہد تیمور گورکانی کے کچھ عرصے بعد تک کی عمومی تاریخ بیان کی ہے۔

"لب التواریخ" تالیف یحیی بن عبد اللطیف سیفی قزوینی میں ۹۴۸ ہجری (۱۵۴۱ء) تک کے واقعات شامل ہیں۔

"جہان آرا" تالیف قاضی احمد غفاری قزوینی (متوفی ۹۷۵ھ / ۱۵۶۷ء) صفوی عہد کے آغاز تک کے واقعات پر حاوی ہے۔

"روضۃ الطاہرین" معروف بہ "تاریخ طاہری" تالیف طاہر سبزواری میں ۱۰۱۴ ہجری (۱۶۰۵ء) تک کے واقعات ملتے ہیں۔

"زینۃ التواریخ" تالیف میرزا محمد رضا منشی الممالک تبریزی اور عبد الکریم بن علی رضا

اشتہاروی ابتدا سے ۱۲۲۱ ہجری (۱۸۰۶ء) تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔

"منتظم ناصری" کا مؤلف محمد حسن خان اعتماد السلطنۃ، ناصر الدین شاہ قاچار کے عہد کا ایک معروف شخص ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں آغاز اسلام سے واقعات کو بترتیب سال بیان کیا ہے۔

جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے تعرض کیا، فارسی نثر میں تواریخ کا ایک اور سلسلہ بھی موجود ہے اس قسم کی کتابیں بادشاہوں کے مخصوص خاندانوں کے ذکر سے مختص ہیں، یہ کتابیں جو بیشتر دربار وقت کے مصنفین نے لکھی ہیں مولفوں کے معاصر بادشاہوں اور سلسلوں کے بارے میں مفید اطلاعات پر حاوی ہیں اغراق اور مبالغہ ان مولفین ...... کی مخصوص زندگی کا لازمہ ہے، اور ان کے حامی سلاطین بھی ان سے اسی کی توقع رکھتے تھے، اگر ہم اس اغراق اور مبالغے کے طرز سے صرف نظر کریں تو اس قسم کی کتابوں سے جو مستقیم اور بلاواسطہ اطلاعات دستیاب ہوتی ہیں، ان کی اہمیت فارسی تواریخ میں بہت زیادہ ہے۔ اگر سلاطین کے خاندانوں کے بارے میں فارسی میں کوئی مستقل کتاب نہ ملے تو اس کمی کو رفع کرنے کیلئے ہم ان کتابوں سے استناد کر سکتے ہیں جو شہروں اور قصبوں کی تاریخ پر لکھی گئی ہیں مثال کے طور پر سامانیوں کی تاریخ کیلئے تاریخ بخارا سے اور صفاریوں کی تاریخ کیلئے تاریخ سیستان کی سودمند تفصیلات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے ہم ان دونوں کتابوں کے بارے میں جن کا ہم نے مثال کے طور پر حوالہ دیا ہے بعد میں ذکر کریں گے۔

فارسی کی اہم ترین کتاب جس کا مذکورہ بالا عنوان کی کتابوں کے تحت اس وقت ذکر کرنا مقصود ہے، ابوالفضل محمد بن حسین بیہقی کی "تاریخ بیہقی" ہے۔ اس نے اپنی کتاب، سلاطین غزنوی کی تاریخ پر اس خاندان کی حکومت کے آغاز سے سلطان ابراہیم بن مسعود کی سلطنت کے زمانہ اوائل تک ترتیب دیا تھا۔ اس کا اب صرف ایک حصہ موجود ہے۔ کتاب کا مؤلف ۳۸۵ ہجری (۹۹۵ء) میں متولد اور ۴۷۰ ہجری (۱۰۷۷ء) میں فوت ہوا۔ اس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ غزنوی بادشاہوں کے نظام حکومت میں دبیر کی حیثیت سے گذارا، دربار کے

اس اہم مقام پر فائز ہونے کی وجہ سے، اطلاعات کا مجموعہ اسے فراہم ہوا، اس نے اسی کی مدد سے اپنی معتبر کتاب کو جو فارسی ادب اور تاریخ کی کتب امہات میں شمار ہوتی ہے۔ ترتیب دیا، اس کتاب کی تاریخی اہمیت صرف اس امر میں پوشیدہ نہیں کہ غزنوی دور کے اہم ترین سیاسی حادثات کا ایک حصہ اس میں محفوظ ہے، بلکہ اس کی اہمیت، مؤلف کے کام کے طریقے، مطالب کی صحت اور اتقان، واقعات کے نقل کرنے میں مولف کی دقتِ نظر اور ان اسناد و دستاویز سے استفادہ میں مضمر ہے جو مؤلف کی درباری حیثیت نے اس کے اختیار میں دے دیئے تھے۔ اسی وجہ سے یہ کتاب تاریخی اسماجی حتیٰ کہ غزنویوں کے دربار میں مؤلف کے زمانے کے بعض ادبی مسائل اور ادیبوں کی زندگی اور ان کی ادبی خدمات سے متعلق تحقیق کے لیے ایک اچھا ماخذ شمار ہوتی ہے۔ یہ اہم کتاب تیس جلدوں پر مشتمل تھی۔ لیکن اب اس کا صرف ایک حصہ باقی ہے۔ جس میں مسعود بن محمود غزنوی کی سلطنت کے واقعات درج ہیں اور آل مامون کی حکومت کے زوال سے سلطان محمود کے ہاتھوں خوارزم کی فتح اور اس شہر پر سلجوقیوں کے غلبے تک خوارزم کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

غزنویوں کے دور کی ایک دوسری اہم کتاب بھی ملتی ہے جو ابونصر محمد عتبی (متوفی ۴۲۰ھ / ۱۰۳۵ء) کی تاریخ یمینی ہے۔ یہ عربی زبان میں تالیف ہوئی تھی اور خود اس زبان کے معروف متون میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں اواخر سامانی عہد اور غزنوی دور کے اوایل کے واقعات اور اس دور سے متعلق نہایت مفید اطلاعات شامل ہیں۔ تاریخ یمینی کو ابوالشرف ناصح بن ظفر جرفادقانی (گلپایگانی) نے ۶۰۳ ہجری (۱۲۰۶ء) میں پُرتکلف فارسی نثر میں منتقل کیا۔

سلجوقیوں کے بارے میں ہمارے پاس فارسی زبان میں بیشتر اور بہتر ماخذ موجود ہیں،

ان میں سے بعض متون، اوایل سلجوقی دور کے سلاطین اور سلاجقۂ عراق سے متعلق ہیں۔ کچھ متون میں کرمان کے سلجوقیوں کی تاریخ ہے اور کچھ دوسرے ایشیائے کوچک کے سلجوقیوں اور دوسرے سلجوقی سلاطین کے بارے میں اطلاعات و روایات پر حاوی ہیں۔ اس کتاب میں ضمنی طور پر اس خاندان کے اتابکوں کا بھی جہاں کہیں ضروری ہوا، کم و بیش ذکر کیا گیا ہے۔

اسی نوعیت کی ایک کتاب ظہیرالدین نیشاپوری کا سلجوقنامہ ہے جو ۵۸۲ ہجری (۱۱۸۶ء) سے پہلے تالیف ہوا۔ ظہیرالدین نیشاپوری سلاجقۂ عراق میں سلطان ارسلان بن طغرل (۵۵۶-۵۷۳ھ/۱۱۶۱-۱۱۷۷ء) کا اتالیق تھا۔ اس نے اپنی کتاب طغرل بن ارسلان (۵۷۳-۵۹۰ھ/۱۱۷۷-۱۱۹۴ء) کے عہد میں لکھی اسی وجہ سے اس کی کتاب میں سلجوقیوں کی ابتدائے سلطنت سے طغرل بن ارسلان کی سلطنت کے ایک حصے تک کی تاریخ شامل ہے۔ سلاجقۂ عراق کے عہد کی تاریخ مکمل کرنے کے لیے ۵۹۹ھ/۱۲۰۲ء میں ابوحامد محمد بن ابراہیم نے ظہیرالدین نیشاپوری کے سلجوقنامہ کا تتمہ لکھا۔ ظہیرالدین نیشاپوری نے اپنی اطلاعات اور باوثوق اور معتبر منابع سے اخذ کی ہیں۔ اس لئے یہ کتاب اپنے موضوع پر مورخوں کا مرجع قرار پائی اور معتبر کتابوں میں شمار ہوئی۔[۱]

دوسری کتاب جو آل سلجوق کی تاریخ کے لیے اسی نوعیت کی حامل ہے۔ راحۃ الصدور و آیۃ السرور ہے۔ اس کا مولف نجم الدین ابوبکر محمد بن علی بن سلیمان راوندی، کاشان کے راوند قصبے کا رہنے والا ہے۔ اس نے اپنی زندگی عراق کے سلجوقیوں کی خدمت میں گذری اور ۵۹۰ ہجری (۱۱۹۴ء) میں یعنی سلطان طغرل بن ارسلان کے قتل کے بعد مولف ایشیائے کوچک کے سلجوقی بادشاہ غیاث الدین کیخسرو بن قلج ارسلان کی خدمت میں چلا گیا۔ اور راحۃ الصدور کو ۵۹۹ ہجری (۱۲۰۲ء) میں اسی کے نام پر تالیف کیا۔ اگرچہ یہ کتاب سلجوقیوں کے

[illegible]

بارے میں مفید ماخذ پر مبنی ہے۔ لیکن حشو و زوائد، اضافات، تکلفات اور مبالغے سے خالی نہیں۔ اس کے بیشتر بنیادی مطالب، ظہیر الدین نیشاپوری کے "سلجوقنامہ" کے زیر اثر ترتیب دئے گئے ہیں۔[1]

چند سال بعد، سلاجقۂ روم کے زوال پذیر اور انقلابی دور کے ایک باقیماندہ بادشاہ سلطان علاء الدین بن سلیمان شاہ (متوفی ۷۰۵ھ/۱۳۰۳ء) کے مطالعہ کے لیے ایک کتاب "تاریخ آل سلجوق" لکھی گئی۔ اس کا مؤلف نامعلوم ہے۔ اس کتاب میں ابتدا سے سلجوقیوں کی تاریخ مختصر طور پر بیان کی گئی ہے، اور کتاب کے آخر میں ۷۰۲ھ (۱۳۰۳ء) تک ایشیائے کوچک میں زمانے کے انقلابات اور بعض دوسرے وقایع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب انتہائی ایجاز کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ اور اس کے مؤلف نے اس کی بنیاد ہی اختصار پر رکھی ہے۔[2]

ایک دوسری بہتر کتاب "مسامرۃ الاخبار و مسایرۃ الاخیار" ہے۔ اس کے مؤلف محمود بن محمد معروف بہ کریم آق سرائی نے اسے ۷۲۳ ہجری (۱۳۲۳ء) میں مکمل کیا۔ اس کتاب میں بزرگ سلاطین سلجوقی اور سلاجقۂ عراق کی تاریخ کے علاوہ عزیز الدین کیکاؤس تک ایشیائے کوچک کے سلجوقیوں کا ذکر شرح و بسط کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا چوتھا حصہ، ہلاکو کے ایران کی طرف کوچ کے بعد ایشیائے کوچک اور شام میں رونما ہونے والے حادثات اور روم میں مغلوں کی مداخلت کے دور اور وہاں کے انقلابات کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ چونکہ یہ مطالب مؤلف کے بلا واسطہ مشاہدات اور اطلاعات پر مبنی ہیں اس لئے کتاب کے باقی دوسرے مطالب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اور در حقیقت کتاب کے اصلی اور بیشتر حصے کو تشکیل

---

[1] اس کتاب کے لئے رجوع کریں: راحۃ الصدور، بتصحیح محمد اقبال اور اس کا انگریزی میں مقدمہ مطبوعہ لائیڈن ۱۹۲۱ عیسوی۔ [2] تاریخ آل سلجوق در آناطولی، بتصحیح و مقدمہ از ڈاکٹر فریدون نافذ اوزلوق مطبوعہ انقرہ۔ ۱۹۵۲۔

ناصر الدین یحیی بن محمد ۔ معروف بہ ابن البیبی کی کتاب الاوامر العلائیہ" معروف بہ
بن بی بی" کا شمار بھی سلجوقیوں سے متعلق مشہور کتابوں میں ہوتا ہے۔ یہ تاریخ کا ایک
ور آراستہ متن ہے۔ مولف نے اواخر عہد قلج ارسلان بن مسعود کی تاریخ سے
کیا ہے، اور ۶۷۹ھ تک کے حادثات و واقعات کو تفصیل سے لکھا ہے۔ مطالب میں
ائد اور تفصیلات کی وجہ سے ایک بار اس کتاب کی تلخیص کی گئی ہے، اس ملخص کو
لجوقنامہ" کے عنوان سے *M. Th. Houtsma* نے ۱۹۰۲ میں شائع کیا
تاب کا مکمل متن یعنی "الاوامر العلائیہ" ۱۹۵۶ میں انقرہ سے شائع ہوا۔[۱]

کرمان کے قاوردیان کے بارے میں محمد ابن ابراہیم نے جو تقریباً ۱۰۲۵ ہجری (۱۶۱۶ء) میں
تھا، ایک کتاب ترتیب دی۔ اسے ہوتسما (*Houtsma*) نے "تواریخ آل سلجوق"
م سے ۱۸۸۶ میں لائیڈن سے شائع کیا۔ حال ہی میں ڈاکٹر باستانی پاریزی نے اسی
کو اپنے مقدمے کے ساتھ "سلجوقیان و غز در کرمان" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب
ردیان، ان کے انجام، کرمان پر غزوں کے غلبے اور غز در کرمان کے نام سے شائع
۔ اس کتاب میں قاوردیان، ان کے انجام کرمان پر غزوں کے غلبے اور غزوں کے
اس خاندان کی زبوں حالی کے بارے میں مفید اطلاعات ملتی ہیں۔ اسی طرح اس کتاب کا
لک دینار اور اس کی اولاد (۶۰۹ھ / ۱۲۲۲ء) تک کی بادشاہت کی تاریخ سے بحث کرتا ہے۔

مسامرۃ الاخبار، بکوشش و تصحیح و تحشیہ عثمان توران، انقرہ ۱۹۴۳ء ص ۷۵ مختصر سلجوقنامہ
بی، مقدمہ ۔ و تصحیح از ۔ *Houtsma*، لائیڈن، ۱۹۰۲؛ و الاوامر العلائیہ،
و تصحیح از نجاتی لوغال و عدنان صادق ارزی، ج ۱، انقرہ، ۱۹۵۶، اور اس کتاب کی ۱۹۵۶ میں

اس کتاب کا بیشتر حصہ افضل کرمانی کی بدایع الازمان[1] سے ماخوذ ہے، اس کتاب کا سلیس اسلوب نگارش جو کسی بھی طرح گیارہویں صدی کے لکھنے والوں کے طرز سے مشابہت نہیں رکھتا، اس سرقہ کی واضح دلیل ہے۔ افضل کرمانی کی دوسری معتبر کتابیں بھی ہیں، جن کا ذکر مناسب مقام پر کیا جائے گا۔

آل اتسز کے خوارزم شاہیوں کے بارے میں جو کچھ ان کے عہد میں لکھا گیا ہے، . . . . اس بارے میں کچھ باقی نہیں۔ شاید اس کی سب سے اہم وجہ چنگیزیوں کی اس خاندان اور اس خاندان سے وابستہ تمام امور سے خاص دشمنی رہی ہے۔ لیکن آل اتسز کا ذکر ان کے زوال کے کچھ عرصے بعد منہاج سراج کی "طبقات ناصری" اور جہانگشای جوینی میں آیا ہے۔ خاص طور پر موخر الذکر کتاب میں ان کا ذکر مفید اطلاعات کے ہمراہ ملتا ہے۔ اسی خاندان کا آخری بادشاہ جو مغلوں کے حملے کے بعد ۶۲۸ ہجری تک ایرانی علاقے کے ایک حصے میں کر و فر رکھتا تھا، اس کے حالات ہم عربی کی ایک کتاب "سیرۃ جلال الدین" میں ملاحظہ کرتے ہیں یہ کتاب شہاب الدین محمد خرندزی زیدری نسوی نے تالیف کی ہے مولف ۶۲۸ ہجری (۱۲۳۰ء) تک جلال الدین منکبرنی کا منشی تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں اسی کے عہد کے واقعات کو قلمبند کیا اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے ۶۳۹ ہجری (۱۲۴۱ء) میں مکمل کیا اور خود ۶۴۷ ہجری (۱۲۴۹ء) میں فوت ہوا۔ گویا اس کتاب کا کسی نے ساتویں صدی میں منشیانہ فارسی نثر میں ترجمہ کیا، آقای مجتبیٰ مینوی نے اس کو مقدمے اور تعلیقات کے ساتھ شایع کیا ہے۔ (تہران ۱۳۴۴ شمسی ہجری / ۱۹۶۵ء) سیرۃ جلال الدین" جس کے بارے میں ہم اس وقت اس کے فارسی ترجمے کی بنیاد پر گفتگو کر رہے ہیں،

---

[1] رجوع کریں۔ مقدمہ بدائع الازمان از ڈاکٹر مہدی بیانی تہران ۱۳۲۶ شمسی۔

چنگیز اور خوارزمیوں، خاص طور پر سلطان محمد کے ابتدائی حالات کے ذکر کے بعد جلال الدین کی زندگی کے خاتمے تک اس کی کارگزاری اور سرگرمیوں کا تفصیل سے ذکر کرتی ہے یعنی یہ کتاب مکمل طور پر اصل عربی سے ترجمہ ہوئی ہے۔ اور اس کا اسلوب نگارش خوبصورت ہے، جس میں فارسی اور عربی اشعار کی پیوند کاری کی گئی ہے[۵۱] سیرۃ جلال الدین منکبرنی کے مولف یعنی محمد زیدری نسوی کی اسی موضوع اور مطالب پر ایک دوسری کتاب بھی ہے یہ کتاب مصنوعی نثر میں، عربی و فارسی کے اشعار و امثال سے آراستہ ہے، اسے مولف نے میافارقین شہر میں ۶۳۲ھ میں سپرد قلم کیا اور اس میں ۶۲۰ ہجری سے خود اپنے اور جلال الدین منکبرنی (متوفی: ۶۲۸ ہجری) کے حالات بیان کئے ہیں[۵۲]

چنگیز اور اس کی اولاد کے بارے میں ان معتبر کتابوں کے علاوہ جن کا ذکر ہم نے عہد مغول کی مشہور عمومی تاریخ کی کتابوں کے ضمن میں اس سے قبل کیا ہے۔ علاء الدین عطا ملک بن بہاء الدین محمد جوینی (متوفی: ۶۸۱ھ / ۱۲۸۲ء) کی کتاب جہانگشا کا سب سے پہلے ذکر ہونا چاہئے۔ عطا ملک نے مغول عہد کے بیشتر واقعات کا شخصی طور پر مشاہدہ کیا۔ اور خود ان واقعات میں شریک رہا۔ اس کے علاوہ باقی حالات کو ثقہ اشخاص سے اور ان لوگوں سے جنھوں نے انھیں خود دیکھا، اور مشاہدہ کیا تھا اخذ کیا ہے۔ اسی طرح کچھ واقعات اس نے اپنے جغرافیائی مشاہدات اور دقیق تاریخی مطالعات سے فراہم کئے ہیں۔ جہانگشا میں یہ مجموعی اطلاعات تین جلدوں میں منقسم ہیں

---

[۵۱] رجوع کریں:۔ ترجمہ سیرۃ جلال الدین منکبرنی، تہران، ۱۳۴۴ شمسی پر مجتبی مینوی کا مقدمہ

[۵۲] اس کتاب کے بارے میں رجوع کریں۔ مقدمہ نفثۃ المصدر، بتصحیح ڈاکٹر امیر حسن یزگردی اور میرزا محمد خان قزوینی اور مجتبی مینوی کے اسی کتاب میں شامل دو مضامین۔

پہلی جلد میں چنگیز کے اخلاف اس کے حالات اور فتوحات، دوسری میں خوارزمیوں اور ایران کے منگول حکام کی تاریخ اور تیسری جلد میں اسمٰعیلی قلعوں کی فتح اور حسن بن صباح کے جانشینوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے، اس کتاب میں "فتح بغداد" کی تاریخ کا تتمہ کے طور پر بعد میں اضافہ کیا گیا ہے۔[۱]

چونکہ جہانکشا ایران کے ایلخانی عہد کے کچھ ابتدائی حالات پر مشتمل تھی اس لئے وصاف الحضرۃ شہاب الدین عبداللہ (۶۶۳ھ/۱۲۶۴ء میں شیراز میں پیدا ہوا) نے جو آٹھویں صدی ہجری کے نصف اول تک حیات رہا۔ اس کتاب پر "تجزیۃ الامصار و تزجیۃ الاعصار" کے نام سے ایک تکملہ لکھا۔ یہ تکملہ نہایت پر تکلف نثر میں ترتیب دیا گیا ہے، اور تاریخ وصاف کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب اولجائیتو کی سلطنت (۷۰۳-۷۱۶ھ/۱۳۰۴-۱۳۱۶ء) تک عہد ایلخانی کے پر ارزش اور اہم واقعات کے بیان پر مشتمل ہے۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا، منگولوں کے حالات، مخصوصاً ایلخانیوں کی تاریخ اس عہد کی دوسری لوگی کتابوں میں بھی ترتیب دی گئی ہے۔ مثلاً خاص طور پر رشیدی کی جامع التواریخ اور حمداللہ مستوفی کی تاریخ گزیدہ جس کا ذکر عمومی تواریخ کے ضمن میں آچکا ہے۔ اور ان کتابوں کے بعد دوسری لوگی تاریخوں جیسے روضۃ الصفا اور حبیب السیر میں بھی اس عہد کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ موخرالذکر دو کتابوں میں ان معدودوں کا ذکر ہے۔ جنھوں نے ابو سعید بہادر خان کے بعد تھوڑی مدت کے لئے حکومت کی اور اسیطرح ان خاندانوں کے حالات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک ان کے تابع ممالک کے کسی حصے میں ان کے جانشین قرار پائے۔[۲]

---

[۱] عطا ملک جوینی اور اس کی کتاب کے لیے رجوع کریں، تاریخ جہانکشا مقدمہ و تصحیح از میرزا محمد خان قزوینی، چھاپ لائیڈن، ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۷ء تک [۲] روضۃ الصفا اور حبیب السیر کیلئے رجوع کریں۔ تاریخ تحول نظم و نثر ... ، تیسرا طبع سوم، ص ۶۰-۶۱۔

معین الدین معلم یزدی (متوفی ۷۸۹ھ/۱۳۸۷ء) "مواہب الہیٰ" میں آل مظفر کی تاریخ مخصوصاً ۷۶۷ ہجری (۱۳۶۵ء) تک کے واقعات مذکور ہیں۔[1] یہی مطالب محمود کتبی کی "تاریخ آل مظفر" میں ملتے ہیں، جس میں اس خاندان کے ابتدائی دور سے فارس پر تیمور گورکانی کے تسلط تک کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔[2]

عہد تیموری اور اس کے حالات و واقعات پر حافظ ابرو کی کتابوں، روضۃ الصفا، حبیب السیر اور دوسری عمومی تواریخ کے علاوہ جو ان کی پیروی میں لکھی گئیں، ایک اہم ماخذ "ظفر نامہ" ہے۔ اسے نظام الدین شنب غازانی معروف بہ نظام شامی نے تالیف کیا۔ اس میں تیمور کی وفات (۸۰۶ھ/۱۴۰۳ء) سے ایک سال قبل تک اس کے عہد کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک دوسری کتاب، شرف الدین علی یزدی (متوفی ۸۵۸ھ/۱۴۵۴ء) کی ظفر نامۂ تیموری ہے۔ یزدی نے نظام شامی سے استفادہ کیا ہے۔ ظفر نامۂ تیموری بہتر اسلوب نگارش میں خاصی تفصیل سے تالیف کیا گیا ہے، اور ۸۲۸ ہجری (۱۴۲۴ء) میں مکمل ہوا ہے۔ حافظ ابرو یعنی شہاب الدین عبد اللہ بن لطف اللہ کی منجملہ کتابوں میں "مجمع التواریخ" کا چوتھا حصہ ابوسعید بہادر خان کی وفات (۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء) سے ۸۳۰ ہجری (۱۴۲۶ء) کی درمیانی مدت کے واقعات پر مشتمل ہے۔ یعنی تیموری عہد کے واقعات کا اہم حصہ اس میں محفوظ ہے۔ یہ تینوں موخر الذکر کتابیں اس لحاظ سے کہ ان کے مولف اپنے معاصر واقعات کی بلا واسطہ اطلاعات رکھتے تھے، بہت اہم ہیں اور معتبر ماخذ کا حصہ ہیں۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود یہ کتابیں درباری چاپلوسی اور مبالغے سے مبرا نہیں۔[3] تیموری عہد کے بارے میں ایک دوسرا معتبر ماخذ، کمال الدین عبدالرزاق

[1] رجوع کریں، مواہب الہیٰ، تصحیح سعید نفیسی، مطبوعہ تہران، ۱۳۲۶ شمسی کا مقدمہ۔ [2] رجوع کریں، مذکورہ کتاب کا مقدمہ جو بتصحیح ڈاکٹر عبدالحسین نوائی، تہران سے ۱۳۳۵ میں شائع ہوئی۔ [3] تاریخ تحول نظم و نثر پارسی، طبع سوم، ص ۵۰، ۵۸

ابن اسحٰق سمرقندی (۸۱۶-۸۸۷ھ/۱۴۱۳-۱۴۸۲ء) کی مشہور کتاب مطلع السعدین ہے۔ یہ کتاب عہد سلطان ابوسعید بہادر (۷۱۶-۷۳۶ھ/۱۳۱۶-۱۳۳۵ء) سے عہد سلطان ابوسعید تیموری کے خاتمے تک ایرانی تاریخ پر مشتمل ہے۔ چونکہ اس کتاب میں اس طویل دور کے واقعات نقل ہوئے ہیں، اس لئے یہ بہت اہمیت کی حامل ہے بعد کے ادوار میں بیشتر مورخوں نے اس اس کتاب سے استفادہ کیا ہے[۱]۔ ایسی کتابوں میں جو تیموریوں کے معاصر حکمراں خاندانوں کے بارے میں لکھی گئی ہیں، ایک کتاب فضل اللہ بن روزبہان ملقب بہ امین (دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی) کی "عالم آرای امینی" ہے۔ یہ مولف سلطان یعقوب آق قوینلو کے لڑکے سلطان ابوالفتح کا معاصر تھا۔ اسی طرح اس ضمن میں "تاریخ ترکمانیہ" کا ذکر بھی کیا جاسکتا ہے جسے محمود بن عبداللہ نیشاپوری نے تالیف کیا ہے۔

عہد صفوی سے متعلق کتابوں کے بارے میں ہم سب سے پہلے شاہ طہماسپ اول (۹۳۰-۹۸۴ھ/۱۵۲۳-۱۵۷۶ء) کے "تذکرۂ شاہ طہماسپ صفوی" کا ذکر کریں گے۔ شاہ طہماسپ اول نے اس کتاب میں اپنی سلطنت کی تاریخ بیان کی ہے۔ اس بادشاہ اور اس کے والد شاہ اسمٰعیل صفوی کے جامع حالات پر مشتمل "احسن التواریخ" ہے جسے حسن بیگ روملو نے لکھا ہے، یہ شاہ طہماسپ اور اس کے جانشین محمد خدابندہ کا ایک فوجی افسر تھا۔ اس کتاب کا جو کچھ حصہ باقی رہ گیا ہے اس میں شاہرخ تیموری اور شاہ اسمٰعیل دوم صفوی کی حکومتوں کی درمیانی مدت کے واقعات ان بادشاہوں کے روم، ازبک اور چغتائی سلاطین سے روابط کی روشنی میں بیان کئے گئے ہیں۔ صفویوں کے دور سے متعلق ایک دوسری اہم اور معتبر کتاب شاہ عباس بزرگ (۹۸۵-۱۰۳۸ھ/۱۵۷۷-۱۶۲۸ء) کے منشی اسکندر بیگ کی مشہور عالم آرای عباسی ہے

---

[۱] تاریخ تحول نظم و نثر پارسی، طبع سوم، ص ۵۹ اور مطلع السعدین، بتصحیح پروفیسر محمد شفیع مطبوعہ لاہور

اسکندر بیگ کی وفات ۱۰۴۳ ہجری (۱۶۳۳ء) میں واقع ہوئی۔ عالم آرا، صفوی خاندان کے آغاز سے شاہ عباس بزرگ کی سلطنت کے خاتمے تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا تتمہ، اسکندر بیگ ترکمان ہی نے لکھا ہے۔ اس میں بھی شاہ صفی کی سلطنت کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔[1] اس عہد پر ایک دوسری کتاب عماد الدولہ میرزا محمد طاہر قزوینی کا "عباسنامہ" ہے۔ قزوینی صفوی دور کا معروف مصنف، شاعر اور وزیر ہے۔ یہ کتاب عہد شاہ صفی کے بقیہ واقعات کے ساتھ جسے مرزا محمد طاہر کے بھائی محمد یوسف والہ قزوینی نے لکھا ہے، شائع ہو چکی ہے۔

عہد صفوی اور قاچاری حکومت کی تشکیل کے درمیانی عرصے کی تاریخ پر مندرجہ ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں:-

مرزا مہدی خان منشی استرابادی کی "جہانگشای نادری" اور "دُرّۂ نادرہ"۔

محمد کاظم وزیر کی عالم آرای نادری؛ ابوالحسن بن محمد امین گلستانہ کی مجمل التواریخ؛ تاریخ گیتی کشای مولفہ میرزا محمد صادق نامی اور عبدالکریم شیرازی کا لکھا ہوا اس کتاب کا تکملہ۔

قاچاری دور سے متعلق روضۃ الصفای ناصری جو روضۃ الصفای خواندمیر کا تکملہ ہے۔ اور ناسخ التواریخ کے علاوہ متعدد کتابیں اور مقالات ملتے ہیں۔ چونکہ اس دور کا ایک حصہ انقلاب مشروطیت کے واقعات اور ابتدائی حالات سے منطبق ہے، اس لئے اس عنوان اور ایسے ہی دوسرے عنوانات کے تحت قاچاری دور کا مطالعہ کیا گیا ہے۔[2]

---

[1] تاریخ تحول نظم و نثر پارسی طبع سوم، ص ۸۰ اور مطلع السعدین، تصحیح پروفیسر محمد شفیع مطبوعہ لاہور۔ [2] چونکہ اس موضوع پر مفصل بحث کا موقع نہیں اس لئے ہم اس عنوان پر تہران یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر زرین کوب کے مستند اور نہایت مفید مضمون سے رجوع کرنے کی سفارش کرتے ہیں جو نشریہ ایران شناسی شمارہ ۱ میں شایع ہوا ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب جج لاہور ہائی کورٹ کا ایک مکتوب

ورٹ لاہور
۲۳؍اگست سنہء

محترمی و مکرمی جناب مولانا سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب

السلام علیکم:۔ آپ کا خط محررہ ۳۰؍جولائی موصول ہوا گرمیوں کی تعطیل کے سبب میں
ے باہر ایبٹ آباد گیا ہوا تھا، اور ابھی چند دن ہوئے لوٹا، اس لئے جواب میں تاخیر ہوگئی، مجھے
رسال کردہ معارف مل گیا تھا، میری کتاب "زندہ رود" پر آپ کا طویل تبصرہ مجھے بہت
، اور اس کے شکریہ کا خط فوراً تحریر کر دیا تھا، تعجب ہے کہ وہ خط آپ کو اب تک نہیں ملا، میں نے
میں یہ بھی لکھا تھا کہ "زندہ رود" پر آپ کا تبصرہ یہاں کے اخبارات و رسائل شائع کرنا چاہتے
تبصرہ نوائے وقت اخبار میں تین قسطوں میں شائع ہو چکا ہے، جو بہت سراہا گیا، اقبال اکیڈمی
لہ "اقبال ریویو" بھی اس کو شائع کرنا چاہتا ہے، یہ تبصرہ یہاں بہت پسند کیا گیا، اور
خطوط بھی اس سلسلہ میں موصول ہوئے۔

اب "زندہ رود" کی دوسری جلد لکھنے میں مصروف ہوں، جس کے تین باب تو تحریر کر لیے ہیں، دو
باقی ہیں، تصوف پر بھی بحث ہوگی جس کی طرف آپ نے اپنے تبصرہ میں اشارہ کیا ہے، انشاءاللہ
کتاب چھپی، اس کو ارسال کر دوں گا۔

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے، خدا کرے میرا یہ خط آپ تک پہونچ جائے۔

خیر اندیش:۔

جاوید اقبال

وفیات

حضرت شاہ آفاق احمد ردولوی

درگاہ شریف ردولی۔ مکرمی تسلیمات

خدا کرے آپ کا مزاج اچھا ہو۔ اس سے پہلے بھی میں دو خط آپ کو تحریر کر چکا ہوں مگر جواب سے محروم ہوں۔ خدا معلوم وہ خطوط آپ تک پہونچے بھی یا نہیں، میرے حقیقی ماموں حضرت شاہ آفاق احمد سجادہ نشین درگاہ شیخ العالم ردولی شریف کا ۲ جولائی کو اچانک میڈیکل کالج لکھنؤ میں قلبی دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔ ان کو پہلا دورہ ردولی شریف میں پڑا تھا اس کے بعد تین دورے میڈیکل کالج لکھنؤ میں پڑے، ڈاکٹروں نے پیس میکر لگانے کو کہا وہ بھی لگا دیا گیا۔ مگر موت کے آگے اور خداوند عالم کی مرضی کے آگے کوئی اختیار نہیں چلتا۔ چونکہ اکثر و بیشتر وہ آپ کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے اسی لیے ان کی بیماری کی اطلاع بھی ۳۰ جون کو آپ کو اور نسیم احسن صاحب کو بھی دے دی تھی، اس کے بعد ۲ جولائی کو انتقال کی بھی خبر تحریر کر دی تھی۔ اسی سال عرس شریف کی ۱۴ تاریخ کی شب کی محفل میں اپنے بڑے صاحبزادے تمیم میاں صاحب مرحوم جن کا بھی اچانک بقرعید میں انتقال ہوا تھا ان کے بڑے صاحبزادے نیر میاں کی دستار بندی اپنے ہاتھوں کر دی تھی اور خرقہ شریف

بھی انھیں کو پہنا دیا تھا۔ چونکہ نیر میاں ابھی طالب علم ہیں اور بی۔ کام کر رہے ہیں اس لئے ماموں صاحب مرحوم نے اپنے چھوٹے صاحبزادے حسین میاں کو نیر میاں کا ولی اور سرپرست مقرر کر دیا ہے۔ جو نیر میاں کی جگہ پر سجادگی کے فرائض انجام دے رہے ہیں، مگر ابھی دونوں صاحبزادگان بچے ہیں آپ حضرات ہی ان کے سرپرست اور بزرگ ہیں اس کم عمری میں انکے اوپر اتنی بڑی ذمہ داری آپڑی ہے، لہذا آپ حضرات کی شفقت دیرینہ ہی ان کی تسلی کا باعث ہوگی، چہلم کا فاتحہ ۳ ستمبر کو ہوگا جس کی اطلاع روانہ کروں گا، مجھے امید ہے آپ حضرات اپنے قیمتی وقت میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر اور یہاں تشریف لاکر شکریہ کا موقع دیں گے جس سے ہماری تسلی بھی ہوگی۔

آپ حضرات ماموں صاحب کے لئے دعائے مغفرت فرمائیں۔

سوگوار

شاہ اخلاق احمد صابری درگاہ شریف ردولی

افسوس ہے کہ ڈاک کی خرابی کی وجہ سے شاہ اخلاق احمد صاحب صابری کے خطوط یہاں نہیں پہونچ سکے۔ اخبار میں اس سانحہ کی خبر پڑھی تھی، ایک تعزیتی خط جناب چودھری محمد ادریس رئیس ردولی کو لکھا، لیکن وہ بھی بہت دیر سے وہاں پہنچا، جناب شاہ آفاق احمد صاحب سے بڑا ذاتی اور گہرا تعلق رہا، ان سے نیاز جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی مرحوم کے حسنِ وساطت سے ہوا جو اس خانقاہ کے اولین بزرگ اور سلسلہ چشتیہ صابریہ کے فخر سلسلہ حضرت شاہ احمد عبدالحق ردولوی کی تھا: ان کے چشم و چراغ تھے اودھ میں اس خانقاہ سے بڑے فیوض و برکات پہنچے، خدا جانے کتنے رہروان سلوک اور تشنگان معرفت نے یہاں آکر اپنی پیاس بجھائی اور انوار و تجلیات سے فیض یاب ہوئے۔

اسی خانقاہ کی آبرو شاہ آفاق احمد صاحب تھے۔ جن کو مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ پانی ہوتا ہے ایک بار وہ دارالمصنفین بھی تشریف لائے تھے۔ گفتگو کرتے تو معلوم ہوتا کہ کوئی عندلیب چہچہا رہا ہے ان کی شیوہ بیانی اور شیریں کلامی سے مجلس کے حاضرین بیحد محظوظ ہوئے۔ اور جب کبھی رودولی جانے کا اتفاق ہوا اور ان کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اپنا کوئی محبوب اور شفیق عزیز گلے لگا رہا ہے۔ پیشانی پر بوسے دے رہا ہے۔ اور دل کی ساری کیفیتوں کو اپنے سینہ سے میرے سینہ میں منتقل کر رہا ہے۔ خاطر تواضع کی کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے، کھانے پر بلاتے کھانے کا وقت نہ ہوتا تو پر تکلف چائے پر مدعو کرتے۔ اس کا بھی موقع نہ ہوتا تو رودولی کی مشہور مٹھائیاں ساتھ کر دیتے۔

ان کے یہاں طعام سے زیادہ ان کے کلام میں لذت محسوس ہوتی۔ ایسی اچھی گفتگو کرنے والا شاید ہی اس صوبہ میں کوئی ہو، تصوف و سلوک پر گفتگو کرتے تو اس کو فارسی اور اردو کے اشعار سے اس طرح مزین کر دیتے کہ جو گتھیاں تصوف کے نکات سے حل ہوتی نظر نہ آتیں وہ اُن کے برجستہ اشعار کے پڑھ دینے سے حل ہو جائیں، فارسی اور اردو کے اشعار ان کی نوک زبان پر ہوتے اور وہ سب کے سب اعلیٰ درجہ کے معیاری ہوتے۔ جلال لکھنوی کے بے حد قائل تھے، اور اگر یہ کہا جائے کہ ان کا پورا کلام ان کو حفظ تھا تو مبالغہ نہ ہوگا۔ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے جلال لکھنوی پر ایک مضمون لکھا تھا۔ میں نے ان سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے خاص طور پر معارف کا پرچہ منگوا کر پڑھا، پڑھ کر مجھ کو خط لکھا کہ "مضمون تو اچھا ہے مگر جلال کی شاعری کے بہت سے رموز و نکات اس میں نہ آسکے ہیں"۔

رودولی کے عرس کے موقع پر جو محفل سماع ہوتی ہے، اس کے متعلق جناب شاہ معین الدین احمد ندوی صاحب مرحوم فرماتے کہ ایسی آراستہ پیراستہ، مہذب اور متین محفل کہیں نہیں دیکھی جاتی

اور اس میں جو نعتیں، غزلیں اور نظمیں پڑھی جاتی ہیں وہ بہت ہی اعلیٰ معیار کی ہوتی ہیں اس روایت کو جناب شاہ آفاق احمد مرحوم نے نہ صرف باقی رکھا بلکہ اونچا کرنے کی کوشش کی۔

جناب شاہ معین الدین، شاہ آفاق احمد صاحب سے سن میں بڑے تھے اس لئے ان سے بزرگانہ طور پر پیش آتے اور مجھ سے کئی بار کہا کہ آفاق کا دل چیر کرکے دیکھا جائے تو اس میں گلاب کی پنکھڑیوں کی نکہت، سبزی اور عطر فشانی محسوس ہوگی اور سچ تو یہ ہے کہ وہ اس وقت اپنی خانقاہ کی آبرو بنے ہوئے تھے، بلکہ رودولی کو ان کی ذات مبارک کی وجہ سے افتخار و وقار حاصل تھا، رودولی کا شاید ہی کوئی ایسا آدمی جس کو ان کی زبان سے کوئی تکلیف پہونچی ہو۔ سجادہ نشینی کے فرائض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ ہر شخص کے کچھ نہ کچھ کام آتے، دلجوئی اور دلنوازی تو ان کے خمیر میں داخل تھی، انھوں نے بڑی باغ و بہار طبیعت پائی تھی، اس میں تو ان کی روحانی مسرتوں کا چمنستان آباد ہونا چاہیئے تھا۔ مگر ان کی زندگی میں دو المناک حادثے پیش آئے، ایک تو ان کے عزیز ترین بھائی اور دوسرے ان کے فرزند اکبر کی المناک موت، جن کا غیر معمولی اثر ان پر پڑا تھا ان کے صاحبزادے کی وفات کی خبر سن کر رودولی گیا تھا، مگر دیر کرکے پہونچا تھا۔ وہ کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔ اس لئے ان سے نیاز نہ حاصل ہو سکا تھا۔ جس کا قلق اب زندگی بھر رہے گا۔

جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی کی وفات سے میں بے حد متاثر تھا، ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے رودولی گیا، جناب شاہ آفاق کے آستانہ پر بھی پہونچا، گلے سے لپٹ کر پہلے تو یہ مصرعہ پڑھا۔ ع

اک عمر کا ساتھی چھوٹا ہے، پھر آتے آتے آئے گا۔

پھر دوسرا شعر یہ پڑھا۔ ؎

بہ گیتی گر کسے پائندہ بودے ابوالقاسم محمدؐ زندہ بودے

ان کے پڑھنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ ایسا معلوم ہوا کہ اس سے بڑھکر کوئی اور تسکین نہیں ہوسکتا وہ وہاں جاچکے جہاں سب کو جانا ہے، لیکن ردودلی کے در و دیوار انکو کبھی نہ بھولیں گے اور ردودلی ہی کے لوگ نہیں بلکہ ان کے ملنے والوں کا جو وسیع حلقہ تھا ان میں سے ہر ایک ان کو یاد کرکے بے اختیار کہے گا۔ ع

جب نام تیرا لیجے تب اشک بھر آوے

دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ ان کی نیکیوں ان کی خوبیوں کی وجہ سے ان کو اپنی رحمت کے کوثر اور مغفرت کی تسنیم سے سیراب کرے آمین! "ص۔ ع"

مولانا محمد اکبر ندوی

از پروفیسر مسعود حسن، ممبر پبلک سروس کمیشن، مغربی بنگال

یہ خبر انتہائی افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ مولانا محمد اکبر ندوی سابق ریڈر شعبۂ فارسی کلکتہ یونیورسٹی ۵ار رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ کو صبح کے وقت [illegible] دار فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی وفات سے مغربی بنگال میں عربی زبان کے ایک ممتاز ادیب، ایک مستند عالم دین اور استاد [illegible] کی جگہ خالی ہوگئی۔ راقم الحروف کے لیے ذاتی طور پر یہ حادثہ ایک بہت بڑا سانحہ ہے کیونکہ ان کی موت کے بعد میرے اساتذہ میں اب کوئی زندہ نہیں رہا۔ اس کے مدرسہ، اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے استاد سب کے سب اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اس کی علمی رہنمائی کے لیے ایک آخری شمع رہ گئی تھی، موت نے اسے بھی چھین لیا۔

مولانا محمد اکبر ندوی کا وطن مالوف نانگیر [illegible] ترک وطن کرکے [illegible]

مقیم تھے۔ ان کی اعلیٰ تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلما میں ہوئی تھی، وہ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے ہم جماعت تھے، طالب العلمی کے زمانے میں ان کی عربی خطابت اور عربی انشاء ندوہ میں مشہور تھی۔ فرماتے تھے کہ طلبہ کے ایک جلسے میں ان کی ایک عربی تقریر علامہ سید سید سلیمان ندوی کو اس قدر پسند آئی کہ انھوں نے جیب خاص سے انعام مرحمت فرمایا۔ عربی انشار پردازی میں مسعود عالم صاحب سے ٹکر ہوتی تھی، ندوہ سے فراغت پاکر کلکتہ آگئے۔ اور اسلامیہ کالج سے بی۔ اے کیا۔ پھر کلکتہ یونیورسٹی سے عربی اور فارسی دونوں میں ایم اے کی ڈگری لی، اور ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی مرحوم کے ارشد تلامذہ میں شمار ہونے لگے۔

مشرقی بنگال کے ایک بڑے کالج میں ایک بڑی اونچی جگہ ملی اور بڑی خوشامدیں ہوئیں مگر اپنے استاد ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی مرحوم کے حکم کی تعمیل کی، اس عہدہ کو قبول نہیں کیا۔ اور کلکتہ یونیورسٹی میں لکچرر کی جگہ پر قانع رہے۔

راقم کو ان کی شاگردی کا شرف کلکتہ یونیورسٹی میں ۱۹۴۱ء میں ایم۔ اے میں حاصل ہوا۔ یہ مولانا کی زندگی کا سنہرا دور تھا۔ بلند و بالا قد و قامت، قابل رشک جسمانی صحت، بڑے سلیقے سے سلی ہوئی شیروانی، سر پر مخمل کی رامپوری ٹوپی۔ کلاس میں اس سج دھج کا بڑا اچھا اثر پڑتا تھا۔ میں نے المرزبانی (متوفی ۳۸۴ھ) کی الموشح ان سے سبقاً سبقاً پڑھی وہ باتوں ہی باتوں میں بہت سے ادبی نکتے بیان کر دیتے تھے۔ یہ زمانہ کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی کا عہد زریں تھا۔ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صدر شعبہ تھے، ڈاکٹر محمد اسحٰق، پروفیسر محمد محفوظ الحق اور مولانا فضل الرحمن باقی جیسے دانشور اور فضلائے روزگار درس دیا کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ ان مرحوموں کی تربت پر اپنی رحمت کے پھول برسائے، اکبر صاحب نے ان بزرگوں کے ساتھ کام کیا، اور کم و بیش ۲۸ سال تک پہلے لکچرر اور پھر ریڈر کی حیثیت سے

درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں شاگردوں کی ایک بڑی تعداد بطور یادگار چھوڑ گئے۔ اس وقت کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی میں بشمول صدر شعبہ جناب ڈاکٹر عطا کریم صاحب برق سبھی ان کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہیں۔ ایک کلکتہ یونیورسٹی پر کیا منحصر ہے، مغربی بنگال کی تمام درسگاہوں میں جہاں عربی اور فارسی کی تعلیم کا انتظام ہے ان کے شاگرد تعلیم و تدریس کی مسندوں کی زینت ہیں۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

افسوس ہے کہ ابھی چند سال ہی گذرے تھے کہ اکبر صاحب کو چند حادثوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا جن سے ان کی زندگی میں ایک بڑا انقلاب آگیا۔ نہ وہ پہلی سی شگفتگی رہی، نہ وہ پہلی سی رعنائی۔ انھیں اچھا کھانے اور اچھا پہننے کا بیحد شوق تھا، حتی کہ اس شوق کی تکمیل کیلئے اپنی آمدنی کی بھی پروا نہیں کرتے تھے، پہننے کا شوق ختم ہوا۔ اب وہ الفقر فخری کی جیتی جاگتی تصویر بن گئے تھے، زیادہ تر وقت تسبیح و تہلیل اور اوراد و وظائف میں گذارتے تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت وہ بڑی پابندی سے کرتے تھے، چنانچہ جس صبح کو پیغام اجل آپہنچا اس صبح کو بھی معمول کے مطابق فجر کی نماز کے بعد تلاوت قرآن سے فارغ ہوچکے تھے۔ اخیر زندگی میں خاص طور پر استغنا، توکل علی اللہ، مالی منفعت سے بے پروائی اور نام و نمود سے بے نیازی ان کا طرۂ امتیاز بن گیا تھا۔ جن سے احباب اور رفقائے کار کے حلقوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ وہ یونیورسٹی کے پروفیسر روم میں داخل ہوتے تو "شہنشاہ اکبر" اور "اکبری گریٹ" کی صداؤں کے ساتھ ان کا خیر مقدم ہوتا، اور ان کے لئے کوئی ممتاز جگہ خالی کی جاتی۔

استاذ مرحوم سے میری آخری ملاقات جولائی کے دوسرے ہفتہ میں ہوئی تھی،

کئی دن پہلے ان کی اہلیہ محترمہ کا انتقال طویل علالت کے بعد ہوگیا تھا۔ میں ان کے اور اپنے شاگرد مولوی محمد شہید اللہ لکچرر شعبۂ عربی و فارسی کلکتہ یونیورسٹی کو ساتھ لیکر تعزیت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ ہم دونوں سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ ان کے چہرے پر ایک پراسرار طمانینت تھی۔ ہم دونوں نے محسوس کیا کہ اس بظاہر ساکن سطح کے اندر غم و الم اور فکر و اضطراب کا ایک پرشور سمندر متلاطم ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ وقت کیسے گذرتا ہے؟ تو فرمایا "اب تو فرصت ہی فرصت ہے۔ پہلے تیمارداری میں وقت گذر جاتا تھا۔ اس وفا پرست شوہر کی وفا شعاری دیکھئے کہ پندرہ دن کے اندر ہی رفیق حیات سے جا ملے۔

خداوند! اپنے اس پیارے بندے کی آخری آرامگاہ کو اپنے ابر رحمت سے سیراب کر اور اسے جنت میں بزرگوں کا مقام عطا کر۔

سقی مثواک غادٍ فی الغوادی
نظیر نوال کفک فی النوال

بزم صوفیہ (طبع سوم)

اس میں تیموری عہد سے پہلے کے صاحب تصنیف اکابر صوفیہ مثلاً شیخ ابوالحسن ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بختیار کاکی، قاضی حمید الدین ناگوری، خواجہ گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیا، شیخ بوعلی قلندر، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، سید اشرف جہانگیر سمنانی، سید گیسو دراز، شیخ عبدالحق ردولوی رحمہم اللہ علیہم کے حالات و تعلیمات و ارشادات کو بہت تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں خواجگان چشت کے تمام ملفوظات کے غیر جعلی اور مستند ہونے پر نہایت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے،

مطبوعات جدیدہ

دیار پورب میں علم اور علماء - مرتبہ، مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات - ۲۸۴، قیمت ۲۵ روپیہ۔ پتہ، ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶۔

یہ کتاب مصنف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو پہلے معارف اور برہان میں شائع ہوئے تھے، اس کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں ملوک سلاطین کے زمانہ سے نوابان اودھ کے زمانہ تک کے پوربی خطہ کی علمی، دینی اور روحانی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے، اور دوسرے حصہ میں یہاں کے چند مشہور علماء و مشائخ کا تذکرہ ہے، مصنف نے پورب کے چار علمی دور قائم کرکے ہر دور کے زریں اصلاحی، دینی اور علمی کارنامے بیان کئے ہیں، پہلا دور غلام سلاطین اور خلجیوں کے علاوہ تغلق دور کے دوسرے فرماں روا سلطان محمد بن تغلق کے عہد پر مشتمل ہے، دوسرا دور تغلق خاندان کے تیسرے اور چوتھے فرماں روا فیروز شاہ اور محمد شاہ کے زمانہ سے شروع ہو کر شرقی و لودی حکمرانوں کے زمانہ پر ختم ہوا ہے۔ تیسرا دور تیموری فرماں رواؤں اور چوتھا دور اودھ کے نوابوں کے عہد کو شامل ہے، پہلے دور میں پوربی علاقہ میں اسلام کی اشاعت کا مختصر ذکر بھی ہے، چوتھا دور مصنف کے خیال میں سلطنت کے ضعف و انحلال اور علم و علماء کی تباہی کا زمانہ تھا، دوسرے حصہ میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی، راجہ سید حامد شاہ مانک پوری، میر علی عاشقان سرائے میری، ملا محمود جونپوری، حافظ امان اللہ بنارسی، شیخ غلام نقشبند گھوسوی لکھنوی،

شاہ ابو الغوث گرم دیوان بھیری لہرادی، اور مولوی حسن علی ماہلی جیسے مایہ ناز علمار و مشائخ کا مبسوط تذکرہ ہے، یہ کتاب بڑی کد و کاوش سے مرتب کی گئی ہے، ابھی تک اس مردم خیز خطہ کی اس قدر مفصل اور جامع تاریخ نہیں لکھی گئی تھی یہ دراصل پورب کے گزشتہ سات سو برس کے اسلامی عہد کی علمی و دینی تاریخ ہے، اس میں یہاں کے نامور علمار و مشائخ کے درس و افادہ تعلیم و تدریس، ارشاد و تلقین، ذکر و شغل، رشد و ہدایت اور فیوض و برکات کی تفصیل بھی ہے، اور مملوک خلجی، تغلقی، شرقی، لودی اور تیموری سلاطین کی علم و معارف پروری، علما کی قدر دانی اور صوفیہ و مشائخ سے عقیدت و تعلق کا ذکر بھی ہے، لیکن خود لائق مصنف کے بیان کے مطابق مسلم دورِ حکومت میں دھلی کے مشرق میں صوبہ الہ آباد، صوبہ اودھ اور صوبہ عظیم آباد پر مشتمل خطہ ملک پورب کہلاتا تھا، لیکن انھوں نے صوبہ عظیم آباد کی علمی و روحانی سرگرمی کا حال بہت سرسری بیان کیا ہے، اور دوسرا حصہ صرف شیراز ہند جونپور کے اشخاص و رجال کے تذکرہ پر مشتمل ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں "سلطان محمود شاہ شرقی (۸۴۴ھ تا ۸۶۲ھ) نے بیس سال سے زیادہ مدت تک حکومت کی" حالانکہ ۸۴۴ سے ۸۶۲ تک ۱۸ سال ہی ہوئے۔ خانقاہ کی جمع خانقاہات (ص۱۰)، اور سرکار کی سرکارات (ص۱۱) بالکل ہی نامانوس اور ثقیل ہے، ایک جگہ بحریابادی کا املا بحر یا بادی لکھا ہے۔ اس طرح کی کتابت و طباعت کی متعدد غلطیاں ہیں۔

نقوشِ دکن :- مرتبہ۔ ڈاکٹر نور السعید اختر۔ تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۳۰۴ مع ڈسٹ کور قیمت۔ مغمہ۔ پتہ جنرل سکریٹری اناساگر ویلفیر السوسی ایشن ۵/۱ زیرہ مینشن، اناساگر مارگ، کرلا بمبئی۔

ڈاکٹر نور السعید اختر استاذ شعبۂ فارسی مہاراشٹر کالج بمبئی کو دکنی ادب سے خاص شغف ہے، ملا وجہی کی تصنیف تاج الحقائق پر تحقیقی مقالہ لکھکر وہ بمبئی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری

لے چکے ہیں، زیر نظر کتاب بھی دکنی ادب سے متعلق مندرجہ ذیل مضامین کا مجموعہ ہے۔ (۱) قصۂ حسن و دل مختلف زبانوں میں (۲) بھوگ بل از قریشی بیدری (۳) قدیم اردو کا پہلا انشا نگار (۴) گیان سروپ از شاہ تراب چشتی (۵) رسالہ کشف الاذکار از شاہ شریف، (۶) عہد تاناشاہ کا ایک گم نام شاعر (۷) محمد عبد الجبار خاں صوفی ملکاپوری۔ پہلا مقالہ زیادہ اہم اور مصنف کی تلاش و محنت کا نتیجہ ہے، اس میں ہندوستان کے علاوہ بعض دوسرے ملکوں کی زبانوں میں اس قصہ سے متعلق تصنیفات کا جائزہ لے کر ان پر تبصرہ کیا گیا ہے، مصنف کے خیال میں یہ قصہ سنسکرت سے دوسری زبانوں میں منتقل ہوا ہے، دوسرے مضامین بھی مفید معلومات پر مشتمل ہیں، ان میں بعض کم یاب کتابوں اور غیر معروف مگر صاحبِ کمال مصنفین کا ذکر ہے، ان مضامین سے مصنف کی تحقیق و جستجو اور سلیقۂ تصنیف کا پتہ چلتا ہے، امید ہے کہ دکنی ادب کے قدردانوں میں یہ مجموعہ خاص طور پر مقبول ہوگا۔

صفائی اور زینت سے متعلق اسلامی تعلیمات و ہدایات — مرتبہ جناب احمد حسین بھوانی پوری، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۳۲ قیمت تین روپے۔

پتہ۔ مدنی مکتبہ (مدرسہ اسلامیہ) ڈھاکہ مشرقی چمپارن بہار۔

طہارت نصف ایمان ہے فقہی کتابوں کی ابتدا اسی سے کیجاتی ہے، اس کتاب میں طہارت کے متعلق اسلامی تعلیمات و ہدایات نقل کی گئی ہیں اور اسکی اہمیت، فائدے اور اس سے متعلق ضروری احکام و مسائل بیان کئے گئے ہیں اسمیں طہارت و نظافت کی مختلف صورتوں کی تفصیل بھی گئی ہے اور اس زینت و آرائش کا ذکر بھی ہے جو شریعت میں مردوں اور عورتوں کیلئے جائز اور پسندیدہ ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے عام مسلمانوں کو بڑا فائدہ ہوگا لیکن اسمیں فقہ، حدیث اور شروحِ حدیث کی بعض دقیق بحثیں، باہم مختلف و متعارض حدیثیں، اور اختلافِ اقوال وغیرہ بھی تحریر کئے گئے ہیں جن سے عام اور کم پڑھے لکھے لوگ خلجان میں پڑ سکتے ہیں، اس مفید کتاب کی ترتیب و تبویب مزید سلیقہ سے کی گئی ہوتی تو یہ زیادہ پرکشش ہوتی۔

ادبی بھول بھلیاں:- مرتبہ جناب مولوی حفیظ الرحمٰن واصف صاحب متوسط تقطیع کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۹۲، قیمت عہ پتہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد دہلی۔

مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے فرزند مولوی حفیظ الرحمٰن واصف کو شعر و ادب کا اچھا ذوق ہے، اور زبان، قواعد اور املا وغیرہ کے مسائل پر بھی ان کی اچھی نظر ہے، زیر نظر کتاب میں انھوں نے زبان و قواعد اور اردو املا مرتبہ رشید حسن خاں اور املا نامہ از گوپی چند نارنگ پر نقد و تبصرہ کیا ہے یہ کتابیں مرکزی حکومت کے قائم کردہ ترقی اردو بورڈ نے شائع کی ہیں، اور ان میں یہ سفارشات پیش کی گئی ہیں کہ عربی و فارسی کے جن لفظوں کی حرکتیں اردو میں بدل گئی ہیں، یا جو غیر عربی و فارسی الفاظ عربی و فارسی الفاظ کے قاعدے کے مطابق اردو میں رائج ہو گئے ہیں ان کے استعمال میں عربی و فارسی حرکات و قواعد کی پابندی ترک کر دینا چاہیے، اسی طرح عربی و فارسی کے اردو میں مروجہ الفاظ کے املا میں اصل کے بجائے اردو کے مروج طریقہ کو اختیار کرنا چاہیے جیسے عیسیٰ موسیٰ کو عیسا موسا لکھنا چاہیے اول الذکر کی مثال خراج کا لفظ ہے جو خرج سے عربی الفاظ کے قیاس پر بنا لیا گیا ہے اور اردو میں بے تکلف بولا جاتا ہے، اس کتاب کے لائق مصنف نے ان سفارشات کو رد کر کے ان کی مختلف خرابیوں اور نقصانات کی نشاندہی کی ہے، اور اس ذہنیت کو احساس کمتری کا نتیجہ بتایا ہے ان سفارشات کے متعلق ترقی اردو بورڈ کی کتابوں پر تبصرہ کے ضمن میں معارف میں بھی بے اطمینانی ظاہر کی گئی تھی اور یہ لکھا گیا تھا کہ اس سلسلہ میں ہر طبقہ خیال کے لوگوں کے مشورہ کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیا جانا چاہیے، اس کتاب سے دوسرا نقطہ نظر بھی سامنے آگیا ہے، گو یہ بھی انتہا پسندی سے خالی نہیں ہے، اور اس کا اسلوب و لہجہ بھی تلخ ہے، تاہم ترقی اردو بورڈ کے ارکان کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے، یہ مفید اور پر از معلومات کتاب ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ وہ مستقبل (بفتح لام) ملزم (بفتح زا) اور متوفی بالف مقصورہ بولتے تھے یہ غلط ہے ان میں تیسرے لفظ متوفی بالف مقصورہ کی غلطی کی وجہ سمجھ میں نہ آئی اور ملزم کی غلطی بھی زیادہ واضح نہیں۔

بندوق:۔ مرتبہ جناب سید اشتیاق علی علوی صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۲۴۰ قیمت ۲۰ روپیہ۔ پتے۔ (۱) اشتیاق علی علوی، کاکوری کوٹھی خیالی گنج، کرائنگ لکھنؤ، (۲) اردو پبلشرز نظیر آباد لکھنؤ۔

یہ اردو میں اپنے طرز کی منفرد کتاب ہے، ابھی تک "شکاریات" کے متعلق اردو تو کیا ملک کی دوسری زبانوں میں بھی اتنی پر از معلومات کتاب موجود نہیں تھی۔ اس میں بندوق کی تاریخ، اس کے مشہور کارخانوں کے نام، جدید تکنیک کے مطابق اس کی پرکھ اور پہچان، اس کے استعمال کے آزمودہ طریقے اور بندوق کی گولیوں اور چھرّوں کی رفتار وطاقت کا حساب نقشوں کے ساتھ دیا گیا ہے، بندوق کی طرح بعض دوسرے آتشیں اسلحہ جات رائفل اور پستول کے اجزا اور ان کے استعمال کے بارہ میں بھی تمام ضروری باتیں درج ہیں۔ اور مختلف جنگلی جانوروں اور ان کے شکار کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں آخر میں بعض ماہر ومشاق شکاریوں کے دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات کا ذکر ہے۔ مصنف کاکوری اور پھر لکھنؤ کے مشہور رئیس جناب منشی احتشام علی مرحوم کے پوتے ہیں جن کی تمدنی اور تہذیبی خوش سلیقگی کی یادیں لکھنؤ میں ابھی تک روشن ہیں۔ اس کتاب سے مصنف کی خاندانی خوش سلیقگی بھی عیاں ہے، وہ اس موضوع پر اخباروں اور رسالوں میں برابر مضامین لکھتے رہے ہیں، یہ کتاب کئی برسوں کی محنت ومطالعہ کا نتیجہ ہے، اس زمانہ میں بندوق وغیرہ کا استعمال روزمرہ زندگی کا جزء ہے امید ہے اس کے پیش نظر یہ کتاب مقبول ہوگی، زبان وبیان آسان، سلیس اور رواں ہے۔

متاعِ زندگی:۔ از جناب سید اظہر حسین صاحب تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۹۰، مجلد، قیمت ۱۲ روپے پتے۔ (۱) مدہ گورنمنٹ نرسری کمپاؤنڈ، مال روڈ، لکھنؤ، (۲) نامی پریس نخاس، لکھنؤ۔

یہ جناب سید اطہر حسین صاحب (آئی۔ اے۔ ایس) کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے، ان کے پہلے مجموعۂ کلام "جام شعور" پر معارف میں مفصل تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اس سے ناظرین کو معلوم ہوا ہو گا کہ وہ نیک نام اور بڑے سرکاری عہدہ دار ہونے کے ساتھ ہی شعر و ادب کا بھی اچھا ذوق رکھتے ہیں، گو اطہر صاحب حسنِ بیان و حسنِ سخن سے زیادہ حسنِ معنی پر زور دیتے ہیں، لیکن وہ تغزل کے مزاج آشنا ہیں، اس لئے ان کے خیالات و افکار میں لطافت و بلندی کی طرح ان کے انداز میں بھی دلکشی و دلآویزی ہوتی ہے، اور خوش فکری کی طرح خوش گوئی بھی ان کا طرۂ امتیاز ہے، ان کا کلام ان کے پاکیزہ احساسات شریفانہ جذبات، پرخلوص اندازِ بیان اور ان کے مذہبی ذوق کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ امید ہے کہ جام شعور کی طرح یہ نیا مجموعہ بھی مقبول ہو گا۔

عبادت و خدمت :- مرتبہ۔ مولانا حافظ حبیب اللہ ندوی، متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۴۸ قیمت۔ ۳ روپیہ ۵۰ پیسے، پتہ، شکیل احمد مہتمم مکتبہ جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ۔

اس چھوٹے سے کتابچہ میں خدمت خلق اور حقوق العباد کی اہمیت واضح کی گئی ہے، اور اس بات پر تشویش ظاہر کی گئی ہے، کہ دین و شریعت کو عقائد، عبادات اور نکاح و طلاق کے بعض مسائل تک محدود سمجھ کر ان ہی پر زور دیا جاتا ہے، اور انسانیت کے احترام اور اسلامی اخلاق و آداب کو نہ دینی کام سمجھا جاتا ہے، اور نہ ان پر زور دیا جاتا ہے یہ بحث تو اس موضوع کی سب ہی کتابوں میں ملے گی مگر مصنف کا خاص زور اس پر ہے کہ خدمت اور حسن عمل ہی سے ہندوستانی مسلمانوں کے بارہ میں اکثریت کے شبہات اور نفرت و حقارت کے جذبات ختم ہو سکتے ہیں۔ "ض"

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰

اکتوبر ۱۹۸۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت پندرہ ۱۵ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

[illegible] ماہ ذی قعدہ ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۸۰ء عدد ۴

مضامین

مقالات

(نئی کتاب)

بزم تیموریہ جلد دوم

جہانگیر اور شاہجہان کی علم دوستی، علما نوازی اور ان کے دربار کے شعراء، فضلاء اور دوسرے صاحب کمال کا تذکرہ۔

مولفہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ قیمت: ۱۲

[illegible]

[illegible] ... مسلمانوں کے عروج کے اسباب ...
... جب ختم ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ ... کے سبب کیا ہے؟

قرونِ اولیٰ کے مسلمان صحیح عمل کر کے اس دنیا میں بھی ... ان کی شمشیر عالمگیر ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں ان کی تکبیر گونج اٹھی، ان کے عروج کے اسباب کیا تھے؟ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں جنگ یرموک میں عیسائی طاقتوں کے ایک جاسوس نے اس وقت کے مسلمانوں کے کردار کی یہ تصویر کھینچی کہ یہ لوگ رات میں راہب اور دن میں شہسوار ہوتے ہیں، حضرت عمرؓ نے حضرت سعد بن وقاصؓ کو امیر لشکر بنایا تو ان کو یہ نصیحت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو پوری زندگی تم نے دیکھی ہے، اس کو پیش نظر رکھنا اسی کو مضبوط پکڑنا، ورنہ تمہارا عمل ضائع ہو جائیگا، اور تم نقصان اٹھاؤ گے، حجاج بن یوسف کے سامنے خلفائے راشدین کے لشکریوں کی فتح و کامرانی کے اسباب کا تجزیہ کیا گیا تو یہ معلوم ہوا کہ ان سے زیادہ زاہد اور دنیا کے ساتھ ان سے زیادہ بغض رکھنے والا کوئی نہ تھا، ان میں بزدلی، خیانت اور بدعہدی نہیں تھی،

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز کے بعد وعظ فرمایا تو صحابہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ایک صحابی نے عرض کیا کہ کوئی ایسی بات فرما دیں جس کو ہم مضبوطی سے پکڑے رہیں، ارشاد فرمایا کہ میرے بعد جو تم میں سے زندہ رہے گا، وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا، مگر میرے طریقہ کو مضبوط پکڑے رہنا اور سنت کا اتباع کرتا۔ ایک اور موقع پر فرمایا جب میری امت دنیا کو عظیم الشان اور اونچی سمجھنے لگے گی تو اس کے دل سے اسلام کی ہیبت جاتی رہے گی جب برے کاموں سے روکنا چھوڑ دے گی تو وحی کی برکت سے دور ہو جائے گی اور جب ایک دوسرے کو برا کہنے لگے گی تو اللہ کی نگاہ سے گر جائے گی۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا کہ جب بیت المال کا مال ذاتی بن جائے گا، امانت کا مال غنیمت

[illegible] ہو جائے گا، کمینے لوگ سردار بن جائیں گے، برائی کے ڈر سے [illegible] کی طاعت اور ماں کی نافرمانی ہوگی؛ گانے والیوں کے گانے سنے [illegible] کے بجانے کے عام طور استعمال کئے جائیں گے، شراب پی جانے لگے گی، ریشمی لباس استعمال ہونے لگے گا، امت کے پچھلے لوگوں کو برا بھلا کہا جائے گا، تو لوگ اس وقت سرخ آندھی اور زلزلہ میں دھنس جانے اور آسمان سے پتھر برسنے کا انتظار کریں۔

پہلی اسلامی قرن کی حکومتوں کے تمام سربراہ جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو مضبوطی سے پکڑا، بنو امیہ میں امیر معاویہ، عبدالملک، ولید اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کی فرمانروائی پر مسلمان فخر کرسکتے ہیں مگر اسی خاندان کے آخری فرمانرواؤں میں ولید ثانی بن یزید عبدالملک اپنی رندی اور مے پرستی میں ایسا مبتلا ہوا کہ اس کے مخالفین نے اس پر غلط یا صحیح الزام یہاں تک رکھ دیا کہ اس نے خانہ کعبہ کی چھت پر شراب پینے کا ارادہ کیا تھا، بنو عباس میں منصور، ہارون رشید اور مامون رشید دنیا کے جلیل القدر فرمانرواؤں کی صف میں لاکر کھڑے کئے جاسکتے ہیں، مگر اسی خاندان میں سے مہدی اور ہادی کی رنگین مزاجی کی وجہ سے ان کا محل حسین عورتوں کا جمالستان بن گیا تھا، امین بن ہارون رشید نے اپنے نامور باپ کی ساری شاندار روایات کو نظر انداز کرکے طرح طرح کی نزہت گاہیں بنوائیں جہاں حسین عورتوں اور مسخروں کے ساتھ عیش میں مصروف رہتا، مامون اپنی تمام خوبیوں کے باوجود پری پیکر نازنینوں کے جھرمٹ میں رہتا، اس کے دربار میں بڑے بڑے صاحب کمال مغنی جمع تھے، رومی کنیزیں رقص و سرود سے اس کی محفل گرم کیا کرتی تھیں، موفق جب نبیذ پینے کیلئے بیٹھتا تو سونے کی کشتی میں بلور کے جام و مینا پیش کئے جاتے۔

بلبن اور فیروز شاہ تغلق جیسے مذہبی سلاطین دہلی اپنی بادشاہت سے پہلے شراب پینے کے عادی تھے، مغل فرمانرواؤں میں بابر اور جہانگیر تو اپنی شراب نوشی کی محفلوں کا ذکر مزے لیکر کرتے ہیں، اکبر نے درباری علماء کو بھی شراب پینے کی خواہش کی، دنیا کی مسلمان حکومتوں میں ایسے کم فرمانروا گزرے ہیں جنکو جام و مینا کا چسکا نہ لگا ہو۔

شذرات

گزشتہ ہفتہ کے شذرات میں ذکر آیا تھا کہ چودہ سو سال کے اندر مسلمانوں کی بہت سی عظیم
[illegible] مگر وہ سب ختم ہو گئیں، آخر ان کے ختم ہونے کے اسباب کیا تھے؟

شروع میں مسلمان عرب سے نکل کر ہر طرف پھیل گئے، ان کی شمشیر جہانگیر ہونے کے ساتھ جہانداری
[illegible] دنیا ان کی تکبیر سے جاگ اٹھی، ان کے عروج کے اسباب کیا تھے؟ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں
[illegible] رومی فوج کے ایک جاسوس نے اس وقت کے مسلمانوں کے کردار کی یہ تصویر کھینچی کہ یہ لوگ راتوں
[illegible] راہب اور دن میں شہسوار ہوتے ہیں، حضرت عمرؓ نے حضرت سعد بن وقاصؓ کو امیر لشکر بنایا تو ان کو
یہ نصیحت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو پوری زندگی تم نے دیکھی ہے، اس کو پیش نظر رکھنا
اسی کو مضبوط پکڑنا، ورنہ تمہارا عمل ضائع ہو جائیگا، اور تم نقصان اٹھاؤ گے، حجاج بن یوسف کے سامنے خلفائے
راشدین کے لشکریوں کی فتح و کامرانی کے اسباب کا تجزیہ کیا گیا تو یہ معلوم ہوا کہ ان سے زیادہ زاہد اور دنیا کے
ساتھ ان سے زیادہ بغض رکھنے والا کوئی نہ تھا، ان میں بزدلی، خیانت اور بدعہدی نہیں تھی،

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز کے بعد وعظ فرمایا تو صحابہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے
ایک صحابی نے عرض کیا کہ کوئی ایسی بات فرمادیں جس کو ہم مضبوطی سے پکڑے رہیں، ارشاد فرمایا کہ میرے
بعد جو تم میں سے زندہ رہے گا، وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا، مگر میرے طریقہ کو مضبوط پکڑے رہنا اور سنت کا
اتباع کرتا، ایک اور موقع پر فرمایا جب میری امت دنیا کو عظیم الشان اور اونچی سمجھنے لگے گی تو اس کے دل سے
اسلام کی ہیبت جاتی رہے گی جب برے کاموں کو روکنا چھوڑ دیگی تو وحی کی برکت سے دور ہو جائیگی اور جب
وہ ایک دوسرے کو برا کہنے لگے گی تو اللہ کی نگاہ سے گر جائے گی۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا کہ جب بیت المال کا مال ذاتی بن جائے گا، امانت کو مال غنیمت

[illegible] ہو گی [illegible] لوگ [illegible] جائیں گے [illegible] کے ذریعے
[illegible] کی سلامت [illegible] زبان کی تفریق ہو گی: گانے والیوں کے گانے سنے
جائیں گے، باجے [illegible] استعمال کئے جائیں گے، شراب پی جانے لگے گی، ریشمی لباس استعمال ہونے
لگے گا [illegible] پہلے لوگوں کو برا بھلا کہا جائے گا، تو لوگ اس وقت سرخ آندھی اور زلزلہ اور زمین میں دھنس
جانے اور آسمان سے پتھر برسنے کا انتظار کریں۔

کیا مسلمانوں کی حکومتوں کے تمام سربراہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو مضبوطی سے پکڑا، جیسے امیر معاویہ عبد الملک، ولید اور حضرت عمر بن عبد العزیز کی فرمانروائی پر مسلمان فخر کر سکتے ہیں مگر اسی خاندان کے آخری فرمانرواؤں میں ولید ثانی بن یزید عبد الملک اپنی رندی اور سرمستی میں ایسا مبتلا ہوا کہ اس کے مخالفین نے اس پر غلط یا صحیح الزام یہاں تک رکھ دیا کہ اس نے خانہ کعبہ کی چھت پر شراب پینے کا ارادہ کیا تھا، بنو عباس میں منصور، ہارون رشید اور مامون رشید دنیا کے جلیل القدر فرمانرواؤں کی صف میں لا کر کھڑے کئے جا سکتے ہیں، مگر اسی خاندان میں سے مہدی اور ہادی کی رنگین مزاجی کی وجہ سے ان کا محل حسین عورتوں کا جہانستان بن گیا تھا، امین بن ہارون رشید نے اپنے نامور باپ کی ساری شاندار روایات کو نظرانداز کر کے طرح طرح کی نزہت گاہیں بنوائیں جہاں حسین عورتوں اور مسخروں کے ساتھ رنگ رلیوں میں مصروف رہتا، مامون اپنی تمام خوبیوں کے باوجود پری پیکر نازنینوں کے جھرمٹ میں رہتا، اس کے دربار میں بڑے بڑے صاحب کمال مغنی جمع تھے، رومی کنیزیں رقص و سرود سے اس کی محفل گرم کیا کرتی تھیں، موفق جب نبیذ پینے کیلئے بیٹھتا تو سونے کی کشتی میں بلور کے جام و مینا پیش کئے جاتے،

بلبن اور فیروز شاہ تغلق جیسے مذہبی سلاطین دہلی اپنی بادشاہت سے پہلے شراب پینے کے عادی تھے، مغل فرمانرواؤں میں بابر اور جہانگیر تو اپنی شراب نوشی کی محفلوں کا ذکر مزے لے لیکر کرتے ہیں، اکبر نے درباری علماء کو بھی شراب پینے کی اجازت دی، دنیا کی مسلمان حکومتوں میں ایسے کم فرمانروا گذرے ہیں جنکو جام و مینا کا چسکا نہ لگا ہو،

[illegible] صلی اللہ علیہ وسلم [illegible] حضرت [illegible]

[illegible] چمڑے کا ایک گدا، ایک پیالہ [illegible] کے گھڑے، ایک مشک [illegible] چکیوں پر مشتمل تھا، مگر [illegible] کی شادی حسن بن سہل کی لڑکی سے ہوئی تو اس کیلئے سنہرے کام کا فرش بچھایا گیا، جب اس نے اس پر قدم رکھا تو اس کے شوہر پر بڑے بڑے موتی نچھاور کئے گئے، شب عروسی کی روشنی میں چالیس موم بتیاں سونے کی لگن میں روشن کی گئی تھیں، تیمور کی ماں نے اپنے کمسن پوتے کی ایک تقریب میں چاندی کا ایک چھوٹا سا گاؤں بسایا جس میں مکانات اور کھیت تک چاندی کے تھے، شاہجہاں نے داراشکوہ کی شادی میں بتیس لاکھ روپیہ خرچ کئے تھے۔

محل کی محبوبہ باندی کی خاطر مال کی نافرمانی کا کیا سوال، ساری مملکت کی آزردگی مول لے لی جاتی، اندلس کے فرمانروا عبدالرحمٰن اول کی محبوبہ طروب اس سے خفا ہوئی تو اس نے اپنے محل کا پھاٹک بند کر کے اس سے ملنے سے انکار کر دیا، پھاٹک توڑنے کے بجائے عبدالرحمٰن اول نے اسکو دروازے تک تیس ہزار کے دینار کی تھیلیوں سے چنوا دیا، طروب اس نازبرداری سے خوش ہو کر اس کے قدموں سے آلگی، ایک اور موقع پر اس نے اسکو ایک لاکھ دینار کے زیورات دیے، وزراء نے اس پر اعتراض کیا تو اس نے یہ کہہ کر ان کا منہ بند کیا کہ جس کے جسم پر ہونگے وہ ان سے کہیں زیادہ بیش بہا گوہر ہے، کیا روئے زمین پر اس کے حسن و جمال کے دیدار سے بھی زیادہ کسی چیز میں آنکھوں میں ٹھنڈک ہوگی؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مسکن مبارک میں نہ صحن تھا، اور نہ دالان، دیواریں مٹی کی تھیں، چھت کھجور کی شاخوں اور پتوں سے چھائی تھی، بارش سے بچنے کے لئے بال کے کمبل لپیٹ دیے جاتے تھے، بلندی اتنی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت چھو سکتا تھا، مگر اسلام اور اسکے رسول ؐ کے نام پر حکومت کرنے والوں نے بڑے بڑے محلات بنوانے شروع کئے، صرف بغداد میں ۲۳ محل تھے قصر فردوس میں سونے کے ۲ ہزار جوشن خود اور دوسرے زرہیں اسلحہ آویزاں تھے، معتضد نے دجلہ کے کنارے قصر التاج بنایا تھا، تو اس کے مرصع تخت کے دائیں بائیں جواہرات کے انبار کی چمک سے رات کو دن کا عالم نظر آتا تھا، اسکی تقلید دوسرے ممالک کے فرمانروا بھی کرتے تھے، اندلس کے فرمانرواؤں نے قرطبہ کو بغداد سے بڑھا دینے کی کوشش کی، اس میں عالی شان محلات، حمام، حوض،

... کی بڑی فراوانی تھی۔ دہلی کے سلطان محمد تغلق نے ایک محل بنایا تھا جس کی اینٹوں کے ساتھ چاندی ... تھا، اس کے ایک حوض میں سونا پگھلا کر اس کو بھر دیا تھا، شاہجہان نے آگرہ اور دہلی کے محلوں کو بہشت بریں بنا دیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے میں تمام عمر چپاتی کی صورت نہیں دیکھی تھی، حضرت صفیہؓ کے نکاح میں آپؐ نے جب ولیمہ کا کھانا کھلایا تھا تو صرف کھجور اور ستو تھا، غزوہ احزاب میں تین دن کے فاقہ کی وجہ سے آپؐ کے شکم مبارک پر پتھر بندھے ہوئے تھے، مگر ہارون رشید کے دسترخوان پر بیس تیس قسموں کے کھانے ہوتے، اس کے باورچی خانہ کا خرچ دس ہزار درہم روزانہ تھا، مامون کا ذاتی خرچ چھ ہزار اشرفی یومیہ تھا، قاہر کے دسترخوان پر تیس ہزار اشرفی کے میوے روزانہ ہوتے تھے، جہانگیری عہد کے ایک فوجی سردار باقر خاں نجم ثانی کے باورچی خانہ کیلئے دو سو بکرے، چالیس اونٹ اور ایک ہزار گائیں روزانہ ذبح ہوتی تھیں، اورنگ زیب اسراف پسند نہ کرتا تھا، مگر اس کے عہد میں بھی جب ایران سے ایک سفیر آیا تو لاہور میں اس کی دعوت میں چار سو قابیں تھیں، فواکہات اور عطریات کے سات سو خوان تھے،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشمی کپڑے کے استعمال کی ممانعت فرمائی، جب آپ کا وصال ہوا تو حضرت عائشہؓ نے کمبل جس میں پیوند لگے ہوئے تھے، اور گاڑھے کی ایک تہ نکال کر دکھائی کہ ان ہی کپڑوں میں آپؐ نے وفات پائی، مگر آپ کا نام لیکر حکومت کرنے والوں کے یہاں حریر، مخمل، دیبا اور مشجر کا استعمال عام ہو گیا تھا، ایک بار حضرت عائشہؓ نے دیواروں پر دھاری دار رنگین کپڑے منڈھ دیے تھے، تو آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ ہم کو اینٹ اور پتھر کو لباس پہنانے کے لیے مال نہیں دیا گیا ہے، مگر خلافت راشدہ کے بعد جتنی حکومتیں جہاں بھی قائم ہوئیں ان کے اور ان کے امراء کے یہاں زمین اور در و دیوار پر قیمتی مخمل و حریر کی بہار دکھائی دیتی۔

یہ تکلفات کیوں پیدا ہوتے گئے، صرف اس لیے کہ فرمانروا دنیا ہی کو عظیم الشان اور اونچا سمجھنے لگے

[illegible] کے دور سے [illegible]

[illegible] سے ہونے لگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گانے بجانے سے پرہیز کرنے کی ہدایت کی تھی، مامون جیسے جلیل القدر فرمانرواؤں کے یہاں رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتی تھیں، اندلس کے فرمانروا عبدالرحمٰن ثانی نے ایک مغنی زریاب کے لئے چالیس ہزار دینار سالانہ کا وظیفہ مقرر کیا تھا، جہانگیر کے ایک امیر اسلام خان رقص و سرود کے ارباب کمال پر نو لاکھ ساٹھ ہزار سالانہ خرچ کیا کرتے تھے۔

اسی عیش و تنعم کی فضا میں مسلمان فرمانروا حسن و جمال کے پرستار بنتے چلے گئے، عثمانی ترک اور ہندوستان کے مغل فرمانروا پُرتکلف عیاشی اور راجپوت شہزادیوں کو اپنے حرم میں داخل کرتے رہے، جس سے نہ صرف ان کی خانگی زندگی میں پیچیدگی پیدا ہوتی رہی، بلکہ اس کے مضرت رساں اثرات ان کی فرمانروائی پر بھی پڑے، صلیبی جنگ کے زمانہ میں عیسائیوں کی کوشش رہی کہ فرنگی عورتیں عرب فرمانرواؤں کے حرم میں بلا تکلف داخل ہو جائیں، تاکہ ان کے ذہنی اور مذہبی طرز فکر کو اپنے حسن و جمال کی عشوہ گری سے بدل دیں۔ ایسی عورتیں حرم میں داخل ہو جاتیں تو نسلی خرابیاں بھی پیدا ہو جاتیں، مگر یہ فرمانروا نسلی خرابیوں کے پیدا ہونے والے خطرات سے بے خبر رہے، اور اگر ان کو احساس بھی ہوا تو اپنے عیش و تنعم کے تکلفات میں اسکو نظر انداز کر دیتے۔

ان تکلفات سے دو بڑے نقصانات ہوئے، وہ ان ہی تمدنی برائیوں میں مبتلا ہو گئے، جن سے قیصر و کسریٰ کی حکومتیں بے جان اور متزلزل ہو رہی تھیں، مسلمان فاتحوں نے انکی ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر ان کو مغلوب کیا، تمدنی ادراک جب اعتدال سے بڑھ جاتا ہے تو یہ مفید ہونے کے بجائے مضر ہونے لگتا ہے، ایک فرانسیسی مورخ کے بیان کے مطابق تمدن قوم کے عادات و اطوار کو نرم کرتا ہے، فہم و ادراک کو ضرور جلا دیتا ہے، لیکن تبرد آزمائی اور جفاکشی

[illegible] ان مسلمان سلاطین کے عہد میں [illegible] قوت [illegible]
[illegible] جن کی بدولت وہ دنیا پر چھا گئے تھے۔

دوسرا نقصان یہ ہوا کہ ان تکلفات کا سارا بار بیت المال پر پڑا، اور اس قومی امانت میں خیانت
ہونے لگی۔ شاہی محلات اور مقبروں کی تعمیرات اور ان کی زینت و آرائش میں بیت المال کا سرمایہ بے دریغ
خرچ ہونے لگا، اس سرمایہ سے انھوں نے آگ، پانی، ہوا اور مٹی پر قابو پانے کی کبھی وہ کوشش نہیں کی جو آج غیر مسلم
قومیں کر رہی ہیں لیکن ہاں ابن ہیثم، ابن جابر، محمد بن جعفر البتانی، الدمیری، ابو معشر، ابوالحسن الناصر بزی، ابن زہیر
اور بو علی سینا وغیرہ جیسے سائنس ہیئت اور طب کے ماہرین پیدا ہوئے، ان سے یورپ والوں نے پورا استفادہ
کیا، مگر وہ خود ان سے زیادہ فوائد نہ اٹھا سکے، ان کو اپنے عیش و تنعم میں زیادہ تر شعر و ادب، الف لیلہ، طلسم
ہوش ربا اور داستان امیر حمزہ ہی میں لذت ملتی رہی۔

بیت المال کے تصرف سے ان فرمانرواؤں کی حکومتیں شخصی اور خاندانی بنتی چلی گئیں، شخصی حکومتوں کے
فرمانرواؤں نے کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ ان کے اندر رہنے والے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے، اور
ان کی معاشرت میں تفریق و تقسیم کی بیگانہ وشی نہ ہونے پائے وہ یا تو میدان جنگ میں لڑتے، لڑنے کے بعد ملکی نظم و نسق میں مشغول
ہو جاتے پھر وہ باہر کی ریشہ دوانیوں سے پریشان رہتے ان سے فرصت مل جاتی، تو محلات اور مقبرے بنانے میں لگ جاتے
اگر وہ قوم کی سیرت کے الحمرا، قرطبہ اور تاج محل بنانے میں مشغول رہتے تو ان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

تاج و تخت کی جانشینی کا کوئی ضابطہ بھی نہیں رہا، اسی لئے جانشینی کے سلسلہ میں کبھی معرکے، کبھی قتل اور
کبھی خونریز لڑائیاں ہوتی رہیں، ان لڑائیوں کے لشکری شخصی حکومت کیلئے لڑتے، ان میں پہلے کی طرح رات کے راہب
اور دن کے سوار نہ ہوتے، اپنے شاہی آقا کی خاطر ایک دوسرے کو برا کہہ کر اور دین کی برکتوں سے محروم۔ مادی فوائد
کے لئے لڑتے، جو جنگ میں حاوی ہو جاتا وہی تاج و تخت کو ذاتی ملکیت سمجھ کر اس کا مطلق العنان مالک ہو جاتا جو ملک و دولت
کیلئے مفید نہ ہوتا اور اگر مفید ہوتا تو وہ اس کا مجازی خدا ہو جاتا، قادسیہ کی جنگ کے موقع پر حضرت سعد بن وقاص کے

...مسلمانوں میں جو گروہ اور مذاہب بنے ان کے اختلافات ہی بعض لوگوں نے بڑھا کر ... ... فرقوں کے ... میں بنیاد ...

قائم ہوئی تھی جب جمل اور صفین میں بعض لوگ مارے گئے تھے ... دلوں میں اسلام کی عظمت و ہیبت بیٹھ گئی تھی

حکمرانوں کمزور پڑ جاتے تو نسلی، علاقائی، اور ذاتی مفاد کی خاطر ان کا کوئی نہ کوئی حریف پیدا ہو جاتا اور وہ ایک علیحدہ حکومت بنا لیتا جس سے مسلمانوں کی فوجی قوت منقسم ہوتی رہی۔ مسلمانوں کی تاریخ میں اگر یکجہتی اور یگانگت کی مثالیں ملتی ہیں تو انکی نفاق پروری سے بھی انکی تاریخ بھری پڑی ہے۔ امیر معاویہؓ نے خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کر دیا، یزید کے عہد میں کربلا کا واقعہ پیش آیا جسکو زمانہ کبھی فراموش نہ کر سکیگا، سفاح بن عباس نے بنو امیہ کو ختم کر کے انکی قبریں کھدوا دیں، عباسیوں کے آخری زمانہ میں نصیر الدین طوسی اور ابن علقمی نے تاتاریوں سے ساز باز کر کے بغداد کو خون اور لاشوں کا ڈھیر بنا دیا، تیمور نے دولت عثمانی اور تغلق خاندان کے فرمانرواؤں پر کسی مقصد کے بغیر حملہ کر کے انکو بے جان کر دیا، جبکہ سلطان بایزید اسلام کے دشمن یا بازنطینی حکومت پر ضرب کاری لگانے والا تھا تو تیمور نے اس سے لڑکر اس کو قید کر دیا اور وہیں اسکی موت ہوئی، ابراہیم لودی کے امیر دولت خان نے بابر کو مدعو کر کے لودی خاندان کو ختم کر دیا، نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کر کے مغلوں کی سلطنت کی بنیاد ہلا دی اسکی رہی سہی قوت کو احمد شاہ ابدالی نے اپنے متواتر حملوں سے ختم کیا، پھر میر جعفر، اور صادق نے انگریزوں سے مل کر بنگال میں سراج الدولہ اور میسور میں ٹیپو سلطان کی حکومتیں ختم کرائیں، اندلس میں بنو عباد، بنو حماد، بنو عامر، بنو ذوالنون اور بربریوں وغیرہ میں خانہ جنگیاں ہوتی رہیں جن سے فائدہ اٹھا کر عیسائیوں نے انکی آٹھ سو برس کی حکومت کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا، اور صفاریوں، طاہریوں، طولونیوں، سامانیوں، خوارزمیوں، زنگیوں، ایوبیوں، غزنویوں، غوریوں، غلاموں، خلجیوں، تغلقوں، سیدوں، لودیوں، مغلوں اور یورپ میں عثمانیوں کی حکومتیں بھی باہمی آویزشوں اور افتراق پسندیوں کی وجہ سے ختم ہوتی گئیں، یہ دکھ بھری داستان ہے کہ صلیبی جنگ کے زمانہ میں مشرق وسطیٰ کے چھوٹے چھوٹے حکمران اپنی علاقائی آزادی کو برقرار رکھنے کی خاطر عیسائیوں سے مل جاتے، پہلی جنگ عظیم میں عربوں نے عیسائیوں سے مل کر ترکش امپائر کو ختم کر دیا، موجودہ دور میں مشرق میں عربوں میں جو پھوٹ پڑی ہوئی ہے، اسکو ہم آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں مسلمانوں کی تاریخ میں منافقوں اور غداروں کی بھی بڑی دردناک داستان ہے

مسلمانوں کے زوال کا واحد سبب تو یہ بتایا جا سکتا ہے کہ ان کا اجتماعی معاشرہ کبھی مستحکم نہیں رہا اس لئے آسانی سے اس میں پھوٹ پڑ جاتی، دیندار اور طاقتور فرمانروا اپنے عہد میں اس معاشرہ کو کچھ دنوں کیلئے مضبوط بنا دیتے مگر جب کمزور اور فاسق حکمرانوں کے سامنے دنیا بلکہ عظیم الشان دنیا ہوتی تو پھر وہ وحی کی برکتوں اور اپنے رسول کی اتباع سے محروم ہوتے اور وہ اپنی تباہی کی سرخ آندھی اور زلزلوں میں زمین کے اندر دھنسنے چلے گئے۔

مقالات

فاتح علم

ازجناب شبیر احمد خاں غوری ایم۔ اے ایل ایل بی۔ سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

(۲)

جیسا کہ سابق میں عرض کیا جا چکا ہے، اس عاجز کو اصل کتاب کے مطالعہ کا شرف حاصل نہیں ہوسکا، کتاب سے میری واقفیت کا واحد ذریعہ فاضل تبصرہ نگار کا تبصرہ ہے، وہ اس کی عظمت تحقیق سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے ہیں، اور لکھا ہے:۔

"بلا خوف، تردید کہا جا سکتا ہے کہ اسلام اور علم کے موضوع پر آج تک کسی زبان میں ایسی جامع اور فکر انگیز کتاب شائع نہیں ہوئی۔"

بایں ہمہ وہ مصنف کی تحقیقات پر غیر مشروط ایمان نہیں رکھتے، چنانچہ تبصرہ کے آخر میں فرماتے ہیں۔

"یہ امر قابل ذکر ہے کہ کتاب کا مصنف اس علم و فضل کے باوجود بہر حال غیر مسلم ہے، اس کے خیالات اور نتائج فکر سے سو فیصد اتفاق مشکل ہے، اس کی بعض باتیں مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے

قابلِ اعتراض بھی ہیں۔ مثلاً مصنف کی قیاس آرائی کہ اوائلِ عہدِ اسلام میں مسلمانوں کی نشاطِ علمی شاید ادیانِ سابقہ خصوصاً یہودیت کے فیضان کا نتیجہ تھی، محض ایک مفروضہ ہے جس کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔"

اس عاجز کو فاضل تبصرہ نگار کے اندازِ فکر سے اتفاق کرنے میں بڑی دقت پیش آرہی ہے۔ بے شک کتاب کا مصنف اس علم و فضل کے باوجود غیر مسلم ہے، مگر تلاشِ حقیقت میں اپنے بیگانے کا امتیاز نہیں کیا جانا چاہئے، علم کی نعمت تو ایک روشنی ہے، اور روشنی کا جویا، جہاں سے بھی وہ اسے ملے کسبِ نور کرتا ہے، اور کرنا چاہئے، وہ یہ امتیاز نہیں کرتا کہ روشنی طاقِ حرم میں جھلملاتی شمع سے آرہی ہے، یا بتکدے میں ٹمٹماتے چراغ سے۔

پروانہ چراغِ حرم و دیر نداند

اسی طرح اس کے خیالات اور نتائجِ فکر سے سو فیصد اتفاق اس بناء پر مشکل نہ ہونا چاہئے کہ اس کی بعض باتیں مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض ہیں، احقاق کا یہ کھوکھلا اصول غیر پسندیدہ ہے، اور اس تعصب و تنگ نظری کا مظہر ہے، جس کا ہم عرصہ سے مستشرقین اور اسلام پر لکھنے والے دوسرے اہلِ علم کو طعنہ دیتے آرہے ہیں۔

حق و ناحق کا صحیح معیار حقائق و واقعات سے مطابقت و عدمِ مطابقت ہونا چاہئے۔

بہرحال جہاں تک عاجز سمجھ پایا ہے، مصنف کے خیالات اور نتائجِ فکر سے جو اتفاق مشکل نظر آرہا وہ اس وجہ سے نہیں کہ وہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض ہیں، بلکہ اس وجہ سے ہونا چاہئے کہ وہ ٹھوس تاریخی حقائق کے ساتھ دست و گریباں ہیں،

مثلاً مصنف کتاب کی یہ قیاس آرائی کہ اوائل عہدِ اسلام میں مسلمانوں کی نشاط شاید ادیانِ سابقہ بالخصوص یہودیت کے فیضان کا نتیجہ تھی، حقیقت نفس الامری کے منافی

، تو اس کی تائید میں کوئی [illegible] شہادت نہیں ہے، اور نہ یہ تاریخی ارتقا کے اصل الاصول "بقائے اصلح" کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اسلام کی بعثت ایک تاریخی وجوب تھی اگر ادیانِ سابقہ خواہ الہامی مذاہب ن یا غیر الہامی اسی قابل ہوتے کہ اسلام ان کی خوشہ چینی کرتا، تو ان کے ہوتے ہوئے اسلام کی ضرورت ، کیا تھی، "بقائے اصلح" کے اصول کی ہمہ گیر کار فرمائی نظامِ کائنات کا ایک اٹل قانون ہے۔ ہزارہ ل مسیحی کی ابتدائی صدیاں بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں، ادیانِ سابقہ کا گوشۂ گمنامی میں جا پڑنا ، اسلام کا ہر طرح کے داخلی اور خارجی موانع کے باوجود دیکھتے ہی دیکھتے معمورۂ عالم کے بڑے حصہ کو بقعۂ نور بنا دینا کسی مانگے کی روشنی کا کرشمہ نہیں ہو سکتا، حقیقت یہ ہے کہ قدیم مذاہب ہوں یا قدیم ثقافتیں اپنی افادیت کے دن پورے کر چکے تھے، مستقبل بقول پروفیسر [illegible] ایک نئے مذہب کا منتظر تھا، مگر یہ نیا مذہب اسلام تھا نہ کہ مسیحیت کیونکہ وہ خود ان مذاہب سے زیادہ فساد اور بگاڑ کا شکار ہو چکا تھا جن کی بیخ کنی کر کے وہ اس طرح پیدا شدہ خلا کو پر کرنے کا مدعی تھا، مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

بہر حال مصنف کے بعض افادات محلِ نظر ہیں، مثلاً فاضل تبصرہ نگار نے باب ہشتم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"مصنف نے لکھا ہے کہ ...... مسلمانوں کے نزدیک یہ مسلمہ امر تھا کہ ایک انسان کی بڑائی اور معاشرے میں اُس کی تعظیم و توقیر کا معیار صرف علم ہے نہ کہ عالی نسبی، اقتدار اور مال و دولت"

فاضل مصنف کے اس ارشاد پر میں صرف اتنی ترمیم کی اجازت چاہتا ہوں کہ یہ امر حصولِ علم، مسلمانوں کے نزدیک صرف مسلّمہ امر ہی نہ تھا، بلکہ براہِ راست قرآنی تعلیمات سے ماخوذ اور اسلام کی بنیادی تعلیم سے مستفاد تھا، مزید تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

اسلام میں علم کی اہمیت | اسلام معاشرہ کی درجہ بندی، عالی نسبی، اقتدار اور مال و دولت کی

بنیاد پر نہیں کرتا، بلکہ صرف دانائی اور نادانی کی اساس پر کرتا ہے،

قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون"[1]   کہہ دیجئے کہ کیا جو لوگ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے دونوں برابر ہیں،

اس کے یہاں عظمت و کرامت کا حق نہ مزعومہ دیوتاؤں کی اولاد کو ہے نہ جبار و زور آور کو اور نہ اہل ثروت کو، اس کے یہاں یہ مرتبہ بلند صرف اللہ رب العزت سے ڈرنے والے متقین ہی کے لئے مخصوص ہے،

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم"[2]   تم میں اللہ کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو

اور خوف خشیت الٰہی صرف اہل علم "علماء" ہی کا شعار ہے، چنانچہ قرآن کریم نے موکد طور پر (علی طریق القصر بحرف "انما") اس وصف کو صرف علماء ہی میں محصور کر دیا ہے۔

"انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء"[3]   بیشک اللہ کے بندوں میں سے علماء ہی اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔

خود اللہ تعالٰی نے اپنے رسول کا تعارف کسی باجبروت شاہنشاہ کی حیثیت سے نہیں کرایا بلکہ صرف "معلم کتاب و حکمت" کی حیثیت سے کرایا ہے اور اس "معلم کتاب و حکمت" کی بعثت کو مومنین پر اپنا سب سے بڑا کرم بتایا ہے۔

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم آیاتہ   اللہ تعالٰی نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا ہے جو انھیں خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر

---

[1] زمر۔ ۹   [2] حجرات۔ ۱۳   [3] فاطر۔ ۲۸۔

ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ [1]	سناتے، ان کو پاک کرتے اور خدا کی کتاب اور حکمت سکھاتے ہیں۔

اسلامی آئیڈیالوجی کی رو سے خلّاق کائنات نے انسان کو خلعت وجود سے نوازنے کے بعد سب سے پہلے جس دولت سے مالامال کیا وہ علم اسماء کی دولت تھی اور یہ وہ چیز تھی جس سے ملائکہ بھی تہی دامن تھے۔

"وعلم آدم الاسماء کلہا ثم عرضہم علی الملائکۃ فقال انبئونی باسماء ھؤلاء ان کنتم صادقین۔ قالوا سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم" [2]	اور اس نے (اللہ تعالیٰ نے) آدم کو سب (چیزوں) کے نام سکھائے، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ، انھوں نے کہا تو پاک ہے، جتنا علم تو نے ہمیں بخشا ہے اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں، بے شک تو دانا (اور) حکمت والا ہے۔

اس کا نتیجہ ہے کہ اسلام کے نظام اقدار میں حکمت ہی کو "خیر کثیر" (خیر اعلیٰ .Summum Bonum) قرار دیا گیا۔

ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا [3]	اور جس کو حکمت ملی اس کو "خیر کثیر" (بڑی نعمت) ملی

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو از دیاد جاہ و ثروت یا اقتدار میں بڑھوتری کے لئے دعا مانگنے کو نہیں کہا اگر حکم دیا تو صرف دولت علم میں فراوانی کے لئے دست دعا اٹھانے کا۔

---

[1] آل عمران - ۱۶۴ [2] بقرہ - ۳۱ - ۳۲ [3] بقرہ - ۲۶۹ ۔

"قل رب زدنی علما" کہو اے میرے رب میرے علم میں اضافہ کر

نہ دنیا کے رسول نے بھی اپنے جان نثاروں کو دولت لوٹنے اور ہوس ملک گیری کو پورا کرنے کی کبھی تعلیم نہیں دی ہاں کہا تو یہی کہا کہ حکمت تمہاری متاعِ گم گشتہ ہے جہاں ملے بے دریغ لے لو کیونکہ تمہیں اس کے حقدار ہو۔

کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن	کلمہ حکمت مومن کی متاع گم گشتہ ہو
اینما وجدھا فھو احق بھا[1]	جہاں پائے وہ اسے لینے کا سب سے
	زیادہ حقدار ہے،

یہی نہیں بلکہ طلب علم کو ان پر فرض گردانا۔

"طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم"

اور حکم دیا کہ اس فرض کی تعمیل میں وہ کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں خواہ اس کے لیے انہیں اقصائے عالم کا سفر ہی کیوں نہ کرنا پڑے

اطلبوا العلم ولو کان بالصین	علم کو تلاش کرو ہر چند کہ وہ چین ہی
	میں کیوں نہ ملے۔

اس تعلیم کے بعد جس سے ان کا دینی ادب معمور ہے، علم کی عظمت کا ان کے فکری مزاج کا جزو لاینفک بنجانا فطری تھا۔ مگر اس کا حقیقی سبب ان کے دین کی بنیادی تعلیم ہی تھا،

اسلام۔ تاریخ و حکمت کا درخشاں باب | فاضل تبصرہ نگار نے باب دوم پر تبصرے کے ضمن میں فرمایا ہے۔

• باب دوم عہد اسلام سے متعلق ہے، بقول مصنف یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ہم تدبر

---

[1] جامع ترمذی لابی عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی۔ المجلد الثانی۔ ابواب العلم ص ۹۳۔

سے وقت تاروشنی میں پہونچ جاتے ہیں"

اس پر میں اتنی ہی ترمیم کی اجازت چاہونگا کہ یہ محض مصنف ہی کا قول نہیں ہے، بلکہ ایک روشن تاریخی حقیقت ہے۔ اسے فرانز روزنتھال (Franz Rosenthal) کا قول بناکر اپنی تاریخ اور ثقافتی عظمت کو کیوں اس کا زیر بار احسان بنایا جائے۔

اس روشن تاریخی حقیقت کے دو جز ہیں۔

(۱) چھٹی صدی مسیحی سے عالم اسلام سے باہر کی دنیا کی تاریخ کا وہ دور شروع ہوتا ہو جو قرونِ مظلمہ (Dark Ages) کے نام سے بجاطور پر موسوم ہے۔

(۲) اسی زمانہ میں عالم اسلام علم وحکمت کی روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔

۱۔ مورخین کا اجماع ہے کہ سنہ ۵۲۹ء کے بعد تاریخ عالم کا وہ دور شروع ہوتا ہے، جو بجاطور پر ظلمت وجہالت کا دور ہے، بعثت اسلام کے وقت مشرق ومغرب دونوں پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

خود جزیرہ نمائے عرب جہاں آفتاب ہدایت کی پہلی کرن چمکی، اس منزل سے گزر رہا تھا جو اسلامی تاریخ میں "عہد جاہلیہ" کے نام سے مشہور ہے، اس وقت اہل عرب کے عمائد کو علم کے بجائے اپنے "جہل" پر ناز تھا۔

الا لا یجهلن احد علینا فنجهل فوق جهل الجاهلینا[1]

ان کے علمی وحکمی کارنامے صرف فصاحت لسانی شعر وشاعری اور خطابت تک محدود تھے، یا پھر کچھ دیسی نجوم کا علم تھا جسے وہ "علم الانواء" کہتے تھے، چنانچہ قاضی صاعد اندلسی (زمانہ پانچویں صدی ہجری) نے لکھا ہے۔

---

[1] سبع المعلقات۔ معلقہ عمرو بن کلثوم۔

"قل رب زدنی علماً" کہو اے میرے رب بڑھا میرا علم

لہٰذا اس کے رسول نے بھی اپنے جاں نثاروں کو دولت لوٹنے اور ہوس ملک گیری کو پورا کرنے کی بھی تعلیم نہیں دی۔ ہاں کہا تو یہی کہا کہ حکمت تمہاری متاعِ گم گشتہ ہے جہاں ملے بے دریغ لے لو کیونکہ تمہیں اُس کے حقدار ہو۔

کلمة الحکمة ضالة المؤمن	کلمہ حکمت مومن کی متاع گم گشتہ ہو
اینما وجدھا فھو احق بھا۔[1]	جہاں پائے وہ اُسے لے لینے کا سب سے زیادہ حقدار ہے،

یہی نہیں بلکہ طلب علم کو ان پر فرض گردانا۔

"طلب العلم فریضة علی کل مسلم"

اور حکم دیا کہ اس فرض کی تعمیل میں وہ کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں خواہ اس کے لیے انھیں اقصائے عالم کا سفر ہی کیوں نہ کرنا پڑے

اطلبوا العلم ولوکان بالصین	علم کو تلاش کرو ہر چند کہ وہ چین ہی میں کیوں نہ ہے۔

اس تعلیم کے بعد جس سے ان کا دینی ادب معمور ہے، علم کی عظمت کا اُن کے فکری مزاج کا جزو لاینفک بنجانا فطری تھا۔ مگر اس کا حقیقی سبب ان کے دین کی بنیادی تعلیم ہی تھا،

اسلام. تاریخ و حکمت کا درخشاں باب | فاضل تبصرہ نگار نے باب دوم پر تبصرے کے ضمن میں فرمایا ہے۔

"باب دوم عہد اسلام سے متعلق ہے، بقول مصنف یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ہم اندھیرے

---

[1] جامع ترمذی لابی عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی۔ المجلد الثانی۔ ابواب العلم ص ۹۳۔

سے روشنی اور روشنی میں پہونچ جاتے ہیں"

اس پر ہمیں اتنی ہی ترمیم کی اجازت چاہونگا کہ یہ محض مصنف ہی کا قول نہیں ہے، بلکہ ایک روشن تاریخی حقیقت ہے۔ اسے فرانز روزنتھال (Franz Rosenthal) کا قول بناکر اپنی تاریخ اور ثقافتی عظمت کو کیوں اس کا زیر بار احسان بنایا جائے۔

اس روشن تاریخی حقیقت کے دو جز ہیں۔

(۱) چھٹی صدی مسیحی سے عالم اسلام سے باہر کی دنیا کی تاریخ کا وہ دور شروع ہوتا ہے جو قرونِ مظلمہ (Dark Ages) کے نام سے بجا طور پر موسوم ہے۔

(۲) اسی زمانہ میں عالم اسلام علم وحکمت کی روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔

۱۔ مورخین کا اجماع ہے کہ ۵۲۹ء کے بعد تاریخ عالم کا وہ دور شروع ہوتا ہے، جو بجا طور پر ظلمت وجہالت کا دور ہے۔ بعثت اسلام کے وقت مشرق ومغرب دونوں پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

خود جزیرہ نمائے عرب جہاں آفتاب ہدایت کی پہلی کرن چمکی، اس منزل سے گزر رہا تھا جو اسلامی تاریخ میں "عہد جاہلیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس وقت اہل عرب کے عمائد کو علم کے بجائے اپنے "جہل" پر ناز تھا۔

الا لا یجهلن احد علینا — فنجهل فوق جهل الجاهلینا[1]

ان کے علمی وحکمی کارنامے صرف فصاحت لسانی شعر وشاعری اور خطابت تک محدود تھے، یا پھر کچھ دیسی نجوم کا علم تھا جسے وہ "علم الانواء" کہتے تھے، چنانچہ قاضی صاعد اندلسی (زمانہ پانچویں صدی ہجری) نے لکھا ہے۔

---

[1] سبع المعلقات۔ معلقہ عمرو بن کلثوم۔

ولما علم العرب الذی کانت تتفاخر به وتباری به فعلم لسانها و احکام لغتها ونظم الاشعار وتالیف الخطب.....وکان للعرب مع هذا معرفة باوقات مطالع النجوم ومغاربها وعلم بانواء الکواکب وامطارها۔[1]

بہرحال عربوں کے وہ علوم جن پر وہ فخر و مباہات کیا کرتے تھے، وہ تھے زبان اور لغت کا علم، نظم اشعار اور تالیف خطبات.........
اس کے ساتھ عربوں کو ستاروں کے طلوع و غروب کے اوقات کی کچھ واقفیت تھی نیز نچھتروں اور اُن کے دوران میں ہونے والی بارش کا کچھ علم تھا۔

اس کے باوجود اُن کا یہ سرمایہ فخر و مباہات سائنٹفک دقت نظری سے محروم تھا، چنانچہ البیرونی ان کے علم الانواء کی (جسے اُن کی ہیئتی حذاقت کی معراج کمال سمجھنا چاہیے) تنقید میں لکھتا ہے۔

وکذلک لو تاملت اسامیهم للکواکب الثابتة لعلمت انهم کانوا من علم البروج والصور بمعزل.... وعلمت انهم لم یختصوا من ذلک باکثر مما اختص به فلاح کل بقعة۔[2]

اور اسی طرح اگر تم ان ناموں پر غور کرو جو عربوں نے کواکب ثابتہ کے رکھے تھے تو معلوم کر لوگے کہ انہیں بروج و صور کا کوئی علم نہ تھا...... اور یہ کہ عربوں کو فلکیات کا اس سے زیادہ علم نہ تھا، جتنا دوسرے مقاموں کے کسانوں کو ہوتا ہے۔

---

[1] قاضی صاعد اندلسی۔ طبقات الامم ص ۴۸ [2] البیرونی۔ الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ

پھر اس "علم الانواء" کا بدترین پہلو یہ تھا کہ ان کے ڈھکوسلوں میں آکر عرب جاہلیت نے اجرام سماوی کی پرستش شروع کردی تھی۔ غرض عرب جاہلیت علم و حکمت میں اس سے زیادہ ترقی نہ کر سکے رہا حقیقی فلسفہ و حکمت تو اس کی انھیں ہوا بھی نہیں لگی قاضی صاعد اندلسی لکھتے ہیں،

فھذا ما کان عند العرب من المعرفۃ واما علم الفلسفۃ فلم یمنحھم اللہ عزوجل شیئا منہ ولا ھیأ طباعھم للعنایۃ بہ[1]

یہ تھی عربوں کے علم و معرفت کی کل کائنات۔ رہا (سائنٹفک) فلسفہ و حکمت تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اس سے بالکل محروم رکھا تھا اور ان کا مزاج اس قابل ہی نہیں بنایا کہ وہ اس کی طرف توجہ کر سکیں

اس سے زیادہ محققانہ تجزیہ ابن خلدون نے کیا۔ "مقدمہ" کی ایک فصل میں وہ کہتا ہے کہ عربوں کی طبعی و نسلی خصوصیات ہی علم و حکمت کے لئے سازگار نہیں ہیں

فصل فی ان العرب ابعد الناس عن الصنائع والسبب فی ذلک انھم اعرق فی البدو وابعد عن العمران وما یدعوا الیہ من الصنائع[2]

فصل اس بات میں کہ عرب نوع انسان میں علم و ہنر سے سب سے زیادہ بے بہرہ ہیں، جس کا سبب یہ ہے کہ وہ جنگلی پن میں راسخ ہیں اور شہری تمدن کے لیے جن دستکاریوں کی ضرورت ہے اس سے بہت دور ہیں۔

ان کے مغربی ہمسایے انھیں "سراسینس" کے لقب سے ملقب کرتے تھے۔ رہے مشرقی پڑوسی اہل ایران، تو وہ تو انھیں سرے سے قابل التفات ہی نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ مشہور عرب بیزار شاعر

---

[1] صاعد۔ طبقات الامم ص ،، [2] ابن خلدون۔ مقدمہ ص ۳۴۲

واما علمها الذی کانت تتفاخر
به وتباری به فعلم لسانها و
احکام لغتها ونظم الاشعار
وتالیف الخطب...... وکان
للعرب مع هذا معرفة باوقات
مطالع النجوم ومغاربها وعلم
بانواء الکواکب وامطارها۔[1]

بہرحال عربوں کے وہ علوم جن پر وہ فخر و
مباہات کیا کرتے تھے، وہ تھے زبان!
اور لغت کا علم، نظم اشعار اور تالیف
خطبات........
اس کے ساتھ عربوں کو ستاروں کے
طلوع وغروب کے اوقات کی کچھ واقفیت
تھی نیز نچھتروں اور ان کے دوران میں
ہونے والی بارش کا کچھ علم تھا۔

اس کے باوجود ان کا یہ سرمایہ فخر و مباہات سائنٹفک دقت نظری سے محروم تھا، چنانچہ البیرونی ان کے علم الانواء پر جسے ان کی ہیئتی حذاقت کی معراج کمال سمجھنا چاہیے، تنقید میں لکھتا ہے۔

وکذلک لو تاملت اسامیهم
للکواکب الثابتة لعلمت
انهم کانوا من علم البروج
والصور بمعزل.... وعلمت انهم
لم یختصوا من ذلک باکثر مما
اختص به فلاح کل بقعة۔[2]

اور اسی طرح اگر تم ان ناموں پر غور
کرو جو عربوں نے کواکب ثابتہ کے
رکھے تھے تو معلوم کر لوگے کہ انہیں
بروج و صور کا کوئی علم نہ تھا....
اور یہ کہ عربوں کو فلکیات کا اس سے
زیادہ علم نہ تھا، جتنا دوسرے مقاموں
کے کسانوں کو ہوتا ہے۔

---

[1] قاضی صاعد اندلسی۔ طبقات الامم ص ۷۸ [2] البیرونی۔ الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ

پھر اس "علم الانواء" کا بدترین پہلو یہ تھا کہ ان کے ڈھکوسلوں میں آکر عرب جاہلیت نے اجرام سماوی کی پرستش شروع کر دی تھی۔ غرض عرب جاہلیت علم و حکمت میں اس سے زیادہ ترقی نہ کر سکے۔ رہا حقیقی فلسفہ و حکمت تو اس کی انھیں ہوا بھی نہیں لگی قاضی صاعد آگے لکھتے ہیں،

فهذا ما كان عند العرب	یہ تھی عربوں کے علم و معرفت کی کل
من المعرفة واما علم الفلسفة	کائنات۔ رہا (سائنٹفک) فلسفہ
فلم يمنحهم الله عز وجل شيئاً	و حکمت تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اس سے بالکل
منه ولا هيأ طباعهم للعناية	محروم رکھا تھا اور ان کا مزاج اس قابل
بها[1]	ہی نہیں بنایا کہ وہ اس کی طرف توجہ کر سکیں

اس سے زیادہ محققانہ تجزیہ ابن خلدون نے کیا۔ "مقدمہ" کی ایک فصل میں وہ کہتا ہے کہ عربوں کی طبعی و نسلی خصوصیات ہی علم و حکمت کے لیے سازگار نہیں ہیں

فصل فى ان العرب ابعد الناس	فصل اس بات میں کہ عرب نوع انسان
عن الصنائع والسبب فى ذلك	میں علم و ہنر سے سب سے زیادہ بے
انهم اعرق فى البدو وابعد	بہرہ ہیں جس کا سبب یہ ہے کہ وہ
عن العمران وما يدعو اليه	جنگلی پن میں راسخ ہیں اور شہری تمدن
من الصنائع[2]	کے لیے جن دستکاریوں کی ضرورت ہے

اس سے بہت دور ہیں۔

ان کے مغربی ہمسایے انھیں "سراسنیس" کے لقب سے ملقب کرتے تھے۔ رہے مشرقی پڑوسی دا ہل ایران، تو وہ تو انھیں سرے سے قابل التفات ہی نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ مشہور عرب بیزار شاعر

---

[1] صاعد۔ طبقات الامم ص ۱۱ [2] ابن خلدون۔ مقدمہ ص ۳۳۴

فردوسی عربوں کی فتح ایران سے مشتعل ہو کر شاہ نامہ میں کہتا ہے۔

زشیر شتر خوردن و سوسمار عرب را بجائے رسید است کار
کہ ملک عجم را کنند آرزو تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

لیکن عربوں کے بارے انھیں جو کچھ کہتے رہے ہوں، ظہور اسلام کے وقت ان کی
وثقافتی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔

عرب کے مشرق میں ایران تھا، جس کا دعوی تھا کہ وہ ہمیشہ سے علم و حکمت کا گہوا
مگر ساسانی حکومت کے آخری دور (جو ظہور اسلام سے کچھ ہی پہلے گزرا تھا) کی علمی و فکر
کو البیرونی اس تشکیک و ارتیابیت سے تعبیر کرتا ہے جو قوموں کے اندر ذہنی اور فکر
و اضمحلال کے بعد طاری ہو جایا کرتی ہے۔ اسلام سے پہلے ایرانی ثقافت کا روشن ترین
نوشیرواں کا عہد حکومت ہے۔ مگر اس کی علمی سرپرستی پر معاصر مورخ اگا تھیاس
بہت زیادہ مایوس کن ہے، چنانچہ کرسٹن سین لکھتا ہے:۔

"اگا تھیاس ..... کے نزدیک یہ بات کیسے ممکن ہے کہ ایک بادشاہ جو جنگی اور سیاسی
معاملات میں اس قدر مصروف ہو، یونانی اور رومی ادبیات کی لفظی و معنوی خوبیوں
کو بہ نظر غائر دیکھ سکے، بالخصوص جب کہ اس کے پیش نظر یونانی کتابوں کے صرف وہ
ترجمے ہوں جو بقول اس کے ایک انتہائی درجہ کی ناشایستہ زبان میں کئے گئے ہوں
یورنیوس جو ...... خسرو کو فلسفہ پڑھاتا تھا، اگا تھیاس کے نزدیک ایک جاہل
اور فریبی شخص تھا۔"[1]

عربوں کے مغربی ہمسایوں میں سے مغربی یورپ کی ثقافتی حالت کے بارے میں

---

[1] کرسٹن سین۔ ایران بعہد ساسانیاں، ص ۴۲۵۔

[illegible] The Bly لکھتے ہیں۔

"ساتویں اور آٹھویں صدی غالباً ہماری مغربی یورپ کی تہذیبی تاریخ کا بدترین زمانہ ہے یہ انتہا جہالت اور بربریت کا عہد تھا جس کی تباہ کاریوں اور غارت گریوں کے اندر کلاسیکی دور ماضی کے ادبی اور فنون لطیفہ کے کارنامے گم ہو کر رہ گئے تھے۔"[۵]

اس عہد تاریک کا یورپ جہالت و پسماندگی کی اندھیری کوٹھری بنا ہوا تھا، چنانچہ ڈریپر

[illegible]تا ہے۔

"یورپ کے ان قدیم باشندوں کے بارے میں مشکل ہی سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ بربریت و وحشت کی منزل سے آگے ترقی کر چکے تھے، ان کے بدن ناپاک تھے، دماغ توہمات سے بھرے ہوئے تھے، یہ لوگ مزاروں کی کرامات اور جھوٹے ادعائی تبرکات کے متعلق ہر قسم کے بے سروپا افسانوں پر اعتقاد رکھتے تھے۔"[۶]

رہا مشرقی یورپ جہاں بازنطینی سلطنت قائم تھی، بے شک کسی زمانے میں علم و حکمت کا سرچشمہ رہ چکا تھا، مگر ظہور اسلام سے پہلے یہاں بھی حکیمانہ فراخ نظری کے بجائے تعصب و تنگ نظری کا دور دورہ شروع ہوا۔ افلاطون و ارسطو کی روشن خیالی نے نو فلاطونیوں کی توہم پرستی اور تنگ نظری کی شکل اختیار کر لی تھی، ولیم ٹیس لکھتا ہے،

"یہ فلسفی متعدد دیوتاؤں کی پرستش کے آخری حامی تھے لیکن کثرت پرستی نے ان کے ہاں فلسفیانہ توجیہ اختیار کر لی تھی۔"[۷]

The lly Hustory of Philosphy. P.142 ۵

Draper History of Intellectual Develo- ۶

ولیم ٹیس مختصر تاریخ فلسفہ یونان ص۲۳ - pment of Europe vol. II P.30 ۷

ان متأخر فلاسفۂ یونان میں سب سے اہم نو افلاطونی جماعت تھی، جس کا معلم اول فلاطینوس (Plotinus) تھا۔ مگر اپنی دانشمندی اور حکیمانہ روشن خیالی کے باوجود وہ بھی مروجہ توہم پرستی کا علمبردار تھا، ولیم نیس اُس کے بارے میں لکھتا ہے۔

"وہ روایات اور دیومالا کے دیوتاؤں کی ایسی تاویل کرتا ہے کہ اُن کا اطلاق اس کے نظام تعلیم پر ہو سکے...... بتوں کی پوجا، پیشین گوئی، دعا اور جادو وغیرہ کی عقلی توجیہ وہ تمام اشیاء کے باہمی تاثیر و تاثر سے کرتا تھا۔"[1]

فلاطینوس کا شاگرد رشید فرفوریوس (Porphyry) تھا۔ اُس کے بارے میں پروفیسر تھلی لکھتا ہے۔

"وہ تزکیۂ نفس کے لئے ریاضت و مجاہدہ اور قومی مذہب پر اپنے استاد سے بھی زیادہ زور دیتا ہے اور ہر طرح کے توہم پرستانہ معتقدات و اعمال کا قائل ہے، جیسے بھوت پریت کا عقیدہ، پیشین گوئی، مورتی پوجا، جادو ٹونا وغیرہ۔"[2]

اس مزعومہ حکیمانہ روشن خیالی کا سب سے بڑا علمبردار ایامبلخس (Jamblicus) تھا۔ اُس کے بارے میں ولیم نیس لکھتا ہے۔

"ایامبلخس کے یہاں فوق الارضی دیوتاؤں کے علاوہ ارضی دیوتا بھی ہیں،..... ان کے بعد جنات، ملائکہ اور ابطال آتے ہیں، قومی دیوتاؤں کو بھی وہ اس دینی نظام میں جگہ دیتا ہے۔ بتوں کی پوجا، جھاڑ پھونک، جادو، پیشین گوئی وغیرہ کی بھی وہ اسی قسم کی توجیہ کرتا ہے۔"[3]

---

۱ ولیم نیس۔ مختصر تاریخ فلسفہ یونان ص ۲۱۵ ۲ Thilly, History of Philosophy, p. 148 ۳ ولیم نیس۔ مختصر تاریخ فلسفہ یونان، ص ۲۱۸۔

ظاہر ہے کوئی تہذیب توہم پرستی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتی۔ لہذا اسے بچانے کے سلسلے میں نوفلاطونی حکماء کی سعی پیہم کے علی الرغم یونانی تہذیب و ثقافت کا خاتمہ وقت کی اہم ضرورت تھی، چنانچہ پروفیسر تھلی لکھتا ہے۔

"لیکن اب اس فلسفہ میں کوئی جان نہیں رہ گئی تھی۔ قدیم شرک و کثرت پرستی میں جان ڈالنے اور پرانی تہذیب کو بچانے کے سلسلے میں اس کی تمام کوششیں بے سود تھیں۔ یہ فلسفہ اپنی افادیت کھو چکا تھا، مستقبل نئے مذہب کا منتظر تھا، جس کے خلاف اس فلسفہ نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔"[1]

لہذا انجام کار ۵۲۹ء میں قیصر جسٹینان نے ایتھنز کے مدرسہ فلسفہ میں تالا ڈالکر اور فلاسفہ کو جلاوطن کر کے قدیم یونانی علم و حکمت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔[2]

مگر اس سے بھی صورت حال کی اصلاح نہ ہو سکی۔ پروفیسر تھلی کے خیال میں مستقبل نئے مذہب کا منتظر تھا، جس سے فاضل پروفیسر کا اشارہ "مسیحیت" کی طرف ہے مگر یہ نیا مذہب اپنے بت پرست پیشروؤں (یونانی حکمت کے پیروؤں) سے بھی زیادہ توہم پرست، عقلیت بیزار اور علم و حکمت آزار ثابت ہوا، رومن امپائر کی اگلی دو سو سال کی تاریخ مذہبی تشدد و تنگ نظری اور فرقہ وارانہ منافرت کی مسلسل داستان ہے، پادریوں نے مندروں کے ساتھ فلسفہ کے مدارس کو بھی اپنے تعصب اور تنگ نظری کا نشانہ بنایا، ان کے ایماء سے فلاسفہ پر حملہ ہوا، اس تعصب و تنگ نظری کا سب سے گھناؤنا واقعہ اسکندریہ کی نوفلاطونی جماعت کی صدر عقیل و فہیم ہائی پیشیہ (*Hypatia*) کا دردناک قتل تھا (۴۱۵ء)۔[3]

---

[1] Thilly: History of Philosophy, P. 119

[2] Weber, History of Philosophy, P. 142.

[3] ولیم نیل۔ مختصر تاریخ فلسفہ یونان ص ۲۲۵

...وریوں کے تعصب و عقلیت بیزاری نے سی پر بس نہیں کیا، انھوں نے علم و حکمت کی ... بند کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کی تنگ نظری نے منطق جیسے علم کو بھی جو مستقبلیت ... شدی کی اساس ہے نہیں بخشا[1]۔ ایسے ہمت شکن حالات میں علم و حکمت کا باقی رہنا نا ممکن تھا بقول ... لس اے موٹ،

"اس زمانہ میں کسی عام مدرسہ فلسفہ کا وجود فرض کرنا بھی مشکل ہے کیونکہ اس وقت سے مذہبی تعصب بڑھتا گیا، اور اس نے وثنی معلمین و تلامذہ کے لئے زندگی دشوار کر دی۔"

لہٰذا ایتھنز کے مدرسۂ فلسفہ کی قفل بندی کے بعد کوئی نام کا بھی عالم پیدا نہیں ہوا، چنانچہ ایم ڈی ولف لکھتا ہے:۔

"نو فلاطونیت کے آخری علمبردار شاسطیوس اور برقلس وغیرہ کے بازنطینیہ (مشرقی رومن امپائر) کے ساتھ تعلقات ضرور تھے لیکن ان کے بعد آٹھویں صدی مسیحی سے پہلے ہمیں وہاں کوئی قابل ذکر نام نہیں ملتا۔"[2]

ساتویں صدی میں ہرقل نے قدیم علمی عظمت کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش بے کار ثابت ہوئی، ایم۔ ڈی۔ ولف لکھتا ہے:۔

"مشرق کے مسیحی شاہنشاہوں نے فلسفہ کا مدرسہ جاری کرنے کی کئی بار کوشش کی تاکہ نیا دارالسلطنت ایتھنز اور اسکندریہ کا حریف بن جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۶۱۵ء میں شاہنشاہ ہرقل نے اسکندریہ کے ایک استاد کو قسطنطنیہ بلایا تاکہ اس کی تعلیم سے بازنطینی ذہانت و فطانت اپنے جمود سے بیدار ہو جائے، مگر یہ سعی سعی لاحاصل ثابت ہوئی"

---

[1] ابن ابی اصیبعہ۔ طبقات الاطباء، جلد ثانی ص ۱۳۵۰۔ [2] M. De Wulf, ... Mediveal Philosophy, P. 23

مقوقہ بیداری کو ظہور میں آنے کے لیے ابھی نسلہا نسل درکار تھیں۔

غرض مدرسہ ایتھنز کی قفل بندی کے بعد سے یورپ کی تاریخ میں وہ زمانہ شروع ہوا جو قرون مظلمہ (Dark Ages) کے نام سے مشہور ہے، چنانچہ اس زمانہ کے یورپ کی علمی و ثقافتی حالت کے بارے میں ایک فرانسیسی مورخ لکھتا ہے۔

"۵۲۹ء سے لے کر جب کہ قیصر جسٹینیان نے یونانی مدارس کو بند کر دیا تھا، ۱۶۳۷ء تک جبکہ ڈیکارٹ کی مقالات برمناہج شائع ہوئی، نیند کی ماتی انسانیت نے غور و فکر کرنا ہی چھوڑ دیا تھا، یا یوں کہیے کہ علم و حکمت کے اہم مسائل کو تخییل و ذہانت کے حضور میں لانا ہی بند کر دیا تھا۔"

اسی طرح قرون وسطیٰ کے علمائے مغرب کی مساعی فکریہ کے باب میں ایم۔ ڈی وولف نے دوسرے مورخین کے اقوال بدیں طور نقل کئے ہیں،

مثال کے طور پر ٹین کا خیال ہے کہ تیرہویں صدی کے فحول علمائے مغرب کا زمانہ محض نالائقوں کا زمانہ ہے، جو نفرت و حقارت کے سوا کسی اور بات کا مستحق نہیں ہے، اس تاریک عرصہ کی تہہ میں جو تین صدیاں گذری ہیں، انھوں نے انسان کے عقلی ورثہ میں ایک نئے تصور کا بھی اضافہ نہیں کیا، دوسرے لوگوں کی رائے ہے کہ قرون وسطیٰ کو نظر انداز کر دینا ہی بہتر ہے، یہ لوگ اس زمانہ کو انسانیت کے لئے موجب ننگ و عار سمجھتے ہیں۔"

اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت یورپی معاشرے میں علم و ثقافت کی قیادت پادری طبقہ

M. De Wulf: Scholast-icism old and New

ibid, P. 12

ibid, P. 5

کے ہاتھ میں تھی، جس کے متعلق بیکن (Bacon) کہتا ہے:

"ان کے علوم نے رو بانحطاط ہو کر اس طرح بے کار اور غیر صالح مباحث کی شکل اختیار کر لی تھی، جس طرح کوئی عضویہ سڑ کر متعفن ہو جاتا ہے۔"[1]

۲۔ تصویر کا دوسرا رخ۔ مگر اسی "عہد تاریک" میں ربع مسکون کا ایک حصہ ایسا بھی تھا جو علم و حکمت کی روشنی سے جگ مگ کر رہا تھا، یہ "سراسینس" کا ملک تھا، جو مشرق تابان بنا ہوا تھا، "نبی اُمی" کی اُمت کا ملک تھا، جس کا ہر فرد بجائے خود افلاطون و ارسطو طالیس، اقلیدس و بطلیوس اور بقراط و جالینوس کے اغلاط کی تصحیح کر رہا تھا، یورپی ظلمت و تاریکی اور اسلامی تنویر" کا موازنہ ڈریپر نے کتنا صحیح کیا ہے۔

"یورپ کے ان قدیم باشندوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے بدن ناپاک تھے، دماغ توہمات سے بھرے ہوئے تھے، یہ لوگ مزاروں کی کرامات اور جھوٹے ادعائی تبرکات کے متعلق ہر قسم کے بے سروپا افسانوں پر اعتقاد کامل رکھتے تھے، (اس کے مقابلے میں اندلس کی اسلامی تہذیب کس قدر خوش آئند معلوم ہوتی ہے) جب کہ ہم یورپ کے جنوبی مغربی گوشہ (اسپین) پر نظر ڈالتے ہیں جہاں بالکل ہی مختلف حالات کے تحت علم و حکمت کے انوار تاباں کی روشنی پھوٹی پڑ رہی تھی، مغرب میں ہلال (اسلامی تہذیب) بدر کامل بنکر مشرق کی طرف جانیوالا تھا۔"[2]

دوسرے مقام پر یہی مصنف مسلمان حکمرانوں کی علمی سرپرستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے،

"جونہیں عربوں کو اسپین میں مضبوطی سے قدم جمانے کا موقعہ ملا وونہی انھوں نے

---

[1] Draper, History of intellectual Development of europe, Vol II, P. 42

[2] Ibid, P. 41

ایک روشن دور کا آغاز کیا ۔ ۔ ۔ ۔ قرطبہ کے امیروں نے خود کو علم وادب کا سرپرست بنا کر ممتاز کر لیا اور ذوق سلیم کی ایک ایسی مثال قائم کر دی جو یورپ کے دیسی حکمرانوں کی حالت کے بالکل برعکس تھی۔"[1]

اس کے بعد وہ ان کی علمی سرپرستیوں کا اجمالی جائزہ پیش کرتا ہے ۔

" انھوں نے بڑے بڑے شہروں میں لائبریریاں قائم کیں ۔ کہا جاتا ہے کہ ستر سے زیادہ لائبریریاں اس زمانہ میں موجود تھیں ، ہر مسجد کے ساتھ ایک عوامی مکتب ہوتا تھا ، جہاں غریبوں کے بچوں کو نوشت وخواند اور قرآن مجید کی تعلیم دی جاتی تھی ۔ صاحب استطاعت لوگوں کے لئے اعلیٰ مدارس تھے ، جہاں ایک بڑا عالم صدر ہوتا تھا ۔ قرطبہ ، غرناطہ اور دوسرے بڑے شہروں میں یونیورسٹیاں تھیں ۔ ان یونیورسٹیوں میں بعض پروفیسر ۔ ۔ ۔ ۔ ریاضی وہیئت کی تعلیم دیتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے علاوہ مخصوص فنون کے واسطے خصوصی مدارس تھے ، بالخصوص طب کے لئے ۔"[2]

ایک اور فاضل کارا دی دو (Cara de vaux) لکھتا ہے ۔

" عربوں (مسلمانوں) نے اس زمانہ میں اعلیٰ تعلیم اور علم وحکمت کے مطالعہ کو زندہ رکھا جب کہ مسیحی مغرب بربریت جہالت کے خلاف جان توڑ لڑائی کر رہا تھا ، ان کی علمی سرگرمیوں کا عہد نویں دسویں صدی میں متعین کیا جا سکتا ہے ، لیکن ان کی یہ سرگرمیاں پندرہویں صدی تک جاری رہیں ، بارہویں صدی کے بعد ہر وہ شخص جسے علم وحکمت کا ذرا سا بھی شوق ہوتا یا حصول علم کی تھوڑی سی بھی خواہش ہوتی تو

---

[1] Draper, History of Intellectual Development of Europe Vol. II, P. 31

[2] ibid, P. 3.

وہ یا مشرق کا سفر کرتا یا اسپین کا[1]

اور اس زمانہ میں۔

"اسپین کی اسلامی یونیورسٹیاں اقطاع یورپ کے علمائے دینیات سے بھری رہتی تھیں، پیڑوی دینریبل . . . . بیان کرتا ہے کہ جب وہ پہلی مرتبہ اسپین پہونچا تو اس نے دیکھا کہ یورپ حتیٰ کہ انگلستان کے بہت سے تعلیم یافتہ اشخاص وہاں ہیئت کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔"[2]

اس کا نتیجہ تھا کہ اس زمانہ کے لوگ عالم اسلام کے علمی سفر کو تمغائے فخر و مباہات سمجھتے تھے چنانچہ ڈریپر لکھتا ہے۔

دسویں صدی مسیحی ہی سے جن لوگوں کو حصول علم کا شوق ہوتا، یا تہذیب و ثقافت کا ذوق رکھتے، وہ ہمسایہ ممالک سے اسپین پہونچتے اور بعد کے زمانہ میں تو اس رسم کو لوگوں کا عمل بہت زیادہ بڑھ گیا، بالخصوص جب گر برٹ نے اپنی غیر معمولی ترقی سے ایک شاندار مثال قائم کر دی، کیونکہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، وہ قرطبہ کی اسلامی یونیورسٹی ہی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد یورپ کے عہدہ پر فائز ہوا تھا۔"[3]

مگر مسلمانوں کے علمی ماضی کی تابانی و درخشانی اغیار کی شہادتوں کی رہین منت نہیں یہ وہ ایک واقعہ نفس الامری ہے، شہر تو شہر رہے گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ میں علم و حکمت کی فراوانی تھی، نہ صرف علوم دینیہ و ادبیہ ہی کے علماء کی کثرت تھی، علوم عقلیہ کے ماہرین بھی، جنھوں نے عالمی سائنس کی تاریخ میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، اپنے اپنے مخصوص علوم و فنون کی ترقی میں سرگرم عمل تھے، ان کے "نام" اور "کام" کی تفصیل دفاتر و مجلات

---

[1] Arnold: Legacy of Islam, P.377

[2] Draper: History of Intellectual Deve-lopment of Europe vol. II, P.30

[3] Ibid, P.36

کی مقتضی ہے، مثال کے طور پر خطیب بغدادی (المتوفی سنہ ۴۶۳ھ مطابق ۱۰۷۱ء) نے اپنے عہد تک کے مشاہیر علمائے بغداد کا تذکرہ چودہ جلدوں میں لکھا ہے، اسی طرح اور شہروں کے فضلائے نامدار کے تذکرے متعدد جلدوں میں مرتب کئے گئے. بڑے شہروں کا تو ذکر ہی کیا، معمولی شہروں کے علمار کے تذکرے کئی کئی جلدوں میں لکھے گئے. جرجان کوئی بڑا شہر نہیں تھا مگر ابوالقاسم حمزہ بن یوسف (المتوفی سنہ ۴۲۷ھ مطابق ۱۰۳۵ء) نے وہاں کے مشاہیر علمار کا تذکرہ کتاب معرفۃ علمار اہل جرجان" کے نام سے مرتب کیا. یہ تذکرہ شائع ہوچکا ہے، اور اس میں ۱۱۹۴ علمار کے تراجم ہیں. مختلف مقامات کے فضلار کے علاوہ بعض تذکرہ نگاروں نے مختلف صدیوں کے مشاہیر علمار وفضلار کے تراجم مرتب کئے جیسے امام یافعی (المتوفی سنہ ۷۶۸ھ مطابق ۱۳۶۶ء) کی "مرأۃ الجنان وعبرۃ الیقظان" ابن حجر عسقلانی کی" الدرر الکامنہ فی اعیان المائۃ الثامنہ" امام سخاوی کی" الضور اللامع. عبدالقادر عیدروس کی" النور السافر فی اعیان القرن العاشر". دوسرے اہل قلم نے مشاہیر کے تذکرے لکھے جیسے ابن خلکان کی "وفیات الاعیان" ابن شاکر کتبی کی "فوات الوفیات" صفدی کی" الوافی بالوفیات" بعض تذکرہ نگاروں نے مختلف علوم وفنون کے ماہرین کے مستقل تذکرے مرتب کئے جیسے ابو اسحاق شیرازی کی طبقات الفقہار، سبکی کی "طبقات الشافعیہ" عبدالقادر حنفی کی "الجواہر المضیۃ" ابن فرحون کی "الدیباج المذہب" یاقوت کی معجم الادبار، سیوطی کی "بغیۃ الوعاۃ" بیہقی کی "تتمہ صوان الحکمۃ" ابن القفطی کی "تاریخ الحکمار" ابن ابی اصیبعہ کی "عیون الانبار فی طبقات الاطبار".

یہ فہرست مشتے نمونہ از خروارے" کی نہیں، بلکہ" قطرۂ از بحر ناپیدا کنار" کی مصداق ہے اور پھر تذکرہ و تراجم کی کتابیں ہی سب کی سب ہم تک کہاں پہونچی ہیں، پھر بھی اس اجمالی ذکر سے علمائے اسلام کی کثرت اور اسلام میں علم وحکمت کی فراوانی کا

بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

کتنا عجیب گر واضح تضاد ہے کہ جس زمانہ میں گربرٹ (پوپ سلوسٹر دوم) شہر روم میں (جو اس وقت دنیائے مسیحیت کا مرکز تھا) پڑھے لکھے لوگوں کی کمیابی نہیں بلکہ نایابی کا شکوہ کر رہا تھا، انہی زمانہ میں ابن عساکر دمشقی (المتوفی سنہ ۵۷۱ھ مطابق ۱۱۷۵ء) جملہ علمائے اسلام کے نہیں بلکہ ان کے ایک محدود طبقہ متکلمین اشاعرہ کے تراجم کے استقصار کی ذمہ داری سے عہدہ برآنہ ہو سکنے کی معذرت فرما رہے تھے کہ نہ میرے لیے آسمان کے ستاروں کا گننا ممکن ہے، اور نہ ان نفوس قدسیہ کا احصار میرے بس کی بات ہے، پوپ سلوسٹر دوم نے بشپ آف اورلینز کے لئے جو تقریر مرتب کی تھی، اس میں لکھا تھا۔

There is not one at Rome, it is notorious, — Who Knows enouph of letters to pualify Him for a door Keeper; With What Face he presumes to teach, Who has never-learned. (35)

[یہ امر قابل غور ہے کہ شہر روم میں کوئی ایسا فرد نہیں ہے جو اتنا پڑھا لکھا ہوا ہو کہ دربان کے کام کو انجام دینے کا اہل ہو، جس شخص نے کبھی خود نہیں پڑھا، وہ کیا منہ لے کر دوسروں کو پڑھانے کا دعویٰ کریگا۔]

اور ابن عساکر معذرت فرما رہے تھے،

Draper: History of Intellectual Devel-lopment of Europe Vol, II, P. 4-

ومن لم اذكر منهم اكثر ممن ذكرت .... ولولا خوفي من الاملال للاسهاب وايثاري الاختصار لهذا الكتاب لتتبعت ذكر جميع الاصحاب واطنبت في مدحهم غاية الاطناب وكنت اكون بعد بذل الجهد فيه مقصرا من تقصيري بالاخلال بذكر كثير منهم معتذرا فكما لا يمكنني احصاء نجوم السماء كذلك لا اتمكن من استقصاء ذكر جميع العلماء مع .... مع كثرة المشتهرين في البلدان والامصار[1]

اور جن لوگوں کا میں نے ذکر نہیں کیا وہ ان سے زیادہ ہیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے .... اور اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ میری طول بیانی قارئین کی ملالت طبع کا باعث بن جائے گی اور میں نے اس کتاب کی تصنیف میں اختصار کو اصول نہ بنا لیا ہوتا، تو میں ضرور جملہ اصحاب کا ذکر کرتا اور ان کی تعریف وتوصیف میں اطناب برتتا، اور پھر بھی اتنی کوشش فرما کے باوجود کوتاہ کار رہتا اور اس بات کا معذرت گزار کہ بہت سے فضلاء کے ذکر میں مجھ سے فروگزاشت ہوئی ہے، کیونکہ جس طرح میرے لیے آسمان کے ستاروں کا گننا ناممکن ہے، اسی طرح میں تمام علمائے (اشاعرہ) کے ذکر کے استقصاء پر قادر نہیں ہوں ... کیونکہ ان میں سے بہت سے مشاہیر بیرونی شہروں میں رہے ہیں۔

اس واضح اور ناقابل تردید تضاد کے بعد تاریخ زبان حال سے پکار اٹھتی ہے،

[1] ابن عساکر دمشقی، تبیین کذب المفتری، ص ۳۳۰

"یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ہم اندھیرے سے دفعتہً روشنی میں پہونچ جاتے ہیں"۔

اور روشن تاریخی حقیقت کی تصدیق کے لیے نہ کسی گولڈ زیہر یا مارگولیتھ کی ضرورت ہے، نہ کسی گستاولی بان یا فرانز روزنتھال کی۔

یورپی تعصب و تنگ نظری | اب اگر یورپ کا پندار قومی اس حقیقت باہرہ کے اعتراف سے شرماتا ہے تو شرماتا رہے، بقول گستاولی بان۔

"بعض اشخاص کو اس خیال سے شرم آتی ہے کہ وحشیانہ معاشرت سے عیسائی یورپ کے نکلنے کا باعث ایک کافر (مسلمان) قوم ہوئی، یہ خیال ان کے لئے اسقدر تکلیف دہ ہے کہ اس کا آسان ترین علاج اس حقیقت سے مکر جانا اور سرے سے انکار کر دینا ہی ہے"

کیونکہ تاریخی حقائق کسی کے چھپائے چھپ نہیں سکتے جیسا کہ ڈریپر کہتا ہے۔

"مجھے اس منظم انداز حقیقت پوشی پر اظہار افسوس کرنا ہے، جس طرح یورپ کے لٹریچر نے کوشش کی ہے کہ علم و حکمت کے باب میں ہم مسلمانوں کے جسقدر ممنون احسان ہیں اسے نظروں سے اوجھل رکھا جائے، مگر ان حقائق کو زیادہ عرصہ تک نہیں چھپایا جا سکتا..... مسلمانوں نے یورپ پر اپنے علمی احسانات کے دیرپا نشانات چھوڑے ہیں اور وہ وقت دور نہیں کہ دنیائے مسیحیت کو ان کا اعتراف کرنا پڑے گا"[1]

اسی "منظم انداز حقیقت پوشی" کی طرف، جس کا ڈریپر نے شکوہ کیا ہے، مشہور مور

---

[1] Draper: History of Intellectual Development of Europe vol. II, P. 42.

ریاضیات کاجوری نے اشارہ کیا ہے۔

"پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ عربوں (مسلمانوں) نے ریاضیات میں کوئی اضافہ نہیں کیا، لیکن حالیہ تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ انھیں اور یجنل نظریات کا شرف ملنا چاہئے جو اس سے پہلے بعد کے لوگوں (اہل یورپ) کی دریافت سمجھے جاتے تھے"

یہاں بھی ہم کاجوری کے اس اجمالی تبصرے کا سہارا نہیں لیتے۔ بلکہ قدیم اور جدید دریافتوں کا تقابلی مطالعہ اس دعوے کا شاہد عدل ہے۔ مثلاً علم المثلثات الکرویہ کا یہ اہم مسئلہ کہ۔

$$\frac{\sin A}{\sin a} = \frac{\sin B}{\sin b} = \frac{\sin C}{\sin c}$$

آج انگریز ریاضی دان نیپر کی دریافت سمجھا جاتا ہے، اور اس کے نام پر Napier. Analogy کہلاتا ہے۔ مگر ابوریحان البیرونی نے اپنے رسالہ "مقالید علم الہیئۃ" میں اور نیپر سے تین سو سال قبل محقق طوسی نے "شکل القطاع" میں تصریح کی ہے کہ یہ ابونصر عراق (المتوفی ۴۰۶ھ مطابق ۱۰۱۶ء) یا ابوالوفا البوزجانی (المتوفی ۳۸۶ھ مطابق ۹۹۶ء) کی دریافت ہے۔

اصل دعاویہ ان نسب
جیوب اضلاع المثلثات
الحادثۃ من تقاطع القسی
العظام فی سطح الکرۃ
کنسب جیوب الزوایا
الموترۃ بھا......

اس شکل کا اصل دعویٰ یہ ہے کہ سطح
کرہ میں دوائر عظام کی قوسوں کے
تقاطع سے جو (کروی) مثلثات پیدا
ہوتے ہیں، ان کے (قوسی) اضلاع
کی جیوب اور ان اضلاع کے سامنے
والے زاویوں کی جیوب متناسب ہوتی ہیں

Cajori, F. History of Mathematics, P.112 ؎

وابتدأت بطرق الامیر ابی
نصر علی بن عراق فان الغالب
علی ظن ابی الریحان انه السابق
الی الظفر باستعمال هذا القانون
فی جمیع المواضع وان کان کل
واحد من الفاضلین ابی
الوفاء محمد بن محمد البوزجانی
وابی محمود حامد بن الخضر
الخجندی ادعیا السبق
ایضاً فیه" (شکل القطاع
للمحقق الطوسی، مقالہ خامسہ
فصل خامس۔ ص ۱۰۰)

[مثلاً اگر کرہ پر ایک کروی مثلث
ا ب ج ہو تو
جیب قوس ب ج / جیب زاویہ ب ا ج = جیب قوس ا ج / جیب زاویہ ا ب ج = جیب قوس ا ب / جیب زاویہ ا ج ب]
میں نے اس توضیح میں امیر ابو نصر علی بن عراق
کے طریقوں سے ابتدا کی ہے کیونکہ ابو ریحان
بیرونی کا غالب گمان یہ ہے کہ تمام
ضروری مسائل میں اس ضابطہ کو
استعمال کرنے کی دریافت کا سہرا
اُسی (ابو نصر بن عراق) کے سر ہے،
اگرچہ دوسرے دو فاضل ابو الوفا
محمد بن محمد بوزجانی اور ابو محمود حامد بن
خضر خجندی بھی اس ضابطہ کی دریافت
میں سابقت کے مدعی ہیں،

مگر جب نیپر (Napier) نے اپنی کتاب (Analogies) ۱۸۱۵ء
میں شائع کی تو اسے اپنی طرف منسوب کر لیا۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا آرٹیکل نویس
Napier اُس کے تذکرہ میں لکھتا ہے۔

Napier ....(1550-1617) ..... is also credited with certain Trignometrical relations—Napies" (Encyc. Brit. Vol. 15, P. 1175)

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

اس طرح اُصول اقلیدس کے مصادرہ توازی خطوط (Parallel Postulate) کا بدل کہ

"دو متقاطع خطوط مستقیم ایک ہی خط مستقیم کے متوازی نہیں ہو سکتے"

چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی مسیحی) میں ابن الہیثم نے دریافت کیا تھا چنانچہ محقق طوسی نے "الرسالۃ الشافیہ" میں لکھا ہے،

اما المقدمۃ التی زعم انھا	دو مقدمہ (مصادرہ) جسے اُس (ابن الہیثم)
ابین عند الحس واوقع فی	نے گمان کیا ہے کہ وہ اقلیدس کے پانچویں
النفس من ھذہ المصادرۃ	(یا بارہویں) مصادرے کے مقابلے میں حس کے
واستعملھا فی المواضع التی	نزدیک زیادہ واضح اور ذہن میں جلدی
یحتاج فیھا الی تلک المصادرۃ	اُتر جانے والا ہے اور جسے اُس نے اُن
بدلا عنھا فھی ان الخطین المستقیمین	مقامات میں، جن کا ثبوت اقلیدس کے
المتقاطعین لا یمکن ان	بیان کئے ہوئے مصادرہ (توازی خطوط)
یوازیا خطاً واحداً مستقیماً"	کا محتاج تھا، اقلیدس کے مصادرہ
(الرسالۃ الشافیہ مشمول رسائل طوسی	کے بجائے استعمال کیا ہے وہ حسب ذیل ہے:
جلد دوم صفحہ ۵)	دو متقاطع خطوط مستقیم ایک ہی خط مستقیم
	کے متوازی نہیں ہو سکتے۔

مگر بعد میں انگریز ریاضی دان پلے فیر نے اسے ہتھیا لیا اور جب ۱۷۹۵ء میں اقلیدس کا نیا ایڈیشن شائع کیا تو اسے اپنی طرف منسوب کر لیا۔

A new axiom is introduced in the room of Theolk for the purpose of demonstrating more easily some of the properties of paeallel lines.

یہ نیا علوم متعارف پلے فیر کے اپنے لفظوں میں حسب ذیل تھا۔

Two st. Lines which Intersect one another can not be parallel to the same st. Line."

اور پھر اس کے ہم وطنوں کے تعصب نے اس پر مہر توثیق ثبت کر دی، چنانچہ کے لے (Calay) جیسے سنجیدہ اور ذمہ دار ریاضی داں نے بھی ۱۹۳۲ء میں برٹش ایسوسی ایشن کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"My own view is that Euclids Lwelfth axion in play Fair's Form of it does not need demonstration, but is part of our notion of Space, of physical Space of our experience."

اسی طرح مثلث کے رقبہ کا ضابطہ ($ABC = S(S-a)(S-B)(S-C$ where $S = \frac{a+b+c}{2}$ جس نے مردوں کے کام کو بازیچۂ اطفال بنا دیا ہے۔ بو موسیٰ (زمانہ تیسری صدی ہجری یا نویں صدی مسیحی کا وسط) کی دریافت ہے۔ جیسا کہ انھوں نے اپنی تصنیف "معرفۃ مساحۃ الاشکال البسیطۃ والکرویۃ" میں بیان کیا ہے۔

کل مثلث اذا ضرب نصف جمیع اضلاعہ علی کل ضلع من

اگر کسی مثلث میں اُس کے اضلاع کے مجموعے کے نصف کو اُس نصف اور

"اضلاعہ بان یضرب فی نصف
علی احد اضلاعہ ثم فی ثانیہا
ثم فی ثالثہا کان الحاصل مساویاً
لضرب تکسیرہ فی نفسہ"
(مساحۃ الاشکال مشمولہ رسائل طوسی
جلد ثانی۔ صفحہ ۹)

ترجمہ

ایک ضلع کے فرق کے ساتھ ضرب دیا
جائے اور پھر۔۔۔ حاصل ضرب کو
اس نصف اور دوسرے ضلع کے فرق میں
ضرب دیا جائے تو پھر اس نئے حاصل
ضرب کو اس نصف اور تیسرے ضلع کے فرق میں
ضرب دیا جائے آخری حاصل ضرب مثلث کے رقبہ کے"

اور اس باب کی تخصیص کہ یہ ضابطہ خود بنو موسیٰ کی اپنی دریافت ہے، انھوں نے کتاب کے آخر میں کر دی ہے:۔

"وکل ما وصفنا فی کتابنا
فانہ من عملنا"
(کتاب بالا صفحہ ۲۵)

اور جو کچھ ہم نے اپنی کتاب میں بیان
کیا ہے، وہ ہماری ہی دریافت ہے
(سوائے دائرہ کے قطر اور محیط کی
نسبت اور دو مقداروں کے درمیان
دو اور مقداروں کی دریافت کے کہ چاروں
نسبت متوالیہ میں ہوں)

مگر ہمارے "محققین" نے اس دریافت کو ایرن (Heron) کے کھاتے میں ڈال دیا کہ کہیں اسکا شرف سبقت اس کے حقدار مگر مسلمان دریافت کنندہ کو نہ پہونچ جائے، حالانکہ بنو موسیٰ کی اس کتاب کا لاطینی ترجمہ جسے جیرارڈ آف کریمونا نے کیا تھا، ان "محققین" کے سامنے تھا۔

یہ محض منظم انداز حقیقت پوشی نہیں ہے، بلکہ کھلا ہوا علمی ڈاکہ ہے۔

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

اقبال کا فکری ارتقا

پر

تعاقب و تصحیح اور اقبال کی ابن سینا کے مزعومہ فلسفۂ عشق کی تشریح

از جناب مولانا عبد السّلام خان رام پوری، سابق پرنسپل مدرسۂ عالیہ رام پور

(۲)

شیخ اور جمادات، نباتات وحیوانات کا عشق رسالۂ عشق کی پہلی فصل میں شیخ نے ثابت کیا ہے کہ حقائق مدبرہ یا نفوسِ ارضی کی ہستی عشق کا کرشمہ ہے، اور خود واجب تعالےٰ بھی عشق سے الگ نہیں، وہاں عاشق، معشوق، عشق اور وجود سب ایک ہی ذات کے مختلف نام ہیں۔ اس فصل کے ضروری اور متعلق اقتباسات میں پہلے نقل کر چکا ہوں۔ دوسری فصل بے جان اور بے ترکیب چیزوں میں عشق کے وظیفے اور عمل سے متعلق ہے، تیسری اور چوتھی فصل میں نباتات وحیوانات میں عشق کے وظیفے اور عمل بیان کئے ہیں، چھٹی فصل انسانی اور ملکوتی عشق کی غرض و غایت اور ساتویں عام موجودات میں اس کی غرض و غایت کی تفصیل ہے،

بے جان اور بے ترکیب چیزوں کی شیخ نے تین قسمیں بیان کی ہیں، ابتدائی مادہ، صورت اور عرض، شیخ کے نزدیک مفرد جسم کی ساخت صرف دو جزوں کی ترکیب کی مرہون ہے؛

عرض جسم کی ساخت سے خارج ہے جب کہ صورت اس کی ساخت کا ضروری جز ہے، عرض اور صورت کا یہی بنیادی فرق ہے، جس کی وجہ سے صورت جسم کا اندرونی جوہر ہے، اور عرض جسم کی بیرونی خصوصیت، مثلاً برقیوں کی خاص خاص تعدادوں اور ان کے خاص خاص نوائی (مرکزی) وزنوں سے ذرات کی صورت نمایاں ہوتی ہے، مادہ برقیہ نہیں رہتا ذرہ ہو جاتا ہے، خاص خاص ذروں کے ترکیب پاتے ہی عنصر کی صورت نمودار ہو جاتی ہے، مادہ اب ذرہ نہیں عنصر ہے، یکساں عناصر سے مفرد[1] اجسام کی صورت پیدا ہوتی ہے، مادہ اب عنصر نہیں جسم کہلاتا ہے، ان مفرد جسموں کے اختلاط سے مرکب اجسام، حیوانات اور نباتات وغیرہ صورت پذیر ہوتے ہیں، اب یہ مفرد جسم نہیں بلکہ حیوان، نبات وغیرہ ہیں، ان سب صورتوں کی تہ میں جو مشترک، بے صورت اور بے خصوصیت شے ہے، اور اپنے اس تجریدی انداز میں استعداد ہی استعداد ہے، اور محض عقلی وجود رکھتی ہے، ابتدائی مادہ یا ہیولیٰ اولیٰ ہے اور نوع بہ نوع اجسام میں اس کی مشترک جسمیت، جوہری صورت یا صورت جسمیہ ہے، یہ دونوں جسم کے ترکیبی اور داخلی جزء ہیں۔

کپڑا مثلاً گرم ہونے پر بھی کپڑا کہلاتا ہے، اور ٹھنڈا ہونے پر بھی، سیاہ ہو تو بھی اور سپید ہو تو بھی، ہلکا ہو یا بھاری، باریک ہو یا موٹا، چھوٹا ہو یا بڑا، چوکور ہو یا تکونا، غرض سب طرح کپڑا ہی رہتا ہے، ان جیسی حالتوں کو عرض کہا جاتا ہے،[2] عرضوں کے اختلاف و اجتماع سے چیز کی نوعیت نہیں بدلتی۔ اپنی ہستی میں مادہ عرض کا حاجت مند نہیں، مگر عرض بغیر مادہ میں سمائے نہیں پایا جا سکتا، تاہم جسم کا ترکیبی اور داخلی جز نہیں محض جسم کی ظاہری حصہ ہے اور جسم کا محتاج۔ بے ترکیب اور بے جان چیزوں کی یہ تینوں قسمیں عشق و شوق سے خالی نہ

البسائط الغیر الحیۃ علی ثلثۃ   بے ترکیب اور بے حیات چیزوں کی

---

[1] یونانی فلسفہ کی اصطلاح ہے یعنی بسیط اور متشابہ مادہ رکھنے والے اجسام۔ مقاصد الفلاسفہ از غزالی، الٰہیات ص ۱۰۱
[2] Essential of Physical Chemistry 152-156

اقسام: احدها العیوفی الحقیقیۃ والثانی الصور التی لایمکن لھا القیام بالانفراد بذاتھا والثالث الاعراض...... فنقول ان کل واحد من ھذہ الھویات البسیطۃ الغیر الحیۃ قرینۃ عشق غریزی لایخلو عنہ البتۃ وھو سبب لہ

تین قسمیں ہیں، ایک اور حقیقی دوم صورت کہ تنہا اور بذات خود جس کا موجود ہونا ممکن نہیں، سوم اعراض ...... چنانچہ ان بے ترکیب اور بے حیات حقیقتوں میں سے ہر ایک طبیعی عشق سے قریب ہے، قطعاً اس سے خالی نہیں؛ یہی باعث ہے انکے وجود کا،

نباتات

نباتات میں عشق سے متعلق فصل میں کہا ہے؛

العشق الخاص بالقوۃ النباتیۃ علیٰ اقسام ثلثۃ احدھا یختص بالقوۃ المغذیۃ وھو مبدء شوقہ الی حضور الغذاء عند حاجۃ المادۃ الیہ ولقائہ فی المغتذی بعد استحالتہ الیٰ طبیعتہ والثانی یختص بالقوۃ المنمیۃ وھو مبدء

نباتاتی قوت (نفس) کے عشق کی تین قسمیں ہیں؛ ایک قوت تغذیہ سے متعلق ہے؛ مادے کی غذائی ضرورت پر حصول غذا کے شوق کا سبب اور ساخت میں اسی جیسی ہوجانے کے بعد اس غذا کے پیوست ہونے کا باعث یہی قوت ہے، دوسری بالیدگی عطا کرنے والی قوت سے مخصوص ہے، یہ جسم کے شوق نمو کی علت ہے اور تیسری قوت تولید

ﻠﻪ رسالہ فی العشق، صہ

شوقہ الی تحصیل الزیادۃ	متعلق ہے۔ یہ خود بینی سے خود بینی
المتناسبۃ فی اقطار المتغذی	کی آزمائش کے شوق کی محرک ہے۔
والثالث یختص بالقوۃ المولدۃ	
وھو مبدء شوقہ الی تھیئۃ	
مبدء کائن مثل الذی ھو منہ[1]	

نفسِ حیوانی میں تغذیہ، نماد تولید کی قوتوں کے ساتھ دو مزید قوتیں ہیں؛ قوتِ تحریک اور قوتِ ادراک، اور ان دونوں قوتوں اور ان کی تحتانی قسموں کے وظائفِ عمل کا باعث عشق ہے؛

لاشک ان کل واحد من	لاریب، قوائے حیوانی میں ہر قوت
القوی الحیوانیۃ یختص	کا خاص وظیفہ ہے جس پر اس کو طبیعی
تبصرف یحثھا علیہ عشق	عشق انگیز کرتا ہے ورنہ حیوانی بدن
غریزی والا لما کان وجودھا	میں انکا وجود محض بیکار بدن میں
فی البدن الحیوانی الامعدودۃ	شمار ہوتا....... اور یہ ان
فی جملۃ المعطلات.	(قوتوں) کی ہر قسم میں ظاہر ہے۔
.... وذٰلک ظاہر فی کل	
واحد من اقسامھا۔[2]	

غرض یہ کہ وجود حقیقی ہو یا دہمی اس کی بنیاد عشق ہے؛ مادہ صورت پر تھما ہوا ہے، صورت کا نقش مادے میں ابھرتا ہے، عرض کو معروض و محل کی ضرورت ہے،

---

[1] رسالۃ فی العشق، ص ۷، ۸ [2] ایضاً ص ۸

یہ عشق کی تحریک ہے جو ہر ایک کو اس کی وجودی ضرورت سے ہمکنار کر رہی اور رکھتی ہے، مفرد طبیعی اجسام کے ذرات سے اور مرکب کی اجزاء سے ترکیب اور اس کا استمرار عشق کا وظیفہ ہے، مزاج یا متناسب ترکیبی کیفیت عشق کا عمل ہے، نباتات میں تغذیہ، نمو اور تولید، حیوانات میں تحریک و ادراک اور انسان میں عملی اور فکری تعقل عشق کی کارفرمائیاں ہیں، اجرام سماویہ کی دوری حرکتیں عشق کی تاثیر ہیں۔

اس عشق کا حقیقی اور آخری معشوق کون ہے، مختلف موجودات میں اس تاثیر کے اثرات میں فرق اور تفاوت کیوں ہے، اس عشق کا مقصد اور غایت کیا ہے؟ شیخ کہتا ہے۔

فاذاً العلة الاولیٰ خیر مطلق	چنانچہ علتِ اولیٰ (واجب تعالےٰ)
من جمیع الوجوہ وقد کان	ہر لحاظ سے خیر مطلق ہے اور یہ واضح
اتضح ان من ادرک خیراً	ہو چکا ہے کہ جو خیر کو پالیتا ہے وہ طبیعةً
فانہ بطباعہ یعشقہ[1]	اُس سے عشق کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر موجود کو خیر مطلق سے طبعی عشق ہے اور خیر مطلق ہر موجود کا فطری محبوب ہے[2]

کل واحد من الموجودات	ہر موجود خیر مطلق سے طبیعةً
یعشق الخیر المطلق عشقاً	عشق رکھتا ہے۔
غریزیاً۔[2]	

مختلف موجودات میں اس عشق کے اثرات کے اختلاف کی وجہ نہ خیر مطلق کی ذات ہے نہ اس کی تاثیر کا اختلاف اور نہ مختلف موجودات سے اس کے تأثر کا نتیجہ[3]، اسکا فیض اور تجلی تو سب کے لئے یکساں ہے، وہ کسی سے متاثر نہیں ہوتا، قصور قابل اور مستفید کا ہے[4]

---

[1] رسالہ فی العشق ص ۹ مخطوطہ ابوالکلام لائبریری علیگڑھ فصل ششم [2] ایضاً فصل ہفتم [3] ایضاً

ان الخیر المطلق تجلی لعشاقہ	خیر مطلق تو اپنے عاشقوں پر جلوہ
الا ان قبولہا لتجلیہ و	فگن ہے، مگر اس کے جلوے قبول کرنے
اتصالہا بہ علی التفاوت	اور اس سے تعلق رکھنے میں فرق
۔ ۔ ۔ ۔ ولاجل قصور بعض	ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بعض حقیقتوں کے
الذوات عن قبول تجلیہا	اس کی تجلی قبول کرنے سے قاصر ہے
یحتجب۔ ان العقل الفعال	پر وہ محجوب رہتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
یقبل التجلی بغیر توسط۔ ۔	عقل فعال اس کی تجلی بلا واسطہ
۔ ۔ ۔ ثم ینالہ النفوس	قبول کرتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے
الذاتیۃ بلا توسط ایضاً	بعد حصول کی حد تک مقربین ذات
عند النیل ۔ ۔ ۔ ثم تنالہ	بھی بلا واسطہ ہی قبول کرتے ہیں اکے
القوۃ الحیوانیۃ ثم النباتیۃ	بعد قوت حیوانی پھر قوت نباتی اسکے
ثم الطبیعیۃ [1]	بعد طبیعت جسمی ۔

موجودات میں اس فطری اور طبیعی عشق و شوق کی غایت اور مقصد بقدر صلاحیت خیر مطلق یعنی واجب تعالےٰ سے زیادہ سے زیادہ مشابہت اور مماثلت حاصل کرنی ہے اور یہی اُس سے تقرب ہے۔

وکل واحد ممانیالہ یشوقہ	اُس کے (یعنی خیر مطلق کے) فیوضات
مانالہ منہ الی التشبہ بہا قدر	ہر فیض یافتہ کو بقدر صلاحیت اُس
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ والجواہر الحیوانیۃ	جیسا بننے کا شائق کر دیتے ہیں، حیوانات

---

[1] ایضاً فصل ہفتم ص۲ حصول تجلی بلا واسطہ ہے لیکن ان کے استعداد محض سے نکل کر موجود ہونے میں تجلی کو حاصل کرنے اسکو محفوظ رکھنے میں عقل فعال کی اعانت ہے اور وہی واسطہ ہے ایضاً

والمنباتية انما يفعل افاعيلها	و نباتات سے جو خاص افعال صادر
الخاصة بها تشبها به في	ہوتے ہیں اسی لحاظ سے ہوتے ہیں کہ اپنے
غاياتها .... والنفوس الانسانية	مقصد میں وہ انھیں اس جیسا کر دیں،
الملكية تحرك تحريكاتها و تفعل	نفوس ملکوتی کی تحریکیں اور اعمال بھی
افاعيلها تشبهاً به ايضاً[1]	اس جیسا ہونے کے لیے ہوتے ہیں۔

تشبیہا ور مماثلت ان اعمال اور وظائف کے سبب اور علت یعنی حرکت میں تو ممکن ہی نہیں، وہ ذات ہر قسم کی حرکت سے پرے ہے، محض مقاصد اور غایات کی حد تک ہی تشبیہ ممکن ہے، شخصی یا نوعی بقا، اظہارِ طاقت وغیرہ ان اعمال کے مقاصد ہیں اور ان میں اُس جیسا ہونا مقصد بن سکتا ہے۔[2]

شیخ ابوعلی ابن سینا کے فلسفۂ عشق وشوق کی یہ تلخیص ہے، اور اس کے رسالۂ عشق سے ماخوذ۔ یہ تنہا اُس کی فکر نہیں عام مسلم فلاسفہ بھی شیخ کے ہم زبان ہیں۔

اقبال کی تلخیص و تشریح | اقبال نے شیخ کے خیالات کو جس طرح پیش کیا ہے اُس میں شیخ کی ترجمانی سے زیادہ اپنی ترجمانی ہے "عشق کی قوت میں ارتکاز و توحد کا میلان، مزاج کا حیوانات میں نشو و نما پانا خود شعوری کا انسانی خصوصیت ہونا، شیخ کی تشریح سے انھیں کوئی واسطہ نہیں یہ اقبال کی اپنی ذاتی رائیں ہیں، بہر حال اقبال کی تشریح و تلخیص یہ ہے: "غیر متقوم (بے صورت) مادہ جو بذات خود بے جان ہے، عشق کے اندرونی زور سے نوع بنوع صورتیں قبول کرتا ہے، بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں، اس کو بنایا ہی گیا ہے کہ وہ انھیں قبول کرے اور میزانِ حسن میں بلند و بلند تر ابھرتا رہے، طبیعیاتی سطح پر اس احساسی قوت کے عمل کو اس طرح واضح

---

[1] رسالۃ فی العشق، مخطوطہ علیگڑھ، فصل ہفتم [2] ایضاً

کیا جاسکتا ہے!

(۱) غیر ذی حیات چیزیں صورت، مادّے اور وصف (عرض؟) کا امتزاج ہیں (اور ذی حیات؟) اس پُر اسرار قوت کے عمل سے وصف اپنے موضوع یا محل سے پیوست رہتا ہے اور صورت غیر منقوم مادے کو اپنی آغوش میں سمالیتی ہے، یہ مادہ عشق کی عظیم قوت کے زور سے صورت بصورت ترقی کرتا رہتا ہے۔

(۲) عشق کی قوت کا میلان خود ارتکازی کی طرف ہے، عالم نباتات میں یہ توحد اور مرکزیت کا بلند تر درجہ حاصل کرلیتی ہے، اگرچہ نفس (نباتی) میں اس وحدت عمل کی ابھی تک کمی رہتی ہے، جس کی بعد میں تکمیل ہوتی ہے۔ نفس نباتی کے وظائف ہیں:- [تغذیہ ب نمو ج تولید مثل۔ یہ وظائف عشق کے گوناگون مظاہر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ تغذیہ خارج کو داخل میں جذب اور تبدیل کرنا ہے۔ نموحصص میں زیادہ سے زیادہ توافق پیدا کرنے کا شوق ہے، تولید کا مطلب ہے نوع کا استمرار، جو عشق وشوق کا ہی دوسرا رخ ہے۔

(۳) عالم حیوانات میں عشق کی قوت کے مختلف وظائف اب زیادہ وحدانیت لیے ہوئے ہیں، نباتاتی جبلت یعنی مختلف الجہات عمل کو یہ قائم رکھتا ہے لیکن اس مین مزاج کا بھی نشوونما ہے جو زیادہ وحدانی عمل کی طرف ایک قدم ہے۔ انسان میں یگانگی کی طرف یہ جھکاؤ خود شعوری میں اپنا اظہار کرتا ہے۔ فطری یا خلقی عشق کی یہی قوت انسان سے عالی تر موجودات کی حیات میں کارفرما ہے، ہر شے محبوب اول؛ حسن ازلی کی طرف رواں ہے،[1] چیز کی قدر وقیمت اس اساسی اصول سے قرب وبعد کی بنا پر مقرر ہوتی ہے شیخ کے بیانات اور اقبال کی تشریح کے مقابلے سے دونوں کا فرق بالکل واضح ہے،

---

[1] فارسی میں مابعد الطبیعیات کا نشوونما، ص ۳۳

میں زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔

اقبال کی شیخ کے فلسفۂ روح و نفس کی تلخیص "طبیب کی حیثیت سے ابن سینا کو نفس کی حقیقت سے خاص دلچسپی ہے مزید براں مسئلہ تناسخ اس کے زمانے میں برابر شہرت پکڑتا جا رہا تھا، چنانچہ نفس کی حقیقت پر وہ ایسے زاویہ نظر سے بحث کرتا ہے کہ نظریۂ تناسخ کی غلطی واضح ہو جائے وہ کہتا ہے "نفس کی (عام) تعریف دشوار ہے، کیونکہ موجودات کی الگ الگ قسموں میں اس سے الگ الگ قوتوں اور الگ الگ میلانوں کا ظہور ہوتا ہے، نفس کی ان الگ الگ قوتوں کے متعلق اس کی رائے یہ ہے"۔

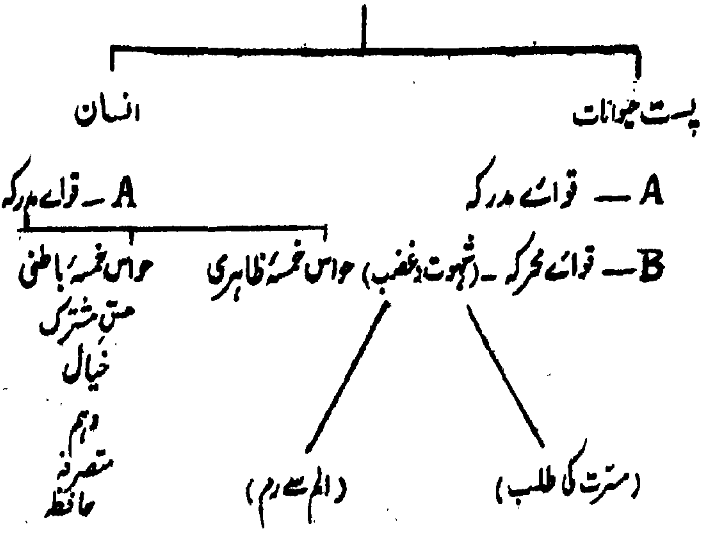
(۱) بے شعور عامل کی حیثیت میں:۔

ا ـــ چند جہتی عامل ۔ نفس نباتی :۔ تغذیہ، نما و تولید مثل

ب ـــ یک جہتی عامل اور عمل کی یکسانی کی ضمانت ـــ (؟) :۔ مزاج کا نشوونما[1]

(۲) باشعور عامل کی حیثیت میں :۔

ا ـــ کثیر الغایات ـــ نفس حیوانی



[1] اصل کا مسودہ دورہ کی شق ا ی و قسموں لکھو میں پوری واضح نہیں ہو سکا ہوں۔

نفس جسکی پانچوں باطنی حسّیں جن کی یہ تشکیل کرتے ہیں،
انسان میں نامی تعقل کی صورت میں اپنا اظہار کرتا ہے،
اور انسانی تعقل سے ملکوتی اور پیغمبرانہ تعقل میں ترقی کرجاتا ہے۔

B۔ قوائے محرکہ ۔ ارادہ
ب۔ وحدانی الغایۃ ــــ نفس فلکی ۔ افلاک کی یکساں، دائم اور دوری حرکت کا محرک[1]"

نفس کی تعریف اور تقسیم قدیم طبیعیات کی عام بحث ہے، اسمیں شیخ کے طبیب ہونے کو کتنا دخل ہے، معلوم نہیں تناسخ کے باطل ہونے کی بنیاد یہ ہے کہ نفس بدن کے ساتھ پیدا ہوتا ہے پہلے سے موجود نہیں کہ نئے بدنوں کے پیدا ہونے پر اُن سے متعلق ہوتا ہے۔ یونانی فلسفیوں میں فیثاغورس اور افلاطون جیسے لوگ تناسخ یا انتقال روح کے قائل تھے، ارسطو بدن کی پیدائش کے ساتھ روح یا نفس ناطقہ کی پیدائش مانتا تھا، اس لئے اس کے نزدیک تناسخ کا تصور محض تمسخر تھا[2]، علاوہ ازیں تناسخ کا عقیدہ اسلامی عقیدۂ جزا و سزا کے منافی ہے چنانچہ مسلم فلاسفہ کے لئے تناسخ کا ابطال یونانی فلسفے کا ورثہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی عقیدے کی حمایت بھی ہے، بظاہر اس مسئلے سے شیخ کے تعرض کرنے کی یہی عام وجہ ہے۔ رہا یہ کہ شیخ کے زمانے میں مسئلہ تناسخ شہرت پکڑتا جارہا تھا، مجھے اسکی سند نہیں ملی۔

اقبال نے شیخ کے حوالے سے کہا ہے کہ "نفس کی تعریف دشوار ہے" معلوم نہیں اقبال نے شیخ کا یہ قول کہاں سے نقل کیا ہے۔ حالانکہ شیخ نے اپنے رسالے علم النفس میں جو بقول خود اقبال کا ماخذ ہے، پہلے نفس کی عام تعریف ہی کی ہے جو سماوی اور ارضی دونوں قسم کے نفوس کو شامل ہے، اور کہدیا ہے کہ یہ نفس کی اس کے جنسی معنی کے لحاظ سے

۱۹۲

[1] فارسی میں مابعد الطبیعیات کا ارتقا ص ۳۳ ـ ۳۵ [2] تاریخ فلسفۂ مغرب از برٹرانڈرسل ص ۱۰۰ ـ ۱۴۶

تقسیم ہے، یعنی اس کی تمام مختلف الحقیقۃ نوعوں کو شامل ہے۔

فالنفس کمال اول لجسم	چنانچہ نفس جسم کا سب سے پہلا[۲]
فالاجسام منہا ماھی صناعیۃ	کمال ہے۔ اجسام میں کچھ صنعتی
ومنہا ھی طبیعۃ والنفس لیس	اجسام ہیں اور کچھ طبیعی ہیں اور نفس
بکمال جسم صناعی	صنعتی اجسام کا کمال نہیں، وہ
فھی کمال اول لجسم طبیعی،	طبیعی اجسام کا سب سے پہلا کمال
والاجسام الطبیعیۃ منہا	ہے، طبیعی اجسام میں سے کچھ اپنے
ما تفعل افاعیلہا بالآلات	افعال آلات (وسائل) کے ذریعے
ومنہا مالا تفعل افاعیلہا	سے انجام دیتے ہیں، اور کچھ اپنے
بآلات کالاجسام البسیطۃ	افعال آلات سے انجام نہیں دیتے،
والفاعلۃ بغلبۃ القوی	مثلاً بے ترکیب جسم کہ جو بے ترکیب
البسیطۃ	قوتوں کے غلبے کی وجہ سے سرگرم
فاذن قد قسمنا النفس	عمل ہیں ...... اب ہم نے
الجنسیۃ وحددناھا	نفس کے جنسی معنی کی تقسیم و تحدید
وذالک ما اردنا بیانہ[۱]	(تعریف) کر دی اور یہی چاہا تھا،

ممکن ہے کہ شیخ کی "اشارات" سے اقبال کو دھوکا لگا ہو، اشارات میں شیخ نے نفس کی بحث کا آغاز اس کی ارضی اور سماوی تقسیم سے کیا ہے، اور آگے فصلوں میں نفس کی

---

[۱] کتاب فی النفس بو علی ابن سینا ص ۲۶ [۲] کمال اول جوہری صورت یا شے کی ذاتی خصوصیت کا نام ہے جو اس کو مستقل نوعی حقیقت بناتی ہے شرح اشارات طوسی جلد ۲ ص ۱۱۱

قوتوں کی تو تفصیل ہے، نفس کی اپنی عام تعریف یا نباتی، حیوانی، انسانی اور سماوی نفسوں کی الگ الگ تعریفیں نہیں[1]، اور بظاہر نفس سے متعلق اقبال کا خاص ماخذ شیخ کی اشارات ہی ہے۔

اشارات میں نفس کی مرتب اور منضبط بحث نہیں، اگر اس تلخیص کا اشارات ماخذ ہے تو نفس کی قوتوں کی ترتیب اقبال کو دینی پڑی، اور ان کے اپنے متعلقہ نفوس سے ان کو متعلق کرنا پڑا اور اس میں خاصا التباس ہو گیا ہے۔

اقبال نے نفس کی حقیقتہً پانچ قسمیں کی ہیں، اور غالباً نفسوں کو چار پر محدود رکھنے کے لیے نفسِ انسانی کو جو نفس کی سب سے اعلیٰ و ارفع قسم ہے، نفسِ حیوانی میں شامل کر دیا ہے، نفسِ انسانی کی قوتوں کو محرکہ اور مدرکہ میں تقسیم کیا ہے، حالانکہ شیخ اور دوسرے فلاسفہ کے نزدیک یہ نفسِ حیوانی کی قوتیں ہیں، اور انسان میں نفسِ حیوانی کے واسطے سے آئی ہیں، یا اس وجہ سے ہیں کہ ہر نفس بالا، نفسِ زیریں کی قوتوں کو شامل ہے، انسانی نفس یا نفسِ ناطقہ کی مخصوص دو قوتیں فکری اور عملی تعقل ہیں۔

بے شعور عامل کی حیثیت سے نفس کی دوسری قسم؛ یک جہتی عامل نفس کی کونسی قسم ہے، شیخ اس قسم سے واقف نہیں، خود اقبال نے بھی اس کا کوئی نام نہیں رکھا، ہاں مزاج کے نشوونما کو اس کا عمل قرار دیا ہے، لیکن مزاج کا نشوونما نفس کا وظیفہ نہیں، مزاج عناصر کے اختلاط اور ان کی صورتوں اور کیفیتوں کے کسر و انکسار سے پیدا ہوتا ہے، اور ترکیبی صورت سے باقی اور قائم رہتا ہے، صورت ترکیبی کا بانفس ہونا ضروری نہیں، چنانچہ معدنی صورت مزاج کے تحفظ کی ضامن ہے، لیکن بانفس نہیں، بانفوس ترکیبوں میں مزاج کا تحفظ اور اس کی بقا ضرور نفس کا وظیفہ ہے، لیکن نشوونما تو وہ نفوس سے پہلے ہو چکتی ہے، کیونکہ اپنی ذاتی استعداد و ان کے

---

[1] اشارات نمط سوم

مطابق ہی تو وہ نفوس پر فائز ہوتا ہے۔[1] اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نفوس سے مقدم ہے۔

سہولتِ مقابلہ کے لیے میں شیخ کی تقسیمِ نفس اور اس کے مطابق نفس کی قسمیں شیخ کے اپنے رسالے "فی النفس" سے پیش کئے دیتا ہوں۔ یہ اقسام اور تقسیم شیخ کی دوسری کتابوں نجاۃ، حکمتِ علائیہ اور شفاء کے عین مطابق ہے۔ اس تقسیم میں نفسِ فلکی شامل نہیں ہے صرف نفسِ ارضی کی یہ تقسیم ہے، نفسِ فلکی کے اضافے سے چار نفسوں کا شمار پورا ہو جائے گا۔

الاقسام الاول للنفس نفس کی ابتدائی قسمیں

- نفس
  - قوت نباتی یا نفسِ نباتی
    - تغذیہ
    - نمو
    - تولید
  - قوت حیوانی یا نفسِ حیوانی
    - مدرکہ
      - حواس ظاہری
      - حواس باطنی
    - محرکہ
      - شہوت
      - غضب
  - قوت نطقی یا نفس ناطقہ
    - عقلِ نظری
    - عقلِ عملی

شیخ کے نزدیک نفسِ انسانی کی خصوصیات اور اقبال: اقبال نے اگرچہ نفسِ ناطقہ یا نفسِ انسانی کی تخصیص نہیں کی ہے، لیکن جو خصوصیتیں لکھی ہیں وہ انسانی نفس سے ہی متعلق ہیں اقبال[2] نے بقولِ خود یہ تلخیص شیخ کے رسالے "فی النفس" سے کی ہے۔[3] اپنے رسالہ نفس میں بو علی سینا نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ نفس کے لئے مادی تکمیلیں ضروری نہیں، یہ نہیں کہ اپنے تصورات و تخیلات کے لئے نفس کو جسمانی آلات یا جسمانی قوت درکار ہو۔ کسی شے کے تصور کے لئے نفس کو کسی طبیعی واسطے کی ضرورت ہوتی تو خود اپنے بدن کے تصور کے لئے بھی دوسرے

---

[1] شرح اشارات از طوسی ص ۱۴۳ ت ۱۵ جلد اول، [2] ایضاً ص ۱۲۵، ۱۲۰ [3] رسالہ نفس ص ۲۴ – ۳۸، ۴۴

بدن کی ضرورت ہوتی چاہیے تھی، مزید براں یہ واقعہ کہ نفس کو خود اپنا شعور بلا واسطہ ہی یعنی اپنا شعور، بذاتِ خود ہے، حتمی طور سے واضح کر دیتا ہے کہ اپنے جوہر کے لحاظ سے نفس ہر قسم کی طبیعی آلودگی سے بالکل پاک ہے۔"

"نظریہ تناسخ مشتمل پیش وجودی کو مستلزم ہے۔ فرض کرو کہ نفس بدن سے پہلے موجود تھا تو واحد تھا یا کثیر، تو ابدان کی کثرت نفوس کی کثرت کی وجہ سے ہوگی، بصورت دیگر اگر واحد تھا تو الف کا جاہل یا عالم ہونا ب کا جاہل یا عالم ہوتا ہے، کیونکہ دونوں میں ایک نفس ہے، اس لئے ان معقولات (وحدت و کثرت؟) کا نفس پر (قبل از وجود بدن؟) اطلاق نہیں ہو سکتا۔"

"بو علی سینا کہتا ہے کہ سچ تو یہ ہے کہ بدن اور نفس ایک دوسرے سے مقارن ضرور ہیں لیکن جوہروں میں متضاد ہیں بدن کا انحلال نفس کے انعدام کو مستلزم نہیں، انحلال یا فساد مرکبات کی خصوصیت ہے نہ کہ بسیط، تقسیم ناپذیر صوری جوہر کی۔ چنانچہ بو علی سینا (بدن سے پہلے نفس کی) پیش وجودی سے انکار کرتا ہے اور قبر سے آگے کی (پس مرگ) بے بدن شعوری حیات کے امکان کو واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"[1]

شیخ کے حوالے سے اقبال کی یہ تلخیص مبہم تو ہے ہی اور مختصر ہونے کے ساتھ ناقص بھی ہے۔ بظاہر شیخ کا نفس پر رسالہ، ہدیۃ الرئیس، اقبال کے پیش نظر نہیں ہے۔ اقبال کی تفصیل میں اس رسالے سے کوئی چیز منقول نہیں معلوم ہوتی، اس تفصیل میں شیخ کی تصانیف یا فلسفۂ قدیم کی دوسری عام کتابوں سے بھی اقبال نے ان کے سیاق و سباق کے ساتھ فائدہ نہیں اٹھایا ہے، اِدھر اُدھر سے ٹکڑے جمع کر کے اپنے طور پر مرتب کر دیے ہیں، شیخ کی

---

[1] فارس میں مابعد الطبیعیات کا نشو و نما ص ۳۵

تصانیف میں "اشارات' ونجاۃ ، اور غزالی کی مقاصد الفلاسفہ ماخذ ہو سکتی ہیں، لیکن یقین کے ساتھ کسی ماخذ کو متعین نہیں کیا جا سکتا۔

تناسخ کے باطل ہونے پر اقبال نے جو دلیل پیش کی ہے، اس کے مقدمات اور کڑے ناقص ہونے کی وجہ سے ناقابل فہم ہوگئی ہے۔ یہ استدلال، نجاۃ' میں بھی ہے اور مقاصد الفلاسفہ میں بھی۔ میں مقاصد سے نقل کئے دیتا ہوں۔ مقاصد میں نسبتاً اختصار ہے، دونوں کتابوں میں یہ استدلال نفس کے بعد از بدن حدوث پر ہے؛

انھا (ای النفس) حادثۃ	نفس جسم کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے،
مع الجسم لانھا لوکانت	کیونکہ جسم سے پہلے اسکا وجود ہو تو یہ
موجودۃ قبل الجسم لکانت	واحد ہوگا یا کثیر۔ کثیر ہو تو باطل ہے'
النفوس اما واحدۃ	کیونکہ کثرت تو عوارض کے اختلاف
واما کثیرۃ، وباطل'	وتغایر سے ہی ہو سکتی ہے، اور جب
ان تکون کثیرۃ، فان	وہ مادے اور عوارض ہی نہیں کہ
الکثرۃ لاتکون الا باختلاف	جن سے اختلاف واقع ہو تو اختلاف
وتغایر بالعوارض، واذا	کا کہاں تصور ہو سکتا ہے، اور
لم تکن مواد وعوارض	واحد ہو تو یہ بھی ناممکن ہے، کیونکہ
یقع بھا الاختلاف، فلا	(کثرت ابدان کی وجہ سے) ہر نون
یتصور الاختلاف	میں تو یہ کثیر ہے ہی، اور حجم و مقدار
وان کانت واحدۃ فھو	کے بغیر (جو جسم کی خاصیتیں ہیں) نہ واحد
محال ایضاً، لانھا فی	کثیر ہو سکتا ہے نہ کثیر واحد کہ

الانهن ان كثيرة، والواحد — (مقداریں) کبھی مل جائیں (اور

لا يصير كثيراً كما لا يصير — ایک مقدار ہوجائے) اور کبھی الگ الگ

الكثير واحداً الا اذا كان[1] — ہوجائیں اور (کئی مقداریں بن جائیں

جسماً ومقداراً فينفصل مرةً — اور اس طرح مقدار کی کثرت پیدا ہوجائے)

وينفصل أخرى۔ — اور بدنوں میں نفوس کی کثرت کی دلیل

ودليل كثرته في الابدان — یہ ہے اگر زید کا معلوم و دانستہ عمرو کا

انّ معلوم زيد ليس — معلوم و دانستہ نہیں اگر (دونوں میں)

معلوم عمرو، ولو كان — ایک ہی نفس ہوتا تو کیونکر ممکن تھا

نفساً واحداً لما كان — کہ ایک شے نفس کو معلوم بھی ہو اور

الشيئ معلوماً لنفس — وہی شے اسی کے لیے مجہول بھی ہو،

ومجهولاً بعينه لنفس اُخرى — پھر تو ایک ہی شے ایک ہی نفس کو معلوم

اذ يكون الشيئ معلوماً للنفس — بھی ہوگی اور مجہول بھی (جو صریح تناقض ہے)

الواحدة ومجهولاً لها۔[1]

بدنوں کی کثرت کی بنیاد پر نفوس کی کثرت کو اور بدنوں کے ساتھ ساتھ انکے حدوث کو شیخ نے شفاء میں اسی دلیل سے ثابت کیا ہے۔ میں اسے بھی نقل کئے دیتا ہوں۔ بظاہر شفاء، اقبال کا ماخذ نہیں تاہم اس سے اقبال کی دلیل کے ساقط مقدمات واضح ہوجائیں گے،

ونحن نعلم ان الانفس ليست — ہم یہ جانتے ہیں کہ سب کے سب

واحدة في الابدان كلها، — بدنوں میں (بعینہٖ) ایک ہی نفس

---

[1] مقاصد الفلاسفہ از غزالی قسم ثالث، طبیعیات ص ۲۹۹

[illegible] واحدة و كثيرة بالاضافة لكانت عالمة فيهما كلهما وجاهلة ولما خفي على زيد ما في نفس عمرو، لان الواحد المضاف الى كثيرين يجوز ان يختلف بحسب الاضافة و اما الامور الموجودة له في ذاته فلا يختلف فيها۔

(شفا مخطوطہ رضا لائبریری رامپور ورق ۵۱۳، ۱۸۵۶)

نہیں ہے، اگر سب بدنوں میں ایک ہی نفس ہوتا، ذاتی وحدت کے ساتھ خواہ اضافی کثرت ہی کیوں نہ ہوتی (ابدان کثیرہ سے متعلق ہونے کی وجہ سے تعلقاتی کثرت) تو یا سب (بدنوں) میں یہ عالم ہی ہوتا یا جاہل ہی ہوتا، اور جو عمرو کے نفس میں ہوتا وہ زید پر مخفی نہ ہوتا۔ رہا ایک تعلقات کی بنا پر اضافی اور تعلقاتی کثرت کا سوال ہے تو چونکہ ایک ہی حقیقت جو کثیر (اشیاء) سے نسبت اور تعلق رکھتی ہے اس میں نسبتی اور تعلقاتی اختلاف ہو جاتا ہے لیکن جو حقیقتیں اس کی ذات میں حاصل اور ثابت ہیں ان میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔

اقبال نے اس دلیل کو ضروری مقدمات ساقط کر کے تناسخ کے باطل ہونے پر قائم کیا ہے، اور بحوالے بیان شیخ کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن شیخ نے اس کو حدوث بدن کے ساتھ حدوث نفس کی معیت ثابت کرنے کے لیے پیش کیا ہے، اور 'نجاۃ' میں

اسی عنوان کے ساتھ اسکو ذکر کیا ہے ابطال تناسخ میں اس پر اعتماد نہیں کیا ہے

علاوہ بریں تناسخ کی یہ صورت کہ کسی ایک بدن کے ساتھ نفس کا حدوث ہو اور اُس بدن کے فساد پر کسی دوسرے بدن میں حلول کر جائے اُس دلیل سے باطل نہیں ہوتی، واللہ اعلم بالصواب۔

(صفحہ ۱۵۵ تا ۱۸۰)

اعتذار: تحریر ضرورت اور اندازے دونوں سے بڑھ گئی، مقصد اپنے پچھلے مقالے کی تصحیح تھی، لیکن بات بہت آگے چلی گئی۔ طولِ داستان کی وجہ یہ ہوئی کہ اہل نظر کو متنبہ کر دوں کہ اقبال مرحوم کے ان حوالوں کو جو عربی تصانیف سے متعلق ہوں احتیاط سے پڑھیں، اور اصل ماخذوں سے مقابلہ کئے بغیر اُن سے فائدہ نہ اُٹھائیں۔

اقبال کامل

اقبالیات پر تو اب اردو اور انگریزی میں سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اور ان پر روز بروز اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، لیکن اقبال پر یہ سب سے پہلی مکمل اور جامع کتاب ہے جسکو اردو کے ادیب اور شعر الہند کے مشہور مصنف مولانا عبد السلام ندوی نے لکھی ہے، اس میں حضرت اقبال کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل کی گئی ہے پہلے ان کی اردو شاعری، پھر فارسی شاعری کے بہترین اشعار کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، پھر ان کے کلام کی ادبی خوبیاں دکھائی گئی ہیں، پھر ان کی شاعری کے اہم موضوعات یعنی فلسفہ خودی، فلسفہ بیخودی، نظریہ ملیت تعلیم، سیاست، صنفِ لطیف اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔

قیمت – ۱۶ روپیے / مجلد

خدا بخش لائبریری
میں
مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی قلمی تصنیفات

از جناب محمد عتیق الرحمٰن صاحب ایم، اے (علیگ) خدا بخش لائبریری، پٹنہ،

مولانا آزاد بلگرامی ایک اچھے تذکرہ نگار، عربی و فارسی کے نامور شاعر اور اسلامی علوم و فنون کے متبحر عالم کی حیثیت سے ہندوستان کی علمی دنیا میں نہایت مشہور و معروف ہیں، بلکہ اپنے علمی فضل و کمال ہی کی وجہ سے حسان الہند کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔

(۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ میں بلگرام میں پیدا ہوئے۔ درسی کتابیں میر طفیل محمد بلگرامی (متوفی ۱۱۵۱ھ) سے پڑھیں، لغت، حدیث، سیرت اور فن ادب کا درس اپنے دادا میر عبد الجلیل بلگرامی (متوفی ۱۱۳۸ھ) سے حاصل کیا عربی شاعری میں بھی ان ہی کے شاگرد تھے،

۱۱۳۱ھ میں سید العارفین میر سید لطف اللہ بلگرامی (متوفی ۱۱۴۳ھ) سے بیعت کی۔

۱۱۵۱ھ میں حج بیت اللہ سے فارغ ہوئے اس مبارک سفر کے دوران میں مدینہ منورہ میں شیخ محمد حیات سندھی (متوفی ۱۱۶۳ھ) سے بخاری شریف پڑھی، اور صحاح ستہ کی اجازت حاصل کی، مکہ معظمہ میں شیخ عبد الوہاب مکی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفادہ کیا۔ اس کے علاوہ جب اپنے کچھ عربی اشعار شیخ عبد الوہاب مکی کو سنائے تو وہ نہایت خوش ہوئے۔ اور

ان کی عربی دانی کی تعریف کی،

انھوں نے اپنی مختلف تصنیفات میں اپنے نام کے ساتھ مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے جس سے ان کی جائے پیدائش اور مذہبی عقائد کا علم ہوتا ہے،

"الحسینی نسباً والواسطی اصلاً والبلگرامی مولداً ومنشأً والحنفی مذہباً والچشتی طریقۃً"

انھوں نے عربی زبان میں ضوء الدراری شرح بخاری تا کتاب الذکر، سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، مظہر البرکات اور دو دیوان یادگار چھوڑے ہیں، ان دو دواوین کے بارہ میں تذکرہ علمائے ہند میں لکھا ہے کہ ان میں تین ہزار عربی اشعار ہیں اور سبحۃ المرجان میں سات سو عربی اشعار بطور مثال پیش کئے گئے ہیں [1]

فارسی زبان میں ید بیضا، سرو آزاد، خزانہ عامرہ، ماثر الکرم، شجرۂ طیبہ، دیوان آزاد، روضۃ الاولیا، ان کی تصنیفات میں ہیں، صاحب تذکرہ علمائے ہند نے سند السعادات فی حسن خاتمۃ السادات کو ان کی تصنیفات میں شمار کیا ہے، اس کے علاوہ مظہر البرکات کو انکی فارسی تصنیفات میں شمار کر دیا ہے، جبکہ یہ ان کی عربی تصنیف ہے۔

وہ ۱۲۰۰ھ میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے [2]

مندرجہ ذیل سطور میں ان کی ان تصنیفات و تالیفات کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے جو مخطوطات کی شکل میں خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہیں۔

الف: عربی مخطوطات

دیوان غلام آزاد بلگرامی | ہینڈ لسٹ نمبر ۳۹۵۹، ورق ۵۶، سطر ۱۲، خط نستعلیق، کتابت بارھویں صدی ہجری، یہ نسخہ مولانا آزاد بلگرامی کے قصائد، غزل اور مراثی پر مشتمل ہے، اس کی ترتیب اس طرح ہے۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ۳۶۳۔ ید بیضا ص ۲۵۰-۲۵۲، نزہۃ الخواطر ۶/۲۰۱، تذکرہ علمائے ہند ۳۶۳

[2] دیکھئے، ماثر الکرم ۱۶۱-۱۶۲، سرو آزاد ۲۶۱-۲۹۴، خزانہ عامرہ ۱۲۳-۱۲۴، سبحۃ المرجان ص ۱۱۰-۱۲۰ وغیرہ

سب سے پہلے یہ مندرجۂ ذیل شعر سے شروع ہوتا ہے، جو درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہے گئے قصیدہ کا پہلا شعر ہے، ؎

لحت الی بعینھا الکحلاء   فرضت طول العمر بالسوداء

اس کے بعد مسلسل ۱۳ قصائد ہیں جن میں پہلے کے ۱۰ قصائد تو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اور بقیہ ۳ سید عبدالجلیل بلگرامی، محمد بن سید عبدالجلیل بلگرامی اور سید جان محمد حسین کی تعریف میں ہیں۔

قصائد کے بعد ایک مرثیہ سید طفیل احمد حسینی کی وفات پر ایک تاریخی نظم سید محمد حسینی کی تصنیف الفرع النابت اور ایک سید قمرالدین اورنگ آبادی کی کتاب مظہر النور کی تصنیف کے موقع پر کہی گئی ہے، پھر محمد اسلم حسینی کے بارہ میں منظوم تاریخ وفات ملتی ہے، اس کے بعد غزلیں شروع ہوتی ہیں، جو کل ۱۳ کی تعداد میں ہیں، یہ حروف تہجی کے اعتبار سے الف سے یای تک کے حروف پر مبنی ہیں، اس کے بعد مندرجۂ ذیل عبارت ملتی ہے۔

ھٰذا قصائد انشاھا الناظم بعد ما رتب الدیوان واثبتھا فی آخرہٖ فمن شاء یثبتھا فی مواضعھا۔

(یہ چند قصائد ہیں جنھیں شاعر نے دیوان مرتب ہونے کے بعد لکھا ہے، اور دیوان کے اخیر میں رکھا ہے جو شخص چاہے انھیں انکی مناسب جگہ پر تحریر کر دے۔)

اس ذیل میں دو قصائد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اور ۱۱ غزلیں ملتی ہیں جو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب ہیں، دیوان کی آخری غزل کا مقطع اس طرح ہے ؎

لقد ذاب فی الحب آزادنا   دیرجو من اللہ حسن الرضا

کتابت کے سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ آخری غزل کو چھوڑ کر دیوان کے تمام قصائد غزل اور مراثی خوبصورت خط نسخ میں لکھے ہوئے ہیں، اس میں نہ کہیں سنہ کتابت درج ہے، اور نہ کاتب کا نام ملتا ہے، ہاں دیوان کی سب سے پہلی عبارت "قال مولانا السید غلام علی المتخلص بآزاد" سے یہ بات ضرور متعین ہو جاتی ہے کہ اس کا کاتب بہرحال کوئی دوسرا ہے، لیکن اس کے برخلاف آخری غزل خط نستعلیق میں ہے درمیان صفحہ سے شروع ہوتی ہے، غزل کے درمندرجہ ذیل خاتمہ کی عبارت ملتی ہے۔

رقم ہذہ القصیدۃ الاخیرۃ الفقیر غلام علی آزاد الحسینی الواسطی البلگرامی ناظم الدیوان فی ۲۵ ربجادی الاخری سنہ ۱۱۷۰ھ

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آخری غزل خود مولانا آزاد بلگرامی کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، جو ۲۵ جمادی الاخری سنہ ۱۱۷۰ھ میں لکھی گئی۔ مزید یہ بھی ثابت ہوا کہ اس کے قبل کے تمام اشعار مولانا آزاد بلگرمی کی حیات ہی میں مذکورہ تاریخ سے پہلے لکھے گئے ہیں،

مظہر البرکات | ہینڈ لسٹ نمبر ۱۰۳۶، ورق ۱۲۶، سطر ۱۱، خط نستعلیق، کتابت سنہ ۱۲۶۰ھ کاتب مظہر علی، یہ مخطوطہ منظوم اخلاقی قصوں، کہانیوں اور حکایتوں پر مشتمل ہے اور مندرجہ ذیل سات دفتر پر منقسم ہے، ہر دفتر حمد باری عز اسمہٗ سے شروع ہوتا ہے،

دفتر اول ــــ یہ سنہ ۱۱۹۳ھ میں لکھا گیا اس کا پہلا شعر یوں ہے ؎

احمد اللہ واجب المنعم … موقع العاشقین فی الضرم

دفتر دوم۔ یہ سنہ ۱۱۹۴ھ میں لکھا گیا۔ اس کا پہلا شعر اس طرح ہے ؎

ربنا انت خالق البشر … جاعل النطق حسن الاثر

دفتر سوم۔ یہ سنہ ۱۱۹۵ھ میں لکھا گیا، اس کا پہلا شعر یہ ہے۔ ؎

حمداً لله مهدی الجبل   ہادی الوری بعد الرسل

دفتر چہارم۔ یہ بھی سنہ ۱۱۹۵ھ میں لکھا گیا اس کا پہلا شعر یوں ہے ؎

انت یا رب خالق النسم   ملهم لورق صنعة النغم

دفتر پنجم۔ یہ سنہ ۱۱۹۶ھ میں لکھا گیا، پہلا شعر یہ ہے۔ ؎

تاج راس الخطاب حمد الله   نور وجه الکتاب وجه الله

دفتر ششم۔ یہ بھی سنہ ۱۱۹۶ھ میں لکھا گیا، پہلا شعر اس طرح ہے۔ ؎

انا اثنی علیك یا الله   انا ارنو الیك یا ربّاه

دفتر ہفتم۔ یہ بھی سنہ ۱۱۹۶ھ میں تحریر کیا گیا۔ اس کا پہلا شعر یوں ہے ؎

ربنا انت منطق الفصحاء   مودع السحر مقول الورقاء

اس نسخہ میں سب سے پہلی حکایت ابو عثمان الحیری کی اور سب سے آخری حکیم بقراط کی نظم کی گئی ہے، اس کے بعد جواب لطیف من الناظم، نکتۃ من الناظم، ترجمۃ الناظم اور الخاتمہ کے عنوان کے تحت مختلف نظمیں تحریر کی گئی ہیں، خاتمہ کی مندرجۂ ذیل عبارت ظاہر کرتی ہے کہ اس نسخہ کی کتابت سنہ ۱۲۶۰ھ میں ہوئی، اور اس کا کاتب مظہر علی ہے۔

تمت فی رابع عشر ذی قعدہ سنہ ۱۲۶۰ھ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم جررہ اضعف الناس مظہر علی۔

دیوان غلام علی آزاد بلگرامی | ہینڈ لسٹ نمبر ۳۳۰، ورق ۱۹۰، سطر ۱۰-۱۱، خط مختلف کتابت تیرہویں صدی ہجری، یہ ایک ناقص نسخہ ہے جو مندرجۂ ذیل دیوان اور دفتر پر مشتمل ہے۔

الدیوان التاسع ۔ اس میں سنہ ۱۱۹۹ھ کے کہے ہوئے اشعار درج ہیں۔

الدیوان العاشر۔ اس میں ۱۱۹۶ھ کے کہے ہوئے اشعار درج ہیں۔

الدفتر الخامس۔ اس میں ۱۱۹۶ھ کے کہے ہوئے اشعار تحریر کئے گئے ہیں۔

الدفتر السادس۔ " " " " "

الدفتر السابع۔ " " " " "

دیوان تاسع کا پہلا قصیدہ آنحضرت صلعم کی شان میں ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

خاجت ادمعی من المقل — واستفادت زمارت الطلل

قصیدہ سے پہلے یہ عبارت ملتی ہے قال ممتدحا للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فی المحرم سنۃ تسع وتسعین ومایۃ والف،

اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ یہ اشعار محرم ۱۱۹۹ھ میں کہے گئے ہیں،

اس دیوان میں دو قصائد کے بعد غزلیں ملتی ہیں جو محرم ۱۱۹۹ھ سے رجب ۱۱۹۹ھ تک کی مدت میں کہی گئی ہیں، دیوان عاشر میں بھی سب سے پہلے قصیدہ ملتا ہے، جس کا پہلا شعر اس طرح ہے۔ ؎

لقد دعانی الی لقیانہ رشاء — اثنی الالہ وبسم اللہ ابتدائی

اس کے بعد ۱۱ قصائد مزید ملتے ہیں جو آنحضرت صلعم کی شان میں کہے گئے ہیں، اس کے بعد دفتر خامس، دفتر سادس، دفتر سابع کے اشعار درج ہیں در حقیقت یہ وہی اشعار ہیں جو مظہر البرکات میں تحریر کئے گئے ہیں۔

اس نسخہ کے نقص کی کئی وجوہ ہیں، پہلی وجہ یہ ہے کہ اس میں دیوان تاسع اور دفتر خامس سے قبل کے اشعار نہیں ہیں، دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ نسخہ درمیانی شعر سے شروع ہوتا ہے جس کی وجہ سے نہ اس کی شان نزول کا پتہ چلتا ہے، اور نہ اس کا آغاز معلوم ہوتا ہے، تیسری وجہ یہ

کہ اس کے بعض قصائد ناکمل ہیں، کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔

سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان | ہینڈ لسٹ نمبر ۲۴۰۸ ، ورق ۳۱۷ ، سطر ۱۳ خط نسخ کتابت ۱۳ ویں صدی ہجری۔

یہ نسخہ مندرجۂ ذیل فصول پر مشتمل ہے۔

الفصل الاول فی ماجاء من ذکر الھند فی التفسیر والحدیث

الفصل الثانی فی ذکر العلماء الفصل الثالث فی محسنات الکلام

الفصل الرابع فی بیان المعشوقات والعشاق۔

جیسا کہ ان فصول سے ظاہر ہے، اس نسخہ میں تفسیر و حدیث کی روشنی میں ہندوستان کا ذکر کیا گیا ہے، اور کچھ علمائے ہند کے حالات بیان کئے گئے ہیں، اس کے علاوہ محسنات کلام پر بھی گفتگو کی گئی ہے،

یہ مکمل نسخہ ہے، لیکن درمیان میں بعض عبارتیں نقل کرنے سے رہ گئی ہیں، اس کے لیے ورق ۲۹۱ ب ، ۲۹۲ ب ، ۲۹۳ ب ، ۲۹۴ الف ، ۳۱۰ ب ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

فصل دوم میں جن علماء و فضلاء کا تذکرہ کیا گیا ہے اُن میں سب سے پہلے شیخ ابو حفص ربیع بن صبیح السندی کا ذکر ہے، اور سب سے آخر میں میر نور الہدیٰ کا۔

اس میں سنہ کتابت درج ہے، اور نہ کاتب کا نام موجود ہے، لیکن تخمیناً ۱۳ ویں صدی ہجری کی کتابت کہی جاسکتی ہے۔

سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان کا ایک اور نسخہ | ہینڈ لسٹ نمبر ۳۱۲ ، ورق ۱۹۵ ، سطر ۲۱ خط نستعلیق کتابت تیرہویں صدی ہجری۔

یہ بھی مکمل نسخہ ہے لیکن شروع صفحہ پر کسی نے غلطی سے الجزء الاول من سبحۃ المرجان

لکھدیا ہے، اس کے علاوہ اس کا ایک ورق (۱۹۴) غلطی سے ورق ۹۵ اکے بعد لگ گیا ہے نسخہ صاف ہے لیکن کاتب نے نقل کرنے میں بد احتیاطی سے کام لیا ہے، اس لئے کہیں کہیں کتابت کی غلطی نظر آتی ہے،

شروع میں ان علمار کی فہرست دی گئی ہے، جن کا فصل دوم میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس فہرست کے مطابق اس فصل میں ۲۴ علمار کے حالات موجود ہیں۔

سبحۃ المرجان کا ایک اور نسخہ | ہینڈ لسٹ نمبر، ۲۲۴۰، ورق ۱۴۹، سطر ۱۱، خط نسخ، کتابت ۱۱۸۰ھ یہ نامکمل نسخہ ہے اور مندرجہ ذیل فصول پر مشتمل ہے،

الفصل الاول۔ فی ماجار من ذکر الہند فی التفسیر والحدیث

الفصل الثانی۔ فی ذکر العلمار

اس کے بعد کی دو فصلیں (الفصل الثالث والرابع) اس نسخہ میں نہیں۔

مندرجۂ ذیل خاتمہ کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ مولانا آزاد بلگرامی نے خود اپنے ہاتھ سے ۱۱ شوال ۱۱۸۰ھ میں لکھا ہے۔

تمت بعونہ تعالےٰ ھذہ النسخۃ علی ید مؤلفھا الفقیر آزاد الحسینی الواسطی البلگرامی عفی عنہ فی الحادی عشر من شوال المکرم سنۃ ثمانین ومأۃ والف۔

(فارسی مخطوطات)

ید بیضا | ہینڈ لسٹ نمبر ۲۲۴۳، ورق ۱۳۰، سطر ۲۱، خط نستعلیق،

یہ فارسی تذکرہ ہے جس میں قدیم شعرار سے لیکر مولانا آزاد بلگرامی کے معاصر شعرار تک کے حالات درج ہیں، حالات کے ضمن میں شعرار کے خوبصورت اور منتخب اشعار بھی تحریر کئے گئے ہیں، اس کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہے، جیسا کہ اسپرنگر نے لکھا ہے

میں ۵۰۰ فارسی شعراء کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں، ۲۷ معاصر شعراء کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سب سے پہلا شاعر افضل الدین محمد کاشانی اور سب سے آخری میر محمد یوسف ہے۔

شعراء کے حالات کے بعد تذکرہ نگار نے اپنی مختصر سوانح لکھی ہے، جس میں اپنی پیدائش، تعلیم و تربیت، سفر حج، تصنیفات اور ید بیضا کے مختلف نسخوں کا ذکر کیا ہے، یہ پانچ اوراق پر مشتمل ہے۔

شروع صفحہ پر مندرجہ ذیل تحریریں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اکثر حصہ مولانا آزاد بلگرامی نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا ہے،

پہلی تحریر مولانا آزاد بلگرامی کے کسی بزرگ کی خود ان کی زندگی میں لکھی گئی ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"تذکرۃ الشعراء مسمی ید بیضا از تالیف سید غلام علی آزاد بلگرامی سلمہ اللہ تعالےٰ ہنگامیکہ فقیر برائے عقد بلگرام رفتہ بودم سید محمد طاب ثراہ ابن دلوند فی سنہ ۱۱۵۳ھ و این نسخہ اکثر بخط مصنف است سلمہ اللہ تعالےٰ شانہ"

دوسری تحریر ہے، ایچ ہلاک مین کی جو سنہ ۱۸۶۸ء میں انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے۔

"اس نسخہ کو میں نے بلگرام میں خریدا تھا، اس کی کتابت کے بارہ میں جب میں نے وہاں کے لوگوں سے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ میر عبدالجلیل بلگرامی سے آخر کتاب تک کا حصہ مولانا آزاد بلگرامی نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا ہے، یہ حصہ باریک خط میں لکھا ہوا ہے"

اسی صفحہ پر خدا بخش خان بانی کتب خانہ کی ایک تحریر ہے، جس میں انکشاف کیا گیا ہے کہ

سلہ اودھ کیٹلاگ ۱۴۲:۱

انھوں نے یہ نسخہ تین روپیہ میں کلکتہ میں وہاں سے خریدا تھا جب ، ایچ بلاک مین کے کتب خانہ کی کتابیں فروخت ہو رہی تھیں ۔

سرو آزاد | ہینڈ لسٹ نمبر ۲۲۲ ، ورق ۱۱۱ ، سطر ۲۲-۲۴ ، خط نستعلیق ، کتابت بارہویں صدی ہجری ۔

اس کے مقدمہ میں مولانا آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ ید بیضا کے بعد انھیں بلگرامی شعراء ، اولیائے کرام اور علماء و فضلا کے حالات قلم بند کرنے کا خیال ہوا چنانچہ اسی مقصد سے انھوں نے دو دفتر لکھا ایک کا نام سرو آزاد رکھا ، اور دوسرے کا مآثر الکرام ۔

سرو آزاد کا موجودہ نسخہ مندرجۂ ذیل فصول پر مشتمل ہے ۔

فصل اول در ذکر صاحب طبعان فارسی ، فصل دوم در ذکر قافیہ سنجانِ ہندی ،

فصل اول میں ان فارسی گو شعراء کا تذکرہ کیا گیا ہے ، جو یا تو ہندوستان کے باشندہ تھے ، یا دوسرے ممالک سے آکر یہاں مقیم ہو گئے تھے ، اس فصل میں سب سے پہلے مولانا نظیری نیشاپوری کے اور سب سے آخر میں سید برکت اللہ کے حالات تحریر کئے گئے ہیں ، فصل دوم میں سب سے پہلے شیخ شاہ محمد کا اور سب سے آخر میں میر عبد الواحد کا تذکرہ کیا گیا ہے ۔

پہلی فصل میں مجموعی طور پر ۱۴۵ فارسی گو شعراء کے اور فصل دوم میں ۸ شعراء کے حالات ملتے ہیں ۔

اس نسخہ میں نہ سنہ کتابت درج ہے ، اور نہ کاتب کا نام ہے ، لیکن تخمیناً ۱۳ ویں صدی ہجری کی کتابت کہی جا سکتی ہے ،

مآثر الکرام | ہینڈ لسٹ نمبر ۲۲۴ ، ورق ۱۳۴ ، سطر ۱۷ ، معمولی نستعلیق ، کتابت تیرہویں صدی ہجری ،

اس تذکرہ میں بلگرام اور کچھ دوسرے علاقوں کے فقراء اور علماء و فضلاء کے حالات تحریر کئے گئے ہیں، یہ مندرجۂ ذیل فصول پر مشتمل ہے،

فصل اول در ذکر فقراء قدس اللہ اسرارہم، فصل دوم در ذکر فضلاء نور اللہ مضاجعہم۔

پہلی فصل میں مجموعی طور پر ۱۰۸ فقراء اور مقدس ہستیوں کا تذکرہ، اور دوسری فصل میں ۱۰۱ علماء و فضلا کا تذکرہ موجود ہے، اس کے بعد تذکرہ نگار نے خود اپنی زندگی کے حالات تحریر کئے ہیں۔

شروع میں ان تمام شخصیات کی فہرست دی گئی ہے، جو اس نسخہ میں درج ہیں۔

یہ مخطوطہ شروع سے ۱۰ ورق تک کسی ناپختہ کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس کے بعد کے اوراق کی کتابت پختہ ہے، لیکن خط بہرحال معمولی ہے،

سنہ کتابت درج نہیں، تاہم تیرہویں صدی کی کتابت کہی جا سکتی ہے،

خزانۂ عامرہ | ہینڈ لسٹ نمبر ۱۲۱، ورق ۲۴۴، سطر ۱۷، خط نستعلیق، کتابت تیرہویں صدی ہجری،

اس میں جدید و قدیم فارسی گو شعراء اور ہندوستانی امراء کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ جدید شعراء اور امراء سے مراد وہ حضرات ہیں جو مولانا آزاد بلگرامی کے معاصر تھے،

اس میں مجموعی طور پر ۱۳۵ فارسی شعراء کے تذکرے ہیں جو حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب کئے گئے ہیں،

تذکرہ نگار نے اس مقدمہ میں لکھا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۱۷۶ھ میں مرتب ہوا، اس میں سب سے پہلے انوری اور سب سے آخر میں میر یوسف بلگرامی کے حالات بیان کئے گئے ہیں، کاتب کا نام

اور سنہ کتابت درج نہیں تاہم اس کی کتابت تیرہویں صدی کی ہو سکتی ہے۔ نسخہ صاف اور خوبصورت ہے،

خزانۂ عامرہ کا دوسرا نسخہ	ہینڈ لسٹ نمبر ۸۰،۱۱، ورق ۳۲۲، سطر ۱۱-۱۹، خط نستعلیق، کتابت تیرہویں صدی۔

یہ خزانہ عامرہ کا دوسرا نسخہ ہے، جو مکمل ہے، لیکن مختلف کاتبوں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں تاہم ۱۳ ویں صدی کی کتابت کہی جا سکتی ہے،

تذکرہ صوبہ داران اودھ	ہینڈ لسٹ نمبر ۱۰۱، ورق ۱۰۴، سطر ۱۱، خط نستعلیق، کتابت سنہ ۱۲۰۳ھ

اس میں حیدرآباد اور اودھ کے ان صوبہ داران اور امراء کا تذکرہ کیا گیا ہے، جو تذکرہ نگار کے معاصر تھے، خدابخش لائبریری کے کیٹلاگر نے اس مخطوطہ کے تعارف کراتے ہوئے ہے، ایچ ملاک ہین کی مندرجۂ ذیل تحریر نقل کی ہے۔

The Subahdars of Audh and Haidarabad. An extract from The Khazanah-i Amirah by Gulam Ali Azad.[1] اس کے علاوہ اس نسخہ میں خاتمہ کی مندرجۂ ذیل عبارت ملتی ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص تاریخی حصہ ہے جو سنہ ۱۲۰۳ھ میں خزانہ عامرہ سے نقل ہوا۔

این قدر احوال کہ تعلق بتاریخ داشت از نسخہ خزانۂ عامرہ میر غلام علی آزاد منقول شد تحریر ہشتم ذی الحجہ سنہ ۱۲۰۳ھ۔

---

[1] خدابخش لائبریری کیٹلاگ ج ۸ ص ۱۲

نسخۂ مرجان [illegible] | ہینڈلسٹ نمبر ۱۰۹۰، ورق ۱۱۲، سطر ۱۷، خط نستعلیق،
کتابت چودہویں صدی ہجری،

یہ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان (عربی) کا فارسی ترجمہ ہے، مترجم کا نام سید شمس الدین حسینی ہے، مترجم نے یہ کام کس کے حکم سے شروع کیا، اس سلسلے میں خدا بخش لائبریری کے کیٹلاگر نے لکھا ہے کہ اس نسخہ کے آخر میں ایک تحریر تھی، جس سے پتہ چلتا تھا، کہ مہاراجہ ایسری پرشاد (بنارس)، نے سید شمس الدین کو ترجمہ کرنے کی ہدایت کی تھی جو ان کے یہاں ملازم تھے،[1] لیکن بدقسمتی سے مجھے یہ تحریر نہیں مل سکی، تاہم مقدمۂ کتاب کے مندرجۂ ذیل اشعار اس بیان کی تائید کرتے ہیں، سے

مہاراج ایسری پرشاد صاحب	وحید العصر عالی خاندان است
امیر بے نظیر و قدر دانی	کہ رایش پیر و اقبالش جوان است
کمر بستم بہ فرمان سترکشی	کہ ہر دم واجب الاذعان جان است
بجان و دل کہ شمس الدین مطیع است	بشکر نعمتش رطب اللسان است
کنم عطف عنان از وادی نظم	کہ اندر نثر حکم ترجمان است

اس نسخہ میں مندرجۂ ذیل فصول ترجمہ کیا گیا ہے۔

فصل اول در بیان آنچہ کہ آمدہ است از ذکر ہند در تفسیر و حدیث

فصل دوم در ذکر علمائے ہند۔

فصل دوم کے ذیل میں سب سے آخر میں مولانا آزاد بلگرامی کی سوانح حیات کا ترجمہ کیا گیا ہے، لیکن تیسری اور چوتھی فصل کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ نامکمل

---

[1] خدا بخش لائبریری کا کیٹلاگ، ج ۸، ص ۸

ترجمہ:

اس میں نہ کاتب کا نام ملتا ہے، اور نہ سنہ کتابت درج ہے، تاہم چودہوین صدی کی کتابت کہی جاسکتی ہے،

دیوان آزاد | ہینڈلسٹ نمبر ۵۳۶، ورق ۶۴، سطر ۱۲، خط نستعلیق، کتابت ۱۲۶۸ھ

اس دیوان میں سب سے پہلے غزلیں تحریر کی گئی ہیں، جو کل ۱۰۶ ہیں پہلی غزل کا مطلع یہ ہے۔

برآر از بسم اللہ تیغ خوش تعالیٰ را مسخر کن سواد اعظم نازک خیالی را

اس کے بعد رباعیات ملتی ہیں، جو تعداد میں ۱۰ ہیں۔ سب سے آخر میں تاریخ ختم مآثر الکرام ہے، جس کا آخری شعر اس طرح ہے، ؎

انجام بعون ایزدی یافت تاریخ شنو ختامہ مسک

مندرجۂ ذیل خاتمہ کی عبارت ملتی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ ۱۲۶۸ھ میں لکھا گیا، اور کاتب کا نام فرزند احمد حسینی واسطی ہے،

الحمد للہ والمنۃ کہ دیوان سحر بیان علامہ نامی مولوی غلام علی آزاد بلگرامی بمقام قصبہ تاج پور ہنگام عہدہ کمشنری جناب قبلہ گاہ صاحب معلہ رشید احمد صاحب بتاریخ بستم ربیع الثانی ۱۲۶۸ھ بخط بدربط بندہ فرزند احمد حسینی واسطی بلگرامی اختتام وانصرام یافت رجاکہ ناظران اگر جای غلطی معانیہ فرمایند بذیل عطا پوشیدہ نمایند کہ ہیچ نوع بشر خالی از خطا نبود۔

رسالہ شجرہ طیبہ | ہینڈلسٹ نمبر ۵۰۳۵، ورق ۱۸، سطر ۱۹، خط نستعلیق کتابت ۱۲۹۲ھ،

یہ مخطوطہ سادات بلگرام کی تاریخ، حالات اور ان کے نسب نامے پر مشتمل ہے۔

اس میں سب سے پہلے وہ احادیث نقل کی گئی ہیں، جن میں اپنے اصل خاندان کے علاوہ کسی دوسرے خاندان کی طرف انتساب کرنے پر خدا اور اس کے رسول کی طرف سے لعنین بھیجی گئی ہیں، اس کے بعد خاندان قریش کی تاریخ اور آل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت بیان کی گئی ہے، اس ضمن میں حضرت علیؓ، اور حضرت حسن وحسین علیہما السلام کے مختصر احوال تحریر کئے گئے ہیں۔

سید حسین بن سید ابو الفرح کے بارہ میں لکھا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں، جو بلگرام آئے، اس کے بعد وہاں کے سادات خاندان کے حالات اور انکے خاندانی شجرے بیان کئے گئے ہیں اس میں مولانا آزاد بلگرامی نے اپنے عہد تک کے بلگرامی سادات خاندان کے واقعات تحریر کئے ہیں۔

رسالہ شجرہ طیبہ کا دوسرا نسخہ | ہینڈ لسٹ نمبر ۵، ۵۰۳، ورق ۹۱، سطر ۱۹، خط نستعلیق کتابت ۱۱۶۲ھ

یہ شجرہ طیبہ کا دوسرا نسخہ ہے۔ دونوں میں ایک اہم فرق یہ ہے کہ ثانی الذکر نسخہ میں مولانا آزاد بلگرامی کے بیان کے بعد کسی دوسرے شخص نے ۱۲۵۲ھ سے ۱۲۵۷ھ تک کے مختلف سالوں میں بلگرام کے علاوہ کوانتھ، آرہ، مظفرپور، بھاگلپور، مارہرہ کے بلگرامی سادات گھرانوں میں پیدائش اور موت کے جو واقعات پیش آئے انھیں سنہ اور تاریخ کے ساتھ تحریر کر دیا ہے۔

بیاض رنگین | ہینڈ لسٹ نمبر ۳۱۳، ۳، ورق ۱۶۲، سطر مختلف، خط نستعلیق، کتابت بارھویں صدی ہجری۔

یہ مولانا آزاد بلگرامی کی خود نوشت بیاض ہے، جس میں ان کے منتخب اشعار، اہم واقعات اور علمی امور درج ہیں، عربی و فارسی دونوں زبانوں کی چیزیں ہیں، یہ نہایت اہم نسخہ اور تفصیل طلب ہے، اس سے اس کا مفصل تعارف کسی آیندہ شمارہ میں کرایا جائے گا۔

اڈیٹر معارف کے نام

اربابِ علم کے خطوط

تکیہ رائے بریلی۔

۲؍شوال ۱۴۰۰ ہجری

برادر محترم و محب گرامی   زید لطفہ

.... خط لکھنے کے بعد قومی آواز میں ایوارڈ کی خبر پڑھی، بڑی مسرت ہوئی، دلی مبارکباد قبول کیجئے۔

والسّلام آپ کا ابوالحسن علی ندوی

تکیہ رائے بریلی۔

۱۰؍شوال سنہ ۱۴۰۰ھ

ایوارڈ سے حقیقتاً دل خوش ہوا کہ حق بہ حق دار رسید بلکہ تاخیر کا افسوس ہے۔

والسّلام ابوالحسن علی ندوی

حبیب منزل، علی گڈھ
۱۰؍اگست سنہ ۸۰ء

مکرم و معظم سید صاحب   دام الطافکم، السّلام علیکم و رحمۃ اللہ

ابھی خوش خبری ملی، فالحمد للہ علی ذالک۔ بارک اللہ تعالیٰ بجا۔ حق بحقدار رسید،

والسّلام۔ عبیدالرحمٰن خان شروانی

محب محترم و مکرم　　　　السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپ نے مجھکو تعزیت نامہ لکھا تھا جس کے لیے میں صمیم قلب سے آپ کا شکر گزار ہوں
آپ کو اس خاکسار سے محبت اور قلبی لگاؤ ہے اس کے لیے کسی دلیل و برہان کی ضرورت ہرگز نہ
لیکن میں آپکو تہنیت نامہ لکھ رہا ہوں، یہ ایوارڈ آپکو اب ملا ہے وہ آپ کو بہت پہلے مل
چاہئے تھا آپ کی محققانہ تصنیفات و تالیفات اور آپ کے بلند پایہ مقالات کم و کیف کے اعتبا
سے اس پایہ و مرتبہ کے ہیں کہ اردو لٹریچر ان پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے، ایوارڈ دینے میں غالباً عمر کا
لحاظ رکھا جاتا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو آپ کے معاملہ میں تاخیر اسی وجہ سے ہوئی، معلوم نہیں کیوں میرا خیال
تھا کہ آپ کو کئی برس پہلے یہ سرکاری اعزاز مل چکا ہے۔

اب انگریزی اخبارات میں آپ کا نام دیکھا تو حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی، بہر حال میں آپ
صدق دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور برہان بھی مبارکباد پیش کرے گا۔

والسّلام۔ سعید احمد اکبر آبادی

بمبئی، ۲۵ر اگست ۸۳ء

برادرم، سید صباح الدین، سلامت رہو

تحیۃً و سلاماً۔ آپ کا نام گرامی اخبار میں آیا تھا کہ آپ کو بھی شمس العلماء کے خطاب
مل گیا، پانچ ہزار مبارک ہو بھیا،

میں آپ کے دیدار کا شایق ہوں، مرنے سے پیشتر ملنا چاہتا ہوں، دار المصنفین آنا چاہتا ہوں
کیا نومبر میں آؤں، اب عمر ۹۰ کی ہو گئی ہے، دیر نہ کیجئے لکھئے،

آپ اسے لئے دعا ختم الاسلام کی دعا سنئے۔

تومس السماء بالحلاله

تومس الارض باکرامه

وتومس النور بسبحانه

مخلص
اے، اے، اے فیضی

جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی۔

۳۰ اگست ۸۰ء

محترم المقام زید مجدکم السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کو مبارکباد، دارالمصنفین کو مبارکباد اور ہم سب کو مبارکباد، امسال کے فارسی زبان وادب کی خدمت کے سلسلہ کا ایوارڈ آپ کو ملا۔

حق بحقدار رسید

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایوارڈ آپ کو پہلے ہی مل جانا چاہیئے تھا، لیکن آج کی دنیا میں خاموش خدمت کرنے والوں کو لوگ بعد میں یاد کرتے ہیں، اور ان کی مستغنی طبیعت کے سبب ارباب انتظام کی نگاہیں ان پر دیر میں پڑتی ہیں، لیکن انھیں اور ایسے ہی حضرات سے علم وادب کی آبرو بھی قائم ہے، ؏ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں،

آپ کا مخلص۔ ضیاء الحسن فاروقی۔

پٹنہ
۱۰ اگست ۸۰ء

محب عزیز و مشفق شفیق، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

کل کے اخباروں سے یہ خوش خبری ملی کہ اس سال صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے فارسی میں

سند قابلیت تمہیں عطا ہوئی ہے۔ اس خوشخبری کا بہت دنوں سے انتظار تھا۔ درحقیقت بہت پہلے ہی تم کو یہ اعزاز مل جانا چاہئے تھا لیکن ہر کام کے لئے خداوند پاک کی طرف سے وقت متعین ہوتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ صاحب استحقاق کو آخر یہ مل کر رہا۔ میں یہ اعزاز پانے کے لیے تمہیں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور خدائے قدوس سے دعاگو ہوں کہ تم آئندہ برسہا برس صحت وسلامتی کے ساتھ اس اکرام سے مستفید ہوتے رہو۔ یہاں تمہارے شناساؤں اور قدردانوں میں سے جس نے یہ مژدہ سنا سبھوں نے مسرت کا اظہار کیا ہے، اور تمہارے علمی خدمات کی تعریف کی ہے۔ ان شناساؤں میں سید عزیز مصطفیٰ صاحب بھی ہیں، جو پٹنہ کالج میں تمہارے ہم عصر تھے، اور بعد میں گورنمنٹ کے ایک اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہوکر خانہ نشین ہیں، آج کل وہ میرے تقریباً پڑوس میں بودوباش رکھتے ہیں، انھوں نے یہ امر تم کو مبارکباد لکھنے کو کہا ہے۔ والسّلام سید حسن (سابق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی)

ناظمہ منزل، سول لائنز علی گڑھ۔ ۱۵ اگست ۸۰ء ۔ ۰ بجے صبح

محترمی سید صباح الدین صاحب

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

ابھی صبح اخبارات سے صدر جمہوریہ کے علمی ایوارڈ ملنے کی اطلاع ملی، بہت مسرت ہوئی۔ صدر جمہوریہ نے آپ کو یہ اعزاز دے کر آپ کی نہیں، اس انعام کی توقیر بڑھائی ہے۔ مولا تعالیٰ اس انعام کو آپ کے لیے باعث برکت ومسرت بنائے۔ مجھے اطلاع ایک ہفتہ پہلے مل گئی تھی لیکن ریڈیو اخبار کی باضابطہ اطلاع کا منتظر تھا۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ والسّلام

مختار الدین احمد (صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی)

علی گڑھ۔ ۱۰ اگست ۸۰ء

محبی! سلام مسنون

ایوارڈ پر بے حد خوشی ہوئی۔ دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

مخلص نذیر احمد (سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی)

کلکتہ ۲۰/۱۰/۸۰

جناب بھائی صاحب، ظلہم۔ سلام و رحمت

کلکتہ سے باہر تھا، واپس آنے پر اوارڈ کی اطلاع ملی، دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں قبول فرمائیے،
یہ اعزاز آپ کے مقام سے بہت نیچے ہے، اسحاق لکچر کے سلسلہ میں اس بار فارسی کا مقالہ جلد آنے والا ہے
اس میں آپ کا ذکر خیر شامل ہے، یہ اعزاز ملنے سے پہلے لکھا گیا تھا، اس لیے اس اعزاز پر مسرت کا
اظہار نہیں کیا جا سکا، آپ کی علمی ذاتِ گرامی ہمارے لیے مغتنم ہے، اللہ تعالیٰ بہت دنوں آپ کو
صحت و سلامتی کے ساتھ قائم رکھے، آمین والسّلام مع الاکرام (قلبی لگاؤ کے ساتھ) دعاؤں کا محتاج

عطا کریم برق (پروفیسر سر آسوتوش مکرجی چیر کلکتہ یونیورسٹی)

دلی۔ ۱۹ اگست ۸۰ء

جناب سید صباح الدین صاحب! السّلام علیکم و رحمۃ اللہ

ایوارڈ پر میری طرف سے مبارکباد قبول فرمایئے، آپ کے علمی کاموں پر ہم سب کو فخر ہے، علامہ شبلی
اور مولانا سید سلیمان کی علمی روایت کو آپ نے برقرار رکھا اور اس ادارہ کی خدمت میں آپ لگے ہوئے ہیں

والسّلام سید امیر حسن عابدی (صدر شعبۂ فارسی دلی یونیورسٹی)

پھلواری شریف، ۲۲/۹/۸۰

محترمی! سلام و رحمت

امید کہ آپ بخیریت ہونگے، میں آپ کو خلوص و محبت کے ساتھ پریسیڈنٹ اوارڈ ملنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

آپ کا مخلص، محمد امان اللہ قادری (صاحب سجادہ خانقاہ مجیبیہ)

مدراس۔ ۱۵ اگست ۸۰ء برادرم، السّلام علیکم

آج کے اخبارات میں آپ کا نام، پریسیڈنٹ ایوارڈ کی فہرست میں شائع ہوا، یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی،

آپ کی ادبی، علمی و تہذیبی خدمات کا تھوڑا سا اعتراف ہوا، آپ کو بہت پہلے ہی یہ ایوارڈ ملنا چاہیے تھا میری طرف سے اور میری بیوی کی طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔

والسّلام، محمد یوسف کوکن
(صدر شعبۂ عربی و فارسی و اردو مدراس یونیورسٹی)

علی گڑھ۔ ۱۱/۹/۸۰ مکرمی و محترمی، السلام علیکم

صد درجہ باعث مسرت ہے کہ حکومت ہند کی جانب سے اس سال یوم آزادی کے موقع پر فارسی کا علمی اعزاز آپ کو عطا ہوا ہے، اس پرمسرت موقع پر میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیے۔ آپ ہر اعتبار سے اس علمی اعزاز کے مستحق تھے، حکومت ہند نے اس گراں قدر اعزاز کے لیے آپ کا انتخاب کرکے اپنی حق پسندی و فرض شناسی کا ثبوت دیا، اس سے قبل آپکے پیش رو اور سابق ناظم شاہ معین الدین احمد ندوی کو بھی یہ اعزاز عطا ہو چکا ہے، حکومت کا اس اعزاز کے لیے آپ کو منتخب کرنا، اس خاموش علمی خدمت کا اعتراف بھی ہے، جو دارالمصنفین انجام دے رہا ہے، خدا کرے یہ ادارہ آپ کی نگرانی میں دن دونی رات چوگنی ترقی حاصل کرے۔

والسّلام، شریک مسرت اقبال انصاری (صدر شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی)

لکھنؤ۔ ۱۱/۹/۸۰ مکرمی و محترمی! السّلام علیکم

اخبارات کے ذریعہ یہ دل خوش کن اطلاع ملی کہ صدر جمہوریہ نے جشن آزادی کے موقعہ پر آپ کو فارسی زبان و ادب کا بہترین اسکالر قرار دیتے ہوئے سند اعزاز عطا کی ہے، جس کے لیے میں آپ کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں، قبول فرمائیں، دراصل یہ اعزاز آپ جیسے صاحبان علم و فضل کو ہی نہ صرف زیب دیتا ہے، بلکہ خود اس کی شان اور وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔

نیازمند، ڈاکٹر محمد رضوان علوی (صدر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی، و صدر یوپی اردو اکیڈمی)

نئی دلی۔ ۱۵ اگست ۸۰ء مجی، آداب

آج صبح کے اخبار میں یہ دل خوش کن خبر دیکھی کہ آپ کو فارسی زبان کا اسٹریٹی ایوارڈ عطا ہوا ہے، بے حد مسرت ہوئی، میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس مادی انعام کو بے شمار روحانی اور علمی انعاموں کا پیش خیمہ بنائے۔ والسّلام مع الاکرام خاکسار مالک رام۔

دلی۔ ۲۲ اگست ۸۰ء برادر مکرم، السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

آپ نے کتنا بڑا یہ ظلم مجھ پر کیا کہ ایسی خوشخبری سے محروم رکھا جس کو سننے کے لیے کان کب سے منتظر تھے' ریڈیو پر ایوارڈ کا ذکر تو سنا لیکن پٹنہ میں اخباروں میں نام نہیں دیکھا کسی اور ذریعہ سے اطلاع ملی یہاں آکر یہ مژدہ سنا کہ امسال ۱۵ اگست کو پریسیڈنٹ ایوارڈ ملا، دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں، یہ عزت آپ کے لیے کوئی بہت بڑی چیز نہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کے ساتھ حیات دے کہ اس ایوارڈ سے خاطر خواہ طور پر مستفید ہو سکیں۔ سید شہاب الدین دسنوی

ایران سوسائٹی، کلکتہ

۲۰ اگست ۸۰ء (انگریزی میں)

پیارے مولانا صاحب

ہم لوگوں کو انتہائی خوشی ہے کہ اس سال یوم آزادی کے موقع پر آپ کو صدارتی ایوارڈ ملا، آپ ہر لحاظ سے اس اعزاز کے مستحق تھے، خوشی کی بات ہے کہ گو سند آپ کو دیر میں ملی لیکن آخر مل کر رہی، میری طرف سے اور ایران سوسائٹی کے ارکین کی طرف سے اس ایوارڈ پر صمیم قلب سے مبارکباد قبول کریں، آپ اس ایوارڈ کے پورے طور پر مستحق ہیں۔ ایران سوسائٹی کو فخر ہے کہ آپ جیسے اسکالروں کا تعلق اس سے ہے۔) آپ کا۔ ایم۔ اے مجید

(جنرل سکریٹری ایران سوسائٹی)

کلکتہ، ۱۹ر اگست سنہ میرے معزز مولانا صاحب! السلام علیکم

ابھی ابھی صبح کے ریڈیو پر یہ خبر سنی کہ آپ کو صدر تی ایوارڈ ملا ہے، میری طرف سے قلب کی گہرائیوں سے مبارکباد قبول کیجیے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے، کہ آیندہ آپ کو اور بھی اعزاز سے نوازے۔

کے۔ ایم۔ یوسف (سینیر گورنمنٹ ایڈوکیٹ ہائی کورٹ کلکتہ)

جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دلی، ۲۵ر اگست سنہ۔

برادر محترم! السلام علیکم

۲۲ر اگست کے اخبار سے معلوم ہوا کہ اس سال آپ کو فارسی اسکالر کا انعام حکومت ہند کی طرف سے دیا گیا، خیال آیا کہ اگر فوراً ہی خط لکھا تو خطوں کے اس انبار میں کھو کر رہ جائے گا جو آپ ان دنوں وصول کر رہے ہونگے۔ اس لیے چند روز انتظار کرنا ہی مناسب سمجھا اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس ملک میں اب اشخاص کے بجائے ان کے کاموں کو تسلیم کیا جانے لگا، اگر یہ ذہنیت شروع سے رہی ہوتی تو یہ خط آج سے کئی برس پہلے لکھ چکا ہوتا۔ بہرحال یقین مانیے، جیسے اپنے گھر کی بات ہو، میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے، اللہ تعالیٰ مزید انعامات سے نوازے، آج مولانا (مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم) ہوتے تو وہ کتنا خوش ہوتے۔ آپ کا مخلص مشیرالحق

(صدر ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اینڈ عرب ایرانین اسٹڈیز)

لکھنؤ، ۱۵ر اگست سنہ کرمی زاد عنایتکم، سلام مسنون، عید مبارک!

آج صبح اخبار سے یہ خبر مسرت اثر ملی کہ آپ کو فارسی کا اعزاز بارگاہ صدارت سے ملا ہے، اس اعزاز پر مخلصانہ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ نیازمند حکیم عبدالقوی (ایڈیٹر صدق جدید)

پھولپور الہ آباد - ۸ر ستمبر سنہ محترم بھائی صاحب!

پرسوں ایک ہندی اخبار میں اس تقریب کی ایک مختصر خبر چھپی تھی، جو آپ کے اعزاز میں

اعظم گڈھ میں کی گئی تھی، شاید قومی اخبار میں چھپی ہو جو یہاں ملتا نہیں اس سے معلوم ہوا کہ اس سال یوم آزادی کے موقع پر صدر جمہوریہ نے آپ کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں سند عطا کی ہے، یہ اعزاز جس کے آپ ہر اعتبار سے مستحق تھے، مبارک ہو، بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کی طویل اور بے لوث خدمات کا اعتراف کیا گیا، دراصل یہ اعزاز تو آپ کو مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہاتھوں سے ملنا تھا۔

مخلص خلیل الرب (سابق ڈپٹی ڈائرکٹر اردو محکمہ تعلیم یوپی)

نئی دلی۔ ۲۴ اگست ۱۹۸۰ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم

بڑی خوشی ہے کہ حکومت نے آپ کو اعزاز عطا کیا، مبارکباد! آپ اسکے ہر طرح مستحق تھے، اور انعام آپ کو بہت پہلے مل جانا چاہئے تھا۔

آپ کا احسان علی (ایسوسی ایٹ ایڈیٹر۔ اسٹڈیز ان اسلام)

محترم و معظم جناب سید صباح الدین صاحب زید مجدہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اس سال ۱۵ اگست کے موقع پر فارسی کا علمی ایوارڈ آپ کو دیا گیا، اس بات سے بے حد مسرت ہوئی، اور حق بحقدار رسید، یہ انتخاب واقعۃً بہت صحیح اور حق شناسی کا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو مبارک کرے، اور اس مسرت کو زیادہ سے زیادہ آپ کے لیے اور سب اہلِ تعلق کے لیے فرحت کا ذریعہ بنائے، میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کیجئے، آپ کی تحقیق اور مطالعہ کی مشغولیت اور ہمہ وقت علمی خدمت بذات خود قدر دانی کی مستحق تھی، میں سمجھتا ہوں کہ اس طریقہ سے دارالمصنفین کی بھی قدر افزائی ہوئی ہے، اور ملک میں دارالمصنفین کی جو واقعۃً حیثیت ہے اس کو کسی حد تک حکومت کی طرف سے خراجِ تحسین ملا ہے، اللہ تعالیٰ مبارک کرے۔ والسلام

شریک مسرت خاکسار محمد رابع ندوی (عمید کلیۃ الادب دارالعلوم ندوۃ)

ندوۃ العلماء لکھنؤ، ۱۷ اگست ۱۹۸۱ء۔ محترم گرامی جناب صباح الدین صاحب، السلام علیکم

خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں، کئی دن سے خیال تھا کہ عریضہ لکھوں لیکن آج نوبت آ

مجھے راستے بریلی پہونچ کر ہی آپ کے ایوارڈ کی خوش خبری ملی تھی، اللہ تعالیٰ ہر طرح اسکو مبارک فر

والسلام معین اللہ ندوی (نائب ناظم ندوۃ العلماء

حیدرآباد، ۱۳ ستمبر ۱۹۸۱ء۔ مکرمی و محترمی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

چند دن پہلے یہاں کے ایک اردو اخبار میں ایک سطری خبر میں اسکی اطلاع چھپی تھی کہ جنا

کو فارسی زبان و ادب کی خدمات کے سلسلہ میں اعزاز سے نوازا لیکن اخبار میں نام بالکل غلط

تھا، اگست ۱۹۸۱ء کا معارف آیا تو شذرات میں آپکے قلم سے یہ خبر دیکھی تو اسکی توثیق ہوئی اطمینان

ہے کہ بقول جناب، حکومت ہند علم و ادب کے خاموش خدمت گزاروں اور عزلت پسندوں پر بھی نظر رکھتی

بھی ہاں، نظر تو رکھتی ہے لیکن شاید دیکھتی ہے دوسروں کی نظر سے، ورنہ اسکا اعتراف بہت پہلے ہو

اور اس اعزاز کے آپ بہت پہلے مستحق ہو چکے تھے، آپنے اس عرصہ میں جو اہم خدمات انجام دیں اور جو

کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، انھوں نے جریدۂ علم و ادب پر آپ کے نقوش کو اتنا گہرا ثبت کر دیا ہے کہ عا

علم و ادب کبھی انھیں فراموش نہیں کر سکتا بلکہ جب تک اردو زبان اور اس میں علم و فن باقی رہیں گے آ

رشحات چمکتے رہیں گے، دنیائے علم و فن میں آپ کی علمی و ادبی حیثیت کو تسلیم کر لیا ہے، حکومت کے اس اعترا

و نوازش پر دلی مبارکباد قبول کیجئے، میرے خیال میں اس اعتراف سے اپنا وقار قائم کیا ہے،

چودھویں صدی ہجری کے اختتام کی مناسبت سے آپنے معارف کے شذرات میں مسلم

کے گزشتہ کارہائے نمایاں کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا میں نے انھیں بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھا

آپ نے جس انداز سے ہماری تاریخ کی علمی ادبی اور فنی روداد کا جائزہ لیا ہے، وہ لائق ستائش

ہے، یقین جانئے مجھے تو ایسا محسوس ہوا کہ میں آموختہ دہرا رہا ہوں، اگست کے پرچہ میں متشرقین

اور مغربی ماہرین کی خشت زنی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ایک ایسی حقیقت ہے، جس کا انکار کوئی منصف مزاج شخص نہیں کرسکتا، آپ نے تو نام نہاد عرب اسکالرز (یعنی جو خود غیر مسلم نسلاً عرب ہیں) کا حوالہ دیا ہی نہیں، انھوں نے بالواسطہ طریقہ پر ہماری تاریخ ہی کی صورت بگاڑنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسلام کی بعض اہم تعلیمات کو بھی مسخ کرنے یا ان سے متعلق الفاظ کے غلط معنی بتاکر ہمارے دین پر بھی کاری ضرب لگانے کی کوشش کی ہے، المنجد عربی کی اہم لغت ہے، عرب علماء نے نشان دہی کی ہے آپ کو محض مثال کے لیے یہ بتاؤں کہ طلقاء جمع طلیق کے معنی لکھے ہیں "الذین ادخلوا فی الاسلام کرھا" یعنی جن لوگوں کو اسلام میں زبردستی داخل کیا گیا، اب اس معنی کو آنحضرتؐ کے فتح مکہ کے موقع پر کہے گئے جملہ کو سامنے رکھ کر پڑھیے تو کیا نتیجہ نکلے گا، تاریخ انسانی کا اتنا بڑا اخلاقی کارنامہ، تاریخ انسانی کا کتنا بڑا وحشیانہ کام ہو جائیگا، ضرورت اسکی تھی کہ پڑھے لکھے صاحب نظر نوجوان علماء کی ایک جماعت ان علمی وادبی جرائم کی پردہ دری پر کمربستہ ہو کر میدان میں آجائے اور ان لوگوں کے چہروں سے علم وادب کے یہ جھوٹے نقاب اٹھا کر پھینک دے۔

قرآن اور اس سے متفرع علوم وفنون سے متعلق ڈاکٹر نذیر احمد صاحبؒ کا مضمون بہت عالمانہ اور محققانہ ہے، میں نے اس سے بہت ہی استفادہ کیا، خاص طور پر اس وجہ سے بھی کہ میں نے اپنی کتاب تاریخ ادب عربی جلد دوم کیلئے قرآن کا باب ابھی مکمل کیا ہے، میرا خیال ہو کہ ڈاکٹر صاحب کے مضمون کی افادیت مکمل نہ ہوگی اگر میرا مضمون بھی شائع نہ کیا جائے اس مضمون میں قرآن کی جمع وتدوین کے علاوہ اسکے ادبی ولغوی کمالات کو اجاگر کرکے یہ دکھایا گیا ہو کہ قرآن کی کسوٹی عربی نہیں بلکہ قرآن کریم عربی زبان وادب کی کسوٹی ہے، اگر آپ مناسب سمجھیں تو ایک سطر جواب میں تحریر فرمائیے، میں مضمون کو بھیجدوں آپ مناسب سمجھیں تو شائع کریں۔

آپ کے شذرات پڑھ کر لکھنے کا ارادہ بہت دنوں سے کر رہا تھا مگر انڈ ازکی تقریب نے اس ارادہ کو عملی جامہ پہنا دیا اور اتنا لمبا خط لکھ ڈالا۔

آپ کا مخلص عبد الحلیم ندوی

(صدر شعبۂ عربی سنٹرل انسٹیٹوٹ آف انگلش اینڈ فارن لنگویجز)

علی گڑھ ۔ ۱۹ اگست ۸۰ء   مخدوم و مکرم ۔ زاد مجدکم

اب کی بار فارسی کا جو ایوارڈ آپ کو ملا ہے اس سے قلبی مسرت ہوئی، اللہ مبارک کرے، خدا کرے مزاج گرامی عافیت ہو۔   والسلام ۔ محمد تقی امینی ۔ (ناظم شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی)

اکبر پور ضلع فیض آباد ۔ ۱۵ اگست ۸۰ء   حضرت سید المحترم ۔ سلام علیکم

عید سعید اور یوم آزادی مبارک ہو، قومی آواز سے آپکے فارسی کی سند اعزاز، صدر جمہوریہ کی طرف سے جاری ہونے کی بشارت پاکے نہایت مسرت ہوئی، میری مخلصانہ اور مودبانہ تہنیت کو قبول فرمائیں، مسرت محض اس بات کی نہیں ہے کہ انفرادی طور پر آپ کی خدمات کو تسلیم کیا گیا بلکہ اسکی بھی ہے کہ حکومت کی نظر گوشہ نشین اور عزلت پسند خادمان قرطاس و قلم تک پہونچ گئی، یقینی طور پر اس سند سے دارالمصنفین کی خدمات کو بھی استناد ملا ہے، یہ بھی اہم بات ہے، توقع یہی ہے کہ اس توسیع سے سکون و یکسوئی کے ساتھ علمی خدمات بجالانے میں سہولت ہوگی اور علمی ثمرات مستحقوں تک پہونچنے کی مقدار میں اضافہ ہوگا، اور رفتار میں سرعت آئے گی۔ اللہ المستعان، آخر میں ایک بار پھر مبارکباد

ارادت کیش سید محمد نقوی (سابق چیرمین اکبر پور میونسپل بورڈ)

انجمن استادان فارسی ہند دہلی ۔ ۵ ستمبر ۸۰ء ۔   (انگریزی میں)

پیارے جناب صباح الدین صاحب

انجمن استادان فارسی ہند کی طرف سے میں آپ کو صدر کی طرف سے جو سرٹیفکٹ آف آنر ملا ہے اس کیلئے مبارکباد پیش کرتا ہوں، یہی موقع ہے کہ جب ہم سب لوگ آپ کی مسرت میں شرکت کریں اور آپ کیلئے دعا کریں کہ آپ آئندہ ایک خوشحال پرامن زندگی بسر کریں تاکہ آئندہ فارسی علم و ادب کی بھی عظیم تر خدمات انجام دے سکیں۔

انجمن استادان فارسی ہند کی یہ بڑی عزت افزائی ہوگی کہ جب آپ یہ سرٹیفکٹ آف آنر صدر جمہوریہ ہند سے لینے کیلئے آئیں تو ایک شام اس انجمن کے ساتھ بھی گزاریں۔

آپ کا مخلص نور الحسن انصاری (جنرل سکریٹری انجمن استادان فارسی ہند)

علی گڑھ ۱۰ اگست ء کرمی، السلام علیکم

یہ معلوم کر کے دلی مسرت ہوئی کہ حکومت ہند نے یوم آزادی کے مبارک موقع پر آپ کو فارسی کا ایوارڈ عنایت کیا ہے، آپ کی علمی خدمت کے پیش نظر آپ کو اسے پہلے ملنا چاہئے تھا، تاہم دیر آید درست آید کے مصداق مخلصانہ مبارکباد قبول فرمائیں، امید ہے کہ آپ کی علمی فتوحات برابر جاری رہیں گی اور آپ کی ذات سے علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندوی کی روایات تازہ رہیں گی۔

نیازمند ریاض الرحمٰن شروانی (ریڈر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی)

بمبئی ۲۰ اگست ء۔ جناب قبلہ سید صاحب سلام مسنون

معارف کے شذرات میں یہ خبر پڑھی کہ آپ کو صدر جمہوریہ ہند نے سرٹیفکٹ آف آنر کے اعزاز سے نوازا ہے، خدا کا شکر ہے کہ علم و ادب میں آپ کی بے لوث خدمت کا اعتراف کیا گیا یقیناً یہ اعتراف دیر سے کیا گیا، آپ جیسے مخلص اور خاموش خدمت گزاروں کو یہ اعزاز دے کر حکومت نے اعزاز کے وقار کو بلند کیا ہے، آپ کی گراں بہا خدمات اس اعزاز سے بالاتر ہیں، خدا مبارک کرے اور دین و دنیا اور علم و ادب کی خدمت کے لیے صحت و تندرستی، سکون و فراغ عطا فرمائے آمین، میری دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

خادم، فرید انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ

نئی دلی ۲۰ اگست ء برادر محترم - آداب و نیاز

آپ اس مسرت کا اندازہ نہیں لگا سکتے جو مجھے آپ کو یوم آزادی پر سرکاری اعزاز ملنے پر ہوئی، علم اللہ کا دیا ہوا انعام ہے لیکن اس کا اعتراف ارباب علم و فن کے توسط سے بے پناہ فضیلت کا آئینہ دار۔ نیازکیش۔ اوم پرکاش بجاج

لکھنؤ، یکم اگست ء مشفق محترم و مکرم زید لطفہ السلام علیکم و رحمۃ اللہ

اخبار میں یہ خبر مسرت اثر پڑھی تھی، کہ صدر جمہوریہ نے اس سال فارسی ادب کا اعزاز آپ کو عطا کیا ہے، خبر پڑھ کر دل نے گواہی دی کہ حق بحقدار رسید، یہ اعزاز آنجناب کو بہت پہلے مل جانا چاہیے تھا، مگر

اب بھی غنیمت ہے کہ یہاں بھی حلقوں میں بھی آپ کی علمی خدمت اور تاریخی تحقیقات کا اعتراف کیا گیا، آپ کا اصل اعزاز تو وہ خاموش اعتراف ہے جو اہل نظر آپ کی تصنیفات اور تاریخی کتابوں سے استفادہ کے وقت کرتے ہیں، جنھوں نے ہندوستان کے اسلامی عہد کے تابندہ نقوش کو اجاگر کر دیا ہے، اہم اس موقع پر دلی مسرت کا اظہار کرتے ہیں اور آپ کی خدمت میں مخلصانہ مبارکباد پیش کرتے ہیں اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ آپ عرصۂ دراز تک علم و ادب کی خدمت کرتے رہیں، ادھر معارف میں آپ کے شذرات سید صاحب اور شاہ صاحب کے جرات مندانہ اور مبصرانہ شذرات کی یاد تازہ کر رہے ہیں، فجزاکم اللہ احسن الجزا

والسلام مخلص و نیازمند شمس تبریز خان

کلکتہ ۔ ۲۰/ اگست [illegible]   محترم گرامی قدر سلام مسنون

اگست کا معارف موصول ہوا اس میں آپ نے جو شذرات لکھے ہیں وہ صحیح ہیں اور میں آپ سے پورا اتفاق کرتا ہوں، اس شمارہ سے یہ معلوم کرکے بے حد خوشی ہوئی کہ صدر جمہوریہ ہند نے آپ کو سرٹیفکیٹ آف آنر سے نوازا ہے، آپ اس سے زیادہ کے مستحق ہیں، میں آپ کو یہ اعزاز ملنے پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں

والسلام مخلص محمد صابر خان کان اللہ لہ (سابق ممبر پبلک سروس کمیشن)

جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۔ ۲۹/ اگست [illegible]   مکرم و محترم   سلام مسنون

ہم تمام لوگوں کے لیے یہ خبر انتہائی خوش کن اور مسرت بخش ہے کہ امسال فارسی کا انعام آپ کے نام نامی پر ہے، اگرچہ آپ کی خدمات بے حساب اور بے اندازہ ہیں اور ان کا دوام خود بہت بڑا انعام ہوگا، پھر بھی حکومت ہند کے اس فیصلہ پر میں آپ کو دلی مبارکباد بھیجتا ہوں، از راہ نوازش قبول فرمائیے، خدا سے یہی دعا ہے کہ فارسی کی دنیا آپ کی گرانقدر اور پر [illegible] تصنیفات سے مالامال ہوتی رہے، اور اس قسم کے اعزاز سے نوازے جانے کا سلسلہ بھی جاری رہے،

والسلام نیازمند شعیب اعظمی (ریڈر شعبۂ فارسی)

مدراس۔ ۲۰ اگست ۱۹۸۸ء مکرمی تسلیمات

پریسیڈنٹ ایوارڈ کے لیے مبارکباد قبول فرمائیے، خوشی ہے کہ یہ ایوارڈ ایک حقیقی اسکالر کو ملا۔ خیام تقریبات کے دوران کلکتہ میں ہماری ملاقات ہوئی تھی، اس بات پر مجھے ناز ہے کہ تین دن آپ کے ساتھ ہی قیام کرنے کا فخر مجھے حاصل ہے،

والسلام۔ سید صفی اللہ لکچرر مدراس یونیورسٹی

بمبئی۔ ۲۲ اگست ۱۹۸۸ء محترم المقام زید مجدکم، ہدیہ سلام مسنون

یہاں اخباروں میں یہ پڑھ کر نہایت مسرت ہوئی کہ امسال یوم آزادی کے موقع پر صدر جمہوریہ کی طرف سے آپ کو علمی اعزاز سے نوازا گیا، میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ یہ اعزاز تو آپ کو بہت پہلے ملنا چاہئے تھا، لیکن ارباب حکومت کو بہت دیر میں یاد آیا، بہرحال آپ اس کے نہ صرف مستحق بلکہ آپ جیسے عظیم مصنف محقق ادیب کی وجہ سے اس اعزاز کو چار چاند لگ گئے ہیں، آپ کے قلم سے تحقیقی کتابوں علمی کارناموں، ادبی و تنقیدی مقالات کا جو گراں بہا ذخیرہ تیار ہوا ہے، اس کے مقابلہ میں یہ اعزاز بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، پھر بھی خوشی اس بات کی ہے کہ آپ کی عظیم خدمات کا اعتراف تو کیا گیا، آپنے جس بے لوثی، جذبہ ایثار، عالی ہمتی اور صبر و استقلال کے ساتھ دارالمصنفین کو سنبھالا ہے اور اس کی عظمت و وقار، شہرت و ناموری اور اسکی شاندار روایات کو برقرار رکھنے میں جو انتھک جد و جہد کی ہے اس کا اعتراف ہر اس شخص کو ہے، جو اس ادارہ کے مقاصد، اسکی تاریخ اور اسکی علمی اہمیت سے واقف ہے، آپ کی ہمت مردانہ اور خداداد انتظامی صلاحیتوں نے اس ادارہ کو استحکام بخشا، اس کے آڑے وقت میں ایسی صورت پیدا کردی جس سے توقع ہو چلی کہ اب اسکا فیض پورا برابر جاری رہے گا، آپنے انتظامی مصروفیتوں کے باوجود اتنی بڑی ضخیم اور محققانہ کتابیں کیسے تصنیف کیں اس پر مجھے کیا بلکہ بہتوں کو حیرت ہے،

[illegible] معنون ہیں

بعض تو کہتے ہیں کہ شبلی و سلیمان کا رنگ اب کسی کے یہاں ملتا ہے تو آپ کی تحریروں میں۔

والسلام آپ کا مخلص عبد الرحمن پرواز اصلاحی

پٹنہ۔ ۱۱ر اگست [illegible]ء   محترم المقام جناب صباح الدین صاحب قبلہ السلیمانی

فارسی زبان و ادب کی خدمات کے صلہ میں حکومت ہند کی جانب سے آپ کو اعزاز سے نوازا گیا، یہ سنکر بے انتہا مسرت ہوئی اور بے ساختہ یہ فقرہ زبان پر آگیا کہ حق بحقدار رسید گرچہ بدیر، اس میمون و مسعود موقع پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمایئے اور مجھے شکر گزار ہونے کا موقع عنایت کیجئے اللہ کرے آپ بصحت و عافیت ہوں۔   طالب علم شرف عالم۔ لکچرر بی۔ این کالج پٹنہ یونیورسٹی

بمبئی۔ ۵ ۲ر اگست [illegible]ء۔   محترم سلام مسنون

گورنمنٹ آف انڈیا نے آپ کو فارسی زبان و ادب کی گرانقدر خدمات کیلئے سرٹیفکٹ آف آنر سے نوازا ہے بڑی مسرت ہوئی، میری جانب سے مبارکباد قبول فرمایئے۔ مخلص ڈاکٹر این۔ ایس گورکر سینٹ زیویر کالج۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دلی۔ ۲۵ اگست [illegible]ء۔   محترم صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب۔ السلام علیکم

پندرہ اگست کو اخباروں سے معلوم ہوا کہ صدر جمہوریہ نے یوم آزادی کے موقع پر آپ کو فارسی کے ایک مایہ ناز عالم کی حیثیت سے علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر آپ کو سرٹیفکٹ آف آنر عطا کیا ہے، دلی مبارکباد قبول فرمایئے، ملک کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کے بڑے بڑے مراکز سے دور رہ کر آپ خاموشی اور لگن کے ساتھ مقابلۃً بے سر و سامانی کے عالم میں جو علمی خدمت ملک و قوم کی کر رہے ہیں اس کے پیش نظر آپ اس اعزاز کے بہت پہلے مستحق ہو چکے تھے آپ کے مضامین اور کتابیں اسلاف کے کارناموں کو جس انداز سے قوم کی نئی پود کے سامنے لا رہی ہیں اس سے ان کا احساس کمتری ختم ہوتا ہے اور ان میں بھروسہ اور یقین کی ایک نئی لہر پیدا ہوتی ہے، خدا تا دیر آپ کو ہم لوگوں کی رہنمائی کے لیے سلامت رکھے۔ آمین۔

آپ کا مخلص شہاب الدین انصاری۔ (لائبریرین ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری)

مطبوعات جدیدہ

سفر آخرت کے آداب و احکام، { مرتبہ مولانا نبیہ محمد صاحب فیض آبادی تقطیع خورد، کاغذ معمولی کتابت و طباعت قدرے اچھی صفحات ۸۰، قیمت آٹھ روپے۔

ناشر مکتبہ الفیض، جلال پور، ضلع فیض آباد۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس مفید کتاب میں مرض الموت سے وفات تک کے ضروری احکام و مسائل بیان کیے گئے ہیں، پہلے دنیوی زندگی کی بے وقعتی و ناپائداری اور اس سے تمتع کی جائز صورتوں کا ذکر ہے، پھر تکلیفوں اور بیماریوں نیز ان کے علاج کا بیان ہے، اور شریعت میں مرض کے اعتبار بیماری کے زمانہ میں عبادات و احکام کے سقوط و تخفیف، مرض کی حالت میں انجام دئے گئے معاملات کی نوعیت، مریض کی عبادت کی فضیلت اور نزع و جانکنی کے وقت کے حالات و شرعی احکام تحریر کیے گئے ہیں پھر میت کے غسل کفن، نماز جنازہ، دفن اور قبر کے ضروری احکام، عذاب قبر، موت کے بعد کام آنے والی چیزیں یعنی میت کا ایمان و عمل صالح، فضل خداوندی اس کیلئے دوسروں کی دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کا ذکر ہے، اسیطرح زیارت قبور کے احکام میت کے مال میں تصرف اور اسکی تقسیم کے مسائل، میت کے متعلقین کے صبر کی فضیلت، نوحہ کی ممانعت اور سوگ کی شرعی نوعیت بتائی گئی ہے، مصنف نے مرض و موت کے سلسلہ کی متعدد غلط رسموں کو ترک کرنے کی تلقین بھی کی ہے اور آخر میں موت و آخرت سے متعلق چند موثر نظمیں نقل کی ہیں، اس کتاب کے اکثر احکام و مسائل احادیث و فقہ کی کتابوں سے ماخوذ ہیں ان سے کسی کو جزئی اور فقہی اختلاف تو ہو سکتا ہے مگر یہ کتاب بہت مفید اور کارآمد ہے، عموماً پڑھے لکھے لوگ بھی ان مسائل سے ناواقف ہوتے ہیں اس لئے اس کتاب کو ہر مسلمان گھر میں ہونا چاہیے۔

اسلام اور عصر حاضر، مرتبہ مولانا عبد … صاحب ندوی، متوسط تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات …، مجلد مع گرد پوش، قیمت … روپے، پتہ: مطبوعات … کمپنی …

اس کتاب میں اسلام کی بعض اہم تعلیمات و خصوصیات بیان کرکے دکھایا گیا ہے کہ یہ مذہب دنیا کی موجودہ بے چینی اور پریشانی کو دور کرسکتا ہے، سائنس اپنی گوناگوں ایجادات کے باوجود انسانی زندگی کے مسائل حل کرنے میں اسلئے عاجز ہے کہ وہ روحانیت و مذہب کو نظرانداز کرکے مادی وسائل میں امن و سکون تلاش کر رہی ہے، ان کے نزدیک سائنس کی مختلف کی نت نئی دریافتوں اور ایجادات سے نہ تو مذہب کی بنیادیں متزلزل ہوئی ہیں اور نہ اسلام کی صداقت پر کوئی زد آئی ہے، ان کا خیال ہے کہ سائنس کا ٹکراؤ ان مذاہب سے ہے جو مسخ ہوکر اپنی حقیقت کھو بیٹھے ہیں اور اب محض فرسودہ رسم و رواج کا مجموعہ ہوگئے ہیں، اس سلسلہ میں وہ یہودیت و نصرانیت کے علمبرداروں کے کردار اور ناعاقبت اندیشی کو مذہب بیزاری کا سبب قرار دیتے ہیں، اور بتاتے ہیں کہ جب سائنسدانوں نے ان کے خلاف عقل عقائد و اعمال پر اعتراضات کئے تو انھوں نے ان کا جواب دینے کے بجائے سائنس کی تحقیقات ہی کو دبا دینے کی کوشش شروع کیا، اس کے برعکس اسلام دین فطرت اور عقل و شعور کی اہمیت کا قائل ہے اور وہی دنیا کی رہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہے اور سائنس کی ترقیاں اس کے خلاف نہیں بلکہ اس کی حقانیت کا واضح ثبوت ہیں، یہ کتاب سنجیدہ ہے اور تحریر میں شائستگی ہے، اصولی حیثیت سے مصنف کا نقطۂ نظر بھی درست ہے، اگر ان کا سائنسی مطالعہ براہ راست ہوتا تو یہ کتاب اور مفید ہوتی، کہیں کہیں قرآنی آیتوں کے سمجھنے میں غلطی ہوگئی ہے، جیسے وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ میں ضمیر کا مرجع قرآن مجید ہے نہ کہ نبوت محمدی، لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ میں مسلمانوں سے خطاب ہے، نہ کہ اہل کتاب سے (ص ۲۴)، ص ۹۲ پر ایک حدیث کے بعد ہی ایک آیت اس طرح نقل کی گئی ہے کہ دونوں میں امتیاز مشکل ہوگیا ہے، ص ۱۲۸ پر ایک آیت کے ایک فقرہ کا ترجمہ رہ گیا ہے، ص ۲۱۳ پر سورۂ اسریٰ کے حوالہ سے جس آیت کا ترجمہ دیا ہے وہ سورہ یوسف کی ہے، اس کے ترجمے میں بھی سہو ہوگیا ہے، ص ۳۹ و ۴۰ پر موسیٰ و خضر کا واقعہ بلا حوالہ دیا گیا ہے، متاع کا لفظ مونث ہے، اس کو مذکر لکھا ہے، (ص ۲۱) "ض"

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰

نومبر سنہ ۱۹۸۰ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

قیمت پندرہ ۱۵ روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(مہتمم سید اقبال احمد)

دارالمصنفین کی نئی کتاب

غالب مدح و قدح کی روشنی میں

غالب کی زندگی سے لے کر ۱۹۶۹ء تک غالب کی مدح و قدح میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا پوری دیدہ وری کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے، اور اس پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے، اس کے دو حصے ہیں،

حصہ اول

اس میں مرزا غالب کی زندگی سے ۱۹۲۸ء تک اُن کی حمایت و مخالفت میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر تبصرہ کیا گیا ہے،

قیمت:- ۱۸ روپئے،

حصہ دوم

اس میں مرزا غالب کی حمایت و مخالفت میں ۱۹۲۹ء سے ۱۹۶۹ء تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر تبصرہ کیا گیا ہے،

قیمت:- ۱۷ روپے،

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

جلد ۱۲۶ ماہ محرم الحرام سنہ ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ نومبر سنہ ۱۹۸۰ء عدد ۵

مضامین

مقالات

وفیات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

معارف کے شذرات میں جہاں چودہ سو سال کے اندر کے بہت سے واقعات کا جائزہ لیا گیا ہے وہاں یہ بھی محاسبہ کرتا ہے کہ اس عرصہ میں مسلمانوں میں کتنے غدار پیدا ہوئے جن سے ملت میں ابتری پھیلی

غداری کا سب سے بڑا واقعہ کربلا کا سانحہ ہے، کوفہ کے لوگوں کی دعوت پر امام حسین علیہ السلام مدینہ منورہ سے روانہ ہو رہے تھے، تو ابن مطیع نے ان سے عرض کیا کہ خدا کے لئے کوفہ کا قصد نہ فرمائیں، وہاں کے لوگ بڑے غدار ہیں، ان کے والد بزرگوار اور بھائی دونوں کو دھوکہ دے چکے ہیں، عراق کے لوگوں کا اصرار بڑھا تو امام حسینؓ نے اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو صحیح حالات معلوم کرنے کے لئے کوفہ بھیجا، وہ وہاں پہونچے تو اٹھارہ ہزار کوفیوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی، مگر جب انھوں نے عبید اللہ بن زیاد کے قصر امارت کو گھیر لیا اور اس کی پسپائی یقینی تھی تو ان کے ساتھیوں نے ان کو چھوڑنا شروع کر دیا، اٹھارہ ہزار آدمیوں میں صرف تیس آدمی ساتھ رہ گئے، وہ دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے، اپنے قتل کئے جانے سے پہلے ابن اشعث کے ذریعہ سے امام حسینؓ کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ ان کے انجام کو دیکھ کر کوفہ والوں پر ہرگز اعتبار نہ کریں مگر وہ ابن اشعث یہ پیغام پہونچانے کے قبل ہی قتل کر دیئے گئے۔ عمرو بن عبد الرحمٰن اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ دونوں کو یقین تھا کہ جن لوگوں نے امام حسینؓ کو دعوت دی ہے، وہی ان کو جھٹلا کر بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے، یہی ہوا، امام حسینؓ حق و صداقت کی خاطر شہید ہوئے، اور اپنے خون سے کوفہ کی سرزمین کو شفق آلود اور لالہ زار کر دیا،

اموی فرمانروا عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں حجاج بن یوسف ثقفی نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو مغلوب کرنے میں خانہ کعبہ پر سنگ باری کر کے اسکو جو نقصان پہونچایا، وہ تاریخ اسلام کا ایک سنگین واقعہ ہے، جس کو نہ صرف مسلمانوں بلکہ اسلام سے غداری ہی پر محمول کرنا صحیح ہوگا، گو عبدالملک نے اس کی عمارت درست کرائی، مگر اس کی جو بے حرمتی ہوئی اس کی تلافی نہیں ہو سکی،

بنو امیہ کے آخری دور میں ابومسلم خراسانی کو بڑا عروج ہوا، وہ عجمی النسل اور پارسی نژاد نومسلم تھا، اپنے عجمی تعصب میں عجمیوں کی حکومت کے خاتمہ کو بھولا نہ تھا، وہ عربوں سے اپنی نفرت میں ان سے انتقام لینے کی فکر میں رہتا، مگر بظاہر انکا دوست بنا رہا، بنو امیہ کے حامی قبیلوں میں سے مضریوں یمنیوں اور ربیعوں کو الگ الگ اپنی ہمدردی کا یقین دلاتا، مگر چپکے چپکے ان کے اختلاف کی آگ سلگاتا رہا، اس اختلاف میں انکے سربرآوردہ لوگوں کو قتل کرایا، پھر خود خراسان اور مرو پر قابض ہوگیا جس کے بعد امویوں اور عباسیوں کے اختلافات کو ایسی ہوا دی کہ عباسی امویوں سے برسرپیکار ہوئے تو ان کو ڈنڈوں سے پٹوا کر مروایا، انکی نیم بسمل لاشوں پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا، ان کی قبریں کھدوا کر ان کی خاک برباد کی، ہشام بن عبدالملک کی لاش سالم نکلی تو اسکو سولی پر لٹکا کر جلا دیا، اس طرح امویوں کو کربلا اور خانہ کعبہ کی سنگ باری کے سانحے کی سزا تو ضرور مل گئی، مگر عباسیوں نے انکے ساتھ جو بہیمانہ سلوک کیا، وہ قرآن پاک کے اس حکم سے غداری تھی، جس میں یہ تعلیم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں میں ایسی محبت والفت پیدا کردی جو بڑے سے بڑا خزانہ صرف کر کے وہ حاصل نہیں کر سکتے تھے، (الانفال ۸- آیت ۶۳) بنو عباس اپنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح جانشین سمجھتے تھے، آپ نے فتح مکہ کے بعد اپنے شدید دشمنوں سے روادارانہ برتاؤ کی شاندار روایت قائم کی تھی، اس سے بنو عباس نے غداری کی،

اس قتل و خونریزی، میں ابومسلم خراسانی بھی ساتھ رہا، مورخین کا بیان ہے کہ اس نے چھ لاکھ

ادریس کا خون کیا اور اپنے کو عباسی حکومت کا بہی خواہ ظاہر کیا، اس نے پہلے تو امامت حضرت کی بنا پر منصور کے زمانہ میں بغاوت کر کے علوی حکومت قائم کرنے کا قصد کیا، پھر وہاں سے اسماعیل بن سلیمان کا ایک اور بہانہ تھا منصور کو اس کی غداری کا یقین ہوا تو اس نے اس کو یہ کہہ کر قتل کرایا کہ غدار کی قسم ہے زمین پر اس سے زیادہ عباسیوں کا کوئی دشمن نہیں۔

عباسیوں کی پانچ سو برس کی حکومت کی مدت میں بہت سی بغاوتیں ہوتی رہیں، اگر کوئی بغاوت کسی حکمران کے ظلم کے خلاف ہوئی تو یہ حق بجانب تھی، مگر یہ بغاوتیں زیادہ تر ذاتی، نسلی، قبائلی، علاقائی اور فساد فی الارض کی خاطر ہوتی رہیں، ادریسی، طاہری، صفاری، اغلبی اور اسی طرح کی جو حکومتیں عباسیوں کے امپائر سے کٹ کر آزاد ہوتی گئیں وہ اگر بالکل قائم رہتیں تو ان کی علیحدگی میں کچھ جواز پیدا ہو جاتا، مگر یہ تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد ختم ہوتی گئیں، ہاں ان سے انکے علاقوں کو کچھ دنوں کے لیے تھوڑے فوائد تو ضرور پہونچے مگر ان کی علیحدگی سے مسلمانوں کے ایک امپائر کی سالمیت، مرکزیت اور یکجہتی قربان ہوتی رہی، یہ علیحدگی پسندی یقیناً غداری تھی پھر یہ علاقائی حکومتیں ایک دوسرے سے خونریز جنگ کر کے ایک دوسرے کو تباہ کرتی رہیں، مثلاً طاہریوں کو صفاریوں، آل بویہ کو سلجوقیوں، سامانیوں کو غزنویوں اور غزنویوں کو غوریوں نے ختم کیا، ان پر اسلامی اخوت کی قدروں سے غداری کا الزام نہیں آتا؟

صلیبی جنگ میں مسلمانوں کے بود و نابود کا سوال تھا، جب عماد الدین اتابک، نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی اسلام کی عزت و ناموس کی خاطر اپنے صلیبی دشمنوں سے سر بکف ہو کر لڑ رہے تھے تو دمشق کا مسلمان جاگیردار عماد الدین کے خلاف عیسائیوں سے مل گیا، مسلمانوں کی مصری حکومت نور الدین کی مخالف ہو کر صلیبیوں کی حلیف بن گئی، اسی طرح موصل کے والی سیف الدین غازی، اسکے جانشین عز الدین، اسکے چچا زاد بھائی عماد الدین اور دمشق کے امراء نے صلیبیوں سے مل کر صلاح الدین ایوبی کے خلاف سازش کی یہ سراسر اسلام سے غداری تھی، مگر اسلام کے جانباز اور سرفروش مجاہدوں نے ان غداروں کو زیر کر لیا۔

جب عباسی حکومت کمزور ہو رہی تھی تو شیعہ سنی کے اختلاف سے اور بے جان ہو گئی، اسکے آخری فرمانروا مستعصم پر اس کا شیعہ وزیر اعظم ابن علقمی حاوی تھا، وہ چاہتا تھا کہ اسکو مستعصم بھی مانتا، سیوطی کے بیان کے مطابق وہ پوشیدہ طور پر تاتاریوں سے ملا ہوا تھا، وہ عباسی حکومت کو تباہ کر کے علوی حکومت قائم کرنے کے بہانے سے اپنا ذاتی اقتدار چاہتا تھا، اسکی دعوت پر تاتاری بغداد پر

حملہ آور ہوگئے اور مستعصم باللہ غافل رہا، ابن خلدون کا بیان ہے کہ اس حملہ میں تمام مقتولین کی تعداد کا اندازہ سولہ لاکھ تھا، ابن علقمی کی یہ غداری تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیگی، عباسیوں نے امویوں کو ختم کرنے میں جو سفاکی دکھائی تھی اس کو زیادہ انکا المناک انجام ہوا،

اندلس میں عرب اور بربر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوکر برابر لڑتے رہے یہ خانہ جنگی شاخ در شاخ عربوں کی قبائلی جنگ بن گئی، شامی اور یمنی بھی ایک دوسرے کے دشمن بن گئے پہلے اندلس افریقہ کے ماتحت تھا اختلاف بڑھا تو بربروں نے افریقہ سے الگ ہوکر اندلس میں ایک آزاد حکومت قائم کر لی، خلیفہ ہشام نے بربروں کے استیصال کیلئے شامی لشکر بھیجا لیکن یہ شامی لشکری افریقہ کے قدیم باشندوں کے مخالف ہوکر انکے شدید دشمن ہوگئے، اس اختلاف میں دو بربریوں سے لڑے تو شکست کھا گئے، جس کے بعد بربری عربوں کو جہاں پاتے قتل کرتے، خلیفہ عبد الملک نے ایک جرار شامی لشکر بھیج کر بربریوں کو شکست فاش دی، جسکے بعد انکی قوت بالکل ختم ہو گئی، مگر خود عبد الملک اور شامیوں میں اختلاف ہوگیا، جس سے یمانیہ اور مضریہ میں ایسی خونریز جنگ ہوئی کہ مورخین کا بیان ہے کہ ایسی جنگ تاریخ میں کبھی نہیں ہوئی، رفتہ رفتہ یمانیوں کا وہاں سے استیصال ہوگیا، ان خانہ جنگیوں کی وجہ سے عیسائیوں کو موقع ملا اور الفانسو اندلس کے تقریباً چوتھائی حصہ کا مالک ہوگیا۔

اندلس میں مسلمانوں کی جو شاندار حکومت رہی، اس پر غیر جانبدار یورپین مورخین بھی فخر کرتے ہیں مگر اس کا زوال وہاں کی نفاق پروری سے شروع ہوا، بنو حماد، بنو عباد، بنو ذو النون، بنو ہود، بنو عامر، بنو ذو القوی، المورری، اور بنو حمار وغیرہ اس چھوٹے سے علاقہ میں اپنی اپنی علٰحدہ ریاستیں بنا کر آزاد ہوگئے، انکے انتشار سے عیسائیوں نے انکو آسانی سے مغلوب کر کے پورے اندلس کو ان سے خالی کرالیا، یہ بربریہ شامی، یہ بنو حمود، یہ بنو عباد، یہ بنو ہود، یہ بنو عامر وغیرہ نے محض قبائلی اور نسلی مفاد کی خاطر اندلس کے مسلمانوں کی مرکزیت اور یکجہتی کو برباد کیا، انکو کیا کہا جاسکتا ہے خود غرض مفاد پرست غدار۔

عثمانی فرمانروا یورپ اور ایشا میں پانچ سو برس تک حکومت کرتے رہے، اس مدت میں ایشائے کوچک، شام اور مصر میں بغاوتیں ہوئیں، انکی فوج میں ینی چری کی شورش اور سرکشی ہوتی رہی، سیاسی فتنے بھی اٹھتے رہے، جن سے اسلامی قدروں کی پامالی ہوتی رہی، مگر اسکی تاریخ کا دردناک واقعہ یہ بھی ہے کہ تیمور مسلمان تھا، مگر وہ سلطان بایزید جیسے جلیل القدر عثمانی

فرمانروا سے خونریز لڑائیاں ہوئیں اور انگورہ میں لڑا، سیواس کی لڑائی میں اس نے چار ہزار عیسائیوں کو زندہ دفن کرادیا، سلطان بایزید کے لڑکے ارطغرل اور بقیہ ترک سپاہیوں کو قتل کرایا، انگورہ کی لڑائی میں سلطان بایزید نے اپنی فوج خود بنائی کی، اسکی فوج میں تاتاری سپاہی بھی تھے، جو میدان جنگ میں اس سے ٹوٹ کر تیمور کی فوج سے جاملے اناطولیہ کی ترکی ریاستوں میں ایدین، منشا، صاروخان اور کرمیان کے دستے بھی عین موقع پر غدار ثابت ہوئے، اور وہ تیمور سے جا ملے سلطان بایزید اپنی سپہ گری اور سپہ سالاری کے پورے جوہر کے ساتھ لڑا، مگر شکست کھا کر تیمور کے ہاتھوں قید ہو گیا اور قیدی کی حیثیت سے جان بحق ہوا، اسکے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت عثمانیہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیگی، تیمور کو کیا کہا جائیگا، فاتح کشور کشا یا مسلمانوں کی ایک شاندار سلطنت کو پامال کرنے والا غدار،

عثمانی سلطنت پھر سنبھلی تو سلطان سلیم اول کو ایران کے شاہ اسمٰعیل صفوی سے جنگ کرنی پڑی، اس سلسلہ میں چالیس ہزار شیعے مارے گئے، سلیم شاہ اسمٰعیل صفوی کی فوج کو شکست دیکر تبریز میں فاتحانہ داخل ہوا، یہ مسلمان فرمانروا جا آپس میں لڑے، ان میں سے دونوں نے اسلامی حمیت سے غداری کی، مصر کے مملوک حکمراں قانصوہ غوری شاہ اسمٰعیل صفوی سے مل گیا، سلیم اول نے اس سے جنگ کی تو قانصوہ کے دو اہم فوجی سردار خیربے اور غزالی غداری کرکے سلیم سے جا ملے اور وہ جنگ میں مارا گیا، اسکے جانشین طومان بے نے مملوکوں کے فوجی دستوں کو از سر نو ترتیب دے کر سلیم اول سے بڑی سخت جنگ کی، جس میں پچیس ہزار مملوک سوار مارے گئے، فتح سلیم اول کو ہوئی، وہ قاہرہ میں داخل ہوا، تو اس نے پچاس ہزار آدمیوں کا قتل عام کرایا، ایک مملوک سردار قرطبے گرفتار ہو کر اس کے سامنے آیا تو اس نے خیربے کو دیکھ کر سلیم اول سے کہا کہ اس غدار کا سر اڑا دے ورنہ کہیں تجھے بھی یہ اپنے ساتھ جہنم میں گھسیٹ نہ لے جائے اور جب سلیم اول کے حکم سے قرطبے کا سر قلم ہونے لگا تو اس نے خیربے کی طرف متوجہ ہو کر کہا اے غدار میرے خون آلود سر کو لے جا اور اپنی بیوی کی گود میں ڈال دے خدا غدار کو اس کے فعل کا ویسا ہی بدلہ دے۔

مصر دولت عثمانیہ کے قلمرو میں رہ کر رفتہ رفتہ خود مختاری حاصل کرتا رہا، لیکن انیسویں صدی کے آخری نصف حصہ میں نہر سوئز تعمیر ہونے لگی تو مصر کے والی اسمٰعیل پاشا نے خدیو مصر کا لقب اختیار کرکے ترکوں سے

غداری کی انگلستان اور فرانس کو نہر سویز کا حصہ دار بنالیا، جس سے مصر ان دونوں ملکوں کے پاس گویا گروی ہوگیا، مصری فوج کو یہ پسند نہ آیا، اس نے عرابی پاشا کی رہنمائی میں بغاوت کی تو اسمٰعیل پاشا کو معزول ہونا پڑا، لیکن جب اسکا جانشین توفیق پاشا ہوا تو وہ غداری کر کے انگریزوں سے مل گیا، اس نے عرابی پاشا کے بہت سے فوجی افسروں کو رشوتیں دے کر اس سے غداری کرنے پر آمادہ کیا، ان ہی غداروں کی مدد سے انگریزوں نے عرابی پاشا کو پکڑ کر انکا جلاوطن کر دیا، جس کے بعد توفیق پاشا نے برطانوی سنگینوں کے سایہ میں مصر کی حکومت حاصل کی۔

پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں نے ٹرکش امپائر کے خلاف عرب قومیت کا جذبہ ابھارا، لارڈ کچنر نے مکے کے شریف حسین بن علی کو اس کے لڑکے امیر عبداللہ کے ذریعہ سے یہ پیام دیا کہ اگر وہ ترکوں کے خلاف اتحادیوں کا ساتھ دے تو اسکو حجاز کا خود مختار حکمران تسلیم کر لیا جائیگا، وہ اس غداری کے لئے تیار ہوگیا، لارڈ کچنر نے سامان جنگ خفیہ طور پر اس کے پاس بھیجا تو اس نے حجاز کی آزادی کا اعلان کر دیا، رشوتیں دے دے کر اس کے لڑکے امیر فیصل نے شام اور فلسطین کے عرب قبائل کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کر لیا، ٹی۔ ای۔ لارنس نے اس غداری کو خوب ہوا دی، ترکوں کی لاشوں پر شریف حسین کو حجاز کا خود مختار حکمران بنایا گیا، انگریزی فوج کے سایہ میں امیر فیصل دمشق میں داخل ہوا، اس غداری پر دنیا کے سارے مسلمان تلملا اٹھے اقبال نے اپنے دل کے پھپھولے ایک نظم لکھ کر توڑے جس کا ایک شعر یہ تھا۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفےٰ خاک و خون میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

غداروں کے ساتھ غداری کرنا آسان ہوتا ہے، اس جنگ عظیم کے بعد اتحادیوں نے عربوں سے آنکھیں پھیر لیں، فرانسیسیوں نے دمشق پر قبضہ کر لیا، انگریز عراق اور فلسطین پر قابض ہوگئے، فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کا اعلان کر دیا، شریف حسین نے اپنے لڑکے امیر عبداللہ کے ذریعہ سے مداخلت کرنی چاہی تو امیر عبداللہ کو اتحادیوں نے اردن کی بادشاہت دے کر باپ سے توڑ لیا، اس افراتفری میں حجاز کے باشندوں کی زندگی اجیرن ہونے لگی، تو اشراف مکہ نے نجد کے فرمانروا سلطان عبدالعزیز ابن سعود کو حجاز پر لشکرکشی کی دعوت دی، شریف حسین نے انگریزوں سے مدد چاہی تو انھوں نے غیر جانبداری کا

[illegible] نے ۷ء سے فرار ہو کر ترکی میں پناہ لی۔

عربوں کی بے وفائی سے غضبناک ہو کر مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی میں خلافت ختم کر دی، اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دینے سے انکار کیا، عربی رسم الخط کے بجائے رومن رسم الخط اختیار کرنے کا حکم دیا، بعض مسجدیں میوزیم بنا دی گئیں، مصطفیٰ کمال اگر عربوں سے خفا تھے، تو اسلام پر تیشہ زنی کی کوئی وجہ نہ تھی، ان کی اس خفگی کو اسلام سے غداری ہی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

عربوں کی عرب قومیت کام نہیں آرہی ہے، اسی قومیت کے سہارے ان کی بہت سی ریاستیں قائم ہو گئی ہیں، مگر وہ راکھ کے ڈھیر ہیں، لاکھوں فلسطینی عرب بے خانماں برباد ہو کر دربدر مارے پھر رہے ہیں، کبھی اردن ان کو خونی غسل دیتا ہے، کبھی شام ان کے ٹھکانوں پر بمباری کرتا ہے، یہودی تو ان کا قصائی بنا ہوا ہے، ۱۹۶۷ء میں یہودیوں نے عربوں کو جو ذلت آمیز شکست دی ہے، وہ مسلمانوں کی تاریخ میں بھلائی نہیں جا سکتی، یہودیوں سے دوسری جنگ کے بعد مصر تمام عرب ممالک سے کٹ کر یہودیوں کا حلیف بن گیا ہے اور یہ تمام عربوں کی نظر میں غدار ہے،

شام، عراق، شمالی یمن اور اب افغانستان کے حکمران اسلام سے غداری کر کے طرح طرح کے غیر اسلامی نظریوں کے قائل ہو گئے ہیں، ترکی کی فوج کو بھی اسلام پر بھروسہ نہیں، مگر ان سبھوں نے اسلام کو کھو کر کیا پایا، عربوں نے اسلام کا نام لے کر حکومت کی تو انھوں نے ایک ایسا امپائر قائم کیا جس کی مسافت بقول ریڈورڈ گبن دو سو دن میں طے ہوتی تھی، عثمانیوں نے اسلام ہی کے نام پر اپنا ٹرکش امپائر بنایا تو انھوں نے رومن امپائر، زار روس اور نپولین سے کامیاب ٹکر لی، محمود غزنوی نے اسلام ہی کا نام لیکر اپنے زمانہ میں ایک افغان امپائر بنا لیا تھا، لیکن آج جب قومیت کے نام پر علاقائی حکومتیں بن رہی ہیں تو دنیا میں ان کی کیا حیثیت رہ گئی ہے، انکا عبرتناک حال امریکہ اور روس کے سہارے زبان حال سے یہ کہہ کر رہا ہے،

تیری بندہ پروری سے میرے دن گذر رہے ہیں   نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ

معارف کے آیندہ شذرات میں کچھ اور غداروں کی روداد ہوگی۔

مقالات

فاتح علم

از جناب شبیر احمد خاں غوری ایم اے۔ ایل ایل بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

(۳)

فاضل تبصرہ نگار کے تبصرے سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ جو بھی وجہ رہی ہو، مصنف نے برصغیر (پاک و ہند) کے فضلاء کی تحقیقات سے اپنی فاضلانہ پیش کش میں کوئی تعرض نہیں کیا، حسب تصریح تبصرہ نگار انھوں نے فراہمی مواد کے سلسلے میں مہینوں ترکی اور مصر میں قیام کیا ہے، مگر کوئی ایسا اشارہ نہیں ملا کہ انھوں نے اس سلسلے میں ہندوستان کو درخور اعتنا یا یہاں کے فضلاء کی تحقیقات کو لائق التفات سمجھا ہو، مثلاً حسب تصریح تبصرہ نگار" باب دوم (میں)...... | " خدائی علم کا مسئلہ" (مسئلہ علم واجب)

انسانی علم اور خدائی علم کے درمیان فرق ظاہر کیا گیا ہے"، انسانی علم سے متعلق ابحاث تو علم کلام کی مطولات میں تمہیدی مقدمات کے طور پر بیان ہوتی ہیں۔ اس کی بہترین مثال " شرح المواقف" ہے، جس کی ابحاث متعلقہ " علمیات" کا خلاصہ سابق میں دیا جا چکا ہے،

خدائی علم کی بحث یا " مسئلہ علم واجب" اسلامی فکر کا ایک اہم مسئلہ ہے جو صفات باری تعالیٰ کے ضمن میں بلا کسی استثناء کے علم کلام کی ہر کتاب میں بیان ہوتا رہا ہے، متکلمین کے علاوہ حکماء و ارباب تصوف سبھی نے اسے درخور بحث سمجھا ہے، امام غزالی نے تہافت الفلاسفہ میں امام رازی نے المحصل اور المباحث المشرقیہ" میں قاضی ناصر الدین بیضاوی نے " طوالع الانوار" میں قاضی عضد الدین ایجی نے

[illegible] سے فرار ہو کر ترکی میں پناہ لی۔

عربوں کی بے وفائی سے غضبناک ہو کر مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی میں خلافت ختم کر دی، اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دینے سے انکار کیا، عربی رسم الخط کے بجائے رومن رسم الخط اختیار کرنے کا حکم دیا، بعض مسجدیں میوزیم بنا دی گئیں، مصطفیٰ کمال اگر عربوں سے خفا تھے، تو اسلام پر تیشہ زنی کی کوئی وجہ نہ تھی، ان کی اس خفگی کو اسلام سے غداری ہی پر محمول کیا جا سکتا ہے،

عربوں کی عرب قومیت کام نہیں آ رہی ہے، اسی قومیت کے سہارے ان کی بہت سی ریاستیں قائم ہو گئی ہیں، مگر وہ راکھ کے ڈھیر ہیں، لاکھوں فلسطینی عرب بے خانماں برباد ہو کر در بدر مارے پھر رہے ہیں، کبھی اردن ان کو خونی غسل دیتا ہے، کبھی شام ان کے ٹھکانوں پر بمباری کرتا ہے، یہودی تو ان کا قصائی بنا ہوا ہے، ۱۹۶۷ء میں یہودیوں نے عربوں کو جو ذلت آمیز شکست دی ہے، وہ مسلمانوں کی تاریخ میں بھلائی نہیں جا سکتی، یہودیوں سے دوسری جنگ کے بعد مصر تمام عرب ممالک سے کٹ کر یہودیوں کا حلیف بن گیا ہے اور یہ تمام عربوں کی نظر میں غدار ہے،

شام، عراق، شمالی یمن اور اب افغانستان کے حکمران اسلام سے غداری کر کے طرح طرح کے غیر اسلامی نظریوں کے قائل ہو گئے ہیں، ترکی کی فوج کو بھی اسلام پر بھروسہ نہیں، مگر ان سبھوں نے اسلام کو کھو کر کیا پایا، عربوں نے اسلام کا نام لے کر حکومت کی تو انھوں نے ایک ایسا امپائر قائم کیا جس کی مسافت بقول ریڈورڈ گبن دو سو دن میں طے ہوتی تھی، عثمانیوں نے اسلام ہی کے نام پر اپنا ٹرکش امپائر بنایا تو انھوں نے رومن امپائر، زار روس اور نپولین سے کامیاب ٹکر لی، محمود غزنوی نے اسلام ہی کا نام لیکر اپنے زمانہ میں ایک افغان امپائر بنا لیا تھا، لیکن آج جب قومیت کے نام پر علاقائی حکومتیں بن رہی ہیں تو دنیا میں ان کی کیا حیثیت رہ گئی ہے، انگلستان، فرانس، امریکہ اور روس کے سہارے زبان حال سے یہ کہہ کر جی رہا ہے

تیری بندہ پروری سے میرے دن گذر رہے ہیں ۔۔۔ نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ

معارف کے آئندہ شذرات میں کچھ اور غداروں کی روداد ہوگی۔

مقالات

فاتح علم

از جناب شبیر احمد خاں غوری ایم اے۔ ایل ایل بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

(۳)

فاضل تبصرہ نگار کے تبصرے سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ جو بھی وجہ رہی ہو، مصنف نے برصغیر (پاک و ہند) کے فضلاء کی تحقیقات سے اپنی فاضلانہ پیش کش میں کوئی تعرض نہیں کیا، حسب تصریح تبصرہ نگار انھوں نے فراہمی مواد کے سلسلے میں مہینوں ترکی اور مصر میں قیام کیا ہے، مگر کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا کہ انھوں نے اس سلسلے میں ہندوستان کو درخور اعتنا یا یہاں کے فضلاء کی تحقیقات کو لائق التفات سمجھا ہو، مثلاً حسب تصریح تبصرہ نگار" باب دوم (میں)۔۔۔۔۔۔ " خدائی علم کا مسئلہ" (مسئلہ علم واجب)

انسانی علم اور خدائی علم کے درمیان فرق ظاہر کیا گیا ہے" انسانی علم سے متعلق ابحاث تو علم کلام کی مطولات میں تمہیدی مقدمات کے طور پر بیان ہوتی ہیں۔ اس کی بہترین مثال "شرح المواقف" ہے، جس کی ابحاث متعلقہ "علمیات" کا خلاصہ سابقا میں دیا جا چکا ہے۔

خدائی علم کی بحث یا "مسئلہ علم واجب" اسلامی فکر کا ایک اہم مسئلہ ہے جو صفات باری تعالیٰ کے ضمن میں بلا کسی استثناء کے علم کلام کی ہر کتاب میں بیان ہوتا رہا ہے، متکلمین کے علاوہ حکماء و ارباب تصوف سبھی نے اسے درخور بحث سمجھا ہے، امام غزالی نے تہافت الفلاسفہ میں امام رازی نے المحصل اور المباحث المشرقیہ" میں قاضی ناصر الدین بیضاوی نے "طوالع الانوار" میں قاضی عضد الدین ایجی نے

"المواقف فی الکلام" ... عضدی میں، علامہ تفتازانی نے "شرح مقاصد" اور "تہذیب الکلام" میں، "شیخ بو علی سینا نے "شفا" اور "الاشارات" میں "شہاب الدین سہروردی مقتول نے "حکمۃ الاشراق" اور "ہیاکل النور" میں محقق طوسی نے "تجرید" اور "شرح الاشارات" میں "شیخ ابن عربی نے "فتوحات مکیہ" اور "فصوص الحکم" میں۔ اسی طرح متاخر مفکرین جیسے محقق دوانی نے "حواشی شرح تجرید" میں "میر باقر داماد نے "الافق المبین" میں "صدرائے شیرازی نے "حواشی شفا" اور "الاسفار الاربعہ" میں، اس مسئلہ کی مختلف حیثیتوں کو اپنی تفکیری ورزش کا موضوع بنایا ہے۔

"خدائی علم" یا "علم باری تعالیٰ" کی بحث دو ذیلی ابحاث میں تقسیم کی جاتی ہے۔

بحث اول:۔ باری تعالیٰ کے لئے صفت علم کا اثبات۔

بحث دوم:۔ علم باری تعالیٰ کا عموم

جہاں تک باری تعالیٰ کے لیے صفت علم کے اثبات کا تعلق ہے، نفس مسئلہ متکلمین اور حکماء کے درمیان متفق علیہ رہا ہے، دونوں اللہ تعالیٰ کے لئے صفت علم کو ثابت کرتے ہیں، اگرچہ دونوں کے مناہج علٰحدہ ہیں۔ سب سے زیادہ معرکۃ الآراء مسئلہ دوسرا ہے، یعنی آیا باری تعالیٰ کو جزئیات مادیہ متغیرہ کا بھی علم ہے یا نہیں۔ متکلمین کہتے ہیں کہ "ہے"، اور حکماء اس کے منکر ہیں، وہ صرف اس بات کے قائل ہیں کہ واجب تعالیٰ کو کلیات کا علم ہے۔ اس اختلاف کی مزید وضاحت سے پیشتر دونوں کے فکری پس منظر پر ایک طائرانہ نظر ڈال لینا مستحسن ہوگا۔

یونانی اسلامی فلسفہ کا بانی دواضع اور معلم اول ارسطو ہے، ارسطو سے پہلے فلسفہ کے آغاز و ارتقا کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ مگر ارسطو کے یہاں بھی باری تعالیٰ کا تصور دواجبی واجبی ہی سا ہے۔ اسے اپنے تجویز کردہ نظام کائنات کے لئے ایک "محرک اول" کی ضرورت تھی اور وہ اس نے اس تصور سے پوری کر لی، جس کی اہمیت ایک مقدس مفروضہ سے زیادہ نہیں ہے، لہٰذا اس کے یہاں اس

تصور باری تعالیٰ" میں علم اور دیگر صفات کی تلاش بیکار ہے بقول حافظ ابن تیمیہ

فان ارسطو واتباعه لیس فی کلامهم ذکر واجب الوجود ولا شئی من الاحکام التی لواجب الوجود وانما یذکر ون العلة الاولیٰ (الرد علی المنطقیین صفحہ ۲۲۴-۲۲۳)

ارسطو اور اس کے متبعین کے یہاں نہ تو واجب الوجود کا ذکر ہے اور نہ ان احکام کا جو واجب الوجود کے لئے ثابت کئے جاتے ہیں، فلاسفۂ متقدمین تو صرف علت اولیٰ ہی کا ذکر کرتے ہیں۔

اور حافظ ابن تیمیہ کے اس تبصرہ کی تائید اس کی "مابعد الطبیعیات" سے کی جا سکتی ہے۔

لیکن باری تعالیٰ کا ایسا تصور جو جملہ صفات کمالیہ سے متصف اور تمام سمات نقص و حدوث سے پاک اور منزہ ہو فطرت سلیمہ کا ایک ناگزیر تقاضا ہے، اور انجام کار متاخر یونانی فکر کو بھی اس تقاضے کو پورا کرنا پڑا، چنانچہ پروفیسر تھلی ان متاخر فلاسفہ کے بارے میں لکھتا ہے،

"کچھ طبائع کے لیے ناممکن تھا کہ وہ کائنات کو سالمات کا ایک میکانکی بازیچہ سمجھ لیں اور خلاق کائنات کے بارے میں تلاش و تجسس کے اس جذبہ کو دبائے رکھیں جو ان کے اعماق قلب میں بار بار تڑپ رہا تھا..... تشکیکین کی تشکیک کے باوجود وہ عرفان الٰہی کی آرزو کا استیصال نہ کر سکے"

مگر نوفلاطونی فلاسفہ نے جو ایک جانب افلاطون و ارسطو کے فکری ورثہ کے امین تھے اور دوسری جانب قیاصرۂ روم کے زلہ ربا، دونوں کے درمیان ایک اونے پونے کا سمجھوتا کر ڈالا تھوس مثبت حقائق انھوں نے قیصر کے حصہ میں رکھے اور دل خوش کن منفی لطائف الہ العالمین کے حصہ میں دیئے، چنانچہ پروفیسر تھلی اس جماعت کے سربراہ فلاطینوس کے بارے میں لکھتا ہے،

" اس کے نزدیک الہ العالمین اس قدر ورا الوراء ہے کہ ہم جو کچھ بھی اسکے بارے میں

سکتے ہیں اس سے اس کی تجدید ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہم اس کی طرف حال، خیر یا علم کسی صفت کا انتساب نہیں کر سکتے ۔۔۔۔۔۔۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا ہے، صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ کیا نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ ہم اس کے متعلق یہ تصور نہیں کر سکتے کہ وہ تعقل کر رہا ہے، کیونکہ یہ تصور عاقل و معقول دو تصوروں کو متضمن ہے حتیٰ کہ عالم بالذات شئی بھی جو اپنی ذات کا تعقل کرتی ہے خود کو فاعل اور مفعول کی دوئی میں بانٹ دیتی ہے، یہ کہنا کہ خدا جانتا ہے یا ارادہ کرتا ہے، اُسے اُس چیز سے جو وہ جانتا ہے یا جس کا وہ ارادہ کرتا ہے محدود کر دیتا ہے:

اسی طرح ان فلاسفہ کے یہاں ذات باری تعالیٰ کے باب میں تنزیہ مفرط نے تعطیل کی شکل اختیار کرنا شروع کر دی، لہٰذا سنہ مسیحی کی ابتدا کے بعد بالخصوص الہامی مذاہب کے پیشواؤں سے تاثر کے بعد انھوں نے غور و خوض کر کے باری تعالیٰ کی صفت علم میں نئی نئی جدتیں پیدا کیں۔ ایک بیدار مغز بادشاہ کی طرح امور مملکت کی جزئیات سے باخبر ہونا اُس کی شان عالی کے شایان نہیں ہے، اُسے تو ایک آئینی سربراہ مملکت کی طرح صرف کلیات اُمور سے واقف ہونا چاہیے۔

اس طرح واجب تعالیٰ کا علم کلیات تک محدود رکھا گیا، اور یہی فکری سرمایہ بعد میں حکمائے اسلام میں منتقل ہوا۔

ادھر اسلام نے مبعوث ہو کر ایک مکمل دین قویم کی بنیاد ڈالی جو انسان کی فطرت خدا جوئی کی تشفی کے ساتھ ساتھ نظامِ عالم میں نظم و ضبط قائم رکھنا بھی چاہتا تھا، چونکہ محض قانون کا خوف یا رائے عامہ کی پروا بدکاروں کو ان کی بدکاری سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ایک موثر روک کے لیے اُن کے اذہان میں ایک ایسی ہستی کا غیر متزلزل یقین (ایمان) پیدا کرنا ناگزیر ہے جو نہ صرف ان کے جزئیات اعمال بلکہ ان کے قلوب میں پیدا ہونے والے ہر خیال و گمان سے بھی علی وجہ الکمال باخبر ہو۔ بالفاظ دیگر ایک علام الغیوب پروردگار عالم پر ایمان اسلام کی تعلیم کا رکن رکین قرار دیا گیا، قرآن کریم بار بار اس حقیقت نفس الامری

کو مومنین کے ذہن میں راسخ کرتا ہے، تفصیل آگے آرہی ہے،

اس طرح باری تعالیٰ کے جزئیات مادیہ حادثہ کے عالم ہونے پر ایمان و ایقان دین اسلام کی بنیادی تعلیم کا جزو لا ینفک بن گیا، جس سے صرفِ نظر تو درکنار اس میں تساہل بھی منافی دین بلکہ کفر بواح سمجھا گیا۔

بہرحال بقول علامہ تفتازانی جب یونانی فلسفہ مسلمانوں میں منتقل ہوا تو جن امور میں وہ اسلامی تعلیمات سے متصادم تھا، متکلمین نے ان کے رد و ابطال پر کمر باندھی، انھیں متنازع فیہا مسائل میں (جن کے اندر اسلام اور فلسفہ میں کسی قسم کا سمجھوتا ناممکن تھا) عموم علم باری تعالیٰ کا مسئلہ بھی تھا، اسلام کی تعلیم تھی۔

"ان اللہ بکل شئی علیم" (عنکبوت ۶۲) ان اللہ بما کنتم تعملون" (نحل ۲۰) یعلم ما فی السمٰوات والارض (عنکبوت ۵۲)

"یعلم ما یلج فی الارض وما یخرج منھا وما ینزل من السماء وما یعرج فیھا وھو الرحیم الغفور" (سبا ۳۰)

"ان اللہ عالم غیب السمٰوات والارض انہ علیم بذات الصدور" (فاطر ۲۰)

"عالم الغیب لا یعزب عنہ مثقال ذرۃ فی السمٰوات ولا فی الارض ولا اصغر من ذالک ولا اکبر الا فی کتاب مبین" (سبا ۳)

"یعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور" (مومن ۱۹)

اور فلسفہ صرف اتنا ہی تسلیم کرتا تھا کہ اول (باری تعالیٰ) صرفِ کلیات کا عالم ہے، اور اگر جزئیات کے علم کا سوال ناگزیر ہو ہی جاتا تو وہ بر سبیل تنزل کہتا کہ اسے جزئیات متغیرہ کا علم محض علی وجہ الکلی ہے، اس طرح علم باری تعالیٰ بجزئیات متغیرہ کا مسئلہ ان معرکۃ الآراء مسائل میں خصوصی اہمیت کا

حائل بن گیا جن کے اندر، جیسا کہ سابق میں مذکور ہوا، شریعتِ اسلامیہ اور یونانی فلسفہ میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا، اور جس سے انکار بقول امام غزالی رحمہ اللہ کھلا ہوا کفر ہے، چنانچہ وہ تہافت الفلاسفہ کے خاتمہ میں فرماتے ہیں۔

قلنا تکفیرھم لابد فی ثلث مسائل	ہم کہتے ہیں کہ تین مسئلوں میں اُن کی
احدھا مسئلۃ قدم العالم	(فلاسفہ کی) تکفیر ناگزیر ہے، اول قدم
وقولھم ان الجواھر کلھا	عالم کا مسئلہ اور فلاسفہ کا یہ کہنا کہ جواہر
قدیمۃ والثانیۃ قولھم ان اللہ	سب کے سب قدیم ہیں، دوم فلاسفہ کا
تعالٰی لایحیط علماً بجزئیات	یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کا علم جزئیات حادثہ
الحادثۃ من الاشخاص،	کو محیط نہیں ہے، اور سوم فلاسفہ کا بعث
والثالثۃ فی انکار بعث الاجساد	بعد الموت اور حشر اجساد کا انکار،
وحشرھا فھذہ المسائل	پس یہ تین مسئلے کسی طرح بھی اسلام کے
الثلاث لاتلائم الاسلام بوجہ	ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتے اور ان کا
ومعتقدھا معتقد کذب	اعتقاد رکھنے والا انبیاء علیہم السلام کے
الانبیاء ..... وھذا ھو الکفر	جھوٹ کا معتقد ہے،..... اور یہ صریح
الصریح۔	کفر ہے،

چنانچہ امام غزالیؒ نے "تہافت الفلاسفہ" کے تیرھویں مسئلہ

"مسئلۃ فی ابطال قولھم ان اللہ تعالٰی عن قولھم لایعلم الجزئیات المنقسمۃ بانقسام الزمان الی الآن والی ماکان ومایکون"

کے اندر فلاسفہ کے اس قول کا کہ "اللہ تعالیٰ کو جزئیات حادثہ متغیرہ کا علم نہیں ہوتا" رد کیا ہے،

امام غزالی کے "تہافت الفلاسفہ" کا ابن رشد اندلسی نے جو یورپ میں " Destruction of Destruction " کے نام سے مشہور ہے تہافت التہافت کے نام سے رد لکھا اور اس کے بعد دونوں کتابوں میں مذکور مسائل حکماء و متکلمین کے درمیان گرمی بحث و مناظرہ کا موضوع بن گئے۔

ترک سلطان محمد فاتح، جو تاریخ میں قسطنطنیہ کے فاتح کی حیثیت سے مشہور ہے، علم و حکمت کا بھی بڑا سرپرست تھا، اس نے دربار کے دو عالموں خواجہ زادہ اور علاء الدین طوسی سے ان دونوں کتابوں (یا حکماء و متکلمین) کے درمیان محاکمہ کرنے کی فرمائش کی، اول الذکر نے یہ محاکمہ تہافت الفلاسفہ کے اور ثانی الذکر نے "کتاب الذخیرہ" کے نام سے مرتب کیا۔

بظاہر بحث ختم ہو گئی، مگر نہ حکماء کے عقیدت مندوں نے ہمت ہاری اور متکلمین کے پیرووں نے اور خصوصیت سے متنازع فیہا مسائل ثلاثہ کے باب میں نئی نئی توجیہات پیش کیں، بالخصوص ایران میں جہاں شیخ بوعلی سینا (جس پر براہ راست ان مسائل ثلاثہ کے باب میں امام غزالی کی منفق بہ تکفیر کی زد پڑتی تھی) ابطال قوم و وطن میں محسوب ہوتا تھا،

ان مسائل ثلاثہ میں ہمارے نقطۂ نظر سے "عموم علم باری" یا "علم باری بجزئیات مادیہ" کا مسئلہ سب سے اہم ہے، مفکرین سابقین نے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، اپنی اپنی تصانیف میں اسے اپنی تفکیری ورزش کا موضوع بنایا ہے لیکن جس طرح منطقی نظم و ضبط کے ساتھ یہ بحث "سلم العلوم" کی شروح اور "میر زاہد قطبیہ" کے حواشی میں ملتی ہے، اس انداز میں علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی (المتوفی ۱۰۶۷ھ مطابق ۱۶۵۶ء) سے پہلے نہیں ملتی، انھیں کو اس انداز بحث کی ابتدا کا شرف حاصل ہے، مستحسن معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر اسے اس کے تاریخی پس منظر میں بیان کر دیا جائے۔

۱۰۵۲ھ (مطابق ۱۶۴۲ء) میں شاہجہاں نے جان نثار خاں کی زیر سرکردگی ایک سفارتی مشن ایران بھیجا تھا۔ اس کے عملہ میں محمد فاروق مشرف اور محب علی پرچہ نویس کو اپنی معقولات دانی پر غرہ

لہذا دونوں ایران کے وزیر اعظم سے جو خلیفہ سلطان کہلاتا تھا باہر سے، اس سے زیادہ بحث ذہنی کی امتحاناً صرف اتنا ہی پوچھا کہ امام غزالی نے قدم عالم نفی علم واجب بجزئیات مادیہ اور انکار حشر جسمانی کی بنا پر فارابی اور بوعلی سینا کی تکفیر کی ہے، لیکن کچھ لوگوں نے حکماء کے کلام کو نیک محل پر محمول کیا ہے۔ لہذا اس کی تقریر تو کیجئے۔ ہندوستانی معقولیوں کا علم عموماً بحاثی تک محدود تھا تحقیق واقعات سے واسطہ کم تھا، اس کا نتیجہ بقول وزیر اعظم علامی سعد اللہ خان یہ نکلا کہ

"مدعیان دروغ چون شمع کشتہ بے فروغ ماندند واز مسلک معقولیت دور افتادند"

شاہجہاں کو جب اس مناظرے میں ہندوستانی وفد کی شکست فاش کی خبر ملی تو ہندوستان کے علمی وقار کی ہوا خیزی پر بیحد رنج ہوا، لہذا وزیر اعظم سعد اللہ خان نے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کو خط لکھا، اور اس میں ان میں ان مسائل ثلاثہ پر ایک مستقل رسالہ لکھنے کی درخواست کی تاکہ اُسے ایران بھیجا جا سکے اور اس طرح ہندوستان کا علمی وقار بحال ہو سکے۔ اس حکم کی تعمیل میں علامہ سیالکوٹی نے صرف ایک ہفتہ میں ایک رسالہ لکھ کر پیش کیا جو بعد میں "الدرالثمین" یا "الدرۃ الثمینۃ" اور بعض لوگوں میں الرسالۃ الخاقانیہ" کے نام سے مشہور ہوا،

مسائل ثلاثہ میں سے سعد اللہ خاں علامی نے دوسرے مسئلہ "علم واجب تعالیٰ بجزئیات مادیہ" کے باب میں بڑی تفصیلی ہدایات دی تھیں،۔

۱۔ احاطہ مسائل متعلقہ باین مطلب علمی از حضوری وحصولی ۔

۲۔ بودن علم عین عالم وعین معلوم یا غیر آن ۔

۳۔ تعلق آن بجزئیات بروجہ کلی است یا بوجہ جزئی است ۔

۴۔ تحریر آنکہ کلیت وجزئیت مفہوم تابع مدرِک (بکسر را) یا تابع مدرَک (بفتح را) است

۵۔ نسبت بادحسب جزئی ہست یا نہ

۹۔ بیان آنکہ ادراک تعقل است نہ احساس

۱۰۔ شمول علم بمغیبات و مشخصات از زمان وغیر آن۔

۸۔ بقاء علم با تغیر معلوم و تبدل زمان۔

علامہ سیالکوٹی نے بھی اسی مسئلہ (مسئلہ علم واجب) کو زیادہ اہمیت دی اور رسالہ کا بڑا حصہ اسی کی توضیح پر وقف کیا، باقی دو مسئلوں سے سرسری طور پر تعرض کیا۔ اسی لئے عام طور سے اس رسالہ کا موضوع "علم واجب" ہی سمجھا جاتا ہے، انھوں نے اس توضیح کو تین مباحث میں تقسیم کیا ہے:۔

مبحث اول:۔ باری تعالے کے لئے صفت علم کے اثبات میں،

مبحث دوم:۔ علم باری تعالیٰ کی حقیقت کی توضیح میں،

[اس ضمن میں انھوں نے مختلف مذاہب کو اسی منطقی انداز میں منضبط فرمایا ہے جس طرح متاخرین بالخصوص شراح "سلم" نے کیا ہے کہ علم باری یا عین ذات باری ہوگا یا ذات باری تعالیٰ سے خارج پھر شق ثانی میں تین ذیلی شقیں نکالی ہیں۔ قائم بنفسہ، قائم بذات باری اور قائم بامر خارج]

مبحث سوم:۔ باری تعالیٰ کے علم کے عموم میں ہے، علامہ فرماتے ہیں کہ اس باب میں اسلامی مذاہب کے پیرو عموماً عموم علم باری کے قائل ہیں لیکن حکماء و فلاسفہ سوائے ابوالبرکات بغدادی کے علم بجزئیات کے منکر ہیں۔

[اس کے بعد انھوں نے اس مسئلہ میں مختلف مذاہب کو نقل کر کے (جس کی تفصیل شارحین سلم العلوم کی سکیم کے تحت آگے آرہی ہے) اُن کے ماله وما علیہ سے بحث کی ہے۔]

علامہ سیالکوٹی کی یہ تقریر میرزاہد ہروی (المتوفی ۱۱۰۱ھ مطابق ۱۶۹۰ء جو علامہ کے ہم عصر قاضی محمد اسلم کے خلف الرشید اور میر محمد فاضل بدخشی کے شاگرد تھے) نے علم میں بھی تھی، چنانچہ انھوں نے علم کے مفاہیم ثلثہ:۔ معنی مصدری (دانستن) مبدء انکشاف اور الحاضر عند الذات المدرکہ متعین کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ تینوں معانی واجب تعالیٰ میں متحقق ہیں لیکن صرف دوسرے معنیٰ ہی میں علم اس کا

عین ہے، مگر صعوبت مقام اور بحث کے اشکال وا غلاق کی بنا پر تفصیل سے یکہ کر معذرت کرلی۔

وتمام القول فیہ یقتضی بسطاً فی الکلام لا یسعہ المقام ؛

اس تمام القول سے میرزاہد کی مراد علامہ سیالکوٹی کی متعلقہ تقریر ہے، اسی وجہ سے انکے محشیوں نے تمام القول کی وضاحت میں علامہ سیالکوٹی کی اسی توضیح کو دہرا دیا ہے جو انہوں نے الدرۃ الثمینہ میں دی ہے، اسکا اعادہ موجب تطویل ہوگا، سلسلۂ کلام کو آگے جاری رکھنے سے پہلے علامہ سیالکوٹی کے ایک افادہ کی طرف توجہ دلانا مستحسن ہوگا۔ یہ باری تعالیٰ کے علم تفصیلی کے مراتبِ چہارگانہ کے بارے میں علامہ کی تقریر ہے، اسی تقریر کو قدرے حذف و ایجاز کے ساتھ اُن کے معاصر متاخر میرزاہد ہروی نے رسالہ قطبیہ میں بیان کیا ہے، ذیل میں دونوں کی تقریریں نقل کی جا رہی ہیں :-

الدرۃ الثمینہ

ثم ان مراتب العلم التفصیلی اربع : الاولیٰ ما یعبر بالقلم والنور والعقل فی الشریعۃ وبالعقل الکل عند الصوفیۃ وبالعقول عند الحکماء فالقلم الذی ہو اول المخلوقات حاضر بذاتہ مع ما ہو مکنون فیہ عند الواجب تعالیٰ۔ فہو علم تفصیلی بالنسبۃ الی العلم الاجمالی الذی ہو عین ذاتہ وبسیط بالقیاس الی ما فی المراتب۔

الرسالۃ القطبیۃ

اعلم ان العلم التفصیلی للواجب سبحانہ عن ما ارجع الی الخارج ومراتبہ اربع : احدہا ما یعبر عنہ بالقلم والنور والعقل فی الشریعۃ وبالعقل الکل عند الصوفیۃ وبالعقول عند الحکماء فالقلم حاضر عندہ تعالیٰ مع ما یکون فیہ

وثانيها ما يعبر عنه فى الشريعة
باللوح المحفوظ وبالنفس الكلى
عند الصوفية وبالنفوس الفلكية
المجردة عند الحكماء فاللوح
المحفوظ حاضر بذاته مع ما ينتقش
فيه من صور الكليات عند
الواجب تعالى فهو علم تفصيلى بالنسبة
الى المرتبتين اللتين فوقهما۔
وثالثها كتاب المحو و
الاثبات وهو القوى الجسمانية
التى ينتقش فيها صور الجزئيات
المادية وهى المنطبعة فى الاجسام
العلوية والسفلية فهذه
القوى مع ما فيها من النقوش
الحاضرة عنده تعالى۔
ورابعها الموجودات الخارجية
من الاجرام العلوية والسفلية

والعالم باشيائها حاضرة عنده واجب الوجود بذاتها فى مرتبة الايجاد

وثانيها ما يعبر عنه فى الشريعة
باللوح المحفوظ وبالنفس الكلى عند
الصوفية وبالنفوس الفلكية
المجردة عند الحكماء فاللوح
حاضر عنده تعالى مع ما فيه
من صور الكليات۔
وثالثها ما يعبر عنه بكتاب
المحو والاثبات فى الشرع يعنى
وهو القوى الجسمانية التى ينتقش
فيها صور الجزئيات المادية
وهى القوى المنطبعة فى الاجسام
العلوية۔ فهذه القوى مع ما
فيها من النقوش المنطبعة
حاضرة عنده تعالى۔
ورابعها سائر الموجودات
الخارجية والذهنية
الحاضرة عنده تعالى

ذیل میں "الدرة الثمینة" کے اقتباس کا ترجمہ دیا جا رہا ہے (رسالہ قطبیہ کے اقتباس کا ترجمہ اسی میں مندرج ہے)

"پھر علم تفصیلی کے چار مرتبے ہیں:-

مرتبہ اول | وہ ہے جسے شریعت میں قلم، نور اور عقل سے، صوفیا کے نزدیک عقل کل سے اور حکماء کے نزدیک عقول سے تعبیر کیا جاتا ہے، پس قلم جو کہ تمام مخلوقات میں سب سے اول ہے، بالذات مع ان تمام امور کے جو اس میں پنہاں ہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک حاضر ہے۔ پس وہ اس علم اجمالی کی نسبت سے جو عین ذات باری ہے، علم تفصیلی ہے مگر باقی مراتب ثلٰثہ کی نسبت سے بسیط ہے،

مرتبہ دوم | وہ ہے جسے شریعت میں لوح محفوظ سے، صوفیہ کے نزدیک نفس کلی سے اور حکماء کے نزدیک نفوس فلکیہ مجردہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پس لوح محفوظ مع ان صور کلیات کے جو اس میں نقش ہیں، واجب تعالیٰ کے نزدیک بذاتہ حاضر ہے۔ پس وہ اپنے اوپر کے دو مرتبوں کی نسبت سے علم تفصیلی ہے،

مرتبہ سوم | کتاب المحو والاثبات ہے، اور اس سے مراد وہ جسمانی قوتیں ہیں، جن میں جزئیات مادیہ کی صورتیں نقش ہوتی ہیں، اور وہ اجسام علویہ وسفلیہ میں منطبع ہیں، پس یہ قوتیں مع ان نقوش کے جو ان میں مرتسم ہیں، باری تعالیٰ کے نزدیک حاضر ہیں۔

مرتبہ چہارم | موجودات خارجیہ کا ہے، از قبیل اجرام علویہ وسفلیہ نیز ان کے احوال۔ تو یہ اپنے مرتبہ ایجاد میں واجب الوجود کے نزدیک حاضر ہیں۔

علامہ سیالکوٹی کا رسالہ "الدرۃ الثمینہ" جس طرح اس سلسلۃ الذہب کا واسطۃ العقد ہے جس کا آغاز امام غزالی نے "تہافت الفلاسفہ" میں کیا تھا، اسی طرح اس علمی تحریک کا مفتتح بھی ہے، جو بعد میں مسئلہ علم واجب کے نام سے متاخر منطقیوں بالخصوص سلم العلوم کے شارحین اور رسالہ میر زاہد کے محشیوں کی فکری سرگرمیوں کا موضوع رہی ہے، انھوں نے ہی علم واجب کے اندر احتمالات پنجگانہ اور مذاہب عشرہ کی اسکیم کی ابتدا کی، چنانچہ فرماتے ہیں:-

"جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کا علم یا تو اس کی ذات کا عین ہوگا یا اس سے خارج ہوگا۔ (بصورت ثانیہ) یا تو بنفسہ قائم ہوگا یا ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہوگا یا کسی خارجی

امر کے ساتھ قائم ہوگا، ان احتمالات اربعہ کے علاوہ اور کوئی احتمال نہیں ہے۔
اس کے بعد انھوں نے علم باری تعالیٰ کے باب میں مختلف مذاہب کی بڑی شرح وبسط سے بیان دی ہے۔

جیسا کہ سابق میں کہا گیا کہ علامہ سیالکوٹی کی یہ تقریر میرزا ہد کے علم میں تھی، مگر صعوبت مقام بحث کے اشکال و اغلاق کی بنا پر یہ کہہ کر کہ "تمام القول فیہ یقتضی بسطاً فی الکلام لا یسعہ المقام" میں سے معذرت کرلی۔ مگر ان کے محشیوں نے "تمام القول" کی وضاحت میں علامہ ہی کی توضیح جو انھوں نے "الدرۃ الثمینہ" میں دی ہے، دہرا دیا ہے۔ چنانچہ مولوی غلام یحییٰ نے "لوا ء الہدیٰ اللیل والدجیٰ" میں لکھا ہے،

"و تمام القول فیہ الخ۔ یعنی باری تعالیٰ کا علم بالفعل واضح تفصیل کا مقتضی ہے، اس سلسلے میں اجمالی قول یہ ہے کہ باری تعالیٰ بذاتہ عالم ہے یا بالغیر یا عالم نہیں ہے۔ شق اول کے مطابق علم یا تو اس کا (باری تعالیٰ کا) عین ہوگا یا غیر۔ شق ثانی کے مطابق یا تو وہ ایسی صفت ہوگا جو ذات باری کے ساتھ قائم ہے مگر اپنی ذات میں متعدد ہے، اور وہ تمام ممکنات کی صورتوں کا دوسرا نام ہے، یا فی ذاتہ واحد اور بسیط ہے، جس کا کائنات کے تمام افراد سے تعلق ہے، یا پھر وہ ایسی صفت ہوگی جو ذات باری کے ساتھ قائم نہیں ہے (پس اس صورت میں کچھ ذیلی شقیں نکلتی ہیں) ممکنات اپنے وجود دہری کے ساتھ باری تعالیٰ کے نزدیک حاضر ہونگے، یا وہ جوہری اور عرضی صورتوں کے ساتھ حاضر ہونگے جو اپنی (ان صورتوں) کی ذوات سے قبل بذات خود قائم ہیں۔ یا خود ان اشیاء کے حضور کے ساتھ . . . . . . بطور حضور اشراقی کے حاضر ہونگے یا ممکنات معدومہ کے نفس ثبوت کے ساتھ بطور ثبوت خارجی کے حاضر ہونگے یا ممکنات کے ثبوت علمی کے بطور بلا تحقق واقعی کے مانند سراب کے حاضر ہونگے،

... شرح ... کے اعتبار کے طور پر حاضر ہونگے ... مذہب ... اور ہر ایک کا
جائزہ ایک جائے ڈالا گیا ہے، رہی حق کی تحقیق تو وہ کتب مبسوطات میں مذکور ہے۔

اسی طرح مولانا فضل اللہ لکھنوی نے اپنے حاشیہ میں اس اسکیم کو دوسرے لفظوں میں دہرایا
لیکن جس شرح و بسط سے مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی نے اسے لکھا ہے، وہ اپنی آپ مثال ہے،
"الدرۃ الثمینۃ" کے انداز فکر کی اتباع کرنے والوں کی دوسری جماعت "سلم العلوم" کے شارحین
کی ہے، جس میں سرفہرست قاضی مبارک گوپاموی کا نام ہے، مزید تفصیل حسب ذیل ہے،
میرزاہد کے ایک شاگرد ملا صالح بنگالی تھے، جن کے دو خاص شاگرد تھے، ملا اشرف اور
قاضی مبارک گوپاموی، اس لئے ملا صالح کے توسط سے قاضی مبارک گوپاموی کو (جو بقول
مولانا فضل امام خیرآبادی "سلم العلوم" کے سب سے پہلے شارح ہیں، وہ پوری تفصیل سینہ بسینہ پہونچی تھی
جسے میرزاہد "قطبیہ" میں عدم گنجائش کی بنا پر (لایسعہ المقام) تحریر نہیں کر پائے تھے، مگر جو حسب توضیح ملا
غلام یحییٰ (لوامع الہدی فی اللیل والدجی) بعینہ وہی تھی جو علامہ سیالکوٹی نے "الدرۃ الثمینۃ" میں سپرد قلم
فرمائی تھی۔

اس سلسلۂ تلمذ کے علاوہ قاضی مبارک کا سلسلہ براہ راست بھی علامہ سیالکوٹی تک پہونچتا ہے
کیونکہ موخر الذکر کے ایک شاگرد مولانا عبد الرحیم مراد آبادی تھے، ان کے شاگرد مولانا شہاب الدین
گوپاموی اور ان کے شاگرد ان کے صاحبزادے ملا قطب الدین گوپاموی تھے، ملا قطب الدین کے
شاگرد قاضی مبارک تھے، جنھوں نے اپنی "شرح سلم" میں مسئلہ علم واجب کی ابتدا بدینطور کی ہے۔

"اعلم ان مسألۃ علم الواجب مما تحیرت فیہ الافہام":

[جاننا چاہئے کہ مسئلہ علم واجب ان مسائل میں سے ہے جن میں عقل و فہم حیران و سرگشتہ رہی ہیں]

اس کے بعد انھوں نے اس مسئلہ میں مختلف مذاہب کو گنایا ہے جس کی تفصیل ملا حسن کے

ضمن میں آچکی ہے،

بعد میں سلم العلوم کے دوسرے شارحین نے بھی اسی روش کی پیروی کی، چنانچہ مولانا بحرالعلوم نے اپنی شرح سلم العلوم" میں فرمایا۔

"اختلفوا فی کیفیتہ اختلافاً عظیما"

[علم واجب کے مسئلہ میں محققین کا شدید اختلاف ہے]

زاں بعد انھوں نے اس "اختلاف عظیم" کی تفصیل میں نو مذاہب گنائے ہیں جو شیخ مقتول، نصیرالدین طوسی، افلاطون، معتزلہ، فرفوریوس، ماتریدیہ، میرباقر داماد، ابونصر فارابی اور بوعلی سینا کی طرف منسوب ہیں۔ آخر میں اپنے قول مختار کو بیان کیا ہے۔

لیکن اس مسئلہ کی سب سے سلجھی ہوئی تفصیل ملاحسن نے اپنی" شرح سلم العلوم" میں دی ہے، پہلے تو انھوں نے مسئلہ علم واجب کی اہمیت بتائی ہے،

"مقصود کے چہرے سے اس وقت تک پردہ نہیں ہٹے گا، جب تک مسئلہ علم واجب کو بیان نہ کیا جائے جو اہم ترین مسائل میں سے ہے، اور جس میں عقل وفہم حیران وسرگشتہ رہی ہیں، کیونکہ ابھی تک کسی نے اس کی ایسی توضیح نہیں بیان کی جو اہل خرد کے دل کو لگتی ہو،

اس کے بعد انھوں نے احتمالات پنجگانہ اور مذاہب عشرہ کو گنایا ہے، پہلے انھوں نے احتمالات عقلیہ کو ضبط کیا ہے،

"ممکنات کے ساتھ باری تعالیٰ کا علم یا تو

(۱) اس کی ذات کا عین ہوگا۔

(۲) یا ذات باری کا جزء ہوگا (مگر اس کا کوئی قائل نہیں ہے)

(۳) یا ذات باری کے ساتھ قائم ہوگا؛

پھر اُس آخری احتمال میں انھوں نے تین ذیلی احتمال قائم کئے ہیں،

باری تعالیٰ کا علم یا تو

۱۔ اُس کی ذات کے ساتھ منضم ہوگا۔

۲۔ یا اُس سے منتزع کیا گیا ہوگا،

۳۔ یا اُس سے علحدہ کوئی امر ہوگا،

[واضح رہے کہ مذکورۂ بالا احتمالات میں سے اس احتمال کا کہ "علم باری ذات باری تعالیٰ کا جزو ہو" کوئی قائل نہیں ہے۔ اس لئے علامہ سیالکوٹی کی حقیقت پسندی نے اسے درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا تھا، اور صرف چار احتمالات ہی گنائے تھے۔

"اعلم ان علمہ تعالیٰ اما ان یکون عین ذاتہ او خارجا عنہ اما قائما بنفسہ او بذاتہ او بامر خارج۔ لامزید علی ھذہ الاحتمالات"

مگر متاخرین نے منطقی ضبط کے لئے اسے بھی محسوب کر کے علامہ سیالکوٹی کے احتمالاتِ چہارگانہ کو احتمالات پنجگانہ میں تبدیل کر دیا۔]

پہلے احتمال میں تین مذاہب ہیں:۔

(۱) صوفیائے کرام کا کہنا ہے کہ عالم میں سوائے ذات باری کے اور کچھ ہے ہی نہیں پس علم باری تعالیٰ اُس کی ذات ہی کا منتزع ہے۔

(۲) فرفوریوس کا کہنا تھا کہ عاقل و معقول متحد بالذات ہیں۔ [یہ بھی صوفیائے کرام کے قول کا ایک دوسرا انداز ہے۔

(۳) حکمائے متاخرین کا کہنا ہے کہ ہر چند ذات باری تعالیٰ ممکنات سے مختلف ہے، بایں ہمہ وہ ان کے تفصیلی انکشاف کی کاشف ہے۔

دوسرا احتمال (شق انضمامی) ارسطو اور فارابی و ابن سینا کا عقیدہ ہے، اُن کا کہنا ہے کہ اشیاء کی صورتیں ذات باری میں مرتسم ہیں۔

تیسرا احتمال کہ علم باری تعالیٰ امر انتزاعی ہے، متکلمین کا مذہب ہے، وہ کہتے تھے :۔

" علم باری ایک بسیط صفت ہے جو اضافی تعلقات پر مشتمل ہے، پس ممکنات میں سے ہر ایک کے انکشاف کا مناط وہ اضافت خاصہ ہے "

چوتھے احتمال میں کہ علم باری تعالیٰ امر منفصل ہے، پانچ مذہب ہیں :۔

(۱) افلاطون کا کہنا ہے کہ علم باری بالممکنات "صور قائمہ" (مجردہ عن المادہ جنھیں امثال افلاطونی بھی کہتے ہیں) سے مراد ہے۔

(۲) اکثر مشائین (پیروان ارسطو) کا قول ہے علم باری تعالیٰ سے مراد ممکنات کا وجود دہری ہے پس ممکنات (وجود دہر میں موجود اور باری تعالیٰ کی ذات میں حاضر ہیں) ہی علم باری کا مصداق ہیں۔

(۳) بعض دیگر مشائیہ (بالخصوص محقق طوسی) کا مسلک یہ ہے کہ تمام اشیاء کی صورتیں، عقل اول" میں موجود ہیں اور "عقل اول" ان تمام صورتوں کے ساتھ باری تعالیٰ کے نزدیک حاضر ہے، اس طرح عقل اول مع صورتوں ہی علم باری کا مصداق ہے،

(۴) معتزلہ کا کہنا ہے کہ علم باری تعالیٰ سے مراد وہ معدومات ممکنہ ہیں جو اس کے علم واقع میں ثابت تو ہیں مگر غیر موجود ہیں۔

(۵) شیخ الاشراق (شیخ مقتول) کا مذہب یہ ہے کہ باری تعالیٰ اشیاء کو "اشراق نوری" کے ذریعہ جانتا ہے۔

بعد کے محشیوں میں مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی نے "التحقیقات المرضیہ" میں ان مذاہب عشرہ کو مع مالہ وما علیہ بڑی شرح وبسط سے ذکر کیا ہے۔

اس وقت یہ مسئلہ ہندوستان کی اسلامی فکر میں ایک اہم مسئلہ بن گیا۔
محمد مصنف (فرائنر روز نتھال) نے اس سے قطعاً تعرض نہیں کیا، اس فروگزاشت کے لیے ہمیں ان سے اس لیے تو شکوہ نہیں ہے کہ اس سے ہندوستانی عبقریت کے ساتھ اُن کے از راہِ استخفاف کا اظہار ہوتا ہے، بلکہ اس لیے شکوہ ہے کہ ایسا کرنے سے کتاب کا ایک اہم حصہ تشنۂ تکمیل رہ گیا۔
بہرحال نام نہاد خدائی علم کی بحث خواہ یورپ اور امریکہ میں مرتب کی جائے یا برصغیر پاک و ہند میں اس وقت تک تشنۂ تکمیل رہے گی جب تک سلم العلوم کے شارحین اور میرزاہد قطبیہ کے محشیوں کے افادات سے اس باب میں مکمل فائدہ نہ اٹھایا جائے۔
مفتی ماضی مصنف (روزنتھال) تک تو یہ بات کہاں پہونچ پائیگی۔ البتہ اگر ہمارے یہاں کوئی حوصلہ مند

ہم اگلے جانے والوں کی تقلید کیوں کریں — اے خوردہ گیر نحن رجال وہم رجال

پر عمل کرتے ہوئے اس کڑی کمان کو نہ کرنے کی جرأتِ رندانہ کرے تو کم از کم اسے روزنتھال کی غلطی کا اعادہ نہ کرنا چاہیئے۔

اختتامی معروض فاضل تبصرہ نگار کے تبصرہ کا ماحصل اُن کا یہ ارشاد گرامی ہے۔
"بلا (خوف) تردید کہا جاسکتا ہے کہ اسلام اور علم کے موضوع پر آج تک کسی زبان میں ایسی جامع اور فکر انگیز کتاب شائع نہیں ہوئی"
فاضل تبصرہ نگار کا مطالعہ بہت زیادہ وسیع ہے، اس لئے انھیں یہ دعوی کرنے کا حق ہے، اس کے بعد ایک قلیل المطالعہ نو آموز طالب علم کو جس کی نظر چند درسی کتابوں تک محدود ہو۔

اُن کی ہر بات پہ ہم نام خدا کہتے ہیں

سے زیادہ اور کچھ عرض کرنے کی جسارت نہیں کرنا چاہیئے۔

ممکن ہے اس اجمالی تبصرہ میں ان کا روئے سخن اپنے سست رفتار کوتاہ ہمت ہم قوم افراد کی طرف بھی ہو، لیکن اگر ہمارا اہل الرائے طبقہ ناراض نہ ہو تو پھر یہ عرض کرنے کی اجازت مل جائے کہ اس میں ان کوتاہ ہمتوں کی کوتاہی پرواز کے ساتھ شاید شائبۂ خوبی تقدیر کو بھی دخل ہے اور یہ شائبۂ خوبی تقدیر مختلف عوامل کے مجموعی نتیجہ کا نام ہے مگر اس کا تجزیہ تشکوہ سنجی کے مترادف ہوگا، ورنہ

فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

آخر میں یہ عرض کرنا مستحسن ہوگا کہ کسی کتاب کے باب میں دو ٹوک رائے کے اظہار سے پہلے اس کا پوری دقت نظر کے ساتھ مطالعہ اور مآخذ و مراجع سے محتویات کتاب کا مطالعہ ضروری ہے، کتاب یا مصنف کی کاوش کی کوتاہیوں یا فردِ گزاشتوں کی نشاندہی کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے، یہ تو خود اپنی ہی تنگیِ چشم حسود کا اظہار ہے، البتہ اگر نقاد کی نظر میں ہو تو اس امر کی وضاحت ضرور قابل ستایش ہوگی کہ مصنف نے پیش نظر شاہکار مرتب کر کے علم و ادب کی خدمت میں کیا حصہ لیا ہے، اور آیندہ مزید ترقی کا امکان ہے یا نہیں۔

زاں بعد یہ دیکھنا ہوگا کہ مصنف نے جن مآخذ و مصادر سے استفادہ کیا ہے، کیا اُن کے علاوہ اور بھی مآخذ و مراجع تھے، اگر اس بات کا جواب اثبات میں ہو، تو پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ فرد گذاشت کیوں ہوئی۔

آیا مصنف نے انھیں درخور اعتنا نہیں سمجھا (تو اس کی وجہ بتانا چاہئے)

یا اس کے علم میں نہیں تھے،

یا پھر اُس کی دسترس سے باہر تھے،

ان دو باتوں کی نشاندہی سے اس موضوع پر آیندہ تحقیقات کرنے والوں کی ہمت افزائی ہوگی، اور یہ امر علم و حکمت کی ترقی کے باب میں موثر اور قوی ثابت ہوگا۔

بہرحال کتاب فرزندانِ مشرق کے لئے ایک چیلنج ہے، کاش کوئی جواں ہمت بڑھ کر اس للکار کو قبول کرلے۔ جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

قرآن عربی زبان وادب کی کسوٹی

از

پروفیسر عبدالحلیم ندوی صدر شعبۂ عربی سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز حیدرآباد

قرآن شریف اللہ کی وہ مقدس کتاب ہے، جسے اس نے اپنے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے فرشتہ جبرئیلؑ کے ذریعہ عربی زبان کے قریشی لہجہ میں نازل فرمائی، یہ کتاب عرب کے دو مشہور شہروں میں آپ پر نازل ہوئی، ان میں سے ایک مکہ معظمہ ہے جہاں آپ کی ولادت مسعود ہوئی تھی، اور نبوت ملنے کے بعد ۱۳ برس اسلام کی دعوت دیتے رہے، اور دوسرا مدینہ منورہ ہے، جہاں آپ مکہ چھوڑ کر چلے گئے تھے، اور عمر کے باقی دس سال آپ نے وہاں گذارے، اور وہیں آپ کی وفات بھی ہوگئی، قرآن شریف کی بعض آیتیں آپ کے بعض سفروں کے درمیان بھی نازل ہوئیں۔

قرآن کریم آپ پر ۲۳ تیئیس سال کی مدت میں حسب ضرورت نازل ہوتا رہا، اس کی مصلحت یہ تھی کہ مسلمان رفتہ رفتہ نئے دین اور اس کی بنیاد پر قائم نئی زندگی، اور اس سے متعلق اصول، قواعد و ضوابط اور اس کے تقاضوں کے عادی ہوتے جائیں، تاکہ یک بیک وقت پرانی روش سے ہٹنے میں جو شدید تکلیف ہوتی ہے اس کا احساس کم سے کم تر رہے، اور آہستہ آہستہ اسلام اور اس کی تعلیمات ان کے دلوں میں گھر کرتی جائیں، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے کہ (وقرآناً فرقناہ لتقرأہ علی الناس علی مکث

ونزلناہ تنزیلا) قرآن کے اترنے کی ابتدا رمضان کی شب قدر سے ہوئی. (اِنَّا اَنْزَلْنَاہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ) اور صاف ستھری اور واضح عربی زبان میں روح امین (جبرئیل فرشتہ) کے ذریعہ آپ کے قلب پر اس کا نزول ہوا، تاکہ آپ لوگوں کو ان کے انجام اور عاقبت سے ڈرا سکیں، (وَاِنَّہٗ لَتَنْزِیْلُ ربّ العالمین نزل بہ الروح الامین علیٰ قلبک لتکون من المنذرین بلسان عربی مبین) اسے فرشتہ جبرئیل آپ کے پاس خدا کی طرف سے لے کر آتے تھے (نزلہ روح القدس من ربک بالحق.)

مکہ کی سب سے پہلی سورت | قرآن کے اترنے کی ابتدا ۱۱ سنہ عیسوی سے ہوئی، اور سب سے پہلی سورت جو آپ پر مکہ میں نازل ہوئی وہ سورت "العلق" کا یہ حصہ تھا (اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ خلق الانسان من علق، اِقْرَاْ وربک الاکرم الذی علّم بالقلم، علّم الانسان مالم یعلم) یہ آیتیں آپ پر ان دنوں اتریں جب آپ مکہ کے قریب غار حرا میں تنہا بیٹھ کر خدا کی عبادت کیا کرتے تھے، اور اس کی ذات وصفات اور نظام کائنات وغیرہ پر غور فرمایا کرتے تھے۔

مدینہ کی سب سے پہلی سورت | سنہ ۶۲۲ء میں آپ نے ہجرت فرمائی اور مدینہ میں آپ پر سب سے پہلے سورہ "المطففین" کی یہ آیتیں نازل ہوئیں، (ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون، الا یظن اولئک انھم مبعوثون لیوم عظیم، یوم یقوم الناس لرب العٰلمین) کیونکہ یہاں کے لوگ ناپ تول میں کمی بیشی کرتے تھے۔

آخری آیت | قرآن کریم کی آخری آیت جو آپ پر اتری وہ یہ ہے

الیوم اکملت لکم دینکم و	یعنی آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا
اتممت علیکم نعمتی ورضیت	اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور اسلام
لکم الاسلام دینا ۔ (مائدہ)	کو تمہارے لئے بطور مذہب کے پسند کیا۔

اور اس اعلان کے بعد ساری نسل انسانی کے لئے اس نے اسلام کو مذہب قرار دیا، کیونکہ
کا نچوڑ اور اس کی آخری شکل ہے۔ یہ آیتیں آپ کے آخری حج کے موقع پر اتری تھیں جسے حجۃ الوداع کہ
چونکہ اب آنحضرت صلعم کا مشن مکمل ہو چکا تھا، اسلام اور اس کی تعلیمات جزیرہ نما
ہر خطہ میں پھیل چکی تھیں، اور سچے مخلص اور اللہ پر کامل یقین اور بھروسہ رکھنے والے مسلم
جماعت پیدا ہو چکی تھی، جو آپ کی خاص تربیت کردہ تھی، اس لئے اب خدا کے نزدیک
صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت دنیا میں باقی نہیں رہ گئی تھی، چنانچہ اس آخری حج کے چند م
آپ کا وصال ہو گیا۔

قرآن کی سورتوں اور آیات کی تعداد | قرآن شریف میں ایک سو چودہ چھوٹی بڑی سورتیں
ہے اکیانوے مکہ میں اور تیئیس مدینہ میں نازل ہوئیں، ہر سورت میں مختلف چھوٹی بڑی آی
تعداد بسم اللہ کو چھوڑ کر چھ ہزار دو سو چودہ ہے، تلاوت کرنے میں آسانی کے خیال سے
کو تیس پاروں یا حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے، پھر ہر پارہ یا حصہ کو دو حصوں میں بانٹا گیا
ان دونوں کو بھی مزید چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، ان حصوں کو رکوع کہتے
ایک پارہ مختلف چھوٹے حصوں یعنی رکوع میں بٹا ہوا ہے تاکہ پڑھنے والوں کو آسانی رہے[1]

قرآن کریم کے موضوعات اور اس کی تعلیمات مکی سورتوں میں | مکی سورتیں مدنی سورتوں
میں چھوٹی ہیں، اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دینے کی ابتدا مکہ سے کی
ان سورتوں میں سب سے پہلے خدا کا واضح اور صاف تصور دیا گیا ہے، اور اس کے بعد صر
عبادت اور پرستش کرنے کا حکم ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا بلا شرکت غیرے ایک
ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، وہ قادر مطلق ہے یعنی وہ جو چاہے کرے اس پر ردّ
یا منع کرنے والا کوئی نہیں، زمین و آسمان چرند پرند، انسان اور سارے جاندار اس

---

[1] ڈاکٹر شوقی ضیف تاریخ الادب العربی ۲-۲۲ مطبوعہ دار المعارف مصر طبعہ ثانیہ

کیے ہوئے ہیں اور پوری کائنات میں اسی کا حکم چلتا ہے، اس کی مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا، ہر آدمی کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اس کے سامنے پیش ہونا ہے، اور دنیا میں جو کچھ کیا ہے، اس کا حساب کتاب دینا ہے اور اس کے مطابق اچھے کام پر انعام پانا ہے، جسے جنت کہتے ہیں، اور برے کام پر سزا بھگتنی ہے، جسے دوزخ کہتے ہیں، وہ معاف کرنے والا ہے، لیکن بہت سخت سزا دینے والا بھی ہے، وہ بہت مہربان اور بڑا رحم والا ہے، مگر جبار و قہار بھی ہے، وہ عالم الغیوب ہے، اور ہمارے دلوں کی باتوں کو بھی جانتا ہے، اس کے سامنے ہر چیز کا ظاہر و باطن کھلا ہوا ہے،

خدا کے واضح تصور اور اس کی وحدانیت کی تعلیم کے بعد قرآن میں اخلاق فاضلہ کی تعلیم دی گئی ہے جیسے عدل، احسان، وعدہ کا پورا کرنا، غلطی کرنے والے کو معاف کر دینا، اور برائیوں سے بچنے کی تلقین کی ہے، جیسے زنا، قتل کرنا، لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا، ناپ تول میں کمی کرنا اور ان تمام باتوں سے روکا ہے، جن سے خدا کا انکار لازم آتا ہے،

جہاں تک عبادات کا تعلق ہے تو نماز اور زکوٰۃ جیسے ارکان دین کا صرف اصولی حیثیت سے مکی سورتوں میں ذکر ہے، ان کی تفصیل یا موجودہ شکل مدینہ میں دی گئی، مثلاً زکوٰۃ کا مفہوم مکہ میں صرف یہ تھا کہ خدا کے راستے اور بھلائی کے کام میں خرچ کیا جائے، لیکن اس کے لیے زر نقد کی تعیین، تعداد اور مال کی خاص مقدار مقرر نہیں تھی، اور نہ اس کا کوئی خاص نظام تھا، یہ سب مدینہ میں ہوا، اسی طرح نماز کا عام حکم تھا، لیکن پانچ وقت کی تعداد مکہ میں مقرر نہیں ہوئی تھی،[1] اس قسم کے احکام کی غالباً بہترین مثال سورت الانعام ہے، جو مکہ میں نازل ہوئی تھی،

مکی سورتوں میں گزشتہ نبیوں اور پرانی قوموں کے قصے بھی بیان کیے گئے ہیں، جن میں یہ دکھایا گیا ہے کہ جن قوموں نے خدا کے احکام کی تعمیل کی خدا نے ان کو ہر قسم کی نعمتوں سے نوازا، اور جب

---

[1] ڈاکٹر احمد امین۔ فجر الاسلام۔ ص ۲۲۰ تا ۲۲۸

انھوں نے نافرمانی کی تو ان کو نیست و نابود کر دیا، ان کو بندر، خنزیر، اور دوسرے جانوروں کی شکل میں مسخ کیا، ان کی بستیاں الٹ دیں، ان پر آندھی طوفان اور زلزلوں کی سخت سزا سے بدانجام کو پہنچایا، بعض پر آسمان سے پتھروں کی بارش ہوئی، جو سزا ان پر آئی ان میں سے بعض کو صفحۂ ہستی سے اس طرح مٹا دیا کہ آج ان کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں۔ دوسری طرف مکی سورتیں مظاہر قدرت کی طرف اشارہ کرکے عقل انسانی کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں، کہ یہ سارا نظام کائنات یونہی بغیر کسی چلانے والے کے نہیں چل رہا ہے، بلکہ اس کے پیچھے ایک قوت محرکہ ہے، جس کے چشم و ابرو کے اشارے کا یہ سب کرشمہ ہے، قرآن تو یہاں تک کہتا ہے کہ دور کیوں جاؤ تم خود اپنے وجود اور اس وجود کی ابتدا اور شکم مادر میں صرف ایک قطرے سے اپنے تمام اعضاء و جوارح کے بننے اور ان کی پیچیدہ اور نازک ترکیب، بناوٹ اور پھر ان کے مختلف فرائض اور کام اور زندگی کے متعلق ان کی ناگزیری پر غور کرو تو سمجھ میں آجائے گا کہ یہ سب کاری گری کسی ایک خاص ہستی کی ہے، جو درحقیقت خالق اور مدبر ہے، جس نے ہر چیز بڑی باریک بینی اور جزرسی سے بنائی ہے، اور وہ ہے اللہ رب العلمین سارے جہان کا پالن ہار، مالک و مختار، اور جزا و سزا کے دن کا تنہا حاکم اور جج۔

مدنی سورتیں | مدنی سورتوں میں جو نسبتاً لمبی ہیں، اسلام کے ارکان دینی کا بیان ہے، مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے متعلق تفصیلی احکام ہیں، اور چونکہ یہاں سے ایک نئے معاشرے کی ابتدا ہو رہی تھی، اور ایک نئی اسلامی مملکت کی داغ بیل پڑ رہی تھی، اس لئے سماج سے متعلق احکام، فرد کے اور سماج کے تعلقات اور حقوق و فرائض کی نشاندہی کی گئی ہے، پاس پڑوس، خاندان، عزیز و اقارب، ماں باپ، اور دوسرے متعلقین کے حقوق و فرائض گنائے گئے ہیں، اور خاص طور سے شادی بیاہ

۱؎ اس قسم کے قصوں سے عربی اور اردو کی کتابیں بھری پڑی ہیں، قرآنی قصوں پر مشتمل جدید ترین کتاب «القصة القرآنية والصورة الفنية» مرتبہ فتحی رضوان ہے، اس کتاب میں مرکزی قصہ حضرت موسیٰ اور فرعون کا واقعہ ہے، جس کا ذکر قرآن میں [illegible] مرتبہ آیا ہے، کتاب قاہرہ میں چھپی ہے تفصیل کیلئے دیکھئے رسالہ "المصور" قاہرہ مورخہ ۲۳ر فروری ۱۹۶۹ء ص ۸۸ - ۸۹۔

اور طلاق کے معاملات اور ان کے احکام، وراثت کے قوانین اور حرام وحلال کی تفصیل گنائی گئی ہے، ملکی سیاسی اور معاشی معاملات سے متعلق اصول قواعد ضوابط اور بنیادی باتوں کا ذکر ہے اور اسی کے ساتھ نظام جماعت، نظام حکومت اور طریقہ حکومت، نظام عدالت، نظام معیشت، اور لین دین، تجارت، صنعت وحرفت وغیرہ سے متعلق اسلامی نقطۂ نظر اور طور طریقوں کی تفصیل ہے، ان کے علاوہ اسلام میں دشمن عناصر سے معاملہ کرنے ان سے جنگ وصلح کرنے کے اصول اور ضابطے متعین کئے گئے ہیں، دوسری قوموں سے تعلقات قائم کرنے انھیں استوار رکھنے، ان سے جنگ وصلح اور امن کے سلسلے میں معاہدے کرنے، ذمیوں کے ساتھ سلوک اور ان کے حقوق وفرائض کے رہنما اصول بنائے گئے ہیں، اس قسم کی بہترین مثال دو مدنی سورتیں یعنی سورہ بقرہ اور النساء ہیں، غرض کہ مدنی سورتوں میں اسلام کی دینی اور دنیاوی زندگی کا مکمل خاکہ پیش کیا گیا ہے، اور مسلمانوں کو اسی خاکہ اور اس کے اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کی ہدایت کی گئی ہے، چنانچہ خود رسول اللہ صلعم نے ان کے مطابق زندگی گزار کر ان کا عملی ثبوت دیدیا۔

قرآن کریم کی جمع وتدوین | قرآن کریم چونکہ کلام الٰہی ہے اور نسل انسانی کے لیے دائمی ضابطۂ حیات کے طور پر نازل ہوا ہے اسلئے اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے ارشاد خداوندی ہے،

انا نحن نزلنا الذکر وانا له	ہم ہی نے قرآن کو نازل کیا ہے، اور
لحافظون (حجر)	ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔

روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کو قرآن کی حفاظت کی اتنی فکر رہتی تھی کہ آپ اکثر اوقات اس کی تلاوت کرنے اور اسے دہرانے میں لگے رہتے، کبھی ایک ساتھ کوئی لمبی سورت نازل ہو جاتی تو آپ بھولنے کے ڈر سے جلدی جلدی اسے دہراتے اور گھنٹوں اس میں لگا دیتے، چنانچہ اللہ نے آنحضرت کی یہ فکر یہ کہہ کر دور کر دی کہ

...علینا جمعہ وقرآنہ اس کے جمع کرنے اور تلاوت کی ذمہ داری
ہمارے اوپر ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن اترتا تھا تو آپ کاتبین وحی سے جن کی تعداد وسا
نو تک بتائی جاتی ہے، بہ ترتیب لکھوا دیتے تھے، اس زمانے میں عرب میں کاغذ کا وجود نہ تھا، اور
چمڑے کے ٹکڑوں، کھجور کے پتوں، ہڈی اور چکنے پتھروں پر آیتیں لکھ لی جاتی تھیں، اسی کے سا
تمام صحابہ انھیں زبانی یاد کر لیتے تھے، اس طرح لکھنے کے علاوہ بیک وقت سینکڑوں سینوں میں
قرآن محفوظ ہوتا رہتا تھا، چنانچہ آپ کی زندگی ہی میں پورا قرآن، آپ کے حکم سے اور آپ کی بتا
ترتیب کے مطابق بجنسہ مرتب ہو چکا تھا، اور جب آپ کا انتقال ہوا ہے تو یہ مرتب قرآن آ
بعد آپ کے خلیفہ حضرت ابوبکرؓ کو ملا،

جنگ یمامہ میں جب سات سو سے زائد حفاظ قرآن شہید ہو گئے، تو حضرت عمرؓ کو فکر ہو
کہ اگر اسی طرح قرآن کے حافظ جنگوں میں شہید ہوتے رہے گے تو ایک دن ایسا بھی آسکتا ہے
گنے چنے چند ہی حفاظ رہ جائیں، اور پھر ایک دن سینوں سے قرآن بالکل ہی مٹ جائے۔ چنا
آپ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور اس خطرہ کا اظہار کرنے کے بعد کہا کہ آپ قرآن شریف کو یکجا جمع
کرا دیتے ؟ حضرت ابوبکرؓ کو شروع میں تردد ہوا لیکن آخر میں بات آپ کی سمجھ میں آگئی، اور آ
حضرت زید بن ثابتؓ کو جو خاص کاتبین وحی میں سے تھے، حکم دیا کہ اسے ایک جگہ جمع کر دیں،
انھوں نے چمڑوں کے ان ٹکڑوں، کھجور کے پتوں، چکنے پتھروں اور ہڈیوں سے قرآن شریف
ایک جگہ جمع کیا اسکے بعد بڑے بڑے صحابہ کے سامنے جنھیں پورا قرآن زبانی یاد تھا جیسے حضرت ابی
عثمان بن عفانؓ، علی بن ابی طالبؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، طلحہؓ، حذیفہ الیمانؓ، ابوہریرہؓ، ا
ابوموسیٰ الاشعریؓ کے سامنے پیش کر کے اس کی تصدیق کرائی، اس طرح جب یہ نسخہ مکمل ہو

حضرت ابوبکرؓ کے پاس رکھ دیا گیا کہ جب آپ کا انتقال ہوگیا اور حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو یہ قرآن آپ کے پاس رہا، آپ کی وفات کے بعد یہ قرآن آپ کی صاحبزادی اور ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس منتقل ہوگیا۔

حضرت عمرؓ کے بعد جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے اور فتوحات کا سلسلہ خاصا بڑھنے لگا اور دوسری قوموں کے لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے اور انھوں نے قرآن کو اپنے لہجوں میں اور غلط اعراب کے ساتھ پڑھنا شروع کیا تو قرآن میں اختلاف پیدا ہونے کا ڈر پیدا ہوا، چنانچہ حذیفہ الیمانؓ صحابی نے جو خود بھی وحی لکھنے والوں میں تھے، آرمینیہ اور آذربیجان کی فتح کے موقع پر مسلمانوں کو مختلف لہجوں اور مختلف اعراب سے قرآن پڑھتے سنا تو انھیں قرآن میں اختلاف پیدا ہونے کا خطرہ محسوس ہوا، چنانچہ وہ فوراً حضرت عثمانؓ کے پاس آئے اور کہا کہ امیر المومنین مسلمانوں میں قرآن کے معاملے میں اتنا اختلاف پیدا ہونا شروع ہوگیا ہے کہ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں ان کی حالت بھی یہود و نصاریٰ کی طرح نہ ہو جائے حضرت عثمانؓ کو معاملہ کی نزاکت کا احساس ہوا، چنانچہ حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپکے پاس جو قرآن ہے اسے ہمارے پاس بھیجدیجئے، ہم اس سے کئی نسخے کرانے کے بعد آپ کے پاس دوبارہ واپس بھیجدیں گے، حضرت حفصہؓ نے وہ قرآن آپکے پاس بھیجدیا، اور آپ نے زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن الزبیرؓ، سعد بن العاصؓ، عبدالرحمانؓ بن الحارث بن ہشام کو حکم دیا کہ اس کی نقلیں کریں، چنانچہ ان لوگوں نے اس نسخہ سے ۳۰ھ میں پورا قرآن نقل کیا، اور اس کا نام "امام" رکھا گیا[1] اس کے بعد حضرت حفصہؓ کو ان کا قرآن واپس کر دیا گیا، حضرت عثمانؓ نے اپنے اس نسخہ سے جس کا نام "امام" تھا، مزید نسخے لکھوائے، اور انھیں مکہ، کوفہ، بصرہ اور دمشق کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھجوایا[2]۔ اور حکم دیا کہ اب صرف

---

[1] الفہرست لابن ندیم ص ۲۴ [2] نفح الطیب ۱/ ۲۸۸

انھیں نسخوں کے مطابق قرآن کی تلاوت کی جائے، باقی تمام نسخوں کو آپ نے جلوا دیا[1] اور اس طرح ایک متفقہ قرآن سارے ممالک اسلامیہ میں پھیل گیا، اور حفاظ صحابہ نے اسی کے مطابق مفتوحہ علاقوں میں قرآن کی تعلیم دینا شروع کر دیا، چنانچہ لہجوں اور اعراب کی غلطیوں کا امکان ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، حضرت عثمانؓ کے ارسال کردہ نسخوں سے مسلمانوں نے اپنے ذاتی نسخے بھی بڑی تعداد میں لکھے، چنانچہ مسعودی نے مروج الذہب میں حضرت علیؓ اور معاویہؓ کے درمیان جنگ صفین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ جب حضرت علیؓ کا پلہ بھاری ہوا، اور عمرو بن العاصؓ نے قرآن کو حکم بنانے کا نعرہ لگایا تو معاویہؓ کے لشکر نے تقریباً پانچ سو قرآن نیزوں پر بلند کر کے قرآن کی ثالثی کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا، اور یہ سب جانتے ہیں کہ اس وقت حضرت عثمانؓ کے ارسال کردہ قرآن پر صرف سات سال کی مدت گزری تھی، کیونکہ جنگ صفین ۳۷ھ میں ہوئی ہے[2]۔

صحابہ حفاظ مختلف قبائل کے تھے، چنانچہ ان میں سے بعض حفاظ بعض حروف یا الفاظ کو اپنے قبیلہ کے رائج طریقہ سے ادا کرتے تھے، اس سے قرأت کے کئی طریقے نکلے، بعد میں ایک مستقل فن وجود میں آگیا، جسے "فن تجوید" یا "قرأۃ" کہتے ہیں، اس فن کے سات امام یہ تھے، ابن عامر، ابن کثیر، عاصم، ابو عمرو بن العلاء، حمزہ، نافع اور الکسائی،

اس طرح یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ قرآن کریم جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، بالکل اسی طرح آج تک محفوظ ہے، کیونکہ جیسے ہی کوئی آیت اترتی، آنحضرتؐ فوراً ترتیب کے مطابق اسے لکھوا دیتے، پھر تمام صحابہ اسے زبانی یاد کر کے پانچوں وقت نمازوں میں پڑھنا شروع کر دیتے، اس کے علاوہ خدا کی طرف سے قرآن کی حفاظت کے لیے یہ احتیاط برتی گئی کہ ہر سال حضرت جبریل علیہ السلام خود آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مکمل قرآن کی ترتیب کے ساتھ

---

[1] مختصر ابی الفداء ۱/۱۶۶ [2] مروج الذہب ۲/۲۰

تلاوت کرتے تھے، چنانچہ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت جبریلؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قرآن کو ترتیب سے پڑھتے تھے، تاکہ آپ بھی اسی ترتیب سے اس کی تلاوت فرمائیں جس سال آپ کا وصال ہوا ہے، حضرت جبریلؑ نے دو مرتبہ آپ کے سامنے قرآن دہرایا،

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کو نازل ہوئے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کا عرصہ گزر رہا ہے اسکے باوجود اس کے ایک لفظ میں بھی رد و بدل نہیں ہوا ہے، اور آج تک وہی قرآن دنیا میں رائج ہے،

چونکہ صحیفۂ خداوندی اسلام کا دستور اور مسلمانوں کا ضابطۂ حیات ہے اسلئے اسکو زبانی یاد کرنے کا رواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لیکر آج تک چلا آرہا ہے اور جب تک مسلمان روئے زمین پر ہیں یہ سلسلہ چلتا رہے گا، آج بھی دنیا میں لاکھوں مسلمانوں کو پورا قرآن زبانی یاد ہے، اور ہر سال رمضان کے مہینے میں پورا قرآن تراویح کی نماز میں دہرایا جاتا ہے، اس طرح خدا کا وہ وعدہ کہ "ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں، پوری طرح حقیقت بن کر رہا، اور قرآن آج تک اسی طرح باقی ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا تھا،

مسلمانوں نے اس معاملہ میں اتنی احتیاط برتی ہے کہ قرآن کے بعض الفاظ جن کے ہجے اس زمانے میں مختلف تھے، انھیں بھی قرآن میں اس طرح رہنے دیا ہے، اور ان کی اصلاح نہیں کی ہے، تاکہ اس کے کسی لفظ یا نقطہ میں بھی تبدیلی یا ترمیم کا شبہہ بھی نہ ہونے پائے۔

قرآن کا اعجاز، انداز بیان اور اس کا عربی زبان و ادب پر اثر،

قرآن کے مذہبی تقدس اور اہمیت سے قطع نظر کرکے خالص زبان اور ادب کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو شاید یہ پہلا صحیفہ ہے جو عربی زبان و ادب میں کتابی شکل میں ابواب، فصلوں اور قصوں کے ساتھ مدون و مرتب ہوا، یمنیوں اور حمیریوں نے بلاشبہ اپنے کارنامے اور بعض اہم واقعات مرتب کیے تھے، لیکن کتابی شکل میں ان کو مرتب کرنے کا ذکر نہیں ملتا، اگر ملتا بھی ہے، تو ان کا وجود نہیں، البتہ ان کی تحریریں پتھروں اور دیواروں پر

کندہ ملے ہیں، جن سے ان کی تاریخ کے بعض اہم واقعات پر ایک ہلکی سی روشنی پڑتی ہے۔[1]

تمام علماء، مفکرین اور نقادوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم اپنی فصاحت و بلاغت اور زبان و بیان کے اعتبار سے عربوں کا سرمایہ فخر و مباہات ہے، کیونکہ اگر قرآن کا نزول نہ ہوا ہوتا تو عربوں کا نہ ادب محفوظ رہ پاتا اور نہ ان کی کوئی شریعت ہوتی،[2] کیونکہ نہ تو وہ نظم ہے، اور نہ ایسی مسجع نثر، جس کے ہر جملہ کا آخری لفظ اس کے پہلے والے جملے کے آخری لفظ کا ہم وزن اور ہم آواز ہوتا ہے، نہ ہی ایسی نثر مرسل ہے جس میں عبارت سیدھی سادی بغیر قافیہ بندی کے لکھی جاتی ہے، اور نہ ہی اس کا انداز اور اسلوب تقریر یا خطبہ کے انداز و اسلوب سے ملتا ہے، بلکہ وہ نثر کی ایک ایسی منفرد قسم ہے، جس میں نظم اور اعلیٰ معیار کے نثر فنی کے امتزاج سے ایسا اچھوتا اور بے مثال اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے جس میں بعض جگہ مسلسل خوبصورت اور دل آویز مسجع عبارتیں بھی ہیں، اور بعض جگہ رواں عبارتیں بھی، مگر کچھ اس انداز سے کہ جس میں پوری فصاحت و بلاغت کے ساتھ پوری موسیقیت اور پوری شعری نغمگی بھی پائی جاتی ہے، اور پوری نثری سلاست و روانی بھی،[3] اس لئے آج تک کوئی انسان قرآن جیسا اسلوب نہ بنا سکا، اور نہ اس جیسی ایک آیت ہی لکھ سکا اور اسی لئے تخلیق آدم سے لے کر آج تک نسل انسانی کو کوئی دینی یا دنیوی کتاب ایسی میسر نہ آسکی جو قرآن کے اسلوب بیان، اس کے معانی و مطالب کی گہرائی و گیرائی اور اس کی اثر اندازی اور دلوں میں گھر کر لینے کی امتیازی خصوصیت میں اس کا مقابلہ کر سکے، اور یہی امتیاز قرآن کا سب سے بڑا اعجاز اور اس کے کلام الہٰی ہونے کی دلیل ہے۔ اس نے انسان کو تخلیق کائنات، مظاہر قدرت اور ان کی رنگا رنگی کی طرف اشارہ کر کے جس مادی اور محسوس طریقۂ استدلال سے ان کے

---

[1] احمد امین، فجر الاسلام صفحہ ۱۹۲ [2] حاشیہ کرد علی۔ الاسلام والحضارۃ العربیہ ص ۷۱ اور اس کے بعد

[3] ڈاکٹر شوقی ضیف۔ تاریخ الادب العربی العصر الاسلامی ۱/۳۰ اور الباقلانی اعجاز القرآن

خالق اور مدبر کے وجود کی طرف سوچنے کی عقل کو دعوت دی ہے، اس کی مثال دوسری کتابوں میں نہیں ملتی۔

اولم ینظروا فی ملکوت السمٰوات والارض وما خلق اللہ من شیٔ۔ (اعراف)

کیا انھوں نے آسمانوں اور زمینوں کی بناوٹوں پر اور اللہ نے جو چیزیں پیدا کیں ان پر غور نہیں کیا۔

یا قرآن کا یہ قول کہ

ان فی خلق السمٰوات والارض واختلاف اللیل والنہار لآیات لاولی الالباب الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا ویتفکرون فی خلق السمٰوات والارض ربنا ما خلقت ھٰذا باطلا۔ سبحانک (آل عمران)

یعنی آسمانوں اور زمین کی پیدایش اور رات دن کے آنے جانے میں ان عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں، جو کھڑے اور بیٹھے اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور آسمانوں اور زمینوں کی پیدایش پر غور کرتے ہیں کہ اے رب تو نے یہ سب بےکار نہیں پیدا کیا، تیری ذات پاک ہے،

یا اس کا یہ قول کہ

ومن آیاتہ خلق السمٰوات والارض واختلاف السنتکم والوانکم (روم)

(زبانوں کا اختلاف مراد ہے)

خدا کی نشانیوں میں زمین اور آسمانوں کی پیدایش اور تمہارے رنگوں اور ۔۔۔

یا اس کا یہ کہنا کہ

لئن سألتہم من خلق السمٰوات والارض لیقولن اللہ (عنکبوت)

اگر آپ ان سے پوچھیں کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ جھٹ بول اٹھیں گے کہ اللہ نے۔

لہ احمد امین، فجر الاسلام۔ ص ۱۸۰

پھر قرآن نے جس انداز سے انسان کو اس کی اپنی تخلیق کے اپنے آثار و عجائبات، اور نظام جسمانی میں ان کے نازک اور اہم کاموں کو سامنے رکھ کر اور ان پر غور و فکر کرکے خالق تک پہونچنے کی دعوت دی ہے، وہ قرآن کا منفرد طریقۂ استدلال ہے، "وفی انفسکم أفلا تبصرون" اور خود تمہارے اندر نشانیاں ہیں، کیا تم کو سجھائی نہیں دیتا یا "فلینظر الانسان مما خلق" یعنی انسان کو اس پر غور کرنا چاہئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا، یا جس طریقے سے وہ عدم سے وجود میں اشیا کو لاتا ہے، جس طرح جاندارون کو پیدا کرتا ہے، اور جس طرح مارتا ہے کیا وہ ذات ان کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے،

قال من یحیی العظام وھی رمیم — (کافر انسان نے) کہا کون ہڈیوں کو زندہ کریگا جب کہ وہ سڑ
قل یحییھا الذی انشأھا اول — گل گئی ہوں تم کہدو وہی انکو زندہ کریگا جس نے پہلی مرتبہ
مرۃ وھو بکل خلق علیم (یٰسٓ) — انکو بنایا تھا اور وہ ہر قسم کی پیدائش سے واقف ہے،

اور جب قادر ہے تو کیا ان سے ان کے اعمال و افعال کے متعلق باز پرس کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا؟ اگر رکھتا ہے تو کیا اس ذات کے علاوہ کوئی دوسری ذات عبادت و بندگی کے لائق ہے؟ پھر اس نے نسل کو روئے زمین پر ایک بامقصد، مفید اور موثر زندگی گذارنے کے جن طور طریقوں کی نشاندہی کی ہے، اور جن پر عمل کرنے کے بعد دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی وکامرانی سکون و اطمینان اور راحت ابدی حاصل ہونے کی ضمانت لیتا ہے، اس کا خاصہ ہے۔

اور اس قسم کے دوسرے طریقۂ استدلال کے ذریعہ جس طرح قرآن نے خالق حقیقی اور معبود اصلی تک پہنچنے کی راہیں ہموار کی ہیں، وہ قرآن کے معجزانہ انداز بیان اور اسلوب کا طرۂ امتیاز ہے،

قرآن کریم کی انہی امتیازی خصوصیات کی بنا پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تلاوت کرتے تھے، تو اس کا ہر ہر لفظ اور ہر ہر آیت، سننے والے کے دل و دماغ میں خواہ آپ کا

دشمن ہو یا دوست اس طرح اثر تی چلی جاتی تھی، کہ وہ مسحور ہو جاتا تھا، اور اسکی معجزہ نما قوت بیان سحر طراز طرز استدلال اور بے پناہ اثر اندازی کے سامنے سپر ڈال دیتا تھا، چنانچہ روایت ہے کہ ولید بن مغیرہ نے جو آپ کا بدترین دشمن تھا، آپ کو قرآن شریف کی بعض آیتیں تلاوت کرتے سنیں تو اتنا متاثر ہوا کہ وہ بھاگا ہوا قریش کے بعض ممتاز سرداروں کے پاس آیا اور بولا کہ

واللہ لقد سمعت من محمد کلاماً	یعنی خدا کی قسم میں نے محمدؐ کو ایسا کلام
ماھو من کلام الانس ولا من	پڑھتے سنا ہے جو نہ تو انسانوں کا کلام
کلام الجن، وان لہ لحلاوۃ وان	ہو سکتا ہے اور نہ جنات کا، اس میں تو
علیہ الطلاوۃ وان أعلاہ	بڑی مٹھاس بڑا بانکپن اور دلکشی ہے،
لمثمر وان اسفلہ لمغدق[1]	اس کا اوپری حصہ (یعنی ظاہر الفاظ)
	بڑا پھلدار (بڑا سامعہ نواز اور حسین)
	اور اس کا نچلا حصہ بہت زیادہ پانی والا ہے،
	(یعنی معانی و مطالب کے اعتبار سے
	بہت دقیق اور گہرا ہے)

اسی طرح معلقات کے مشہور شاعر اعشیٰ قیس (۶۲۹ء مطابق ۸ھ) کے متعلق روایت ہے کہ فتح مکہ سے پہلے جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں مدحیہ قصیدہ لکھ کر آپ سے ملنے کے لیے حجاز روانہ ہوا تو قریش کے بعض سردار اس سے راستے میں ملے، اور اس ڈر سے کہ کہیں وہ قرآن کی سحر آفرینی سے متاثر ہو کر مسلمان نہ ہو جائے، انھوں نے اسے ایک سو اونٹ دے کر اس کے وطن یمامہ میں واپس بھیج دیا، اسی طرح مغیرہ بن شعبہ اپنے کان میں روئی ڈال

---

[1] تفسیر زمخشری ۔ تفسیر سورۃ المدثر ۔ الطلاوۃ ۔ الحسن والبھجۃ ۔ یعنی دلفریب، من موہنا، خوبصورت،

کعبہ کے سامنے سے گزرتا تھا کہ مبادا اس کے کان میں قرآن کی آواز نہ پڑ جائے اور وہ اس سے متاثر ہو کر مسلمان نہ ہو جائے،

حضرت عمرؓ جو اسلام، مسلمانوں اور آنحضرت صلعم کو اتنے سخت دشمن تھے کہ ایک دن گھر سے نکلے کہ آج آنحضرتؐ کا خاتمہ کر کے رہیں گے، تو اتفاق سے راستے میں ہی کسی نے کہدیا کہ محمدؐ کو تو بعد میں ختم کرنا پہلے اپنی بہن اور بہنوئی کی خبر لو، وہ بھی مسلمان ہو چکے ہیں، چنانچہ اسی شدید غصہ میں بہن کے گھر پہونچے تو قرآن پڑھنے کی آواز آئی، آپ کا پارہ اتنا چڑھا کہ بہن اور بہنوئی دونوں کو مارتے مارتے لہولہان کر دیا، اور جب خون میں لت پت بہن نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہا کہ عمرؓ چاہے جان مار ڈالو یہ خمار اب اتر نہیں سکتا، تو عمرؓ سناٹے میں آگئے اٹھا ہوا ہاتھ ایک دم سے رک گیا، جیسے فالج پڑ گیا ہو، پھر زچ ہو کر بولے کہ اچھا تم کیا پڑھ رہی تھیں، مجھے سناؤ، چنانچہ انھوں نے سورت طٰہٰ کی چند آیتیں پڑھ کر انہیں سنائیں، عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا، اور بے اختیار پکار اٹھے کہ لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ اور اس کے بعد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر باقاعدہ مسلمان ہو گئے[1]، اور یہیں سے خطاب کے اونٹ چرانے والے نوجوان بیٹے کی قسمت محض قرآن کی اثر اندازی کی بدولت بدل گئی بقول اقبال، ؎

تو می دانی کہ سوزِ قرأتِ تو   دگرگوں کرد تقدیرِ عمرؓ را

ان واقعات سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ قرآن کریم کا اسلوب بیان، طرز تخاطب، طریق استدلال اتنا موثر، دل آویز اور معجز نما تھا کہ جو کوئی بھی سن لیتا اس کے آگے سپر ڈال دیتا، اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی ان خصوصیات میں بالکل منفرد و یگانہ ہے، نہ وہ اس زمانے کے ممتاز ادبا اور فصحا کے کلام سے ملتا جلتا تھا، اور نہ جنوں کی ان بولیوں سے مشابہ تھا، جس کو لوگ اپنے منتروں

---

[1] حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کی پوری تفصیل سیرۃ النبیؐ علامہ شبلی نعمانی میں ملاحظہ ہو۔

میں استعمال کرتے تھے، نہ وہ ان اشعار سے ملتا جلتا تھا، جو اس زمانے کے شعراء سناتے تھے، اور نہ ہی کاہنوں اور مقروں کی زبان سے اسے کوئی مشابہت تھی، بلکہ وہ ان سب سے جدا، منفرد، اور ممتاز چیز تھی، جس کی مثال وہ آپ خود تھا[1]، اس کا انداز بیان اتنا اچھوتا اور ممتاز تھا کہ قرآن نے عربوں کو چیلنج دیا کہ تم اپنی زبان دانی، اپنی فصاحت و بلاغت پر اتنے نازاں ہو تو قرآن جیسی کتاب لاکر دکھادو، خود نہ کرسکو تو اپنے ساتھ جنوں کو بھی شریک کر لو، مگر یاد رکھو تمھیں اس میں کامیابی نہ ہوگی، پورے قرآن جیسی کتاب تو کیا تم اس جیسی ایک آیت بھی نہیں لاسکتے۔

قل لئن اجتمعت الانس والجن	آپ (محمد صلعم) ان لوگوں سے کہہ دیجیے
علی أن یاتوا بمثل هذا القرآن	کہ انسان اور جنات مل کر بھی قرآن جیسی
لا یاتون بمثله ولو کان بعضهم	کتاب لانا چاہیں گے تب بھی انھیں اس میں
لبعض ظهیراً۔	کامیابی نہ ہوگی، چاہے ان میں سے بعض بعض
	کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔

یہی نہیں بلکہ اگر تمھیں اس قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں شبہ ہے اور اگر تم سچے ہو تو اس جیسی ایک ہی آیت لاکر دکھادو، اور اس کام میں خدا کے سوا اپنے ساتھیوں کو بھی شامل کر لو۔

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی
عبدنا فأتوا بسورة من مثله
وادعوا شهداءکم من دون الله
ان کنتم صادقین۔ (بقرہ)

چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ عرب کے بڑے سے بڑے ادیب، اور ممتاز سے ممتاز شاعر اس

---

[1] ڈاکٹر شوقی ضیف۔ تاریخ الأدب العربی، ۲/ ۳۰

چیلنج کے آگے بے بس ہو گئے، ان میں سے بعض نے کوشش بھی کی، لیکن ان کی کوشش خود انکی نگاہ میں مضحکہ خیز اور مہمل دکھائی دینے لگی۔

اس طرح کی کوشش کرنے والوں میں مورخین نے سات آٹھ اشخاص کا ذکر کیا ہے، جن میں مسیلمۂ کذاب کا جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اور سجاح بنت الحارث بن السویہ کا جو عورتوں میں پہلی مدعیۂ نبوت تھی، اور جس نے بعد میں مسیلمہ سے شادی کرلی، خاص طور سے ذکر کیا ہے اور ان کے بقول ان پر نازل شدہ آیات بھی لکھی ہیں، جو مہمل اور بے معنی اور انتہائی مضحکہ خیز ہیں، مدعیانِ نبوت کے علاوہ ادبا اور شعراء میں مشہور شاعر ادیب اور فلسفی ابو العلاء المعری کا بھی ذکر کیا ہے، کہ انھوں نے قرآن جیسی عبارت لکھنے کی کوشش کی مگر بری طرح ناکام رہے،[۱]

جب اس طرح عربوں کو قرآن کا تحریری مقابلہ کرنے میں ذلت آمیز ناکامی ہوئی تو انھوں نے اب اپنی زبانیں بند کرلیں، اور تلواریں میان سے نکال لیں، لیکن یہ قرآن ہی کا اعجاز تھا، کہ باوجود سخت مخالفت اور متعدد خونریز لڑائیوں کے اسلام کے سیل رواں کو کوئی روک نہ لگا سکا، اور اور اس کا ڈنکا آنحضرت صلعم ہی کے زمانے میں نہ صرف جزیرہ نمائے عرب میں بجنے لگا، بلکہ اس کے اثر دور دور تک پھیل گئے، اور بعد میں تو قرآن کا غلغلہ مشرق میں ہندوستان تک، مغرب میں بحر اوقیانوس کے ساحلوں تک، شمال میں دریائے لورا کے کناروں تک اور جنوب میں وسطی افریقہ تک بلند ہوئے

جیسا کہ معلوم ہے، عرب قبائل عام طور سے معمولی باتوں پر آپس میں لڑ جاتے تھے، اور ان لڑائیوں کے سلسلے ایک مدت دراز تک چلا کرتے تھے، قرآن نے نازل ہو کر سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ان کے

---

[۱] ایسے لوگوں کی پوری فہرست اور تفصیل کے لیے دیکھئے۔ الکامل للمبرد ۲/ ۱۱۱ اور مصطفیٰ صادق الرافعی تاریخ ادب العرب مطبوعہ الاستقامۃ۔ القاہرہ، ۲/ ۱۰۴ ۔ جرجی زیدان۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ۲/ ۵ مطبوعہ دار الہلال، مصر مراجعۃ و تعلیق ڈاکٹر شوقی ضیف۔

اختلافات کو ختم کرکے ان سب کو بھائی چارگی کے رشتہ میں پرو دیا، اور اس طرح آنحضرت صلعم کے قول کے مطابق المسلمون اخوۃ سب بھائی بن گئے، اس طرح یہ قبائل مختلف لہجوں میں گفتگو کرتے تھے بلکہ یمنیوں کی زبان تو حجازیوں کی زبان سے اتنی مختلف تھی کہ کہیں سے تال میل معلوم ہی نہیں ہوتا تھا، قرآن نے لہجہ قریش میں نازل ہوکر یہ تاریخی کارنامہ انجام دیا کہ تمام لہجوں کو ختم کرکے زبان کے معاملے میں بھی لہجہ قریش پر سب کو اس طرح متحد و متفق کر دیا کہ اب سارا عرب اسے اسی لہجہ میں تلاوت کرنے لگا، اور اسی لہجہ میں زبانی یاد کرنے لگا، نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ سارے لہجے ختم ہونے لگے، اور آخر میں شعر و ادب کی زبان بھی قریشی لہجہ بن گیا، اور یہ قرآن کا وہ اعجاز ہے، جس کی مثال کسی دوسری آسمانی کتاب میں نہیں ملتی زبان و ادب کے اس اتحاد کے بعد قرآن نے ان عربوں کو جو سیاسی وحدت اور ملی یگانگت کے مفہوم تک کو نہیں سمجھتے تھے، بقول وان کریمر مختلف قبیلوں کو ایک مشترک دین کے شعور کے ساتھ ساتھ ایک واحد قیادت کے سہارے ایک ہی سیاسی نظام میں پرو دیا، اور اس طرح وہ قبائلی نظام جو بالکل تو ختم نہ ہو سکا، لیکن پہلی مرتبہ اس کو دینی وحدت کے مقابلے میں ثانوی حیثیت ملی (سرتھامس آرنلڈ کی انگریزی کتاب کا ترجمہ "الدعوۃ الی الاسلام ص۵۳)

قرآن اور اس کے انداز بیان کا زبان و لغت پر یہ خاص اثر ہوا کہ اس نے عربی زبان میں ایک خاص قسم کا انفرادی تقدس پیدا کر دیا، جس کی مثال کسی دوسری زبان میں مشکل سے ملے گی اور وہ اس طرح کہ اس نے نہ صرف نئے الفاظ وضع کئے اور ان کے معنی متعین کئے، بلکہ بعض پرانے الفاظ کے معانی و مطالب کو وسعت و گہرائی دی، اور بعض کے معنی بدل کر نئے معنی پہنائے جیسے فرقان، کفر، ایمان، شرک، نفاق، اسلام کہ ان الفاظ کو مخصوص معنوں میں استعمال کرنے کا سہرا قرآن ہی کے سر ہے، اور اسی طرح یہ الفاظ جو پہلے سے عربی میں موجود تھے، لیکن نئے اور مخصوص معنوں میں عربی زبان میں بالکل نئے الفاظ کی طرح شامل ہوئے، اور ان کے معنی پہلے سے رائج شدہ

حقیقی معنوں سے بالکل مختلف ہوگئے، مثلاً لفظ "صلوٰۃ" جس کے معنی لغات میں صرف "دعا" کے تھا لیکن قرآن کریم نے اسے مسلمانوں کے مخصوص طریقۂ عبادت کے لئے متعین کر دیا، اب لفظ صلوٰۃ کسی دوسرے مذہب کی عبادت کو نہیں کہہ سکتے، یا لفظ "صوم" جس کے لغوی معنی کسی کام سے رک جانا کے تھے لیکن قرآن نے اسے مخصوص طریقے اور چند قیود اور شرائط کے ساتھ کھانے پینے اور بعض دیگر انسانی ضروریات سے صبح صادق سے لے کر سورج ڈوبنے تک رکے رہنے کے لئے مخصوص کر دیا ہے جسے ہم روزہ کہتے ہیں، یا لفظ "زکوٰۃ" جس کے لغوی معنی صرف "پاک و صاف کرنے" کے ہیں، مگر قرآن نے اسے اس ٹیکس کے لئے مخصوص کر دیا ہے، جسے مسلمانوں کو اپنے مال و دولت پر ہر سال دینا پڑتا ہے، اسی طرح مومن، کافر، فاسق، وغیرہ کے الفاظ ہیں، جن کے معنی قرآن نے متعین کر کے ان کے معنی میں وسعت و گہرائی کے علاوہ ایک دینی رنگ دے دیا، چنانچہ اب انکے مخصوص اصطلاحی معنی متعین ہو گئے، جو کسی دوسرے معنی میں استعمال نہیں ہو سکتے،

قرآن کریم کی بدولت عربی زبان میں بہت سے نئے علوم کا وجود ہوا، جیسے اس کی تشریح و توضیح کے لیے علم تفسیر اور اصول تفسیر پیدا ہوا، اس کے معنی و مطالب کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے علم نحو و صرف پھر علم بیان و بلاغت و بدیع اور اس سے مسائل نکالنے (استنباط کرنے) کی غرض سے علم فقہ، علم فرائض یا وراثت اور اس کے مختلف مباحث کے اثبات و تحقیق کے لیے علم کلام اور دوسرے فنون ایجاد کئے گئے۔

قرآن کو خوبصورتی سے لکھنے کی غرض سے فن کتابت پیدا ہوا، اور اس کے اتنے نمونے نکلے کہ کسی دوسری زبان میں کتابت و طرز تحریر کے اتنے نمونے نہیں مل سکتے مسلمان خطاطوں نے اس فن کو اتنی بلندی بخشی اور اس میں اتنا تنوع، اتنا حسن اور اتنا بانکپن پیدا کیا جس نے فنون لطیفہ کے دوسرے اصناف میں ان کی کوتاہ دستی کی کمی کو پورا کر دیا۔

قرآن کی بکثرت تلاوت کرنے پانچوں وقت کی نمازوں میں اس کی آیات پڑھنے ان سے نئے مسائل اور احکام نکالنے (استنباط) کی غرض سے ان پر غور و فکر کرنے اور ان کے معانی و مفہوم کو سمجھنے کی وجہ سے اس کا اسلوب بیان اس کے تشبیہ و استعارے، اس کا انداز تخاطب، انداز تذکیر و تحذیر، ادبا، شعرا، علما اور متکلمین کی زبانوں پر چڑھ گیا، اور بعد میں ان کی انشا و ادب کا جز بن گیا، چنانچہ اصحاب علم و فن اس کی تقلید کر کے اس کی آیتوں کو بطور استدلال پیش کر کے اپنی تحریر، تقریر اور شعر و شاعری کو ادب کا مرقع اور فن کا شہ پارہ بنانے لگے اور آج تک قرآن کی یہ امتیازی شان بدستور باقی ہے، اور آخر میں قرآن ہی کی زبان عربی تمام مفتوحہ اسلامی ملکوں کی سرکاری زبان بھی بن گئی۔

زبان و ادب پر قرآن کے ان اثرات کے علاوہ اس کی بدولت زمانۂ ماقبل تاریخ کی بعض گتھیاں سلجھانے میں بڑی مدد ملی، اور ایک ایسا علم وجود میں آگیا جو شاید پہلے نہ تھا، اور وہ تھا آثار قدیمہ، تورات اور انجیل میں بعض پرانے نبیوں اور پرانی بھولی بسری قوموں کے واقعات اور ان کے قصوں کا ذکر بہت اجمال کے ساتھ آیا ہے، جنھیں بعد کے لوگوں نے اور بھی مسخ کر دیا تھا، ان میں سے بعض قصوں کو علمائے یہود و نصاریٰ سطحی اور مسخ شدہ حالت میں جانتے تھے لیکن کوئی قطعی اور واضح بات ان کے ذہن میں ان کے متعلق نہ تھی، قرآن نے پہلی بار بعض جگہ تفصیلی اور بعض جگہ اشارۃً ان پر روشنی ڈالی، ان قوموں میں عاد و ثمود، اصحاب کہف و رقیم، فراعنہ مصر، اہل بابل و نینوی اور دوسری قومیں ہیں، جن کا ذکر پچھلی کتابوں میں تھا لیکن اس طرح تھا کہ انکی کوئی واضح شکل سامنے ابھر کر نہ آئی تھی، کہ کہاں تھیں، کیسی زندگی گزاری اور پھر ان کا انجام کیا ہوا، قرآن نے نازل ہو کر عبرت و موعظت کے خیال سے ان کی زندگی پر پڑے دبیز پردوں کو اٹھایا اور ان کی اصلی شکل دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ پیش کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس صدی کے شروع میں

جب آثار قدیمہ کے علماء نے تاریخ کے ان اہم ابواب کی تلاش وجستجو میں زمین کے سینے کو حقائق نکالنے کی کوشش شروع کی تو قرآن کو اُن آیات سے بڑی مدد ملی، اور انھوں نے مختلف عرب ممالک میں کھدائیاں کر کے بہت سا قیمتی ذخیرہ جمع کر لیا ہے، جس سے ان قوموں کی زندگی کے بعض بھولے بسرے گوشے واضح ہو کر سامنے آگئے ہیں، اور تاریخ کے بہت سے کٹے ہوئے سلسلے اور ٹوٹی ہوئی کڑیاں پھر سے جڑ گئی ہیں۔[1]

غرض کہ قرآن نے اپنی امتیازی خصوصیات کی وجہ سے نہ صرف عربی زبان کو دوسری سامی زبانوں کی طرح مٹنے سے بچا لیا، بلکہ مختلف لہجوں اور بولیوں کو ختم کر کے ایک ایسی خوبصورت میٹھی، دلنشین، موثر اور گٹھی ہوئی زبان کو جنم دیا جو سب عربوں کو متحدہ اور متفقہ زبان بن گئی اور بعد میں جس کا دامن اتنا وسیع ہوا کہ علم وفن کے لئے بحر بیکراں بن گئی، پھر بھی قرآن اسکی کسوٹی بنا، اور آج تک اس کا یہ امتیاز باقی ہے، اور جب تک عربی زبان زندہ، اور روئے زمین پر ایک مسلمان بھی باقی ہے، ہمیشہ رہے گا۔

---

[1] ان کھدائیوں، اور ان کے نتیجہ میں برآمد شدہ آثار کا ذکر عربی ادب کی تاریخ' مصنفہ مضمون نگار کی پہلی جلد کے ص ۲۰، ۲۸، ۳۶ سے ۳۷ تک کے حاشیہ پر ملاحظہ فرمایئے۔

شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید مسعود گنجشکرؒ

کے

مجموعۂ ملفوظات اسرار الاولیا کا مطالعہ

از جناب مولانا اخلاق حسین دہلوی

اسرار الاولیاء (فارسی نسخہ) مطبوعہ ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۵ء (بار ششم) مطبوعہ مطبع نولکشور کانپور، حجم ۹۴ صفحات سائز ۱۰×۲۰ مسطرہ ۲۰ سطری قلم خفی، اس کتاب میں حضرت باباصاحبؒ کے ملفوظات ہیں، جو بائیس ۲۲ فصلوں پر مشتمل ہیں، ہر فصل کا عنوان جداگانہ ہے، اس کے جامع مولانا بدرالدین اسحاقؒ ہیں، جو حضرت باباصاحبؒ کے خلیفہ و داماد اور حضرت باباصاحبؒ کی خدمت میں ہمہ وقت کے حاضر باش تھے،

اسرار الاولیاء کی قدامت | عہد مغلیہ کے شہرۂ آفاق عالم و درویش اور مسلم الثبوت اہل قلم شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (المتوفی ۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۲ء) مولانا بدرالدین اسحاقؒ کے احوال میں لکھتے ہیں،

وے را رسالہ ایست مسمیٰ اسرار الاولیاء	(اخبار الاخیار)	ان کا ایک رسالہ ہے جس کا نام اسرار الاولیاء
کہ در وے ملفوظات گنجشکرؒ را جمع کردہ		ہے جس میں انھوں نے حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات
در علم تصریف کتابے نظم کردہ است[1]		جمع کئے ہیں، علم صرف میں ایک کتاب نظم کی[1]

[1] انوار الفرید ص ۱۹۰ مطبوعہ پاکستان میں لکھا ہے کہ ہندوستان کے دینی مدارس میں جو کتابیں نصاب میں داخل تھیں ان میں سے کئی کتابیں حضرت مولانا کی تصنیف تھیں، یہ بیان خلاف تحقیق غلط بلکہ افترا ہے۔ (بقیہ حاشیہ ص ۳۵۶)

مفتی غلام سرور لاہوری مرحوم نے مولانا بدرالدین اسحاقؒ کے ذکر میں لکھا ہے،

کتاب اسرار الاولیاء از تصنیف وے است (خزینۃ الاصفیاء جلد ا ص ۳۱۵)

کتاب اسرار الاولیاء ان کی (مولانا بدرالدینؒ اسحاق کی) تصنیف ہے،

مفتی غلام سرور لاہوری مرحوم نے امیر خورد کرمانیؒ کے تذکرے میں یہ بھی لکھا ہے،

درین خاندان دو کتاب بنام سیرالاولیاء معروف و مشہور است یکے تالیف مولانا بدرالدین اسحاقؒ کہ از ملفوظات خواجہ فریدالحق والدین جمع آوردہ است دوم سیرالاولیاء تالیف سید محمد بن مبارک کرمانی رحمۃ اللہ علیہ

(خزینۃ الاصفیاء جلد ا ص ۳۶۶ نولکشوری)

اس خاندان میں سیرالاولیاء نام سے دو کتابیں معروف و مشہور ہیں، ایک مولانا بدرالدین اسحاقؒ کی تالیف ہے جس میں حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات جمع کیے ہیں، دوسری سیرالاولیاء، سید محمد بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ہے،

مفتی غلام سرور لاہوری مرحوم کے بیان سے معلومات میں یہ اضافہ ہوتا ہے کہ سیرالاولیاء نامی کوئی کتاب مولانا بدرالدین اسحاقؒ کی تالیف بھی ہے، جو حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔ جو اسرار الاولیاء کے علاوہ ہے، جس کا ذکر انھوں نے مولانا بدرالدین اسحاقؒ کے احوال میں کیا ہے مگر نہ تو مفتی غلام سرور لاہوری مرحوم ہی نے متذکرہ سیرالاولیاء کا ذکر مولانا بدرالدین اسحاقؒ کے احوال میں کیا ہے، اور نہ کسی اور نے، ممکن ہے کہ مغالطہ ہوا ہو، یہ کتاب سیرالاولیاء تالیف مولانا بدرالدین اسحاقؒ ہمارے مطالعہ میں بھی نہیں آئی، اس لئے ہم اس کے متعلق اظہار خیال سے معذور رہیں،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۵) مولانا موصوف سے منسوب صرف دو ہی کتابیں ہیں جن کا ذکر قدیم کتابوں میں ملتا ہے (۱) اسرار الاولیاء (۲) علم صرف میں منظوم رسالہ جس کا نصاب تعلیم میں داخل ہونا ثابت نہیں،

کتاب شمائل الاتقیاء دلائل الاتقیاء تالیف مولانا رکن الدین عماد کاشانی کی فہرست ماخذات میں اسرار المتحیرین نامی ایک کتاب ہے، جو حضرت بابا صاحبؒ ہی کے ملفوظات پر مشتمل ہے، جو نایاب ہے، مولف کا نام بھی نہیں لکھا ہے، ممکن ہے متذکرہ سیر الاولیاء سے مراد یہی کتاب ہو، تاہم فی الحال وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

حضرت خواجہ غلام فرید چشتیؒ (المتوفی ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء) جو عہد ماضی قریب کے ممتاز ترین مشائخ میں تھے، جن کی عالمانہ اور درویشانہ شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ہے، ان کے ملفوظات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ علوم و فنون سے انھیں کمال آگاہی تھی، وہ فرماتے ہیں:۔

بدر الدین اسحاق قدس اللہ سرہٗ جو اسرار الاولیاء کے جامع ہیں، ان کا ضبطا تاریخ والفاظ اس قدر پختہ ہے کہ جو کچھ انھوں نے شیخ شیوخؒ کی زبان درفشاں سے سنا اسی طرح لکھ دیا۔ اختلاف کی کوئی گنجایش ہی نہیں ہے (مقابیس المجالس ص ۲۶۵ ترجمہ)

مناسب ہیں یہ ان جلیل القدر بزرگ کا بیان ہے، جو علم و فضل اور بصیرت باطنی سے مالا مال تھے، اس بیان سے یہ مترشح ہے کہ موصوف کے زیر مطالعہ اسرار الاولیاء کا کوئی مستند و معتبر نسخہ تھا، جس کی صحت پر انھیں کامل بھروسہ تھا، شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کا بیان نقل کیا جا چکا ہے۔ وہ نہایت درجہ ثقہ اور باکمال بزرگ تھے، یقیناً ان کے پیش نظر بھی اسرار الاولیاء کا کوئی قدیم و مستند نسخہ تھا، ممکن ہے کہ وہ قدامت کے جملہ اوصاف سے متصف ہو، تاہم شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ جیسے باکمال بزرگ سے متعلق اس بدگمانی کی ذرا بھی گنجایش نہیں ہے کہ

۱؎ مقابیس المجالس ص ۴۶۳ (ترجمہ) میں اسرار الاولیاء اور راحت القلوب دونوں ہی کا ذکر ہے، اس کے حاشیے میں مترجم نے خواجہ موصوف کے مقابلے میں خیر المجالس اور جوامع الکلم کی بے صرفہ اور الحاقی عبارتیں نقل کر کے حضرت خواجہ غلام فریدؒ کے مبارک بیان کی تردید کی ہے، جو نہایت درجہ غلط اور تشر مناک ہے

وہ کسی ایسی روایت کو مولانا بدر الدین اسحاق سے منسوب فرماتے جو اصول تصوف اور تعلیمات اسلامی کے خلاف مضامین پر مشتمل ہوتا، وہ اصول تصوف سے بھی بہرہ کامل رکھتے تھے، اور تعلیمات اسلامی سے بھی، اگر کم علمی اور بے احتیاطی کا شائبہ بھی پاتے تو بلاشبہ ان کی حق گوئی ہرگز اس کے اظہار میں تامل نہ کرتی۔

سات سو برس سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے ہزار ہا علمائے مشائخ اور صوفیائے کرام گزرے ہیں، ان بزرگوں کے جو ملفوظات دستیاب ہوتے ہیں، ان سے واضح ہے کہ ان حضرات نے بھی اسرار الاولیاء سے استفادہ کیا ہے، اور رد گردانی نہیں فرمائی ہے یہ بھی ہے، کہ دستیاب شدہ کتب ملفوظات میں قدامت کے اعتبار سے جو فوقیت نسخۂ اسرار الاولیاء کو حاصل ہے وہ اور کسی کو حاصل نہیں، کتب ملفوظات کے جو قدیم ترین نسخے ہندوستان کے مشہور و معتبر کتب خانوں (لائبریریوں) میں محفوظ ہیں، ان میں سب سے قدیم نسخہ اسرار الاولیاء ہی کا ہے، جو ۱۰۰۸ھ (دس سو آٹھ ہجری) کا مکتوبہ ہے اور جو مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (انڈیا) کے ذخیرۂ مخطوطات کی زینت ہے،

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر اعتبار سے اسرار الاولیاء کا قدیم و مستند ہونا اور مولانا بدر الدین اسحاق کی تالیف ہونا ثابت ہے، حتیٰ کہ داخلی شواہد سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، البتہ عصری حالات کی اثر اندازی سے اور الحاق و تحریف سے مبرا ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اور اس سے کسی قلمی کاوش کو مفر نہیں ہے، لہذا ضرورت ہے کہ صحت و مقابلہ سے آراستہ کر کے اسرار الاولیاء کو منظر عام پر لایا جائے تاکہ متدین معاشرہ کو اور دینی و اخلاقی اور صوفیانہ قدروں کو از سر نو رواج عام نصیب ہو اور طالبان حق کی تشنگی رفع ہو۔

جوامع الکلم کا بیان | خواجہ سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نواز مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے خلفاء میں

نامور شخصیت کے مالک گزرے ہیں، اُن کے سوانح حیات سے واضح ہے کہ وہ مخدوم نصیرالدین چراغ دہلیؒ کی وفات (۷۵۷ھ) کے بعد عتباتِ عالیات کی زیارت کرتے ہوئے دہلی سے دکن تشریف لے گئے تھے، گلبرگہ میں قیام فرما ہوئے اور وہیں (۸۲۵ھ) میں انتقال ہوا، مزار پر انوار گلبرگہ ہی میں ہے، اور مرجع خلائق ہے۔

اس سفر کے دوران خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ حضرت بابا صاحبؒ کے مزار پُر انوار کی زیارت کو بھی گئے تھے، جوامع الکلم کی ایک ژولیدہ عبارت یہ بتاتی ہے کہ قیام اجودھن (پاک پٹن) میں انھوں نے ایک مجموعۂ ملفوظات دیکھا تھا، جسے بعض مولانا بدرالدین اسحاقؒ کا مرتبہ بتاتے تھے، اور بعض کو اس سے انکار تھا، جوامع الکلم کی مشمولہ عبارت یہ ہے۔

ملفوظے ازاں شیخ فریدالدین در	میں نے اجودھن میں شیخ فریدالدین
اجودھن دیدم کہ آں را نسبت بہ	کا ایک ملفوظ دیکھا ہے، جسے مولانا
مولانا بدرالدین اسحاقؒ می کنند	بدرالدین اسحاقؒ سے منسوب کرتے ہیں،
سربسر ہمہ افترا است. می گویند	وہ تمام تر بہتان ہے، کہتے ہیں کہ مولانا
کہ جمع کردہ مولانا بدرالدین اسحاقؒ	بدرالدین اسحاقؒ کا جمع کیا ہوا نہیں
نیست (جوامع الکلم ص ۱۴۴)	ہے۔

اس بیان کا اسلوب حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے دیگر بیانات سے مختلف مشتبہ مذبذب اور مبہم ہے، یہ نہیں کھلتا کہ سربسر ہمہ افترا کس سے متعلق ہے، ملفوظے سے متعلق ہے یا نسبت سے، اگر دونوں ہی سے ہے تو پھر می گویند جمع کردہ، مولانا بدرالدین اسحاقؒ نیست کیا ہے، ماننا ہوگا یہ حشو ہے، جس سے ابتدائی جملوں کا مفہوم مشتبہ اور مبہم ہو گیا ہے، اور یہ اسقام بتاتے ہیں کہ یہ جملے حضرت خواجہ گیسو درازؒ جیسے باکمال انشاپرداز کے نہیں ہو سکتے بلکہ کسی ایسے شخص کے نوشتہ

ہیں جو انشاء میں کامل دسترس نہیں رکھتا تھا، یہی کیفیت ان عبارتوں کی ہے، جو سیرالاولیاء اور خیرالمجالس میں الحاق کی گئی ہیں۔ اور ایسے ہی اسقام سے الحاقی عبارتیں گرفت میں آتی ہیں البتہ ذوق سلیم اور ادب وانشاء میں دسترس درکار ہوتی ہے۔

بہرحال اس مبہم و مشتبہ عبارت سے جو نکات برآمد ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) ایک صدی کے اندر ہی اندر مولانا بدرالدین اسحاقؒ کے تالیف کردہ مجموعۂ ملفوظاتؒ کا ذکر مل جاتا ہے، اور یہ پتہ چلتا ہے، اس عہد کے خواندہ حضرات اس سے باخبر تھے۔ یہ علاحدہ بات ہے بقول غالبؔ۔ ؎

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے بایں ہمہ   ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

پھر خواہ اسرار الاولیاء کا صحیح نسخہ دستیاب ہوسکا تھا یا نہیں مگر اس کے وجود کی نشان دہی ہوتی ہے، جس سے معقولیت کے ساتھ انکار نہیں کیا جاسکتا۔

(۲) اس بیان سے یہ بھی علم میں آتا ہے کہ اجودھن (پاکپٹن) میں مختلف الخیال دو گروہ تھے، ایک اس کا قائل تھا کہ مولانا بدرالدین اسحاقؒ نے حضرت باباصاحبؒ کا مجموعۂ ملفوظاتؒ تالیف کیا تھا، جو بقول مسخ شدہ صورت میں دستیاب ہوسکا تھا۔ دوسرا گروہ منکر تھا، جو کہتا تھا کہ جمع کردہ مولانا بدرالدین اسحاقؒ نیست یعنی متذکرہ مسخ شدہ نسخہ ملفوظات مولانا بدرالدین اسحاقؒ کا جمع کردہ نہیں ہی مگر اس سے انکار نہیں کہ انھوں نے حضرت باباصاحبؒ کا مجموعہ تالیف فرمایا تھا،

(۳) امیر خورد کرمانی کے بیان سے بھی یہ ثابت ہے کہ اجودھن (پاکپٹن) میں ایک گروہ ایسا تھا ایسا تھا جو مولانا بدرالدین اسحاقؒ سے عناد رکھتا تھا، اسی کی سازش سے شیخ بدرالدین سلیمانؒ اور مولانا بدرالدین اسحاقؒ کے درمیان کشیدگی ہوئی تھی، اور مولانا بدرالدین اسحاقؒ نے جامع مسجد اجودھنؒ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔

شیخ بدرالدین سلیمانؒ حضرت باباصاحبؒ کے منجھلے صاحبزادے تھے، جو بھائیوں کے مشورے سے اور بعض عقیدتمندوں کے مشورے سے حضرت باباصاحبؒ کے سجادہ نشین بنے تھے، مولانا بدرالدین اسحاقؒ ان کی خدمت بھی اسی طرح کرتے تھے جس طرح حضرت باباصاحبؒ کی کیا کرتے تھے مگر حاسدوں کا وہ گروہ جو منصب خادمی یا بالفاظ دیگر قرب شیخ کا طالب تھا وہی مولانا بدرالدین اسحاقؒ کا مخالف تھا اور اسی کی سازش سے ان بزرگوں کے درمیان اختلاف کی خلیج حائل ہوئی تھی، امیر خورد کرمانیؒ لکھتے ہیں

حاسدان میان شیخ بدرالدین سلیمانؒ
درمیان خدمت مولانا بدرالدین اسحاقؒ
القاے عداوت کردند و خواستند کہ
منصب خادمی خود فرو گیرند، خاطر مبارکؒ
خدمت مولانا بدرالدین اسحاقؒ بدین سبب
منغص شد۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدمت مولانا
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در مسجد جامع آمد و بنشست
(سیرالاولیاء ص ۱۸۱، ج)

حاسدوں نے شیخ بدرالدین سلیمانؒ اور
مولانا بدرالدین اسحاقؒ کے درمیان
کشیدگی کرادی تھی اور وہ یہ چاہتے تھے
کہ خادمی و قرب شیخ کا منصب وہ حاصل
کریں مولانا بدرالدین اسحاقؒ کی مبارک
طبیعت ان حالات سے مکدر ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ لہذا حضرت مولانا بدرالدین اسحاقؒ نے
(کنارہ کشی اختیار کی) اور ۔ ۔ ۔ ۔ جامع مسجد
میں اقامت اختیار کرلی۔

اس کشیدگی کی تلخی مولانا بدرالدین اسحاقؒ کی وفات کے بعد بھی برقرار رہتی محسوس ہوتی ہے، کہ نامساعد حالات سے مجبور ہو کر مولانا بدرالدین اسحاقؒ کی بیوہ جو حضرت باباصاحب کی چھوٹی صاحبزادی تھیں گھربار کو خیرباد کہہ کر دونوں یتیم بچوں سمیت دلی چلی آئی تھیں، اور تاحیات وہ دلی ہی میں رہیں اور حضرت محبوب الٰہیؒ کی کفالت میں رہیں، اور ان کے بعد ان کے دونوں بچوں نے حضرت محبوب الٰہی کی سرپرستی میں پرورش پائی، اور پروان چڑھے، بلاشبہ حضرت محبوب الٰہیؒ حضرت باباصاحبؒ کے

اصل جانشین تھے [illegible] اس سے طبیعت کو بڑی تسکین ہوگی اور کیا ہوگی کہ ان حضرات میں صلہ رحمی کا فقدان [illegible] تھے۔ ع

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

(۴) قیام اجودھن (پاکپتن) میں جس مجموعہ ملفوظات کا دیکھنا بتایا گیا ہے (ملفوظ از ان شیخ فرید الدینؒ) اس کے متعلق یہ بتانا تھا کہ نام اس کا کیا تھا، وہ نسخہ اسرار الاولیاء تھا یا کوئی مجموعہ لوح تھا، کتنا حجم تھا، کب کا مکتوبہ تھا، اور اس میں جو ملفوظات تھے جنھیں حضرت بابا صاحبؒ سے منسوب بتایا ہے، وہ کیا تھے، کیسے تھے، اور کیوں سر بسر ہمہ افترا کی حد میں تھے، خواہ وہ بے سروپا حکایات کا مجموعہ ہی سہی تاہم یہ بتانا ضروری تھا کہ وہ تھے کیا، جنھیں سر بسر ہمہ افترا کہا گیا ہے کیونکہ ع

دعویٰ بلا دلیل قبولِ خرد نہیں

یہ بھی حیرت انگیز ہے کہ اجودھن (پاکپتن) ہی میں ایسا مجموعہ ملفوظات حضرت بابا صاحبؒ سے منسوب دکھانے کی جسارت کی جائے جو سر بسر ہمہ افترا کی حد میں داخل ہو، جہاں حضرت بابا صاحبؒ کی تعلیمات سے دل و دماغ متاثر تھے، وہ کون ہو سکتا ہے جو ایسا از کار رفتہ مجموعہ ملفوظات دکھا سکتا تھا۔

الغرض یہ بیان نہایت درجہ مبہم اور بہایت از کار رفتہ ہے، اس میں حضرت باباؒ کو ایک عامی کی مثل یاد کیا گیا ہے (ملفوظے از ان شیخ فرید الدینؒ) جو نظر عقیدت میں دقیع نہیں ہی حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے شیخ محترم مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے بھی کبھی اس طرح یاد نہیں فرمایا ہے، ان کی مبارک زبان پر جب حضرت بابا صاحبؒ کا نام نامی آیا ہے کمال ادب و احترام سے آیا ہے، جو مشرقی تہذیب کا خاصہ ہے، آیندہ نقاد بتائے گا کہ یہ چیستان ہے کیا اور اس بیان کا ادب و انشار میں کیا مقام ہے، صدیاں گزر گئیں، اہل علم میں سے کوئی بھی اس عبارت سے متاثر نہیں، نہ اس کے سہارے کسی نے اسرار الاولیاء کو ناقابلِ اعتنا قرار دیا ہو بلکہ معترف ہیں کہ ضبط الفاظ اس قدر پختہ ہے کہ

بعینہ حضرت بابا صاحب کا بیان معلوم ہوتا ہے، البتہ چودہویں صدی کے ربع آخر میں ایسے اشخاص جو ادب و دانش کی نزاکتوں سے ناآشنا ہیں، وہ اس عبارت کے سہارے اسرار الاولیاء کو جعلی بنانے لگے ہیں۔

(۵) جس نسخۂ ملفوظات کا ذکر متذکرہ عبارت میں ہے، اور جو سرتاسر مہمہ افترا کی مد میں شمار ہوا وہ کیا تھا، اس کا آج بھی کسی کو علم نہیں ہے، مگر اسرار الاولیاء کے دستیاب ہونے والے نسخے پر آج بھی سرتاسر مہمہ افترا کا اطلاق نہیں ہوتا، کیونکہ اسرار الاولیاء کا متداول نسخہ اصول شریعت و طریقت کے بالکل مطابق ہے اور صحیفۂ رشد و ہدایت ہے، اور اس کی روایات پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ سطحی ہیں۔ متذکرہ بیان جسے حضرت خواجہ گیسو درازؒ سے منسوب کیا گیا ہے، اور جو فی الواقع ان کا نہیں ہے اور جو نہایت درجہ مبہم مشتبہ اور مذبذب ہے اور جس سے صحیح نقطۂ نظر واضح نہیں ہوتا، ہرگز قابل قبول نہیں ہے بلکہ اس کو حضرت خواجہ گیسو درازؒ سے منسوب کہنا افترا بھی ہے، اور جب کبھی کوئی صاحب کمال جوامع الکلم پر لکھے گا تو پوست کندہ کیفیت سامنے آجائے گی۔

جوامع الکلم حضرت خواجہ گیسو درازؒ کا مجموعۂ ملفوظات ہے، جسے ان کے صاحبزادے سید محمد اکبر حسینیؒ نے مرتب فرمایا تھا، جو تمام تر دس ماہ کا مجموعۂ ملفوظات ہے، (۱۰، رجب ۸۰۲ھ تا ۲۰ ربیع الثانی ۸۰۳ھ) اس پر یہ اعتراض بھی ہے، اس کے بعض بیانات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ گیسو درازؒ مائل بشیعیت تھے[۱] مگر اس خیال کی تردید[۲] جوامع الکلم کے دیگر بیانات سے ہو جاتی ہے، لیکن یہ واقعہ ہے اور افسوس ناک واقعہ ہے کہ جوامع الکلم میں متعدد ایسی روایتیں ہیں کہ شرم و حیا سے آج بھی کوئی مہذب باپ اپنے بیٹے کے سامنے بیان نہیں کر سکتا۔

---

[۱] مجلس منعقدہ ۵ رمضان ۸۰۲ھ [۲] مجلس منعقدہ ۱۰ رمضان ۸۰۲ھ جوامع الکلم مطبوعہ کانپور ۱۳۵۶ھ آغاز ہی میں ہے، افضل صحابہ ابوبکرؓ ثم عمرؓ ثم عثمانؓ، ثم علیؓ

تنی بھی ایسی روایتیں ہیں جن سے مشکل ہی کوئی اچھا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کتنی ایسی ہیں جن سے
متدیہ اور نکو کار اشخاص کی شخصیت مجروح نظر آتی ہے حتیٰ کہ خواجہ اقبال تک بد دیانتی
سے ملوث نظر آتے ہیں، جو بچپن سے بڑھاپے تک حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں رہے تھے،
ور خادم خاص کے منصب پر فائز تھے، بلکہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی ذات گرامی بھی ملوث
دکھائی دیتی ہے، یہ کیا ہے؟ اگر الحاق و تصرف نہیں ہے، اسی طرح ملفوظات کے متعلق جو کچھ
ہے وہ بھی الحاق و تصرف ہی ہے، اور وہ حضرت خواجہ گیسو درازؒ کا بیان نہیں ہے؛

تاریخی اندراج | کتب دینیات ہوں یا کتب تصوف اُن میں تاریخی اندراج کی نہ کچھ اہمیت تھی
ور نہ عہد قدیم میں اس کا رواج و اہتمام تھا، چنانچہ متعدد کتابیں اس وصف سے معرا ملتی ہیں،
مثلاً اسرار الاولیاء پہلا مجموعۂ ملفوظات ہے جس کے آغاز میں ایک تاریخی اندراج ہے جو غلط اور محرف
ہے، غلطی کا سبب کاتبوں اور ناقلوں کا سہو بھی ہو سکتا ہے، ورنہ تحریف و الحاق کرنے والوں کی کارستانی ہے۔

نقاد ہو یا محقق یا سوانح نگار تاریخی اندراجات سے کام لینے سے پہلے اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ
تاریخی اندراجات کو خوب اچھی طرح کسوٹی پر کس لے۔ اگر صحیح ہیں تو فھو المراد اور اگر غلط ہیں ان کو بے تکلف
مسترد قرار دے اور تحقیق سے صحیح تاریخی تعین کی کوشش کرے اور ہرگز غلط تاریخی اندراج کو محور نہ بنائے
ورنہ کیا دھرا سب اکارت جائے گا، سنین کے اندراجات میں اکثر غلطیاں ہوئی ہیں۔ خواہ نقل و کتابت

لہ جوامع الکلم مجلس منعقدہ رجب ۔ ۔ ۔ شعبان ۹۔ ۱۲۔ ۱۹۔ ۲۲۔ ۲۵۔ ۲۷۔ ۲۹۔ ۳۰۔ رمضان ۱۔ ۳۔ ۵۔
۱۱۔ ۲۲۔ شوال ۳ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲ اس مضمون کے تحریر کے دوران اتفاق سے گلبرگہ شریف کے معزز صحافی جناب
عبد الحکیم صاحب ملاقات کو تشریف لائے، دوران گفتگو میں جوامع الکلم کا ذکر آیا تو انھوں نے بتایا کہ جب جوامع الکلم گلبرگہ شریف سے
شائع ہوئی تو ہنگامہ ہوا اور اس کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا، اور یہ نقطۂ نظر طے پایا کہ زمانۂ قدیم میں شیعہ حکومت کے زمانے میں
گلبرگہ شریف پر کسی شیعہ صاحب کے ایما سے یہ الحاق و تصرف عمل میں آیا تھا، اور فحش و مکروہ بیانات شامل کیے گئے تھے جن سے
شیعوں کی ہو یا کسی بھی کی مگر حضرت خواجہ گیسو درازؒ کی ذات گرامی اس لغو بیانی سے مبرا ہے۔ (اخلاق)

ہی اس کا سبب ہو، تاریخ فرشتہ نہایت متداول تاریخی کتاب ہے، مگر غلطیوں سے مبرا نہیں
طبقات ناصری اور تاریخ فیروز شاہی برنی بھی مستثنیٰ نہیں ہیں، مگر آج تک کسی دانشور نے غلط تاریخی
اندراج کو صحیح و معتبر قرار دیکر محور نہیں بنایا ہے، یہ انسانی لغزش ہے۔ اسے نظر انداز کرنا ہی ہوگا ہے
اسرار الاولیا کی پہلی فصل کے آغاز میں ایک تاریخی اندراج ہے جو غلط ہے، بلکہ محرف ہے اس کے
علاوہ اس میں اور کہیں کوئی تاریخی اندراج نہیں ہے، اور وہ غلط اندراج یہ ہے،

دوشنبہ ہژدہم شعبان ۶۳۱ھ احدیٰ و ثلثین و ستمائۃ ہجری (اسرار الاولیاء ص ۳)

یعنی پیر کا دن۔ شب برات کے مہینے کی اٹھارہویں تاریخ ۶۳۱ھ ہجری۔ اس تاریخی
اندراج کو تقویم کی کسوٹی پر کس کر دیکھنا چاہیئے۔ کہ صحیح ہے یا نہیں اگر صحیح ہے تو فہو المراد ہے اور اگر غلط ہے
تو داخلی شواہد سے کام لے کر صحیح تاریخی اندراج کے استقرار کی کوشش کرنی چاہیئے۔

تقویم بتاتی ہے کہ ۱۸ شعبان ۶۳۱ھ کو دوشنبہ نہیں جمعہ ہے، تقویم میں ایک دن کا فرق
تو ہو سکتا ہے، مگر بالعموم اس سے زیادہ نہیں ہوتا، تقویم کے اعتبار سے ۲۹ کو چاند نظر آتا تھا۔ مگر
کہیں مطلع صاف تھا اور کہیں نہ تھا، لہذا کہیں چاند نظر آیا اور کہیں نظر نہیں آیا، جہاں نظر آگیا
وہاں تقویم سے مطابقت برقرار رہی اور جہاں نظر نہیں آیا، وہاں ایک دن کا فرق پڑ گیا اسی
وجہ کی بنا پر دو مختلف مقامات پر بعض اوقات دو مختلف دنوں میں عید الفطر منائی جاتی رہی ہے
اگر اس میں دن تاریخ اور مہینے کو صحیح مان لیا جائے جو صحیح بھی ہے تو داخلی شواہد بتاتے ہیں کہ ۶۳۱ھ
غلط ہے ۶۵۱ھ ہونا چاہیئے، جو کاتب و ناقل کے سہو کی بنا پر یا تحریفی کارستانی کی بدولت غلط کر دیا
گیا ہے یہ بھی ہے کہ اسرار الاولیاء کے مطبوعہ نسخے میں نقل و کتابت کی بکثرت غلطیاں ہیں، جن کی نشاندہی
بآسانی کی جا سکتی ہے، حیرت ہے کہ مطبع نولکشور کا نپور سے نسخۂ اسرار الاولیاء اس قدر غلط کیسے شائع ہو گیا
داخلی شواہد | داخلی شواہد سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت مخفی نہیں رہی کہ اسرار الاولیاء کی تدوین تا۔

تحقیق کی ضرورت ہے، داخلی شواہد میں سے بعض شواہد یہ ہیں:

(۱) امیر خورد کرمانی کا بیان ہے، دیگر تذکرہ نویس بھی اس سے متفق ہیں کہ مولانا بدرالدین اسحاق جب دلی سے بخارا کے لیے روانہ ہوئے اور اجودھن (پاکپتن) پہنچے۔ تو انھوں نے حضرت بابا صاحب کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل کی تھی، (سیر الاولیاء ص ۱۰۰ ج)

(۲) حضرت بابا صاحبؒ آخری چوتھائی مدتِ حیات میں اجودھن (پاکپتن) میں سکونت پذیر تھے، قیام اجودھن (پاکپتن) کی مدت امیر خورد کرمانیؒ نے اٹھارہ یا چوبیس سال بتائی ہے (سیر الاولیاء ص ۹۳ ج) گو یا کہ یقینی طور پر وہ بھی بتا نہیں سکے ہیں، علی بن محمود جاندار شاہ نے ستائیس سال بتائی ہے (درر نظامی ص ۱۲۰ ترجمہ) اس اعتبار سے اجودھن (پاکپتن) میں قیام کا آغاز ۶۵۲ھ یا ۶۴۷ھ یا ۶۴۳ھ سے ہوتا ہے لہٰذا جو مجموعہ ملفوظات حضرت بابا کی خدمت میں رہتے ہوئے اور دوران قیام اجودھن (پاکپتن) میں مرتب ہوتا ہے، وہ ۶۴۳ھ سے پہلے ہرگز مرتب نہیں ہو سکتا۔ سبب کچھ بھی ہو، مگر یہ تاریخی اندراج قطعاً غلط ہے، اور تحقیقی و تنقیدی نقطۂ نظر سے ہرگز اسے محور نہیں بنایا جا سکتا ہے۔

(۳) ۶۳۳ھ میں حضرت بابا صاحبؒ کا قیام بالاتفاق ہانسی میں تھا (سیر الاولیاء ص ۹۴ ج) قرین قیاس یہ ہے کہ ۶۳۱ھ میں بھی ہانسی ہی میں ہوگا۔ لیکن اگر ہانسی میں قیام نہ ہو تو نہ سہی تاہم اجودھن (پاکپتن) میں قیام ہرگز نہ تھا، واقعات شاہد ہیں کہ حضرت بابا صاحبؒ نے ۶۳۳ھ سے کہیں بعد اجودھن (پاکپتن) میں سکونت اختیار کی تھی، لہٰذا جو مجموعہ ملفوظات اجودھن (پاکپتن) میں مرتب ہوا ہے وہ ۶۳۱ھ میں مرتب نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے کہیں بعد ہوا ہے اور اسرار الاولیاء میں مندرج ۶۳۱ھ محرف اور قطعاً غلط ہے،

(۴) جب خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ اسرار الاولیاء کا جائزہ لیا جاتا ہے، اور مطالعہ

کیا جاتا ہے، تو زیادہ نہیں تو دو نکتے ایسے ضرور ملتے ہیں، جن کی مدد سے اسرار الاولیار کے عہد تدوین کا تعین بآسانی کیا جاسکتا ہے۔

(ا) اسرار الاولیار کی آخری اور بائیسویں فصل کے اختتام پر یہ عبارت ملتی ہے۔

پس این بود کہ از اسرار انوار و الفاظ در دار شیخ الاسلام در مدت دوازدہ سال شنیدہ است۔ درین مجموعہ نوشتہ آمد (اسرار الاولیا ص ۹۴)

گویا کہ یہ مجموعۂ ملفوظات اسرار الاولیار بارہ سالہ شغف و انہماک کا ثمرہ ہے جو مرتب کرنے والے کے فطری ذوق و شوق کا آئینہ دار ہے،

(ب) اسرار الاولیار کے مطالعہ سے یہ واضح ہے کہ پندرھویں فصل سے آخر تک آٹھ فصلوں کے شرکا میں حضرت محبوب الٰہیؒ بھی ہیں جس سے یہ ثابت ہے کہ اس بارہ سالہ مدت میں وہ زمانہ بھی شامل ہے کہ جب حضرت محبوب الٰہیؒ اجودھن (پاکپتن) میں حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں تھے،

امیر خورد کرمانیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی خود نوشت یادداشت سے نقل کیا ہے کہ رمضان المبارک ۶۶۹ھ میں حضرت بابا صاحبؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو خلافت نامہ عنایت فرمایا تھا (سیر الاولیار ص ۱۱۶ اچ) اور خواجہ امیر حسنی علاء سجزیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی زبانی یہ بھی نقل کیا ہے، کہ حضرت بابا صاحبؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو شوال کی کسی تاریخ کو اجودھن (پاکپتن) سے دہلی بھیج دیا تھا، اور محرم کی پانچویں کو حضرت بابا صاحبؒ واصل بحق ہوئے تھے، (فوائد الفواد ص ۵۲) لہٰذا اگر ۶۶۹ھ کو بارھواں سال مان لیا جائے جو قرین قیاس بلکہ صحیح ہے تو اسرار الاولیار کی تدوین کا آغاز ۶۵۸ھ قرار پاتا ہے جو تقویم کے اعتبار سے بھی صحیح ہے، بلکہ ہر اعتبار سے صحیح ہے، اور واقعات کے مطابق بھی ہے،

(۵) تقویم یہ بھی بتاتی ہے کہ ایک دن کا فرق ہے، جو ہو سکتا ہے، تقویم میں ۱۰ شعبان

سنہ ۶۵۲ھ کو یکشنبہ (اتوار) ہے، اور جمادی الآخر کا مہینہ ۲۹ دن کا ہے، غالباً ۲۹ کو ابر و غبار یا کسی وجہ
میں مطلع صاف نہ تھا، اس لیے جمادی الآخر کو ۳۰ دن کا مہینہ مان لیا ہے، جیسا کہ ہوتا رہتا ہے،
اس اعتبار سے ۱۰ شعبان سنہ ۶۵۵ھ کو دوشنبہ ہی ہے، اور یہی آغاز اسرار الاولیاء کی صحیح تاریخ ہے،
قلمی کتابوں میں جو غلطیاں ملتی ہیں انھیں اسی طرح سلجھانا ہوتا ہے، نقاد ہو یا محقق تاوقتیکہ
کہ اس کی کارگزاری میں اخلاق و خون جگر کی چاشنی نہ ہوگی، اس کی کارکردگی کی مقبولیت حاصل
نہیں کرے گی، ہر حال میں کامل احتیاط سے حق تنقید ادا کرنا چاہیے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اسرار الاولیاء کی پہلی فصل کے آغاز میں جو تاریخی اندراج ہے اس کی
وجوہ کچھ بھی ہوں، مگر وہ غلط ہے، اس لیے پہلے اس کی صحت کی جانب متوجہ ہونا ہوگا، جب
صحیح حل مل جائے تو قدم آگے بڑھانا ہوگا، ورنہ غلط اندراج کو کسی حالت میں بھی اپنایا نہیں
جاسکتا، لہذا تقویم کی مطابقت سے اور داخلی شواہد سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے، اسے صحیح تسلیم
کرنا ہوگا، یہ بھی مناسب ہے کہ قدیم قلمی نسخوں کے مطالعہ سے بھی استفادہ کیا جائے۔

۴۔ اسرار الاولیاء کا عہد تدوین | تقویم کی مطابقت سے اور داخلی شواہد سے یہ ثابت ہے کہ اسرار الاولیاء
کا عہد تدوین سنہ ۶۵۲ھ تا ۶۶۹ھ ہے اور یہ صحیح ہے، اس عہد تدوین کے اعتبار سے حضرت بابا صاحبؒ
کی مجالس میں حضرت محبوب الٰہیؒ کی اور بعض مجالس میں مولانا برہان الدین ہانسویؒ کی شرکت
بھی صحیح قرار پاتی ہے اور شیخ نجیب الدین متوکلؒ کی وفات کا ذکر بھی برمحل رہتا ہے ان کے
علاوہ دیگر تاریخی واقعات بھی برمحل قرار پاتے ہیں، اور وہ خلفشار رفع ہو جاتا ہے، جو غلط تاریخی اندراج
کی بنا پر لاحق ہوتا ہے، لہذا عہد تدوین سنہ ۶۵۲ھ تا سنہ ۶۶۹ھ کو صحیح تسلیم کر کے اسرار الاولیاء
کا جائزہ لینا چاہیے، یقین ہے کہ پھر کوئی الجھن درپیش نہ ہوگی۔

(۵) امتیازی خصوصیات اسرار الاولیاء | میں بعض امتیازی خصوصیات ہیں جو اس سے پہلے کے ملفوظات

کے مجموعوں میں یا تو ہیں نہیں یا اگر ہیں، تو شاذونادر ہی ہیں، اس اعتبار سے اسرار الاولیار امتیازی منفرد حیثیت کی مالک ہے ان میں سے بعض کا ذکر خیر زیر قلم آتا ہے،

۲۔ **استفسار و مکالمہ** مولانا بدرالدین اسحاقؒ کی پہلی حاضری کا واقعہ شاہد ہے کہ حضرت باباصاحبؒ کی مبارک نظر طالبوں اور حاضر خدمت ہونے والوں کے قلوب پر بھی رہتی تھی، جو بھی سوال ان کے دل میں پیدا ہوتا، وہ بصیرت باطنی سے اسے معلوم کر لیتے اور تقریر ہی میں اسے حل فرما دیتے تھے،[1] عموماً کسی کو دریافت کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی، اگر کیفیات سے مغلوب ہو کر کسی کی زبان پر کچھ آگیا ہے تو وہ مستثنیات میں سے ہے، ایسی مثالیں اسرار الاولیار میں خال خال مل جاتی ہیں، اس کو مکالمہ سے تعبیر کر لیا جائے یا استفسار سے، دراصل ذہو مغلوبیت کا تاثر، ورنہ دوران تقریر میں مداخلت و استفسار خوبی نہیں بلکہ معیوب ہے، جو بے ادبی کے مصداق بھی ہو سکتا ہے، بہرحال ایسی مثالیں متقدمین کی کتب ملفوظات کے بالمقابل امتیازی نوعیت کی مالک ہیں، جس کی اتباع کے نقوش فوائد الفواد وغیرہ بعد کی کتب ملفوظات میں ملتے ہیں گویا کہ اسرار الاولیار نقش اول ہے، اور فوائد الفواد نقش ثانی ہے، اور وہ مثالیں یہ ہیں،

(۱)، ہمیں کہ شیخ الاسلام این بیت بہ زبان راند عزیزے از اہل صفہ ......
روئے بہ زمیں آورد و عرض داشت کرد۔ الخ (اسرار الاولیار فصل سوم ص ۱۶)،

(ب) آں گاہ عزیزے از اہل صفہ حاضر بود۔ روے بہ زمین آورد و عرض کرد
وگفت۔ الخ۔ (ایضاً ص ۱۰)

(ج)، در آں میان عزیزے حاضر بود عرض داشت کرد۔ الخ (اسرار الاولیار فصل ۱۴ ص ۷۲)

ان مثالوں سے یہ واضح ہے کہ اسرار الاولیار میں استفسار و مکالمہ ہے، مگر بقدر قلیل ہی

---

[1] اسرار الاولیار ص ۱۰۰ ج

تاہم اس سے اسرار الاولیاء کی اہمیت اور اس کی امتیازی نوعیت واضح ہے۔

۶۔ فصول | اسرار الاولیاء کئی فصلوں پر منقسم ہے، ہر فصل کسی عنوان سے متعلق ہے، جو ہر فصل کے آغاز میں تحریر ہوتا ہے متعلق معلومات اس فصل میں فراہم کی ہیں خواہ ان معلومات کا تعلق مختلف بیانات ہی سے کیوں نہ ہو تاہم اس سے یہ سہولت ہے کہ کسی ایک بات کو پوری کتاب میں تلاش کرنے کی زحمت سے دوچار نہیں ہونا پڑتا بلکہ کسی ایک عنوان کے تحت تلاش کر لینا کافی ہوتا ہے، تلاش میں نہ تو وقت ضائع ہوتا ہے اور تکلیف گوارا کرنی پڑتی ہے، بلاشبہ یہ خوبی لائق تحسین ہے، جو اس سے پیشتر کی کتب ملفوظات میں نہیں ہے، علی بن محمود جاندار نے درر نظامی میں اسرار الاولیاء ہی کی اتباع کی ہے اس لیے اسرار الاولیاء نقش اول ہے اور درر نظامی نقش ثانی ہے، مگر فوائد الفواد اور خیر المجالس میں یہ خوبی نایاب ہے،

بعض فصلوں کے آغاز میں بعض ممتاز ترین شرکاء کے اسمائے گرامی مندرج ہیں جن سے مجالس کی نوعیت و اہمیت واضح ہے آخر میں اختتام کی نوعیت بھی واضح کی ہے، درر نظامی میں ان دونوں اوصاف کا فقدان ہے،

۷۔ عربی فارسی ہندی مرکبات | اسرار الاولیاء میں کئی مقامات ایسے ہیں جن سے ہندی فارسی اور ہندی عربی مرکبات کے استعمال و رواج کا پتہ چلتا ہے اور لسانی اتحاد کی نشان دہی ہوتی ہے، گویا کہ یہ تخم ریزی ہے اردو زبان کے لیے جو پھلی پھولی اور پروان چڑھی، جو آج گوناگوں موانعات کے باوجود دنیا کی شائستہ ترین زبان ہے بعض مثالیں یہ ہیں ا۔

(ا) اور ابھیا غریب گفتندے۔	اسرار الاولیاء	فصل پہلی	ص ۴
(ب) فرید [illegible]	″	دوسری	ص ۱۴
(ج) اور اور دیش بدھنی گفتندے۔	″	تیرھویں	ص ۶۰
(د) خریزۂ ہندی	″	″	ص ۱۷

اس روش کی اتباع صاحب سیر الاولیاء امیر خورد کرمانی نے کی ہے۔ اس اعتبار سے اسرار الاولیاء نقش اول اور سیر الاولیاء نقش ثانی ہے، خیر المجالس میں اس اتباع کے گہرے نقوش ملتے ہیں

۹۔ تبلیغی کارنامہ | اسرار الاولیاء کی ایک امتیازی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک تبلیغی کارنامہ کا ذکر ہے، جو راحت المحبین میں بھی ہے، مگر فوائد الفواد اور خیر المجالس جیسی بعد کی کتب ملفوظات میں نہیں ہے، اس اعتبار سے اسرار الاولیاء اولین اور منفرد اوصاف کی مالک ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ خواجہ قطب الدین چشتیؒ جن سے مراد خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ ہیں، انکی مجلس میں حاضرین مجلس میں سے کسی نے دریافت کیا کہ کوئی کیسے جانے کہ وہ کامل ہو گیا ہے اور اس نے سلوک کی منازل طے کر لی ہیں، آپ نے فرمایا کہ یہ شخص کسی مردے پر دم کرے، اگر وہ بحکم الٰہی زندہ ہو جائے تو یہ علامت اس کی کمالیت کی ہے۔ سے[۱]

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید دیگران ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

ابھی یہ گفتگو ختم ہونے نہ پائی تھی کہ ایک بڑھیا روتی دھوتی حضرت خواجہ قطب الدین چشتیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میرا ایک ہی لڑکا تھا بادشاہ نے بے گناہ اسے سولی پر چڑھا دیا ہے، آپ یہ سنتے ہی عصا ہاتھ میں لیکر اسکے ہمراہ ہو لئے موقع واردات پر پہنچے لڑکے کو سولی پر چڑھایا جا چکا تھا آثار زندگی باقی نہ تھے آپنے دیکھا اور بارگاہ الٰہی میں التجا کی خداوندا اگر بادشاہ نے اسے بے جرم و خطا سولی پر چڑھوایا ہے تو آپ زندہ فرما دیں آپنے یہ فرمایا ہی تھا کہ وہ لڑکا زندہ ہو گیا، مولانا رومؒ نے فرمایا ہے،

اولیا راہست قدرت از الٰہ تیر جستہ باز گرداند ز راہ

اس عمل کرامت کی برکت سے ہزاروں غیر مسلم جنکا تعلق کسیطرح ہندوستان سے تھا مسلمان ہو گئے، اور صحیح راہ عمل اختیار کر لی تھی، لکھا ہے۔

آں روز چند ہزار در ہزار ہند و مسلمان شدند۔ (اسرار الاولیاء، ص ۸۹)

ہندو سے مراد بدھسٹ بھی ہو سکتے ہیں جو چشت خراسان اور بت بامیان کے علاقہ میں آباد تھے، اور وہ ہندو بھی جو عہد غزنوی سے غزنی اور اس کے گرد و نواح میں آباد تھے، اور کھلم کھلا اپنے ٹھاکروں کی پوجا پاٹ کیا کرتے تھے، اگر چہ تر سانہ تھے۔ (باقی)

---

[۱] امیر خورد کرمانی نے حضرت محبوب الٰہی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ تصور عوام در نفس ایشاں مؤثر آید۔ اولیاء را آں تصور نفس غیر مؤثر آید۔۔۔ اگر صاحب کرامتے تصور کند در نفس غیرے اثر آں تصور حاصل می شود تا اگر موت شخصے تصور کند آں شخص بمیرد۔ و اگر دیدن شخصے تصور کند در حال آں شخص حاضر شود۔ (سیر الاولیاء، ص ۳۵۲، ۳۵۳، ج)

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کا مکتوب گرامی

اڈیٹر معارف کے نام

ندوۃ المصنفین دہلی۔ ۱۰؍ اکتوبر ۱۹۸۱ء

مجی و مکرمی! السلام علیکم و رحمۃ اللہ برکاتہٗ

بہت دنوں سے یہ عریضہ تحریر کرنے کے ارادے میں تھا، یوں ہی، آج، کل ہوتی رہی، ستمبر کا بڑا حصہ کلکتہ میں گذرا، وہیں سے مبارکباد تحریر کرنے کا خیال تھا، مگر نگاہ زیادہ موٹی ہوگئی ہے، ضروری خطوط بھی یوں ہی رہجاتے ہیں، اب عام طور پر کسی دوسرے ہی سے خط لکھا تا ہوں حکومت نے جو علمی اعزاز آپ کو عطا کیا ہے، ہم سب کے لیے باعث اعزاز اور وجہ مسرت ہے، مبارک باد رسمی نہیں، قلبی قبول فرمائیے، آپ نے گزشتہ چالیس سال میں جو علمی، تاریخی اور ادبی خدمات انجام دی ہیں، یہ ایوارڈ ان کا ادنیٰ صلہ ہے، آپ ہر حیثیت سے اس اعزاز و اکرام کے مستحق تھے، حضرت سید صاحب مرحوم اور شاہ صاحب مرحوم کی روحیں یہ خبر سن کر عالم ارواح میں روحوں کے اجتماع کو پُر مسرت خطاب کر رہی ہوں گی، یہ واقعہ ہے کہ اب آپ ہی ان ارواح پاک کے جانشین ہیں، حق بحق دار رسید ایک عام مثل ہے، لیکن یہ مثل آپ پر اپنی تمام خصوصیتوں اور تمام رعنائیوں کے ساتھ صادق آتی ہے، یہ ایوارڈ مجھے بھی مل چکا ہے مگر میرا اسوقت بھی اور اب بھی یہ پختہ خیال ہے کہ یہ علمی اعزاز آپ کو ہم لوگوں سے پہلے ملنا چاہیئے تھا، آپ کی صحت و عافیت کے لیے دعا کرتا ہوں اور خود بھی دعا کا محتاج ہوں، نقرس کی تکلیف تو سالہا سال سے ہے، ایک سال سے عرق النساء کے عارضے نے بھی گھیر رکھا ہے، ضعف و اضمحلال اور حالات کی تلخیوں کے باوجود گاڑی چل رہی ہے، کیا بعید ہے آپ سے ۱۰؍ اکتوبر کو ندوۃ العلماء میں ملاقات ہو جائے، خط کی ناہمواری کے لیے معذرت ہے،

عتیق الرحمٰن عثمانی

وفیات

ظفر احمد صدیقی مرحوم

از۔ ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی، لکھنؤ،

۴ اکتوبر ۲۰۰۰ء کو جناب ظفر احمد صدیقی وکیل، سکریٹری دینی تعلیمی کونسل کا انتقال اپنے آبائی وطن راما بھاری تحصیل لسواں ضلع سیتاپور میں ۱/۲ ۷ بجے صبح کو طویل علالت کے بعد ہو گیا، دفتر دینی تعلیمی کونسل لکھنؤ میں وہ حضرت مولانا علی میاں صاحب کے ایما پر ۱۹۸۵ء سے مقیم تھے، یہ ایک طرح سے ان کا وطن ثانی بن گیا تھا، اپنی وفات سے ۴۸ گھنٹے پہلے اس حال میں رخصت ہوئے تھے کہ انھیں ہوش نہیں تھا، بلڈ یوریا کی وجہ سے ایک ہفتہ سے غفلت تھی، احباب اور رفقا نے اسی وقت یہ سمجھ لیا تھا کہ برسوں کا یہ تھکا ہوا مسافر اور ساتھی اب لکھنؤ واپس نہیں آئے گا، سیتاپور سے فون پر اطلاع ملی، وہ سب سے جدا ہو کر اللہ کو پیارے ہو گئے، ان کی اہلیہ کا انتقال سال بھر پہلے ہو چکا تھا، اولاد کوئی نہیں تھی، بھتیجوں کو اولاد سمجھتے رہے، جن کو اپنی نگرانی میں تعلیم دلائی، ان کے حقیقی بھائی کا قیام راما بھاری میں ہے، جہاں ان کا خاندان صدیوں سے آباد ہے،

ظفر صاحب نے تعلیم مسلم یونیورسٹی میں پائی، ان کا قیام میکڈانلڈ ہوسٹل میں تھا، تعلیم کے بعد سیتاپور میں وکالت شروع کی، ان کا شمار وہاں کے کامیاب وکیلوں میں تھا، ۴۷ء سے پہلے مسلم لیگ سے وابستہ رہے، تبلیغی کاموں سے بھی شغف رکھا، لیکن جب قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم

نے ۱۹۵۹ء میں دینی تعلیم کی تنظیم کے سلسلہ میں کنونشن کیا اور وہاں یہ فیصلہ ہوا کہ اس مسئلہ پر مستقل کام کی ضرورت ہے۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب کے ایما پر ظفر صاحب نے اپنی کامیاب وکالت چھوڑ دی اور دینی تعلیمی کونسل کے کاموں کے لیے اپنے کو وقف کر دیا، پھر ان کو ایسی لگن پیدا ہوئی کہ اپنے کھانے پینے کی فکر زیادہ نہ کرتے، خود ہی اسٹوو پر کوئی چیز تیار کر لیتے اور روٹی بازار سے منگا لیتے، اسی کو کھا کر اکتفا کر لیتے، صبح کی چائے بھی خود ہی تیار کر لیتے اور اپنے مہمانوں کی بھی اس سے ضیافت کرتے، اپنی ان دشواریوں کا اظہار کبھی کسی سے نہیں کیا، اس طرح انھوں نے ۱۷ سال جس بے نفسی، جاں فشانی، فرض شناسی اور دل سوزی سے وقت گزارا اس کی مثال ملنی مشکل ہے، جناب شفیق الرحمن ایڈوکیٹ نے ان کو پیش کش کی کہ اگر وہ لکھنؤ میں کچہری کے مقدمات لے لیا کریں تو معقول آمدنی ہو جایا کرے گی، انھوں نے معذرت کی کہ جو چیز چھوڑ دی اس کو پھر اختیار کرنا صحیح نہیں، کونسل میں بڑھتی ہوئی گرانی کی وجہ سے ان کے الاؤنس میں اضافہ کا مسئلہ آیا تو انھوں نے اپنے جذبۂ ایثار سے اضافہ منظور نہیں کیا،

وہ اپنے اوقات کے بہت پابند تھے، عشا کے بعد فوراً سو جاتے، تہجد کے سختی سے پابند رہے، سفر ہو یا قیام، بیماری ہو یا صحت، جلسے ہوں یا کنونشن ہر حال میں اس کی پابندی کرتے، ذکر سے بھی شغل رکھتے، صبح کو ہلکے سے ناشتہ کے ساتھ چائے پی کر اخبار پڑھتے، تعلیمی سلسلہ کی کوئی بات اخبار میں پڑھ لیتے تو اسی وقت قلم برداشتہ ایک مضمون لکھ ڈالتے، ان کا خط اچھا نہیں تھا، اکثر کہتے کہ میں خود اپنا لکھا مشکل سے پڑھ پاتا ہوں، انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھنے پر یکساں قدرت رکھتے، عبارت آرائی بالکل نہیں کرتے لیکن ٹھوس حقائق سے مسئلہ کو واضح کرتے، دینی تعلیمی کونسل اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے متعلق اہم لٹریچر ان ہی کا تیار کیا ہوا ہے، ۱۹۶۵ء کے بعد علی گڑھ کے جتنے معاملات اٹھے ان کا وہ گہرا مطالعہ کرتے رہے، مرتے دم تک وہ اس محاذ پر

بڑی مردانگی اور پامردی سے جمے رہے حکومت نے مسلم یونیورسٹی سے متعلق جو بھی قانون بنایا، اسکی موشگافیوں میں انھوں نے ہندوستان کے چوٹی کے ماہرین قانون سے ٹکر لی اور کبھی کسی موقع پر آنکھ نہیں جھپکائی۔ علی گڑھ سے متعلق کوئی چیز ان کے مشوروں کے بغیر مرتب نہیں ہوتی تھی، سب کو ان پر مکمل اعتماد تھا۔ مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائے ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے وہ جس طرح سینہ سپر رہے، وہ اس یونیورسٹی کی نئی نسل کے لیے ایک اعلیٰ نمونہ ہے، انھوں نے اس کے لیے برابر جہاد باللسان اور جہاد بالقلم کیا، اس سے متعلق حکومت کی پُرپیچ حکمت عملی کو واشگاف کرنے میں ان کو بڑی مہارت تھی، ان ہی کی تحریروں کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ کو اس کے اصلی اور حقیقی پس منظر میں سمجھتے رہے،

وہ دار العلوم ندوہ کے بھی قانونی مشیر تھے، مسلم پرسنل لا بورڈ، مسلم مجلس مشاورت، مسلم مجلس، دینی تعلیمی کونسل، مسلم مائنارٹیز ایسوسی ایشن، ہر جگہ ان کی قانونی مہارت سے فائدہ اٹھایا جاتا، شفیق الرحمٰن صاحب ایڈوکیٹ کنوینر مسلم یونیورسٹی ایکشن کمیٹی نے ان کی ان صلاحیتوں سے متاثر ہوکر ان کا نام مجلس شوریٰ کا صدر رکھ دیا تھا، وہ خود کم بولتے مگر بولتے تو حقائق ہی بولتے، نمایاں ہونے کی کوشش نہیں کرتے، عمر میں ان سے کوئی چھوٹا بھی اگر معقول رائے دیتا تو اسے فوراً قبول کر لیتے، وکیل تھے لیکن زیادہ بحث پسند نہیں کرتے، مقرر تو نہیں تھے لیکن اپنی تقریروں میں جچے تلے الفاظ میں اپنی باتیں پیش کر دیتے، شعر و شاعری کا ذوق نہیں تھا لیکن اچھے شعر کا لطف لیتے اور برمحل شعر بھی پڑھ جاتے، چہرہ پر شب بیداری کی رونق اور سرخی دکھائی دیتی، ہونٹوں پر پان کی سرخی بھی رہتی، دعوتوں میں ان کے بے تکلف دوست ان کو میٹھا کم کھانے پر اصرار کرتے لیکن وہ انکار کرتے مگر دوستوں کے اصرار پر لطف و لذت سے کھانے پر آمادہ ہو جاتے، ان کو آم اور جامن بھی بہت پسند تھے، وہ غلہ گھری سے منگاتے، ایک مرتبہ ان کا دلیا چارپائی پر دھوپ میں

سکے، ہاتھ لگاتے اگر کھا گئی، انھوں نے اپنی معصومیت میں اس کا ذکر اپنے دوستوں سے کیا تو مستقل موضوع بنا رہا، سفر میں شفیق الرحمٰن صاحب کا ان کا ساتھ ہوتا تو جونیر ہونے کے ناطے سارے فرائض ان ہی کو انجام دینے پڑتے، چائے، پان، حقہ اور اخبار وغیرہ کی فراہمی کا انتظام ان کے ذمہ ہوتا، شفیق الرحمٰن صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ بھی جاری رہتی، مگر یہ دو پیاروں کی باتیں ہوتیں، دونوں میں بیحد محبت تھی، دونوں صبح و شام ملتے، شفیق الرحمٰن صاحب ان کا محاسبہ کرتے ہوئے کہتے کہ اپنی تحقیق رائے گھوڑے پر ڈال دیتے ہیں، ظفر صاحب ہنس کر جو جواب دیتے اس میں اخلاص اور محبت کے آبدار موتی چمکتے ہوئے نظر آتے، یہ پُرکیف اور بے تکلف مجلسیں اب اشکبار آنکھوں کے ساتھ یاد آئیں گی، ظفر صاحب نے شفیق الرحمٰن صاحب کو تھرڈ کلاس میں یہ کہہ کر سفر کرانا شروع کیا کہ ملت کا کام کرتا ہے تو تھرڈ کلاس میں سفر کرنا پڑے گا اور مسجد کی چٹائی پر لیٹنا ہوگا، میں ان کو مجسم تقویٰ کہتا، جب کبھی اُن کے ساتھ سفر کیا تو ان کی کفایت شعاری کا سارا منظر دیکھنے میں آتا، سفر کے بعد فوراً حساب پیش کر دیتے، کبھی ان کے ازار بند میں بندھی ہوتی، سفر میں ان کا جھولا ساتھ ہوتا تھا، جس میں ماہرین قانون کی رائے، قانون کی کتابیں، ڈبیا، بٹوہ، اور ضرورت کا سارا سامان ہوتا، چند منٹ کے نوٹس پر وہ سفر پر روانہ ہو سکتے تھے، دو مرتبہ پہلے بھی فالج کا اثر ہو چکا تھا، علاج سے ٹھیک ہو گئے تھے، میں نے سفر سے منع کر رکھا تھا لیکن مسلم یونیورسٹی کے مسئلے میں بیتاب ہو کر اچانک دہلی کا سفر کیا پھر جو پڑے تو سنبھلے تو ضرور لیکن بائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں پر مستقل اثر رہا، اور رفتہ رفتہ معذور ہو گئے، ذہن آخر تک کام کرتا رہا لیکن صحت گرتی رہی،

مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں ان کی خدمات گنانے کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہے، اقلیتی کردار کی اصطلاح ان ہی کی ایجاد ہے، جسے پورے ملک نے قبول کر لیا، طلبہ انھیں ظفر چچا کہتے، ان کی باتیں تسلیم کرنے میں تامل نہ کرتے، ایک بار مسلم یونیورسٹی میں ایک اسٹرائیک ہوئی تھی

خبر پڑھتے ہی ہم دونوں وہاں پہونچے، طلبہ نے ہماری مداخلت سے اسٹرائیک ختم کر دی ظفر صاحب نے یونین میں جو تقریر کی اس سے طلبہ بالکل مطمئن تھے، مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں شروع سے ہم لوگوں کی یہ کوشش رہی کہ تحریک علی گڑھ شہر اور مسلم یونیورسٹی کیمپس کے اندر نہ رہے بلکہ ملک کے دوسرے حصوں میں چلائی جائے تاکہ یونیورسٹی کو نقصان نہ پہونچے، بیگ کمیٹی کی مشہور رپورٹ کو مرتب کرنے میں ظفر صاحب کا بہت بڑا حصہ ہے، مسلمانوں کے تعلیمی مسائل اور تعلیمی جائزہ کے سلسلہ میں انھوں نے متعدد کتابچے پھر اردو اور انگریزی میں بکثرت مضامین لکھے، وہ جب یاد آئیں گے تو ان کا خلوص، ان کا بے پایاں ایثار، ان کی بے نفسی، ملت کے لئے ان کی تڑپ اور دردمندی آنکھوں کے سامنے متحرک نظر آئیگی، وہ اپنے پیچھے بے لوث اور بے غرض خدمات کی ایک مثال چھوڑ گئے ہیں، جو کم از کم مسلم یونیورسٹی کی نئی نسل کے لیے مشعل راہ بن سکتی ہے، جناب عدیل عباسی کے فوراً بعد ان کا انتقال پوری ملت کا بہت بڑا سانحہ ہے، لیکن جن مضبوط بنیادوں پر انھوں نے اس تحریک کی بنیاد رکھی ہے، امید ہے کہ وہ قائم رہے گی نیا خون ملتا رہے گا، اور یہ کام برابر برگ و بار لاتا رہے گا، ظفر صاحب نے اپنی مخلصانہ خدمات کی جو مثال چھوڑی ہے، اللہ تعالے مسلم یونیورسٹی اور دینی تعلیمی کونسل کے خدمت گزاروں میں اس جذبہ کو دوام عطا کرے، اور ان کو آخرت میں اس کا بہترین اجر دے۔ آمین ثم آمین،

معارف:۔ جناب ظفر احمد صدیقی صاحب آج کل کی اصطلاح کے لحاظ سے تو بہت بڑے آدمی نہیں ہو سکے لیکن ان میں جو بے نفسی، بے غرضی اور ایثار پسندی تھی، اس لحاظ سے ان کی شخصیت میں بڑے پن کے پورے اوصاف تھے، مسلم یونیورسٹی کا ایسا جانثار مرد مجاہد مشکل سے کوئی ملے گا، جس لگن اور ایثار کے ساتھ انھوں نے اس یونیورسٹی کی خدمت کی وہ اپنی مثال آپ ہے، مگر دکھ کی بات ہے کہ اس یونیورسٹی کے لوگوں نے ان کی وہ قدر نہیں کی

جیسے وہ حقیقی مستحق تھے، ان کی علالت کے زمانہ میں راقم کو جناب محترم نواب عبیدالرحمٰن خاں شیروانی کی معیت میں ان کی عیادت کرنے کا کئی بار اتفاق ہوا، دینی تعلیمی کونسل کے دفتر کا ایک معمولی کمرہ میں ان کو جس طرح پایا اس کو دیکھ کر انتہائی تکلیف ہوئی، بجلی کا ایک بہت ہی معمولی پنکھا ان کے سامنے ہوتا، ان کی راحت کا سامان اس سے بھی زیادہ معمولی تھا، خیال آیا کہ مسلم یونیورسٹی کے اس مرد مجاہد کے لیے وہاں کے طلبہ اور اساتذہ کو اپنی ہر چیز ان پر نچھاور کر دینا چاہیے تھی مگر یہ لوگ لکھنؤ آتے تو شاید ان کی عیادت کی بھی تکلیف گوارا نہ کرتے، اس کا بھی احساس ہے کہ اگر علی گڑھ کے لوگ ان کی مالی امداد کرنا بھی چاہتے تو وہ اپنی خودداری اور عزت نفس میں اس کو قبول کرنا پسند نہیں کرتے، مگر علی گڑھ کے طلبہ و اساتذہ اپنے نفس کا محاسبہ کریں کہ اپنے اس جان نثار مجاہد کے لیے ان کو کیا کرنا چاہیے تھا، اور کیا نہیں کیا، ان کی وفات کے بعد، ان کی خدمات کا صلہ شاید یہی ملا ہوگا کہ وہاں کے ڈرائنگ روموں کے صوفوں پر اور دوسری تفریحی باتوں کے سلسلہ میں چند لمحوں کے لیے ان کا بھی ذکر آگیا ہوگا، اس سے ہم کو اپنی ملت کی نفسیات کا اندازہ کرنا چاہیے، ہم میں آج کل اچھی قیادت نہیں ابھر رہی ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے مخلص کارکنوں اور رہنماؤں کی وہ قدر نہیں کرتے جس کے وہ واقعی مستحق ہوتے ہیں۔

سیرۃ جلد ہفتم

باب التقریظ والانتقاد

نئے رسالے

جرنل خدابخش لائبریری: مرتبہ جناب عابد رضا بیدار صاحب۔ طباعت اچھی، سائز ۲۲×۱۸ صفحات مقرر نہیں، قیمت سالانہ پندرہ روپیہ، پتہ۔ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ۔

یہ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کا سہ ماہی جرنل ہے، ابتک اس کے آٹھ شمارے شائع ہوئے ہیں، اس میں لائبریری ہی سے متعلق مضامین چھپتے ہیں، اس کی مجلس ادارت قاضی عبدالودود (صدر) ڈاکٹر سید حسن عسکری (رکن)، فسرالدولہ فیاض الدین حیدر (رکن) اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار (ناظم) پر مشتمل ہے۔ اردو کے علاوہ فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں میں بھی مضامین شائع کئے جاتے ہیں اور مضمون نگاروں کا مختصر تعارف بھی ہوتا ہے، اس کی اکثر اشاعتوں میں وہ توسیعی خطبات بھی شائع کئے جاتے ہیں جو لائبریری کے زیر اہتمام ہر سال دیئے جاتے ہیں، پہلے شمارہ کی ابتدا ڈاکٹر نذیر احمد (مسلم یونیورسٹی) کے توسیعی خطبہ "فارسی اور ہندوستانی" سے ہوئی ہے، یہ ایک مبسوط اور عالمانہ خطبہ ہے، اس میں ہندوستانی تہذیب، تمدن اور معاشرت پر فارسی زبان کے اثرات کا ذکر ہے، اسی اشاعت کے انگریزی حصہ میں ڈاکٹر سید حسن عسکری کا ایک فاضلانہ خطبہ بھی درج ہے اس میں سلسلۂ فردوسیہ کے بزرگ مولانا مظفر شمس بلخی کے مکتوبات کا اس حیثیت سے جائزہ لیا گیا ہے کہ وہ اس عہد کی سماجی و سیاسی تاریخ کا ماخذ ہیں، پانچویں، چھٹے اور ساتویں و آٹھویں مشترکہ شمارہ میں بھی ڈاکٹر صاحب کے انگریزی مضامین اور خطبے شامل ہیں، چوتھے شمارہ کی ابتدا میں کلیم الدین احمد صاحب کا توسیعی خطبہ "میری تنقید۔ ایک بازدید"

صفح ہے، اس میں انھوں نے خود اپنی تمام تنقیدی کتابوں کا جائزہ لیکر اپنے بعض خیالات کی وضاحت اور مزید توثیق کی ہے اور ان پر اعتراضات کا جواب دیا ہے، ان کا اپنا خیال ہے کہ زیادہ سے زیادہ قارئین دل و دماغ سے ان کی باتوں کو مان لیتے ہیں لیکن زبان سے نہیں، نہیں کہنا ہی تی ادا سمجھتے ہیں" وہ ایک تمثیل پیش کر کے یہ دعوی کرتے ہیں کہ اردو کے ادبی و تنقیدی ذخیرے کی خامیاں ان پر تو منکشف ہوئیں اور دوسروں سے مخفی رہیں۔

اسی نمبر میں ڈاکٹر ہاشم علی کا انگریزی مضمون "اسلامی تقویم کی تشکیل" بھی توسیعی خطبات کی کڑی ہے، کتبخانہ کے بانی خدا بخش پر دو انگریزی مضامین شائع ہوئے ہیں، ایک خود ان کے فرزند صلاح الدین خدا بخش کا اور دوسرا مشہور مورخ ڈاکٹر جدو ناتھ سرکار کا ہے، ایک انگریزی مضمون کتبخانہ خدا بخش کے متعلق بھی چھپا ہے، ایک اور انگریزی مضمون بانی کتبخانہ کے قلم سے اسلامی کتبخانے پر پچھلے شمارہ میں دیا گیا ہے، انگریزی کا ایک مضمون عہد سلطنت میں صوفی لٹریچر کا ایک جائزہ بھی اہم ہے، فارسی میں اب تک تقریبًا ایک درجن مضامین شائع ہوئے ہیں جن میں بعض قاضی عبدالودود صاحب کے قلم سے ہیں، ان میں خدا بخش لائبریری کے بعض نادر اور اہم مخطوطات کا متن شائع کیا گیا ہے، اور ہر ایک کے شروع میں مخطوطہ اور اس کے مصنف سے متعلق ضروری معلومات تحریر کئے گئے ہیں، عربی میں یہ مضامین شائع ہوئے ہیں، طبقات الحنفیہ و مولفوں تنزیہ الاعتقاد عن الحلول والاتحاد للسیوطی (ڈاکٹر عبدالرشید پٹنہ یونیورسٹی) رسالۃ الشعاعات للکندی (ڈاکٹر مختار الدین آرزو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اسی نوعیت کا مضمون عہد ہمایونی کی ایک عربی تصنیف "عصمۃ الانبیار" مولفہ ملا عبداللہ سلطان پوری (ڈاکٹر سید عبدالباری علی گڑھ یونیورسٹی) بھی ہے لیکن یہ اردو میں ہے، دیوان جمیلہ خدا بخش (ڈاکٹر حمیرا خاتون) میں خدا بخش خان کی اہلیہ کی شاعری کا ذکر ہے، پچھلے شمارہ میں لائبریری کے قیام کے وقت بانی کتب خانہ کی تقریر اسکی سالانہ رپوٹ

اور لائبریری کے متعلق مولانا شبلی کے تاثرات درج ہیں، خدابخش لائبریری میں اردو کے قدیم اور نایاب رسالوں کا مفید ذخیرہ ہے، ان سے متعلق چند مضامین بھی چھپے ہیں، ان میں رسائل کے مقاصد خصوصیات کے علاوہ ان کے بعض مکمل مضامین بھی نقل کئے گئے ہیں، اور بعض کے خلاصے دئے گئے ہیں، پہلے شمارہ میں کشمیر درپن (اڈیٹر سرتیج بہادر سپرو) کا تعارف ہے، اور اس سے پنڈت موتی لال نہرو کی ایک اہم اور یادگار صدارتی تقریر نقل کی گئی ہے، جو یوپی میں انڈین نیشنل کانگریس کی پہلی صوبائی کانفرنس میں ہوئی تھی، چوتھے شمارہ میں میر اکبر علی کی ادارت میں ایک برس (جنوری ۱۸۹۶ء سے دسمبر ۱۸۹۶ء) تک شائع ہونے والے رسالہ ادیب (فیروز آباد) کے اہم مشمولات کا خلاصہ اور اس کا تعارف درج ہے، ساتواں اور آٹھواں شمارہ مشترکہ ہے اس کی حیثیت خاص نمبر کی ہے، اور یہ ماہنامہ ادیب (الہ آباد) کے ساڑھے تین برس (جنوری ۱۹۱۰ء تا جولائی ۱۹۱۳ء) کے ۴۳ شماروں کا انتخاب ہے، یہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ متنوع، مفید اور دلکش مضامین کا مجموعہ ہے اس میں اس دور اور اس سے قبل کے کئی اکابر علم و ادب کے متعلق پُرمغز مضامین ہیں، ایک مضمون علامہ شبلیؒ اور ایک دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ پر بھی ہے، اسی حصہ میں پریم چند کے چھ افسانوں کے ساتھ ان کا ایک مضمون بھی ہے، دوسرے حصہ میں طویل اور مختصر مضامین نیز رسالہ ادیب کے مختلف ادارتی نوٹ درج ہیں، ان میں اکثر اردو زبان کے امور و مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے، اور اردو کو قومی زبان بنائے جانے کی حمایت اور اس کے رسم الخط تبدیل کئے جانے کی مخالفت کا ذکر ہے، یہ سب تحریریں ادیب کے اڈیٹروں منشی نوبت رائے نظر، پیارے لال شاکر اور دوسرے ہندو اہل قلم کی ہیں، اس حصہ میں ایک بہت مدلل مضمون منشی کانت چند پادھیا کا ہے، انھوں نے اردو کا مقابلہ انگریزی اور ملک کی مختلف زبانوں سے کرکے ثابت کیا ہے کہ اردو ہی پورے ملک کی قومی زبان بنائے جانے کے لائق ہے، اردو بیزاری اور اردو کشی کے موجودہ دور میں اب ان حقائق کو

کتب خانہ کی ... اس نمبر میں کئی تصویریں بھی دی گئی ہیں، جن سے پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں نیز مرزا غالب، عبدالرشید دیلمی عرف آغا رشید، سید علی خان جواہر رقم استاد اورنگ زیب، اشوتی شاہ منغلیہ اور خواجہ میر علی تبریزی کی تحریروں کے عکسی نمونے بھی دئے گئے ہیں، اس جرنل کے ہر شمارہ میں لائبریری کے وزیٹرز رجسٹر سے مشاہیر کی اردو یا انگریزی تحریروں کا عکس بھی شائع کیا جاتا ہے، اس میں ہندوستان و پاکستان اور بعض اسلامی ملکوں کے علاوہ یورپ کے فضلا کی تحریروں کا عکس دیا گیا ہے، ہر شمارہ میں تصحیح و اضافہ اور مطبوعات جدیدہ کے مستقل عنوانات بھی ہوتے ہیں، اول الذکر میں کتبخانہ کی قدیم فہرستوں کے اغلاط کی تصحیح کی جاتی ہے، اور موخر الذکر میں نئی کتابوں پر تبصرہ کیا جاتا ہے، یہ دونوں حصے عموماً قاضی عبدالودود کے قلم سے ہوتے ہیں، فرہنگ آصفیہ (دہلوی سید احمد دہلوی) پر طویل تبصرہ قاضی صاحب کی وسیع النظری کا ثبوت ہے لیکن اس میں کتابت و طباعت کی غلطیاں بکثرت رہتی ہیں، اس لئے اکثر مضامین کے ساتھ صحت نامہ بھی لگا رہتا ہے، پٹنہ کی یہ لائبریری ہندوستان کے لئے ایک بہت ہی قابل فخر و سرمایہ ناز چیز ہے، دعا ہے کہ یہ کتب خانہ ہر حال میں مایہ ناز و بلند رہے، اور اس کے ذریعہ سے مفید علمی خدمات انجام پاتی رہیں۔

مجلہ تحقیق:- مرتبہ- ڈاکٹر وحید قریشی صاحب، سائز ۲۰ x ۲۶، صفحات ۱۵۰، قیمت سالانہ ۴ روپیے فی شمارہ ایک روپیہ- پتہ فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ یونیورسٹی اورینٹل کالج

یہ نیا رسالہ بھی سہ ماہی ہے جو پنجاب یونیورسٹی کی فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ کی طرف سے شائع ہوا ہے، ہمارے پیش نظر اس کا پہلا اور دوسرا مشترک شمارہ ہے، اس کا خاص مقصد یونیورسٹی اور اس سے متعلق کالجوں کے اساتذہ کی نگارشات کی اشاعت ہے، لیکن یہ دوسرے فضلا کے مضامین سے یکسر خالی نہیں ہے، پہلا مضمون اسی نوعیت کا ہے جو پاکستان کے مشہور فاضل جناب مشفق خواجہ

کے قلم سے ہے، اس میں شاہ قدرت اللہ قدرت کے نام، خاندان اور ابتدائی تعلیم وغیرہ کے متعلق بہت تحقیق سے معلومات بیان کیے گئے ہیں، اور ان کی ولادت، ان کے ترک وطن اور مرشد آباد میں قیام وغیرہ کے زمانہ کی تعیین بڑی دیدہ ریزی سے کی گئی ہے، آخر میں قدرت کے ذریعۂ معاش، سیرت و کردار، معاصرین، اولاد، شاعرانہ کمالات، کلام اور دیوان کے متعدد قلمی نسخوں کے متعلق محققانہ بحث کی گئی ہے، اور اب تک قدرت کے بارہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا جائزہ دقت نظر سے لے کر اغلاط کی نشاندہی کی گئی ہے، ایک اور مضمون میں جہانگیری اور شاہجہانی عہد کے ایک شاعر شیدا فتح پوری کے حالات، شاعری اور دیوان وغیرہ پر سیر حاصل اور پُرمغز بحث ہے، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے مکاتیب اقبال کے موجودہ مجموعوں پر اظہار خیال کر کے ان کی خامیوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان کو از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت واضح کی ہے، اس سلسلہ میں بعض اصول بھی بتائے ہیں، کلام محمود کے نادر لغات و اصطلاحات (ڈاکٹر محمد بشیر حسین) بھی محققانہ مضمون ہے، اس میں اکبری دور کے مولانا محمود لاہوری کے کلام سے تیس نادر الفاظ منتخب کر کے ان کی تشریح و وضاحت کی ہے، ان لفظوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے بعض کا ذکر کسی لغت و فرہنگ میں نہیں اور بعض کا ذکر محض خاص فرہنگوں یا ایک ہی کسی فرہنگ میں ہے، بعض لفظوں کے معانی لغت کی کتابوں میں درج ہیں، لیکن ان کی مثالیں نہیں دی گئی ہیں، لائق مضمون نگار نے اساتذہ کے کلام سے مثالیں اور شواہد پیش کیے ہیں، جن سے فارسی شعر و ادب سے ان کی گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے، ایک مضمون میں منصور حلاج کے متعلق مولانا روم کا نقطۂ نظر پیش کر کے ان کے نعرۂ انا الحق اور فرعون کے دعوے ربوبیت کا فرق دکھایا گیا ہے، اس میں منصور کے پھانسی دیئے جانے کے بعض خاص اسباب کا ذکر بھی ہے، یہ رسالہ ڈاکٹر وحید قریشی کی ادارت میں شائع ہوا ہے، ان کا نام ہی اس کی بلند پایگی کا ثبوت ہے، ان کے قلم سے بھی ایک

[illegible] ... خدا بخش لائبریری ڈاکٹر محمد باقر کا انگریزی مضمون بھی شامل ہے، اس مجلہ کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ اس کا دائرہ اردو و عرب کی تحقیق تک ہی محدود نہ ہوگا بلکہ دوسری مشرقی زبانوں اور علوم تک وسیع ہوگا، امید کہ اس مجلہ کا خیر مقدم علمی حلقہ میں کیا جائے گا۔

اندازے: مرتبہ جناب علی احمد صاحب فاطمی، سائز $\frac{20\times30}{16}$ کتابت و طباعت بہتر، صفحات مقرر نہیں، قیمت سالانہ ۵ روپے، پتہ انجمن تہذیب نو پبلیکشنز، ۲۰۰ چک الہ آباد۔

یہ دوماہی رسالہ الہ آباد کے چند نوجوانوں کی کوششوں سے ڈاکٹر سید محمد عقیل (شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی) کی نگرانی میں ۱۹۸۰ء کی آخری ششماہی سے جاری ہوا ہے اس کا زیادہ حصہ کتابوں پر ریویو کے لیے وقف ہوتا ہے، لیکن بعض ادبی مضامین اور افسانے بھی شائع ہوتے ہیں، اس کا رجحان جدیدیت کے بجائے ترقی پسند تحریک کی جانب ہے، اس کی اشاعت کا خاص مقصد ہر مکتبۂ فکر کی معیاری اردو کتابوں پر تبصرہ بتایا گیا ہے، لیکن اس کا دائرہ صرف شعری اور افسانوی مجموعوں تک محدود کر دیا گیا ہے یہ نامناسب ہے، اس کا آٹھواں شمارہ سہیل نمبر ہے، اس میں مشہور ترقی پسند ادیب و افسانہ نگار جناب سہیل عظیم آبادی مرحوم کے متعلق بعض مضامین، ان کی کتابوں پر تبصرے اور ان کے خطوط وغیرہ شائع کئے گئے ہیں، مجموعی حیثیت سے یہ رسالہ دلچسپ ہوتا ہے،

الرسالہ: مرتبہ محمد نسیب کاغذ عمدہ طباعت ٹائپ بڑا سائز، صفحات ۶۴، قیمت سالانہ الجزائر میں ۱۵ ڈالر، دوسرے ملکوں سے اسی کے برابر۔ پتہ ۴ شارع علی بومنجل، الجزائر۔

یہ ایک اصلاحی، دعوتی اور دینی رسالہ ہے، جو اسی سال مارچ سے الجزائر کے دینی امور کی وزارت کی جانب سے عربی میں شائع ہوتا ہے اس کے مضامین میں مسلمانوں کو ایمان اور صحیح عقائد اختیار کرنے کی دعوت دی جاتی ہے، اور موجودہ دور میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے اسلام کے بارہ میں جو شبہات پیدا کر دئے ہیں، ان کا جواب بھی دیا جاتا ہے، آخر میں حکمت و ظرافت کی

مفید اور دلچسپ باتیں اور شعر و ادب کی چاشنی بھی ہوتی ہے،

ندائے الاصلام :۔ مرتبہ۔ مولانا بدر القادری، کاغذ عمدہ کتابت و طباعت بہتر تقطیع خورد، صفحات ۴۰ قیمت تحریر نہیں، پتہ۔ نیدر لینڈ اسلامک سوسائٹی کو دے نار ڈہ ایمسٹرڈم الہند

یہ نیا اردو ماہنامہ جون ۱۹۸۰ء میں ہالینڈ سے شائع ہوا ہے، جولائی کا شمارہ اصلاحی مضامین پر مشتمل ہے، ایک مضمون میں باطینوں کے فرقہ نصیریہ کے متعلق معلومات درج ہیں، یہ المجتمع کویت سے ماخوذ ہے، ایک مضمون میں بیت المقدس کی بازیابی کے لیے مسلمانوں کو سرگرم ہونے کی دعوت دی گئی ہے، رسالہ مفید ہے، مگر خطیبانہ انداز اور لفاظی سے پرہیز کرنے اور فرقہ و مسلک کے اختلاف سے بالاتر ہو کر صرف اسلام کی خدمت و اشاعت کو نصب العین بنانے کی ضرورت ہے۔

عبارت :۔ مرتبہ۔ جناب رئیس نعمانی صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت معمولی چھوٹا سائز، صفحات ۳۲ قیمت سالانہ دس روپیہ۔ پتہ پرشین اکاڈمی ۱۹۱ اصطبل چار باغ، لکھنؤ،

جناب رئیس نعمانی کی تحریری سرگرمیوں کا میدان فارسی زبان ہے، ان کے مجموعہ کلام "برات معنی" کا معارف میں پہلے ذکر ہو چکا ہے، اب انھوں نے یہ ماہنامہ جاری کیا ہے، جس کا پہلا شمارہ جولائی میں شائع ہوا تھا، لیکن ہمیں تاخیر سے ملا، یہ اچھے مضامین پر مشتمل ہے، خصوصاً سبک اقبال (ڈاکٹر سید عبد اللہ پنجاب یونیورسٹی لاہور) اور مسائل تدریس فارسی (ڈاکٹر نیر مسعود لکھنؤ یونیورسٹی) قابل ذکر ہیں، منظومات کا حصہ بھی فروتر نہیں ہے، اردو کی کسمپرسی کے اس دور میں فارسی کی پرستش اور پذیرائی کون کرے گا، رئیس صاحب کی یہ جرأت رندانہ بہرحال قابل تحسین ہے،

"ض"

مطبوعات جدیدہ

عربی میں نعتیہ کلام: مرتبہ ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت
عمدہ صفحات ۲۰۰ مجلد قیمت ۳۰ روپیے۔ پتہ:- میزان ادب ۱۳۱ بادرشاہ مارکیٹ بیلی روڈ کراچی پاکستان

شعرا نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات سے اپنی عقیدت و محبت اور فدویت و جاں نثاری کے اظہار کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے اردو میں اس کا اصطلاحی نام نعت ہے اس سے دنیا کی ہر زبان کی طرح خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بول چال کی زبان عربی کا ذخیرہ بھی خالی نہیں ہے گو اس میں اس صنف کلام کے مجموعے کم مرتب کئے گئے ہیں زیر نظر کتاب کا مقصد اردو خوان طبقہ کو عربی کی نعتیہ شاعری کے انداز بیان اور خصوصیات سے واقف کرانا ہے، اس کے لائق مرتب ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی پھلواری کے اس علمی و دینی گھرانے کے فرد ہیں جو کئی پشتوں سے علم و عرفان کا گہوارہ رہا ہے اور اب مکہ معظمہ میں علمی و تعلیمی سرگرمیوں میں مشغول ہیں اس لیے عشق و محبت نبوی میں سرشاری و وارفتگی کی دولت ان کے خمیر میں ہے اور وہ اردو و عربی پر یکساں قدرت رکھتے ہیں، اس بنا پر یہ کتاب خوش ذوقی اور سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے، اشعار کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ اور ان کی ایسی دلنشین تشریح کی ہے، جس سے کلام کی بلاغت و لطافت اور ادبی خوبیاں بھی سامنے آگئی ہیں پہلے تقریباً ۰۰ اصفحے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے دور خیر و برکت میں کہے گئے نعتیہ کلام کو مع تبصرہ پیش کیا گیا پھر عباسی عہد اور اسکے بعد کے ممتاز و غیر ممتاز نعت گو شعرا کا کلام درج ہے ہندوستان کے حضرت شاہ ولی اللہ شیخ احمد تھانیسری اور آزاد بلگرامی کے نعتیہ کلام کا بھی نمونہ دیا ہے، آخر میں اس عہد کے ممتاز مصری شاعر احمد شوقی کی نعتوں کا بھی انتخاب ہے، شروع میں عربی نعت گوئی کی مختصر تاریخ، اس کے خاص اجزا و عناصر اور اس میں بیان

کئے گئے، اہم مضامین کی وضاحت ہے اور آخر میں حق بحقدار رسید کے زیر عنوان چند ایسے اشعار درج میں جو گو رسول اللہ کی مدح و منقبت میں نہیں کہے گئے ہیں لیکن ان کی اصل مستحق اور خاص مصداق آپ ہی کی ذات مبارک ہے، مفہوم کی وضاحت کے لئے لغات و شروح کی کتابوں کے علاوہ احادیث سے بھی مدد لی ہے، اور اشعار کے ہم معنی اردو و فارسی اشعار بھی نقل کئے ہیں، کہیں کہیں عام شارحین کے بیان کردہ مفہوم سے بے اطمینانی ظاہر کی گئی ہے، غلط روایتوں کی تردید پر بھی توجہ کی ہے اور مستشرقین نے جن واقعات کو رنگ آمیزی دیکر کچھ سے کچھ بنا دیا ہے ان کی حقیقت بھی ظاہر کی ہے، جن قصائد کی شرحین اور تخمیسات لکھی گئی ہیں ان کا ذکر بھی آگیا ہے، مصنف کے نقد و نظر کا کمال وہاں ظاہر ہوتا ہے جہاں انھوں نے الحاقی اشعار پر بحث و گفتگو کی ہے، بعض معروف نعتیہ کلا[illegible] کے انتخاب میں اس لیے نہیں آسکا کہ وہ منحول تھا اس معاملہ میں انھوں نے اپنے مخدوم و مربی اور علمی مرشد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے بھی ایک جگہ اختلاف کیا ہے، مولانا نے حضرت حسانؓ کی نسبت سے دو اشعار نقل کئے ہیں (ص ۱۸) مصنف کے نزدیک ان کی نسبت حضرت حسانؓ کی جانب مشکوک ہے (ص ۴۲) گو مصنف نے بعض شعرا کے مختصر حالات بقدر ضرورت تحریر کیے ہیں لیکن اگر وہ اسی طرح سب شعراء کے مختصر حالات بھی تحریر کر دیتے تو اس کتاب کا فائدہ اور بڑھ جاتا مراجع کے زیر عنوان بھی بعض مصنفین کے سنین وفات درج ہیں، مگر بعض کے نہیں، ص ۲۹۹ پر علامہ ابن عبد البر کا نام دو جگہ تحریر ہے پہلی جگہ ان کا سنہ وفات ۴۶۲ھ اور دوسری جگہ ۴۶۳ھ دیا گیا ہے، یہ تضاد کتابت کی غلطی کا نتیجہ ہوگا، لیکن محقق قول کے مطابق ان کی وفات ۴۶۳ھ میں ہوئی تھی مصنف نے اعتراف کیا ہے اس کتاب کا مقصد عربی کی نعتیہ شاعری کا استیعاب نہیں ہے تاہم اس سے عربی شعر و ادب [illegible] ان کی دلچسپی کے علاوہ اس قلبی کیفیت کا پتہ بھی چلتا ہے، جو ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ہے، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مقدمہ بھی موثر اور ان کے ادب و انشاء کا دلکش نمونہ ہے، یہ اس کتاب کا دوسرا اڈیشن ہے جو ترمیم و اضافہ کے بعد اہتمام سے شائع کیا گیا ہے،

جریر شخصیت اور شاعری مرتبہ ڈاکٹر عبد الباری، تقطیع خورد، کاغذ بہتر کتابت و طباعت معمولی صفحات ۲۰۰ مجلد مع گرد پوش قیمت ۲۲ روپیے پتہ ڈاکٹر عبد الباری دار الانس، دودھ پور، علی گڑھ،

زیر نظر کتاب میں اموی دور کے ممتاز شاعر جریر کی شخصیت اور شاعری پر بحث کی گئی ہے، اس میں جریر کی شخصیت کے خط و خال اس کے عہد، ماحول اور شاعری کی روشنی میں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اس سلسلہ میں اس کے گھرانے، بادیہ نشینی سے دربار شاہی تک رسائی، اور اس کے اخلاق و عادات کا مرقع پیش کیا ہے اور اسکی شاعری میں مذہبی اثرات اور جدت طبع کے نمونے پیش کئے ہیں پھر ان اصناف کلام پر بحث کی ہے جن میں جریر نے طبع آزمائی کی تھی جیسے ہجو، قصیدہ، مرثیہ اور غزل وغیرہ اس ضمن میں جریر کے پیش رو شعرا کے علاوہ اسکے معاصرین فرزدق و اخطل وغیرہ سے مقابلہ کر کے اس کی عظمت و برتری دکھائی ہے، مستشرقین اور ان مسلمان مورخین اور ادیبوں کی تردید بھی کی گئی ہے جو اموی دور کی شاعری کو جاہلی دور کی شاعری سے پست اور اس کی غلامانہ تقلید کا نتیجہ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اسلامی عہد کے اثرات و فتوحات کے ذکر سے خالی اور اپنے زمانہ کی تصویر پیش کرنے سے قاصر ہے، لیکن مصنف کے بعض خیالات درست معلوم نہیں ہوتے کیونکہ یہ صحیح ہے کہ جاہلی دور کی شاعری سے اموی دور کی شاعری فروتر ہے، اور اس میں پوری طرح اسلامی اثرات کا ذکر نہیں ہے، محض چند اشعار اسکی دلیل نہیں ہو سکتے کہ جریر اسلامی افکار و تصورات کا ترجمان تھا، کتاب میں جریر کے عام حالات بھی بیان نہیں کئے گئے ہیں کتابت و طباعت کی غلطیوں کے علاوہ کہیں کہیں زبان و طرز ادا کی بھی خامیاں ہیں جیسے جریر کی شاعری کا جون سا رخ ہو (ص ۵۹) اس سیاسی نزاع کے اشارہ مذکورہ دونوں گھرانوں کے ... (ص ۱۰۶) عربی ادب کے مشہور عباسی ناقد و راوی ابو عبیدہ ..... (ص ۱۳۰) مزار کا لفظ مذکر ہے، مصنف نے اسکو مونث لکھا ہے، (ص ۱۶۷) ص ۱۵۳ پر متمم بن نویرہ کے مرثیہ کے دو شعر کے ترجمہ میں بھی غلطی ہو گئی ہے کیا مقام لوی اور دکادک کے درمیان بنی ہر اس قبر پر آنسو بہاؤ گے جس پر تمہاری نگاہ پڑے گی، صحیح ترجمہ اسی طرح ہو گا کیا مقام لوی و دکادک کے درمیان بھی ایک قبر کی وجہ سے تم ہر ہر قبر پر ..... اردو میں جریر پر کوئی مستقل کتاب نہیں تھی اس کتاب سے جریر کی شخ...

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰ — دسمبر سنہ ۱۹۸۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت پندرہ ۱۵ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

جلد ۱۲۶ ماہ صفر المظفر سنہ ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ دسمبر سنہ ۱۹۸۰ء عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد

اعلان

معارف کی سالانہ قیمت اب تک ۱۵ روپیے تھی، کاغذ، کتابت و طباعت کی روز افزوں گرانی کیوجہ سے جنوری سنہ ۱۹۸۱ء سے ۲۰ روپیے سالانہ کیجاتی ہے، قدردان [illegible] معارف اسکو نوٹ فرمالیں

منیجر دار المصنفین

شذرات

معارف کے گذشتہ شذرات میں چودہ سو سال کے اندر مسلمانوں میں جو غدار پیدا ہوئے اور ان سے ملت کو جو نقصان پہونچا، اس کا ذکر آیا تھا، اس برصغیر میں ایسے غداروں کا ذکر رہ گیا تھا اس کا جائزہ ہم اس وقت سے لیتے ہیں جب کہ دہلی میں مسلمانوں کی باضابطہ حکومت قطب الدین ایبک نے ۶۰۲ھ میں قائم کی، وہ صرف پانچ سال تک حکمران رہا، اس کی وفات کے بعد جانشینی میں سخت اختلاف ہوا، اس وقت کے مسلمانوں اور خصوصاً امراء کو اس نوزائیدہ سلطنت کو بچانے کی خاطر متحد رہنا چاہئے تھا، مگر ان کی باہمی آویزش سے قطب الدین ایبک کا جانشین آرام شاہ ہلاک ہوا، اس کا داماد ناصر الدین قباچہ سندھ کا حکمراں بن بیٹھا، لکھنوتی میں علی مردان خان نے دہلی سے کٹ کر اپنی آزادی کا اعلان کر دیا، دہلی کے قرب و جوار کے علاقے کا مالک شمس الدین التمش ہوا، ایک مرکزی حکومت سے گریز پائی کرکے علاقائی آزادی کے ان علمبرداروں نے جس طرح ایک نئی حکومت کو نقصان پہونچایا، ان کو کیا کہا جائے گا، کیا وہ مفاد پرست غدار نہ تھے،

سلطان شمس الدین التمش نے ازسرنو اس سلطنت کو مستحکم کیا، مگر اس کی وفات کے بعد پھر جانشینی کی لڑائی چھڑ گئی، پہلے رکن الدین تخت پر بیٹھا لیکن وہ اپنی ماں شاہ ترخان کے ساتھ جیل میں ڈال دیا گیا، رضیہ سلطانہ تخت پر بٹھائی گئی، تو امراء کو اس کا ہوا خواہ ہو کر حکومت کو مضبوط بنانا چاہئے تھا، مگر لاہور اور سرہند کے حاکموں نے اس کے خلاف بغاوت کی، جب اس نے سرہند کے حاکم التونیہ سے کیتھل میں جنگ کی تو اس کے لشکریوں نے غداری کرکے اس کا ساتھ چھوڑ دیا، وہ شکست کھا گئی جس کے بعد وہ ہندوؤں کے ہاتھوں ہلاک کر دی گئی، جو اب تک ایک بڑا المیہ سمجھا جاتا ہے،

سلطان ناصرالدین محمود کے عہد میں ناگور، دوآب اور سمانہ کے حاکموں نے مرکزی حکومت سے بغاوت کرکے اس کو کمزور کیا، غیاث الدین بلبن نے وزارت عظمیٰ کی باگ ہاتھ میں لی تو ان غداروں کی سرکوبی اچھی طرح کی، جب وہ خود تخت نشین ہوا، تو اس نے ایک مرد آہن بن کر ملک میں امن قائم کیا پھر بھی لکھنوتی کے حاکم طغرل نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، یہ علاقہ دہلی کی مرکزی حکومت کے لئے برابر دردسر رہا، بلبن اس سرکشی کو فرو کرنے کے لئے خود وہاں پہونچا طغرل کو شکست دے کر اس کے رشتہ داروں اور حامیوں کے سر قلم کرکے لکھنوتی کے بازار کے دونوں طرف سنگینوں میں لٹکا دیے، غداروں کی یہ عبرتناک سزا کئی روز تک جاری رہی،

بلبن کی مضبوط اور باوقار سلطنت اس کے کمزور جانشین کیقباد کے ہاتھوں سنبھل نہ سکی خلجی امرأ نے اسکو موت کے گھاٹ اتار دیا، جس کے بعد جلال الدین خلجی دہلی کے تخت پر بیٹھا، وہ نیک دل اور بامروت حکمران تھا، اس کے بھتیجے علاء الدین خلجی نے دیوگیر میں غیر معمولی فوجی کامیابی حاصل کی تو وہ خود تاج و تخت کا خواہاں ہوا، اس نے اپنے شفیق چچا کو غدارانہ طور پر قتل کرایا، اور بادشاہ بننے کی ہوس پوری کی، اور جب وہ اپنی دلیرانہ فتوحات سے سلطنت کا اثر بڑھا رہا تھا، تو اس کے بھتیجے اکت خاں نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا، گو ناکام رہا اسی کے بعد دہلی کے کوتوال فخرالدین کے ایک غلام کے لڑکے حاجی مولیٰ نے ایک سید کو تخت پر بٹھا کر علاء الدین کو بے دخل کرنے کی کوشش کی مگر وہ سید کے ساتھ ہلاک کر دیا گیا،

علاء الدین خلجی کا بڑا معتمد فوجی سردار ملک کافور تھا، اس نے دکن میں فتوحات حاصل کرکے بڑی شہرت حاصل کی، اپنے شاہی آقا کی وفات کے بعد اس نے پہلے اس کے دو شہزادوں خضر خان اور شادی خان کو اندھا کیا اور ایک چھ سالہ شہزادہ کو تخت پر بٹھا کر خود اس کا مالک بن بیٹھا، مگر اور دوسرے امراء نے اس غدار کو ہلاک کیا، اس کے بعد مبارک شاہ خلجی دہلی کا سلطان ہوا، اس نے

اپنے ایک خاص مصاحب خسرو خان پر پورا بھروسہ کیا، مگر اس نے غدارانہ طور پر اپنے مربی سلطان کو قتل کیا، اور خود بادشاہ بن گیا، مگر غیاث الدین تغلق نے ایک جنگ لڑ کر اس کو ہلاک کیا،

محمد بن تغلق کے عہد میں دہلی کی سلطنت کو بڑا عروج حاصل ہوا، اس کا وقار بیرونی ممالک میں بھی بڑھا، اس کی مزید ترقی میں تمام امراء کو حصہ لینا چاہئے تھا، مگر معبر کے حاکم جلال الدین نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا، بنگال حسب معمول پھوڑا بنا رہا، مشرقی بنگال کے حاکم بہرام خان کا اسلحہ بردار فخر الدین اپنے آقا کو قتل کر کے اس علاقہ کا مالک بن بیٹھا، لکھنوتی کے حاکم قدر خان نے اس کے خلاف لشکر کشی کی، تو لڑائی میں وہ بھی مارا گیا، اسکے بعد اس نے اپنی آزادی کا اعلان کر کے مرکزی حکومت کو نقصان پہونچایا، ظفر آباد کے حاکم عین الملک نے بھی بغاوت کر کے حکومت کو کمزور کیا،

فیروز شاہ تغلق نے اپنی سلطنت کا وقار قائم رکھا، لیکن اس کی کافی سرگرمیاں بنگال کے باغی حکمران حاجی الیاس کے خلاف لشکر کشی میں ضائع ہوتی رہیں، اس کی وفات کے بعد غدار امراء کی سازش سے جانشینی کی لڑائیاں یکے بعد دیگرے ہوتی رہیں، ان جانشینوں میں کوئی مارا گیا، کوئی جیل خانہ میں ڈال دیا گیا، کسی کے خلاف امراء کی بغاوت ہوئی، کسی کو زیر کرنے کے لئے کوئی حریف حکمران بنایا گیا، اسی انتشار پسندی میں امیر تیمور کا حملہ دہلی پر ہوا، وہ اپنے کو مسلمان کہتا تھا، لیکن مسلمانوں کی ایک سلطنت کو بڑی سفاکی، خونریزی اور غارتگری سے تباہ کیا، کیا اس نے اسلامی قدروں سے غداری نہیں کی؟ اس تباہی سے سازش پسند امراء کو سبق لینا چاہئے تھا، مگر افراتفری جاری رہی، جس سے فائدہ اٹھا کر مالوہ، گجرات، جونپور اور دکن کے حاکموں نے دہلی سے اپنے کو آزاد کر لیا، ستم ظریفی یہ بھی ہوئی کہ دکن کے اندر بیجاپور، اور گولکنڈہ، اور بیدر کی حکومتیں علحدہ علحدہ بن گئیں،

جو علاقائی حکومتیں بنیں، ان کا حشر کیا ہوا، مالوہ کے حکمران غزنین خاں کو اس کے وزیر محمود خاں نے زہر دیکر ہلاک کیا، اور خود وہاں کا سلطان بن بیٹھا، اسکے ایک اور حکمران غیاث الدین کو اسکے لڑکے نصیر الدین نے

زہر دیدیا، ناصر الدین کے جانشین محمود ثانی کو گجرات کے فرمانرواں نے تہ تیغ کیا، اور مالوہ کو گجرات کا حصہ بنالیا، گجرات کے حکمرانوں میں سکندر شاہ کا بھی قتل ہوا، اس کے بعد اس کا بھائی ناصر خان حکمران ہوا، تو بہادر شاہ اسکو معزول کر کے خود تخت نشین ہوگیا، مگر وہ خود پرتگالیوں کی سازش سے مارا گیا، اس کے بعد یہ سلطنت کمزور ہوتی چلی گئی، اکبر نے اپنے زمانہ میں اسکو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا، بنگال کے حکمرانوں میں علاء الدین فیروز شاہ کو اسکے چچا نے قتل کیا اور غیاث الدین محمود شاہ چہارم کے لقب سے تخت پر بیٹھ گیا، امراء کے اختلاف کی وجہ سے مغلوں کے عہد میں یہ حکومت بھی اکبر کے نذر ہوگئی۔

خاندیش میں بھی امراء کی باہمی غداری کی وجہ سے بڑا انتشار رہا، اسکا ایک کمسن حکمران قتل ہوا، جس کے بعد گجرات کا حکمران محمود شاہ بیگڑہ یہاں اپنا نامزد فرمانروا تخت پر بیٹھانے لگا، اکبر نے اسکو بھی اپنے زیر نگین کر لیا، دکن میں بہمنی خاندان کی حکومت کو بڑا عروج ہوا، وجیانگر جیسی طاقتور ہندو حکومت اسکے سامنے جھکتی رہی، مگر یہاں بھی باہمی آویزش غداری کی حد تک پہونچ گئی، اسکے حکمران مجاہد شاہ کو اسکے چچازاد بھائی داؤد نے قتل کیا، اس کا انتقام مجاہد کی بہن روح پرور آغا نے داؤد کو قتل کرا کے لیا، ایک دوسرے حکمران احمد شاہ نے اپنے بھائی کو قتل کر کے تخت حاصل کیا، اسی خاندان کا سلطان ہمایوں اپنے چھوٹے بھائی حسن کو معزول کر کے برسر اقتدار آیا، اور اس کو ایک خوفناک شیر کے منہ کے پاس ڈال دیا، جو اسکو چبا کر کھا گیا، بہمنی حکومت کا وزیر اعظم محمود گاواں بہت ہی نیک دل، فرشتہ صفت اور عظیم المرتبت سیاست داں تھا، دکنی امراء کی سازش سے اس کے شاہی آقا محمد شاہ ثالث نے اسکو قتل کرا دیا۔

بہمنی حکومت امراء کے اختلاف سے کمزور ہوتی گئی، تو فوجی امراء میں عماد الملک نے برار، یوسف عادل شاہ نے بیجاپور، ملک احمد نے احمد نگر، قطب الملک نے گولکنڈہ اور قاسم برید نے بیدر میں آزاد حکومتیں قائم کرلیں، برار کی حکومت نوّے سال تک قائم رہ کر احمد نگر میں مل گئی، بیجاپور میں شیعہ سنی کے جھگڑوں سے بڑا انتشار رہا، اسمٰعیل عادل شاہ کے زمانہ میں اس کے باپ کے ایک معتمد امیر کمال خان نے اس سے

غداری کی، اور جب [illegible] سے مل کر تخت پر غاصبانہ قبضہ کرنا چاہتا تھا، لیکن سلطان کی ماں نے اسکو قتل کرادیا، اسکے فرمانروا احمد نگر، بیدر، اور گولکنڈہ کی حکومتوں سے برسرپیکار تھے، احمد نگر کے حکمران تو بیجاپور سے لڑنے میں وجیانگر کی ہندو ریاست سے بھی مدد لیتے رہے، یہ بھی امراء کی غدارانہ سازشوں سے روز بروز کمزور ہوتی گئی جو مغلوں کے عہد میں ان کی قلمرو کا جزبن گئی، گولکنڈہ کے قطب شاہی حکمرانوں میں سے قطب شاہ کو اس کے لڑکے نے قتل کیا، بیدر کی سلطنت کمزور ہوئی، تو اسکو عادل شاہیوں نے اپنے میں ضم کر لیا۔

دہلی میں تغلق خاندان کے خاتمہ کے بعد سیدوں کی حکومت قائم ہوئی، اس کا بانی خضر خان امیر تیمور سے مل گیا، اور اس کا باجگذار بن کر حکومت کرنے لگا، مگر غدار امراء کی سازشوں سے اس خاندان کے سلاطین کو چین نصیب نہیں ہوا، دوآب، بیانہ، کول، بدایوں، سامانہ اور گوالیار میں امراء کی سرکشی جاری رہی، ایک امیر سرور الملک نے اسکے فرمانروا سلطان مبارک کا قتل کرایا، انتشار پھیلا تو جونپور کے ابراہیم شاہ شرقی نے دہلی کی حکومت کے بہت سے علاقے غصب کر لئے، مالوہ کے حکمران محمود خلجی کی بھی نظر دہلی کی طرف اٹھی، لاہور اور سرہند کے حاکم بہلول لودی کی للچائی ہوئی نظر بھی دہلی پر پڑی، اسکے آخری فرمانروا علاء الدین عالم شاہ کا اختلاف اپنے وزیر حمید خاں سے بڑھا تو وزیر نے اپنے شاہی آقا سے غداری کر کے بہلول لودی کو دہلی کے تخت کا مالک بننے میں مدد پہونچائی۔

بہلول لودی تخت پر بیٹھا تو اس نے حمید خاں کو گوشۂ گمنامی میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ جو اپنے شاہی آقا سے غداری کر چکا ہے وہ اسکا وفادار نہیں ہو سکتا ہے، مگر بہلول لودی کے مخالفوں نے جونپور کے حکمران محمود شاہ شرقی کو دہلی پر حملہ کرنے کی دعوت دی جس کی فوج میں کچھ افغان سردار بھی تھے، عین لڑائی کے موقع پر وہ غداری کر کے بہلول لودی کی فوج سے مل گئے، ان فوجی سرداروں کی غداری سے دہلی اور جونپور کے دونوں مسلمان حکمران ایک عرصہ تک برسرپیکار رہے، جن سے دونوں کی حکومتیں کمزور ہوتی گئیں، بہلول لودی کے جانشین سکندر لودی کو اپنے بھائی بھتیجے سے لڑ کر تخت حاصل

کر چکا، خود سکندر لودی کو اپنے افغان فوجی سرداروں پر بھروسہ نہیں رہا، لوانی، فرملی اور لودی قبیلے کے امرا ایک دوسرے پر اعتماد نہ کرتے، اور ڈرتے رہتے کہ معلوم نہیں کون کس وقت دھوکا دیدے،

اسی بے اعتمادی کی حالت میں ابراہیم لودی تخت پر بیٹھا تو اس نے اپنے بھائیوں کو جیل میں ڈالدیا، اپنے غدار فوجی امرا کو دبانے کی کوشش کی، تو ہر طرف بغاوت پھیل گئی، ایک گھمسان لڑائی میں بھائی بھائی، باپ بیٹے، اور دوست اپنے دوست سے لڑے، مسلمانوں کی گردنیں اس وقت شرم سے جھک گئی ہونگی کہ اسلام فصل کے بجائے وصل کی تعلیم دیتا ہے، مگر یہ نظر انداز ہوتی رہی، امرا کا اختلاف اتنا بڑھا کہ آخر میں دولت خاں لودی نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی، وہ حملہ آور ہوا، اور ابراہیم لودی پانی پت کے میدان میں بابر سے لڑتا ہوا مارا گیا، جس کے بعد بابر نے ہندوستان میں ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی، مگر اسکو افغانوں پر کوئی بھروسہ نہیں رہا، ان کو ہمیشہ شبہہ کی نظر سے دیکھتا، وہ ایک بہت ہی دل آویز حکمران ہوا، مگر تاریخ اسکو کیسے فراموش کر سکتی ہے کہ اس نے مسلمانوں کی لاشوں پر اپنی سلطنت کھڑی کی ـــ

ہندوستان کے مغل فرمانرواؤں کے دور میں جو غداریاں ہوتی رہیں، ان کا ذکر آیندہ اشاعت میں آئے گا، مذکورۂ بالا سطروں کو پڑھ کر ہمارے قارئین بددل ہو کر اپنے آپ سے شاید سوال کریں کہ کیا مسلمانوں کی تاریخ میں غدار ہی غدار پیدا ہوتے رہے، ایسا نہیں، ہماری تاریخ میں ہمارے اچھے حکمرانوں کی اکثریت رہی ہے، ان کی جہانگیری، جہانبانی اور جہانداری کی اعلیٰ سے اعلیٰ مثالیں بھی ملتی ہیں، مگر اس دور میں ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے محاسن سے زیادہ اپنے نقائص پر نظر رکھیں، یہ صحیح ہے کہ دوسری قوموں میں بھی یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے، اسی لیے گبن نے کہا ہے کہ تاریخ نوع انسانی کے جرائم اور مصائب کا ایک رجسٹر ہے، یورپ تو میکاولی کی اس تعلیم پر عمل ہی کر رہا ہے، کہ سیاست میں بداخلاقی کوئی چیز نہیں،

سیاسی مقصد کے حصول کے لیے حکمراں بداخلاق بھی ہو سکتا ہے، اس کے لیے طاقت جھوٹ اور فریب کا استعمال کرنا ضروری ہوتا ہے، آدمی عموماً برے ہوتے ہیں، اس لئے ان کے ساتھ برا ہونا ناگزیر ہے، ہندوؤں کے ایک سیاسی فلسفی چانکیہ بھی اسی کا قائل رہا، قدیم ہندوستان کی تاریخ میں راجپوت راجاؤں کے یہاں بھی اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں، سرجدو ناتھ سرکار نے اپنی تاریخ فال آف دی مغل امپائر جلد اول میں لکھا ہے کہ ایک راجپوت جاگیر کی خاطر ہر قسم کے جرم کا ارتکاب کر لیتا، باپ بیٹے کو مار ڈالتا، بیٹا باپ کو قتل کر دیتا، شریف ترین خاندان کی عورتیں بہت ہی قابل اعتماد رشتہ داروں کو زہر دیدیتیں، راجہ اپنے وفادار وزیروں کی جان لے لیتا یا رام دیوتا، کی اعلیٰ ترین نسل سے پیدا ہونے والے راجپوت بھی ایک بیرونی ڈاکو کی مدد حاصل کر کے اپنے خانگی جھگڑوں کا فیصلہ کرا لیتے، (ج ۱ ص ۱۳۱)

مگر ان مثالوں سے ہم اپنے کو مطمئن نہیں کر سکتے، ہم میں اور دوسری قوموں میں فرق ہونا چاہیئے، ہم کو خیر امت قرار دیا گیا ہے، ہم رحمۃ للعالمین کے پیرو ہیں، ہم کو صفحۂ دہر سے باطل کو مٹانے کے لیے پیام دیا گیا ہے، نہ کہ ذاتی، نسلی، قبائلی اور علاقائی مفاد کی خاطر اپنے حکمرانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے اپنی غداری سے اپنے بھائیوں کا خون بہانے، بغاوت کرنے اور انتشار پھیلانے کو کہا گیا ہے، یہ اللہ اور رسولؐ کی تعلیمات سے سراسر غداری ہے،

کاغذ اور ہر چیز کی گرانی کی وجہ سے جنوری سنہ ۱۹۸۱ء سے معارف کا زر مبادلہ پندرہ سے پچیس روپیے کر دیا گیا ہے، امید کہ اس کی ضخامت اور افادیت کے لحاظ سے یہ اضافہ ہمارے خریداروں کو گراں نہ گذرے گا،

مقالہ

شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید مسعود گنج شکرؒ

کے مجموعۂ ملفوظات اسرار الاولیاء کا مطالعہ

از جناب مولانا اخلاق حسین دہلوی

(۲)

استاد محترم اسرار الاولیاء ہی سے ہماری معلومات میں یہ اضافہ ہوتا ہے کہ حضرت باباصاحبؒ کے ایک استاد محترم کا نام نامی مولانا بہاء الدین بخاری تھا، آپ نے فرمایا:۔

"اے درویش وقتے از زبان استاد خود شنیدم مولانا بہاء الدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ کہ وقتے خواجہ تمیم انصاری رحمۃ اللہ علیہ بر دست حبشیان گرفتار شدہ بود" (اسرار الاولیاء ص۳۰)

ایک دفعہ یہ بھی ذکر فرمایا۔

"اے درویش از شیخ بہاء الدین بخاریؒ کہ یکے از واصلان حق بود این قطعہ از دیاد دارم اما از شوق گفتہ بود۔

من اول روز چوں در تو بدیدم شیفتہ گشتم — ندانستم تو بودے یا کہ بود ستاین کہ من دیدم
چناں در روئے آں جاناں شدم من شیفتہ والہ — کہ من از خود شدم بیروں ترا در جان وتن دیدم

الغرض ان امتیازات سے اسرار الاولیاء کی انفرادیت واضح ہے؛ اسرار الاولیاء کے مطالعہ سے

معلومات میں وہ اضافہ ہوتا ہے، جو دیگر کتب ملفوظات کے مطالعہ سے نہیں ہوتا۔

اسرار الاولیاء کی ضخامت اسرار الاولیاء کے فارسی مطبوعہ نسخے کا حجم ۹۴ صفحات ہے، مولانا بدرالدین اسحاق نے یہ بھی وضاحت فرمائی ہے، کہ انھوں نے یہ صحیفۂ رشد و ہدایت بارہ(۱۲) سال میں مرتب فرمایا ہے، اس بیان کے صحیح ہونے میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں، حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے،

مولانا بدرالدین اسحاقؒ چناں خادمی
شیخ الشیوخ العالم قدس اللہ سرہ العزیز
کردے کہ از دو تن چنان خدمت نیاید
باآں ہم مستغرق و مشغول حق بودے تا حدے
کہ بخدمت شیخ شیوخ العالم نشستہ مستغرق
حق تعالیٰ بودے کہ از خود خبر نداشتے،
(سیر الاولیاء، ص ۱۷۱ ج)

مولانا بدرالدین اسحاقؒ حضرت بابا
صاحبؒ کی ایسی خدمت کرتے تھے جو دو(۲) شخص
آدمی بھی نہیں کر سکتے تھے (اس مشغولی کے
باوجود) نہایت مستغرق اور یاد حق میں محو
رہتے تھے، حتیٰ کہ جب حضرت بابا صاحبؒ
کی خدمت میں بیٹھے ہوتے تو بھی ہمہ تن یاد الٰہی
میں محو رہتے تھے، اپنا بھی ہوش نہ رہتا تھا،

حضرت محبوب الٰہی نے یہ بھی فرمایا ہے:

وقتے مولانا بدرالدین اسحاقؒ کہ
تعویذ او نوشتے حاضر نہ بود، و خلقے جہت
تعویذ بروں آمدہ بودند، مرا اشارت
کرد کہ تو بنویس من تعویذ نوشتم تا خلق
انبوہ شد کتابت من بسیار شد و مزاحمت
خلق بیشتر شد، درین میان شیخ روئے
سوئے من کرد و فرمود کہ ملول شدی،

ایک دفعہ مولانا بدرالدین اسحاقؒ موجود
نہ تھے جو حضرت بابا صاحبؒ کے حکم سے
تعویذ لکھا کرتے تھے، تعویذ لینے والے آئے
ہوئے تھے، حضرت بابا صاحبؒ نے مجھ سے
فرمایا کہ تم لکھو، میں نے تعویذ لکھے تعویذ
لینے والے بہت ہی آ جمع ہو گئے مجھے بہت ہی
لکھنا پڑا، مخلوق کے ہجوم سے کام میں

من گفتم کہ وقت شیخ حاضر است	رکاوٹ بھی ہوتی تھی، حضرت باباصاحبؒ
(فوائد الفواد ص ۲۰۰)	نے میری طرف رخ کیا اور فرمایا (کیا)
	تھک گئے، میں نے عرض کیا آپ پر
	سب کچھ روشن ہے،

حضرت محبوب الٰہیؒ کے بیان سے واضح ہے کہ مولانا بدرالدین اسحاقؒ کو بھی ہجوم خلائق سے دوچار رہنا پڑتا تھا، جس میں خاصا وقت صرف ہوتا تھا، اس انہماک و مشغولیت کے باوجود دیگر امور بھی ان کے سپرد تھے، مہمانوں کی تواضع اور خدمت لنگر خانے کا انتظام و اہتمام بھی ان ہی کے سپرد تھا، حتیٰ کہ لنگر خانے کے لیے جنگل سے لکڑیاں بھی لاتے تھے، (سیر الاولیاء ص ۱۷۶) پھر جو شخص اس قدر منہمک اور مشغول بکار ہو اور جس کے لیے حضرت باباصاحبؒ کی خدمت مقدم ہو اور خدمت بھی ایسی کہ اس سے دس آدمی بھی عہدہ برآنہ ہو سکیں اور ہمہ وقت مشغول بھی رہتا ہو، اس سے کتنی ضخیم کتاب کی تدوین متوقع ہو سکتی ہے، لہذا جو کچھ بھی کیا وہ ان ہی کا کام تھا، جو انھوں نے کیا، دوسرا کوئی عہدہ برآنہ ہو سکتا تھا،

واقعات شاہد ہیں کہ یہ مجموعۂ ملفوظات اسرارالاولیاء مولانا بدرالدین اسحاقؒ ہی کے رشحاتِ قلم کا ثمرہ ہے جو دست برد زمانہ سے ہم تک محفوظ نہیں پہنچا ہے، لیکن جو کچھ ہے، عقیدت مندوں کے لئے سرمۂ چشم اور سالکانِ راہ سلوک کے لیے خضر راہ ہے،

کتابوں کے حوالے　حضرت باباصاحبؒ کا مطالعہ وسیع اور حافظہ نہایت قوی تھا، آپ کو یہ یاد رہتا تھا کہ کس مضمون کا ماخذ کیا ہے، لہذا آپ گاہ بگاہ طالبوں کی رہنمائی کے پیش نظر جزدی یا کلی طور پر ماخذات کا ذکر بھی فرماتے رہتے تھے، یہ روش ملفوظات میں عام ہے، عموماً ہر مجموعۂ ملفوظات میں ملتی ہے، اسرار الاولیاء میں بھی متعدد ماخذات کا ذکر ہے مثلاً

(۱) قاضی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ در تواریخ خود نوشتہ است (ص ۴-۱۳) (۲) خواجہ معین الدین سنجری جائے نبشتہ است (ص ۵) (۳) در دلیل العارفین نبشتہ دیدہ ام (ص ۱۲) (۴) خواجہ امام محمد طاہر غزالی در تواریخ خود نبشتہ است (ص ۱۳) (۵) در آثار الاولیاء نبشتہ دیدہ ام (ص ۱۵) (۶) شیخ الاسلام شہاب الدین قدس اللہ سرہٗ العزیز فرمودہ است (ص ۳۷) (۷) در سلوک نبشتہ دیدہ ام (ص ۴۰،۴۳) (سلوک سے مراد کتاب سلوک الاولیاء) (۸) در عہد خواجہ جنید بغدادی قدس اللہ روحہ دیدہ ام (ص ۴۰،۴۲) (۹) در اسرار العارفین نبشتہ دیدہ ام (ص ۵۰) (۱۰) در کتاب محبت نبشتہ دیدہ ام (ص ۵۱-۵۳) (۱۱) در حجۃ العارفین آمدہ است (ص ۵۲) (۱۲) خواجہ عبد اللہ سہیل تستری رحمۃ اللہ علیہ جائے نبشتہ است (ص ۶۶) (۱۳) در سلوک الاولیاء نبشتہ دیدہ ام (ص ۶۷) (۱۴) از زبان شیخ اوحد الدین کرمانی شنیدہ ام (ص ۶۹) (۱۵) شنیدم از زبان خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہٗ العزیز (ص ۷۳)

تلاش و تفحص سے کچھ حوالے اور بھی ملتے ہیں، ماخذات کی یہ تعداد نہایت قلیل ہے آٹھ سات کتابوں کے نام ہیں، دیگر حوالہ جات کا تعلق ذاتی معلومات اور ذاتی مطالعہ سے ہے، حوالہ جات کا یہی عالم دیگر کتب ملفوظات میں ہے، خیر المجالس میں اکتیس (۳۱) تو مستقل کتابوں کے نام ہیں اور متعدد حوالے ذاتی معلومات پر مبنی ہیں، خیر المجالس میں ماخذات کا ذکر کچھ اس طرح ہے۔

(۱) در کشاف نوشتہ است (ص ۸۳) (۲) در کتابے نوشتہ است (ص ۹۲) (۳) حجۃ الاسلام غزالی حکایت بزرگے نوشتہ است (ص ۹۵) (۴) عین القضاۃ در کتاب خود نوشتہ است (ص ۹۸) (۵) قول بزرگے فرمودند (ص ۱۵۵) (۶) در عوارف است (ص ۱۵۵) (۷) از بزرگے روایت فرمودند (ص ۱۵۳) (۸) در رسالہ نبشتہ دیدہ ام (ص ۲۳۵) (۹) در فلاں کتاب نوشتہ است (ص ۲۳۹) (۱۰) در کتابے دیدہ ام (ص ۲۵۰)

متقدمین کی اکثر وبیشتر کتابیں نایاب و ناپید ہیں، بعض کا پتہ نشان کشف الظنون (چلپی) کی سی کتب حوالہ جات سے مل سکتا ہے، لیکن کتب حوالہ جات بھی جز وکل پر حاوی نہیں ہوتیں، حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی لاہور (پاکستان) سے "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" نام سے کئی جلدیں شائع ہوئی ہیں، لیکن متعدد کتابوں کا ذکر رہ گیا ہے، جن کی طرف ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، (جنوری و فروری ۱۹۸۵ء) میں توجہ دلائی گئی ہے، اس کا مدعا یہ ہے کہ اگر بعض کتابوں کا ذکر نہیں ملتا تو یہ بدگمانی نہیں کی جاسکتی کہ یہ کتابیں جعلی و فرضی ہیں، اولیاء اللہ سے متعلق کتابوں کے باب میں تو یہ بدگمانی نہایت درجہ مکروہ ہے۔ اِنَّ بعض الظنِّ اِثمٌ۔ بدگمانی کا مرتکب وہی ہوگا، جو علمی قدروں سے نابلد ہوگا۔

الغرض اسرار الاولیاء میں ماخذات کے جو حوالے ملتے ہیں وہ خیر المجالس کے حوالوں سے زیادہ وقیع اور معتبر انداز میں ملتے ہیں، ان کے باب میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں، تقریر و بیان میں حوالہ جات کی یہی روش ہے، جو آج بھی ہے،

اسفار و مشاہدات | کتب ملفوظات کا مطالعہ شاہد ہے کہ اولیاء اللہ کا یہ بھی معمول رہا ہے کہ وہ ملفوظات میں برمحل اپنے اسفار و مشاہدات کا ذکر فرماتے رہے ہیں۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کے اسفار نہایت قلیل ہیں، بدایوں سے دہلی اور دہلی سے اجودھن (پاکپٹن) مگر آپ نے ان مختصر اسفار و مشاہدات کا بھی ذکر خیر فرمایا ہے، جو فوائد الفواد اور سیر الاولیاء کے اوراق کی زینت ہے، یہ صورت حال اس کی دلالت کرتی ہے کہ یہ بھی حضرت باباصاحبؒ کے اسفار و مشاہدات کی اور دیگر مشائخِ عظام ہی کی اتباع ہے،

حضرت باباصاحبؒ کے اسفار و مشاہدات کا ذکر اسرار الاولیاء میں بھی ہے، اور راحت القلوب میں بھی ہے، ممکن ہے کہ حضرت باباصاحبؒ کے ملفوظات کے ان مجموعات میں بھی ہو، جو

اب نایاب ہیں، فوائد الفواد میں بیشک حضرت بابا صاحبؒ کے ان سفروں اور مشاہدوں کے ذکر کو دہرایا نہیں گیا ہے، جن کا تعلق دیگر ممالک سے ہے، فوائد الفواد نہ تو حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، نہ حضرت بابا صاحبؒ کی سوانح حیات ہے، نہ وہ کوئی انسائیکلوپیڈیا ہی ہو کہ اس میں وہ کچھ ہوتا، جو عمومی کتابوں میں نہیں ہوا کرتا البتہ وہ صحیفہ رشد و ہدایت ہے طالبانِ سلوک کے لیے، مگر کیا اس میں سلوک سے متعلق سب ہی کچھ ہے، پھر اگر حضرت بابا صاحبؒ کے اسفار و مشاہدات کا ذکر نہیں ہے تو وہ نفی اسفار کی دلیل کیسے ہو سکتی ہے، لزوم مالا یلزم بے معنی سی بات ہے،

حضرت بابا صاحبؒ کے جن سفروں کا ذکر اسرار الاولیاء کے اوراق کی زینت ہو وہ یہ ہیں،

ملک بالا (مقام سوتہ) بغداد، غزنی، طرف شام، بدخشاں، سیوستان، بدایوں، لاہور،

ان کے علاوہ بھی دیگر معتبر ماخذات میں دیگر سفروں کا ذکر ملتا ہے، مثلاً

اجمیر، دہلی، ہانسی، ملتان، اُچ، فرید کوٹ، علاقۂ سہارن پور، مارواڑ، بخارا، اور قندھار .....

عہد وسطیٰ میں سیاحت مشائخ عظام کا خصوصی مشغلہ تھا، خواجہ عثمان ہارونیؒ، خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین سجزیؒ، خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ، قاضی حمید الدین ناگوریؒ، شیخ جلال الدین تبریزیؒ، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، شیخ سعدی شیرازیؒ متواتر حرکت میں رہے ہیں، اور اس پُر آشوب زمانے میں بھی عزلت گزین نہ ہوئے اس باب میں حضرت بابا صاحبؒ بھی ان ہی بزرگوں کے ہم ردیف رہے، اور سیر و سیاحت کے فوائد سے مستفید ہوئے۔

تاریخی وقائع | ہر کتاب کا ایک موضوع اور نصب العین ہوتا ہے، اور وہ اس علم و فن سے متعلق ہوتا

وہ متعلق ہوتی ہے، اگر ضمناً دیگر علوم وفنون سے متعلق کچھ شامل ہو جائے اور وہ مربوط بھی
تو کچھ مضائقہ نہیں، ایسا خال خال ہی ہوتا ہے، ورنہ ہر کتاب اپنے فن سے متعلق رہتی ہے،
نطق، ریاضی، سائنس، دینیات، تصوف ان علوم سے متعلق جو کتابیں ہوں گی، ان میں
قائع کی تلاش بے سود اور لاحاصل ہے، کتب ملفوظات کی نوعیت بھی یہی ہے، کہ اذہان
ق زق وبق بق میں مبتلا نہ ہوں، چنانچہ فوائد الفوائد، اور خیر المجالس میں بھی ان کے عہد تالیف
وقائع نہیں ملتے لیکن یہ عجوبۂ روزگار ہے، اسرار الاولیا میں مختصر سہی دو تاریخی وقائع ملتے ہیں
۱) سلطان ناصر الدین محمود کا سفر ملتان (۶۵۵ھ) ص ۸۲ (۲) اُچ پر مغلوں کی یورش
ملتان شیر خان کا مارا جانا (۶۶۲ھ) ص ۷۹
س اعتبار سے بھی اسرار الاولیاء کو دیگر کتب ملفوظات پر فوقیت حاصل ہے۔
سرار الاولیا اگرچہ دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت باباصاحبؒ کے ملفوظات کا
رہا سال گزرنے کے باوجود آج بھی اس میں وہ کیفیت اور دلآویزی ہے، جو بیان میں سما نہیں سکتی، بار بار پڑھنے
میں متواتر اضافہ ہوتا رہتا ہے، ذرا بھی کمی نہیں آتی پڑھنے والا نئی سے نئی کیفیت سے
روز ہوتا رہتا ہے، کبھی کسی بیان سے اور کبھی کسی بیان سے پڑھنے والے پر لگاتار کچھ
ت طاری ہوتی رہتی ہے، کہ وہ اپنے کو ہر بار کسی اور ہی عالم میں پاتا ہے، محسوس کرتا
د ذوق سے طبیعت ایسی متکیف رہتی ہے کہ گویا وہ نغمۂ الست میں کھو سا گیا ہے، اور
کی موجوں سے کھیلنے سا لگا ہے، کیف وسرور کے عالم میں مدہوش وبے خبر ہے، اور
میں رہنا چاہتا ہے، کبھی عالم سرور وبیخودی میں گنگنانے لگتا ہے۔ ؎

محبت میں کہ سب کچھ ہے روا ‏ ‏ ‏ ‏ حسرت حرمت بادۂ دمِ امیر نہ کھینچ

رورت حاضرہ کے پیش نظر میں نے اسرار الاولیاء کا از سر نو مطالعہ کیا، کیا بتاؤں میں نے

کیا پایا کسی مقام ایسے آئے کہ روح میں اہتزاز پیدا ہو گیا، جی بھر آیا، آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے، حسرت و حیرت طاری ہو گئی، دل دنیا سے بیزار سا ہو اور ہی چاہنے لگا، سب سے حیرت انگیز یہ کہ یہ بھی پتہ نہ چلا کہ یہ کیف و سرور یہ سرمستی کس لفظ کس جملے یا کس عبارت سے حاصل ہوئی ہے، کہہ لیجئے کہ تدریجی طور سے جو کیفیت فراہم ہوتی رہی ہے جب پیمانہ لبریز ہو گیا تو چھلک پڑا ہے،

بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسرار الاولیاء از اول تا آخر کیف و مستی، شریعت و طریقت، ادب و زبان، نور و عرفان اور صداقت و دلربائی کا بیش مرقع ہے دیرینہ روزی کے اثرات سے متاثر ہونے کے باوجود تاثیر کا نشتر رگ جان میں پیوست ہوتا ہی چلا جاتا ہے، اگرچہ وہ بزبان حال سے عقیدت مندوں کی سرد مہری اور بے اعتنائی کی نوحہ خوان بھی ہے کہ وہ صحت و مقابلہ سے مزین ہو کر منظر عام پر نہ آسکی، جس کی اشد ضرورت ہے،

عرفائے کاملین رشد و ہدایت کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور وہ اس باب میں ضعیف حدیث کو بھی روا رکھتے ہیں، اور اس سے کام لینے میں تکلف نہیں برتتے، وہ طبیب روحانی ہوتے ہیں، حاذق اطباء سے بھی اس باب میں ان کا مقام بلند ہے، وہ دل کی نبض پر انگلی رکھتے ہیں، اور تشخیص و تجویز کرتے ہیں، اور تدبیر فرماتے ہیں، جس طرح حاذق اطباء کو ان ادویہ سے کام لینے کا استحقاق ہے، جو عام حالات میں شرعاً ممنوع اور حرام و ناروا ہیں اسی طرح عرفا بھی بوقت ضرورت ان تدابیر کو اپنا لیتے ہیں، جنھیں علمائے شریعت وقیع نہیں جانتے اور ان سے اجتناب برتتے ہیں۔

خوارق عادات اور محیر العقول نقلیں اور تمثیلیں بالطبع انسان کو مرغوب ہیں، عرفائے کاملین نے ان سے بھی کام لیا ہے انوار سہیلی، کلیلہ و دمنہ و پنج تنتر، منطق الطیر اور مثنوی معنوی تمثیلی بیان کے شاہکار ہیں، جن کی حکایتوں اور تمثیلوں سے اہم اخلاقی نتائج برآمد ہوتے ہیں، جن سے دل و دماغ کی کایا پلٹ جاتی ہے، حیرت انگیزی کا وصف دلوں کو موہ لیتا ہے، اور آمادۂ عمل بنا دیتا ہے،

اسرار الاولیاء اس وصف سے خالی نہیں، اگر اس کو اسرار متحیرین سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا، اور اسرار الاولیاء ہی کیا عہد وسطیٰ کا جملہ ادب مشرقی ہو یا مغربی اس وصف سے مالا مال ہے، اگر اسرار الاولیاء میں یہ وصف نہ ہوتا تو نگاہ تحقیق میں یہ اس کا وصف نہ ہوتا سقم ہوتا۔

یہ صحیح نہیں کہ محیر العقول واقعات سے ناممکنات کے یقین کا نقش بٹھانا مقصود ہوتا ہے، بلکہ مقصود ہوتا ہے اس کا اثر و نتیجہ[1]، اور وہ اصل اسلوب کی جاذبیت اور کشش مراد ہوتی ہے، بہر نوع دیرینہ روزی کے اثرات سے متاثر اور دستبرد زمانہ کے اثرات سے دوچار رہنے کے باوجود مجموعۂ ملفوظات اسرار الاولیاء خوبیوں سے مالامال اور لائق مطالعہ و استفادہ ہے، البتہ ضرورت ہے کہ صحت و مقابلہ سے آراستہ کرکے اسے منظر عام پر لایا جائے تاکہ معاشرہ میں ایمانی تنوع رونما ہو، اور حقیقی راہنمائی حاصل ہو سکے،

۴۔ اسلوب بیان | اسرار الاولیاء کا اسلوب بیان اگرچہ سادہ، سلیس اور عام فہم ہے، مگر نہ ایسا سپاٹ اور بے آب و رنگ کہ مطالعہ سے امتلائے ادبی پیدا ہو اور نہ ایسا رنگین و دقیق اور مسجع و مقفیٰ کہ اس پر مصنوعی ہونے کا اطلاق ہو سکے، اور جس سے خاص و عام لطف اندوز نہ ہو سکیں، اسرار الاولیاء بلکہ جملہ ملفوظات کے مجموعات کا یہ عمومی وصف ہے کہ ہر طبقہ کا فارسی دان مفہوم و مضمون کو بآسانی سمجھ لیتا ہے، اور اپنی استعداد کے مطابق استفادہ کر لیتا ہے تصوف کے دقیق اور نازک مسائل کو اس خوبی سے بیان کرنا زبان دانی کا اور اسلوب بیان کا ایسا وصف ہے جو ہر تعریف و توصیف سے بالاتر ہے،

اس وصف کا تعلق جامع سے بھی ہے، اور صاحب ملفوظ سے بھی، جامع کتنے ہی فاضل سہی لیکن راہ سلوک میں وہ مبتدی ہوتے ہیں، اگر شیخ کا اسلوب کمالیت سے مالامال نہ ہو تو وہ یقیناً عہدہ برآ

---

[1] ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، اگست ۱۹۶۹ء ص ۱۰۰،

براہ ہوں، گویا کہ اسرار الاولیار کا اسلوب در اصل پر تو ہے حضرت بابا صاحب کے

محبوب الٰہی کا ارشاد ہے۔

ہر بار در ذوق بیان ایشان مردم چنان فردی شد — اکثر ایسا ہوا کہ سامعین آپ کے حضو

کہ تا بردہ شدے اگر ہمیں زمان مردم بمیرد نیکو باشد — کہ کیف میں کھو سے گئے ہیں اور آرزو

(فوائد الفواد، ص ۵۰) — اسی کیف میں مرجائیں تو اچھا ہو

حضرت خواجہ غلام فرید چشتیؒ (متوفی ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء) کا ارشاد ہے۔

"شیخ بدر الدین اسحاق قدس سرہٗ جو اسرار الاولیار کے جامع ہیں ان کا ضبط ا

اس قدر پختہ ہے کہ جو کچھ انھوں نے شیخ شیوخ کی زبان درفشان سے سنا اسی طرح

اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے" (مقابیس المجالس، ص ۳۶۵ - ۳۶۶ ترجمہ)

یہ اس بزرگ کا بیان ہے، جو علم و فضل اور بصیرت باطنی سے مالا مال اور درویشانہ و عا

جامع تھے، ان کے بیان کے بعد اسرار الاولیار کے اسلوب بیان سے متعلق لب کشائی کی گنجا

گویا کہ اسرار الاولیار کا اسلوب بیان ہر اعتبار سے جامع اور بے مثل ہے،

۱۱۔ نفس مضمون | اسرار الاولیار جن جواہر پاروں کا خزینہ ہے، ان میں سے معدودے چن

ہیں تاکہ نفس مضمون سے آگاہی حاصل ہو سکے اور اسرار الاولیار کی اہمیت واضح ہو جائے

(۱) اے درویش جو بادۂ محبت سے سرشار ہے وہی عرفا کے کلام کا قدر داں ہے۔ ا

جاں نثار اور سمجھتا ہے۔ (۵)

(۲) اے درویش کلام معرفت کی قدر و منزلت سے وہی آگاہ ہے، جس کے دل

انوار عشق اور اسرار دوست نے گھر کر لیا ہے، (۵)

ورنہ حقیقت یہ ہے، سہ

اے کہ آگاہ نہ عالم درویشاں را   تو چہ دانی کہ چہ سودا و سر است ایشاں را

(۳) اے درویش فقرا اہل عشق ہیں اور علما، اہل عقل ــــــــــــــــــ

اور درویش کا عشق علمار کی عقل پر غالب ہے

(۴) اے درویش مردان خدانے یہی کیا ہے کہ وہ جس کسی درماندہ اور محتاج کے پاس

سے گزرے اسی کو نعمت دارین سے مالا مال کر دیا ہے۔ (۶)

یہ فیض رسانی انسانی ہمدردی کے وصف کا ثمرہ ہے، جو اب ناپید ہے،

(۵) اے درویش جس دل میں محبت گھر کر لیتی ہے، اس میں محبوب کے سوا اور کسی شے

کے سمانے کی گنجایش نہیں رہتی . . . .

وصالِ محبوب سے باریاب وہی ہوتا ہے، جو دوئی کے عیب سے محفوظ و مبرا ہوتا ہے،

(۱۷-۱۸) پھر شرک و کفر کی گنجایش کہاں، عیب جوئی اور خوردہ گیری کا گزر کہاں،

(۶) اے درویش عشق و محبت کی آگ درویش ہی کے دل میں سلگتی ہے، اس کی جلوہ

آرائی کے لیے اور کوئی محل و مقام نہیں ہے، (۷)

سماع سے یہ آگ بھڑک اٹھتی ہے، حضرت بابا صاحبؒ کا ارشاد ہے، السماع یحرک قلوب

المستمعین ویوقد نار الشوق فی صدور المشتاقین[1] (سیرالاولیاء ص ۴۹۲)

(۷) اے درویش اس عالم آب و گل سے جو کوئی ایمان سلامت لے گیا یہ یقین جانو

اس نے بڑا کام کیا، پالا مار لیا،

سلامتی ایمان کا تو یہاں احساس تک نہیں، اللہ ہی انجام بخیر فرمائیں تو فرمائیں،

(۸) جب کسی درویش پر کیفیت طاری ہوتی ہے، تو از عرش تا فرش بلکہ تحت الثریٰ

---

[1] ترجمہ: سماع سننے والوں کے دلوں کو حرکت میں لاتا ہے، اور مشتاقوں کے دل میں شوق کی آگ کو بھڑکاتا ہے،

تک کوئی شے اس سے چھپی نہیں رہتی ۔ (۱۳)

یہ کیفیت فضلِ الٰہی پہ منحصر ہے، یہ بڑا نازک مرحلہ ہے، اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگا گئے ہیں، عالمِ تحیر میں بسا اوقات اسی کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔

(۹) دنیا طلبی مسلمانوں کو راس نہیں، مسلمانوں میں جو بھی طالبِ دنیا ہوگا وہ محروم ہی رہے گا، دنیا پاس بھی نہیں پھٹکے گی،

بڑے گر کی بات ہے، معاشرہ کے نقص کی نشان دہی ہے، طلبِ دنیا کیا ہے، حق سے بے خبری اور روگردانی۔ ؎

چیست دنیا از خدا غافل بودن

(۱۰) اے درویش دنیا میں کوئی شے صدقے سے بہتر اور سخاوت سے افضل نہیں ہے، جس نے بھی کچھ پایا ہے، سخاوت ہی کی بدولت پایا ہے،

ایثار و قربانی کی ترغیب و تحریص ہے، درویش اسی پہ عامل ہوتے ہیں، سعدی علیہ الرحمۃ کا ارشاد ہے۔ ؎

نیم نانے گر خورد مردِ خدا — بذلِ درویشان کند نیم دگر

درویشی میں حاتم کا سا دل درکار ہے، قارون کی سی تنگ دلی مطلوب نہیں، آج کے درویش کیا طمع زر اور حبِ جاہ میں مبتلا نہیں ہیں۔

(۱۱) نزولِ رحمت کے تین وقت ہیں،

(۱) سماع کے دوران اہلِ سماع پر، اور ان کے یار و انصار پر نزولِ رحمت ہوتا ہے،

(۲) اولیاء اللہ کے ذکر کے دوران شرکائے محفل پر نزولِ رحمت ہوتا ہے،

(۳) اہلِ دل جب انوار و تجلیات کے عالم میں مستغرق ہوتے ہیں تو ان پر نزولِ رحمت ہوتا ہے،

سماع فی نفسہ مباح ہے، اس کی حرمت نص قطعی سے ثابت نہیں، جو سماع صوفیہ کرام کے
ں مروج تھا، وہ اب نایاب ہے قوالی جس کا رواج آج کل ہے، وہ سماع نہیں، سماع کی مسخ
رہ شکل ہے، موجودہ قوالی کو سماع سے تعبیر کرنا اور اس کے پردے میں سماع کو حرام بتانا صحیح
ں ہے، اسی طرح مروجہ قوالی کو سماع سے تعبیر کرنا اور روا جاننا بھی صحیح نہیں ہے ؎

حسن بلائے چشم ہے نغمہ وبال گوش ہو جنکو نہیں شعور زیست ان کو یہ کنا ہو روا

(۱۲) اے درویش یاد الٰہی میں ہمہ تن مشغول رہنا چاہئے، بمصداق دل بیار و دست
بکار، ہر ہر کام اللہ کی رضا کے مطابق ہونا چاہئے، دیکھنا پھر تم کیسی کیسی نعمتوں سے
نوازے جاتے ہو،

خداوند عالم عمل صالح کی توفیق عنایت فرمائیں، یہی خلاصہ ہے، اسلامی تعلیمات کا۔

(۱۳) اے درویش مولیٰ اور بندے میں جو دوری ہے اور درمیان مین جو پردے حائل
ہیں، وہ آلایش دل کا سبب ہیں، دل دنیاوی دھندوں میں الجھا ہوا ہے، اگر آلایش
دل دور ہو جائے تو جو پردے حائل ہیں اٹھ جائیں گے، وصف مکاشفہ اور مقام مشاہدہ
حاصل ہو جائے گا، جو بہت بڑی نعمت ہے، توبۃ النصوح سے یہ پردے مرتفع ہو سکتے ہیں،
توبۃ النصوح کی تلقین اور خدا رسی کی تعلیم ہے، جو انسانیت کا اعلیٰ وصف ہے، خدائے پاک
یق نصیب فرمائیں،

جب صبح ہوتی ہے تو جسم انسانی کے ساتوں حصے زبان سے پناہ مانگتے ہیں، اور
کہتے ہیں کہ اے زبان اگر تو نے اپنے کو قابو مین رکھا تو ہم ہلاکت سے محفوظ رہیں گے، ورنہ
تباہ و برباد ہو جائیں گے، اے زبان ہمارے حال پر رحم کر اور اپنے کو قابو میں رکھ تا کہ ہم
ہلاکت سے محفوظ رہیں۔

ہفت اندام (۱) سر (۲) سینہ (۳) پیٹھ (۴) (۵) دونوں ہاتھ (۶) [illegible] دونوں

دل، دماغ، کلیجہ، تلی، پھیپھڑے، پتہ، معدہ۔ مگر وہ قرار دیتے ہیں کہ ان کا تعلق دراصل

عمومی طور پر ہفت اندام سے مراد پہلے ہی سات عضو انسانی ہیں،

خواجہ حالیؔ کی زبان گویا کا ماخذ یہی حکایت ہے، دیکھئے اہل کمال برادران وطن کی

کے لئے کہاں کہاں سے خوشہ چینی کرتے اور دسترخوان سجاتے ہیں ؎

تمتع زہر گوشۂ یافتم ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم

(۱۵) زبان کی آفت وبلا سے محفوظ رہنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ جو کوئی اس آفت

محفوظ رہنا چاہے، وہ تازہ دم وضو کرے، دو رکعت نماز نفل پڑھے پھر قبلہ رو بیٹھ کر

باری میں عرض کرے الٰہ العٰلمین! میری زبان کو بدگوئی سے محفوظ رہنے کی توفیق

نصیب فرمائیے اور یہ وصف عنایت فرمائیے کہ ذکر الٰہی کے سوا کوئی ذکر زبان پر

اور ان باتوں سے میری زبان کو اپنی پناہ میں رکھیے جو آپ کی رضا کے خلاف ہیں،

سمجھے یہ کیا ہے، معاشرے ہی کی عکاسی ہے، غیبت و بدگوئی کی بدولت جنگ و پیکار کا

یہ اسی کا سدباب ہے ”اسرار الاولیاء“ میں قدم قدم پر سماجی اور تہذیبی زندگی کا نہ صرف سراغ

بلکہ سماجی خرابیوں کی اصلاح کی تدابیر بھی ملتی ہیں، مگر دیکھنے کے لیے دیدۂ بینا درکار ہے، ع

بے بصیرت یہ راز کیا جانے۔

(۱۶) اے درویش نیکوکاری کا راز سربستہ یہی ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات

کو قابو میں رکھے، طبیعت کے تقاضوں سے کنارہ کش رہے، اور دنیاوی لذتوں

میں مبتلا نہ ہو،

یہ بھی وہی ہے، جس سے معاشرہ مسموم تھا، آج بھی جن کے ایئ کیٹ (TTE) [illegible]

دنیاوی مشاغل ہیں جن سے انھیں دم بھر کو مہلت نہیں ملتی، ان کا ذکر کیا، ان کا تصوف اور ان کی طریقت تو ان کی خواہشات ہیں۔

(۱۷) اے درویش سعادت کی نعمت جس کسی نے پائی ہے، خدمت ہی سے پائی ہے، دین و دنیا کی فلاح و بہبود مشائخ کی خدمت میں ہے، (۲۷)

ع: ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد ۔۔۔ بلاشبہ مشائخ کی خدمت بہت بڑی سعادت ہے ع: طریقت بجز خدمت خلق نیست مگر اب مشائخ ہیں کہاں، جو ان کی خدمت سے دین و دنیا کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو سکیں، علامہ اقبال بتا گئے ہیں۔ ؎

میراث میں آئی ہے انھیں مسند ارشاد زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

(۱۸) صوفی وہ ہے جو دنیاوی آلائشوں سے پاک صاف ہے۔ جس کا آئینۂ دل مکدر یا زنگ آلود ہے، وہ صوفی نہیں،

(۱۹) صوفی وہ ہے جس کا آئینۂ دل صاف و شفاف ہو، حتیٰ کہ ہر شے اس میں منعکس ہو جائے کچھ بھی پوشیدہ نہ رہے،

(۲۰) تصوف سے مراد خدا کی دوستی ہے، نور وحدت کے سوا دل میں اور کچھ بھی نہ ہو۔

یہی صفائے باطن ہے، گو لفظاً مختلف ہیں، مگر مفہوم واحد ہے، اللہ ہی کی دوستی و محبت سے قلب آئینہ ہو جاتا ہے، حدیث مبارکہ ہے کہ اللہ کے ذکر سے قرآن پاک کی تلاوت سے اور موت کی یاد سے آئینۂ دل کا زنگ چھوٹ جاتا ہے، اور دل آئینہ بن جاتا ہے،

(۲۱) حیات علم میں ہے، راحت معرفت میں ہے، شوق محبت میں ہے، اور ذوق یاد میں ہے (۵۵)

علم و معرفت اور محبت و یاد سے مراد علم الٰہی، معرفت الٰہی، محبت الٰہی اور یاد الٰہی ہے، اور یہ کیفیات سے متعلق کلام ہے،

(۲۲) کوئی عبادت تلاوت قرآن سے بہتر نہیں، اس سے غفلت روا نہیں۔ (۴۱)

اولیاء اللہ تلاوت قرآن پاک میں اکثر محو رہتے تھے، اور رات دن میں کئی کئی قرآن پاک ختم کر لیا کرتے تھے،

(۲۳) قرآن پاک کی تلاوت کے دوران حضوری اور مشاہدے کی نعمت نصیب ہوتی ہے اور عالم بالا کے راز بھی تلاوت کرنے والے پر منکشف ہوتے رہتے ہیں، (۴۱)

اللہ پاک قرآن پاک کی تلاوت کی سعادت نصیب فرمائیں، اور ایسی توفیق عنایت فرمائیں کہ حق تلاوت ادا ہو جائے تو پھر سب ہی کچھ ہے،

(۲۴) بھوک کیا ہے، ابر رحمت ہے اس سے رحمت ہی کی بارش ہوتی ہے،

حضرت بابا صاحبؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو نصیحت فرمائی تھی، روزہ داشتن نیمے راہ است و اعمال دیگر چون نماز و حج و نفلی نیمے راہ (اسرار الاولیاء ص ۱۲ ج)

(۲۵) ضرورت مندوں کی خدمت میں مشغول رہنا۔ اوراد و وظائف سے افضل ہے، (۵۱)

یہی راہ سلوک ہے کہ ؏ طریقت بجز خدمت خلق نیست۔ یہی انسانیت کا اعلیٰ وصف ہے، یہی حضرت بابا صاحبؒ کا عمل تھا، حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے کہ حضرت بابا صاحبؒ کا دستور یہ تھا کہ عصر کی نماز کے بعد بھی اگر ضرورت مند ہوتے یا آجاتے تو درود و وظائف میں مشغول نہ ہوتے، بلکہ ضرورت مندوں کی سنتے اور ان کے دکھ درد کا درماں فرماتے، حالانکہ عصر و مغرب کا درمیانی وقت صوفیۂ کرام کے لئے مشغولی خاص کا وقت ہے، اس وقت یاد الٰہی کے سوا اور

---

[1] مولوی غلام احمد خان بریان مرحوم نے ۱۳۳۱ھ میں سیر الاولیاء کا اردو میں ترجمہ کر کے شایع کیا تھا اور اردو سیر الاولیا نام رکھا تھا جو اب کیاب ہے، اس میں انھوں نے نماز دیگر کا ترجمہ ظہر کی نماز کیا ہے جو صحیح نہیں ہے، فارسی میں ظہر کی نماز کو نماز پیشین اور عصر کی نماز کو نماز دیگر کہتے ہیں، لاہور (پاکستان) میں آج تک یہ لفظ اسی طرح مستعمل اور اہل پنجاب کی زبان پر ہیں۔

کسی طرف متوجہ نہیں ہوتے، مگر حضرت بابا صاحبؒ فرماتے تھے "کے بر سر راہ محتاج بر دو داد مشغول
بود و ماند، در چنین حالتے اگر کسے بہ ورد سے مشغول باشد چہ ذوق یابد" (سیرالاولیاء ص ۲۲۴ ج)
ضرورت مند موجود ہوں ورد و وظائف میں دل کیسے لگے گویا کہ ان کے دکھ درد کا احساس مشغولہ
میں مانع رہتا ہے، اس ذکر کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ شعر بھی پڑھا تھا۔ ؎

در کوے خرابات دسراے او باش   منعے نہ بود بیاد بنشین و بباش

(۲۶) سجادۂ طریقت اس کے لیے ہے، جو متوکلانہ بسر کرتا ہے، مخلوق میں سے کسی سے
توقع نہیں رکھتا، اگر ایسا نہیں تو وہ لائق سجادۂ طریقت نہیں ہے مدعی دروغ زن ہے (۲۲)
آج اس کے برعکس عمل ہے، جو جتنا فراہمی زر میں مشغول ہے اور امراکی دریوزہ گری کرتا پھرتا
ہے، اتنا ہی وہ کامیاب سجادہ نشین ہے اور معزز و محترم ہے،

(۲۷) اے درویش بیماری اچھی چیز ہے، اس کی وجہ سے انسان گناہ سے پاک صاف ہو جاتا ہے (۹۲)
بیماری میں انسان اللہ کی طرف متوجہ ہوتا اور اسی کو فریاد رس سمجھتا ہے اس سے یقین کو
تقویت حاصل ہوتی ہے، اعتماد باللہ کو استحکام نصیب ہوتا ہے، جو بڑی اہم چیز ہے،

(۲۸) درویش کے روپ میں جو طلب دنیا میں مبتلا ہے، طلب جاہ و منزلت میں
کوشاں ہے وہ درویش نہیں وہ گمراہ ہے، اور گمراہی کے دشت و بیابان میں مارا پڑا پھرتا ہے (۶۲)
درویش صورت رہزن سیرت بہروپیوں سے دور ہی رہنا چاہئے، ان کے جال میں پھنسنا
خسر الدنیا والآخرۃ ہے جولانا روم نے فرمایا ہے، ؎

اے بسا ابلیس آدم روے است   پس بہر دستے نہ شاید داد دست

یہ ہیں معدودے چند جواہر پارے جو اسرار الاولیاء کے اوراق کی زینت ہیں، پوری کتاب
ایسے ہی جواہر پاروں سے مالا مال ہے، پوری کتاب میں کوئی ایسی روایت یا کوئی مقولہ ایسا نہیں

بہا مجموعہ ترتیب دے [illegible] اہلسنت کے خلاف [illegible]
حوادث روزگار سے دوچار رہنے کے باوجود اور چند مستندوں کی [illegible] کے باوجود
اسرار الاولیاء بے پناہ قدر و منزلت کی مستحق ہے، اور اس سے کیا کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے، اخلاق و معاشرہ کی اصلاح کے لیے اس میں وہ کچھ ہے، جو آج درکار ہے، اللہ پاک اکتساب سعادت کی توفیق عنایت فرمائیں، آمین ثم آمین۔

بعض اہم ترین روایتیں | کتب ملفوظات کا مطالعہ شاہد ہے کہ بظاہر کتب ملفوظات کی روش میں نمایاں فرق نہیں ہے، نقطۂ نظر ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے، کہ انسان قرآنی تعلیمات کی راہ نمائی کے سہارے خدا رسیدہ ہو جائے، جو واحد ذریعہ ہے خدا دوستی کا، اصلاح اخلاق، معاشرے کا سدھار، انسانی ہمدردی غرض جو بھی کچھ ہے، اسی کے فروعات ہیں، اسلام کا بنیادی نقطۂ نظر یہی ہے، جو کلمۂ لا الٰہ الا اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور جو کچھ ہے وہ اسی کی فروعات و ثمرات ہیں، صوفیائے کرام اسی روش پر کاربند رہے، جس کی بدولت معاشرہ میں سدھار آیا اور انسانیت نے فروغ پایا،

بہر حال جب کتب ملفوظات کو نظر تعمق سے مطالعہ کیا جاتا ہے، تو ہلکا سا امتیاز ملتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ جن ملفوظات کے سامعین میں کوئی ایسی شخصیت بھی ہے، جسے مخلوق کی خدمت و رہنمائی اور شیخ کی جانشینی کی ذمہ داری سونپنی ہے، تو ان میں کچھ ایسی روایتیں بھی ہیں کہ سطحی نگاہ ان کی کنہ کو نہیں پہنچتی، اور ان کی تفہیم سے وہ قاصر رہتے ہیں، جو ذوق تصوف سے لذت آشنا نہیں ہوتے، اور وہ تردد بے جا میں مبتلا ہو کر راہ حق سے دور جا پڑتے ہیں، وَاللّٰہُ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ۔

اسرار الاولیاء میں بھی ایسی روایتیں ہیں جن کی تفہیم سے خصوصاً مادہ پرست اذہان

قاصر رہتے ہیں ان ہی میں سے بعض کو پیش کیا جاتا ہے، اور مناسب محل طریق تفہیم کی یا اس کے پس منظر کی وضاحت اور ان نکات کی موشگافی کی کوشش کی جائے گی جو تفہیم میں قدرے حائل ہو سکتی ہیں چہ اصل تل او جبل پہاڑ کی مصداق ہیں،

روایت ۱: مولانا بدر الدین اسحاقؒ لکھتے ہیں:۔

"غلبات شوق میں حضرت باباصاحبؒ نے یہ حکایت بیان فرمائی کہ جب حضرت یوسفؑ نے حضرت زلیخا کو چاہا اور بلایا تو وہ آئیں لا انھوں نے دین یعقوب علیہ السلام کو قبول کیا اللہ پاک کی عبادت میں مشغول رہنے لگیں، کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت یوسفؑ نے ان سے خلوت چاہی تو وہ بھاگیں حضرت یوسفؑ نے ان کا پیچھا کیا اور پکڑ لیا، اور ان سے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ پہلے تو تم میرا پیچھا کرتی اور مجھے پکڑتی تھیں، اب میں چاہتا ہوں تو تم مجھ سے بھاگتی ہو، حضرت زلیخا نے کہا کہ اے یوسفؑ جب تو میں خدا سے ناواقف تھی، اور تمھارے سوا مجھے کسی سے محبت وانسیت نہ تھی لیکن اب میں نے رب کو پالیا ہے، اب میں اسی کی عبادت و پرستش میں لگی رہتی ہوں، مجاہدے سے مجھے مشاہدے کی نعمت نصیب ہو گئی ہے، اسکی محبت نے میرے دل میں گھر کر لیا ہے، اے یوسفؑ اب تم اور تم سے لاکھوں درجے افضل بھی کوئی ہو تو وہ بھی میری نظر میں سما نہیں سکتا، پھر جب مجھے اللہ سے محبت ہو گئی اور میں اس کی ہو گئی ہوں تو اگر میں کسی اور سے محبت کرنے لگوں تو میں دروغ گو اور جھوٹی ہوں، اور محبت میں یہ بات زیبا نہیں۔"

مقصد واضح ہے کہ اللہ کا ہونے کے بعد کسی اور کی چاہت یا طلب ہرگز مناسب نہیں یہی تو توحید خالص ہے اور نہ سچی محبت اس کی اجازت دیتی ہے، بیان واقعہ سے واقعہ ہی مراد نہیں ہوتا بلکہ اس کا اثر و نتیجہ بھی مراد ہوتا ہے، اس واقعہ سے مقصود استحکام محبت الٰہی کا اظہار ہے، اور بس

[illegible] روایات سے متعلق ہو اس [illegible] مصداق نہیں ہوتا [illegible] مسلمانوں کا [illegible]
یہ کہ کبھی اسکا اعتراف ہو اس روایت کو تاریخی و تفسیری کتابوں میں بجز تعینیت کی علامت ہو البتہ اسکا تعلق اسرائیلیات سے ہو جو قرون اولیٰ میں یہود جو مسلمان ہوگئے تھے وہ قصص القرآن سے متعلق اسرائیلی روایات کو بھی بیان کیا کرتے تھے لہٰذا اگر وہ روایات کفر و شرک کی آمیزش پاک ہیں تو انھیں اپنا لینے میں کچھ مضائقہ نہیں، ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

حَدِّثُوْا عَنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ وَلَا حَرَجَ،	بنی اسرائیل کی روایات نقل کرو اس میں کوئی حرج نہیں ہے،

اس ارشاد کی تعمیل میں ہمارے علماء مفسرین نے متعدد روایتیں بنی اسرائیل سے نقل کی ہیں، یہ بھی ان ہی میں سے ہے، سورۂ یوسف کی تفسیر پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں اس روایت کو اپنایا ہے، ہمارے مشائخِ کرام نے بھی اعتنا فرمایا ہے، برصغیر ہند و پاک کے سب سے پہلے مشہور و مقبول اسلامی مبلغ عالم درویش کامل حضرت داتا گنج بخش لاہوری رحمۃ اللہ علیہ (سید علی ہجویری) نے لکھا ہے،

"چوں یوسف با یعقوب رسید خداوند دیرا وصال یوسف کرامت کرد، زلیخا را جوان کرد و با سلام راہ نمود، و بزنی یوسف داد، یوسف قصد وے کرد، زلیخا از وے گریخت" (کشف المحجوب ص۲۶۲)

حضرت بابا صاحبؒ نے ذکر فرمایا جو عارف کامل اور بے مثل عالم شریعت و طریقت تھے، مولانا عبدالرحمٰن جامی نے مثنوی یوسف زلیخا میں کمال شستگی سے اس واقعہ کو بیان فرمایا ہے، یہ مثنوی مدارس اسلامیہ میں مدتوں سے داخل درس ہے، مولانا جامی وہ جلیل القدر عالم بلکہ عالم گر ہیں جن کی شرح جامی اسلامی درس گاہوں کے نصاب میں مدت مدید سے شامل اور آج تک داخلِ نصاب ہے، جسے پڑھ کر طالب علم عالم بنتے ہیں،

ہمارے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ ہمیں یہ روایت ثقہ بزرگوں سے پہنچی ہے، ہمیں اس سے بحث نہیں کہ یہ روایت آج یہودیوں کے علمی ذخیرے میں ہے، یا نہیں ہے، کیونکہ ردوبدل ان کی دیرینہ عادت ہے،

کی بدولت وہ کتاب مقدس توریت کو بھی محفوظ نہیں رکھ سکے ہیں، رب العلمین کا یہ ارشاد ہے
ہی کے یے یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ، اور قدیم علمائے یہود میں سے کسی نے انکار بھی نہیں
ہے، پھر ثقہ بزرگوں کی روایت کو ہر اعتبار سے ترجیح ہے، اس روایت کے متعلق اتنی ہی معلومات
سب ہے، جس سے اس کی نوعیت واہمیت واضح ہے۔

اس روایت میں کئی جملے ایسے ہیں جو روایت کی جان اور روح رواں ہیں اور ایسے ہی بزرگ
رمودہ ہو سکتے ہیں جو توحید وحق شناسی کی نعمت سے مالا مال ہوگا، ان جملوں کو دہرائیے اور ان کی
انیت اور کیف سے لطف حاصل کیجئے، عجب پُرکیف جملے ہیں۔

این زمان کہ حق تعالیٰ را بشناختم — در پرستش او مشغول شدم از مجاہدہ بشارہ اوتافتم
— چون مرا حق تعالیٰ الفت شد — اگر بعد ازیں با غیرے او الفت گیرم — مدعی
دروغ زن بودم —

یہی شواہد سراسر مونھ سے پکارے بول رہے ہیں کہ اسرار الاولیاء کا انتساب حضرت باباصاحبؒ
بلاشبہ صحیح اور درست ہے۔

ایت ۲ حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ ایک دفعہ یہ دعاگو حضرت خواجہ قطب الدین بختیارؒ
اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ کے ساتھ محفل سماع میں تھا، سماع ہو رہا تھا، دونوں بزرگ
ع میں محو تھے ایک شبانہ روز رقص فرماتے رہے، البتہ نماز کے وقت نماز پڑھ لیتے تھے کیف کے
ران میرا ہاتھ پکڑا اور محو کیف ہوگئے اور رقص فرمانے لگے، گانے والے جو قصیدہ گا رہے تھے
یہ تھا، ؎

من آں نیم کہ عشق تو پا سے لبس آرم — اگر بہ تیغ کشدم در تو نہ گزارم
مپرس ماز شب ہجران چگونہ می گزرد — مہاد ہیچ کسے را تو بیست دشوارم

من از جمالِ تو اے [illegible] ﴿ چو من نہ شد کہ گے دل ددا بہ گلزارم
اگر دہند بغیرِ د ابہشت با ہمہ چیز ﴿ بجز نہ خرم من کہ مت دیدارم

اس روایت سے یہ واضح ہے کہ اتباعِ شریعت ان حضرات کی طبیعت ثانیہ تھی، اور اتباع کا ملکہ ایسا راسخ اور پختہ تھا کہ کیسی ہی کیفیت ہو نماز بروقت ادا فرماتے تھے، جو بھی یہ روز گار ہے نماز دین کا ستون ہے، اگر ستون برقرار نہ رہے تو دین و ایمان کہاں، تصوف کی معراج یہی ہے کہ صوفی عاملِ شریعت ہو، اگر یہ نہیں تو خاک بھی نہیں، اس روایت میں بروقت نماز پڑھنے کی عملی ترغیب و تحریص ہے، ممکن ہے کہ بے نمازیوں کو اس سے وحشت ہوتی ہو، اور وہ اسے اقوال نامناسب میں شمار کرتے ہوں یا در ہوا شد نہ کے غلط معنیٰ سے کوئی متاثر ہو، جس کی وضاحت حاشیہ میں آچکی ہے۔ ورنہ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے سادہ وصاف ہے اعمال صوفیہ کے مطابق ہے،

روایت ۱۳ | حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ دعا گو اور برادرم مولانا بہاء الدینؒ (زکریا ملتانی) ایک جگہ بیٹھے ہوئے سلوک کی باتیں کر رہے تھے، ذرا دیر بعد برادرم مولانا بہاء الدینؒ اٹھ کھڑے ہوئے، زار و قطار رونے لگے اور کہا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن، میں نے کہا کیا بات ہے، انھوں نے کہا اٹھو اور دیکھو، میں اٹھ کھڑا ہوا، دیکھتا کیا ہوں کہ دروازۂ بغداد سے شیخ سعد الدین حمویہؒ کا جنازہ لائے ہیں، اور بغداد کی جامع مسجد کے سامنے نماز جنازہ پڑھ رہے ہیں (اسرار الاولیا ص۱۱)

یہ روایت سادہ وصاف ہے، اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے، البتہ سطحی علم رکھنے والوں کو دو اشکال لاحق ہو سکتے ہیں، ایک تاریخی اندراج سے متعلق اور دوسرا بصیرت باطنی سے متعلق، تاریخی خلفشار و اندراج کے متعلق یہ دو نکات ذہن نشین رکھنے چاہئیں (۱) اسرار الاولیا کا عہد تدوین ۶۵۵ھ تا ۶۶۴ھ ہے البتہ اس کتاب کے آغاز میں جو ۶۳۱ھ لکھا ہے وہ غلط اور تحریف شدہ ہے، (۲) شیخ سعد الدین حمویہؒ کے سال وفات کے متعلق حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشاد سے رہنمائی حاصل

---

[1] اسرار الاولیا ص ۹۰ ۔ مستغرق در ہوا شد نہ کے معنی ہیں کہ ذوق و شوق میں محو و مستغرق ہو گئے، یہ ترجمہ غلط ہے کہ اڑنا فرمانا کیا [illegible]

حاصل کرنی چاہیے، حضرت والا کا ارشاد ہے ا۔

اول شیخ سعد الدین حمویہؒ نقل کرد،	پہلے شیخ سعد الدین حمویہؒ نے انتقال
بعد از دو بسہ سال شیخ سیف الدین	فرمایا، ان سے تین سال بعد شیخ
باخرزیؒ ــــ بعد از دو بسہ سال	سیف الدین باخرزیؒ نے انتقال
شیخ بہاء الدین زکریا ــــ بعد از دو بسہ	فرمایا، ان سے تین سال بعد شیخ بہاء الدین
سال شیخ فرید الدین رحمۃ اللہ علیہم	زکریاؒ نے انتقال فرمایا، ان سے تین سال
(سیر الاولیاء، ص ۱۰ وج فوائد الفواد	بعد حضرت باباصاحبؒ نے انتقال
ص ۱۳۰)	فرمایا، رحمۃ اللہ علیہم۔

تذکروں میں جو سنین مرقوم ملتے ہیں، وہ عموماً سماعی اور خلاف تحقیق ہوتے ہیں، اسی لیے وہ مختلف بھی ہیں لہذا ان پر بلا تحقیق اعتماد نہیں کیا جا سکتا حضرت محبوب الٰہی کے ارشادات کے مطابق اور بروئے تحقیق حضرت باباصاحبؒ کا سنہ وفات ۶۶۴ھ ہے۔ ۶۶۲ھ وغیرہ سنین غلط اور بالکل غلط ہیں۔

شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا سنہ وفات بروئے تحقیق ۶۶۱ ہجری ہے جو حضرت محبوب الٰہیؒ کے مذکورہ بیان کے مطابق بھی ہے، ۶۶۶ھ غلط اور نہایت غلط ہے۔

شیخ سیف الدین باخرزیؒ کا سنہ وفات حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشاد کے مطابق اور حضرت باباصاحبؒ کے سنہ وفات کی مطابقت میں ۶۵۸ - ۶۶۳ھ ہے۔

شیخ سعد الدین حمویہؒ کا سنہ وفات بھی حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشاد کے مطابق اور حضرت باباصاحبؒ کے سنہ وفات کی مطابقت میں ۶۵۵ - ۶۶۰ ہجری ہے۔ سنہ ۶۵۰ھ یا ۶۵۵ھ یا ۶۶۰ھ غلط اور بالکل غلط ہے۔

ا۔ جونل آف پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی ۔۔۔ اگست ۱۹۵۱ء ص ۲۰۲ تا ۲۰۳ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۵۱ء ص ۱۹۲ تا ۱۹۴

حضرت محبوب الٰہی بصیرت باطنی سے مالامال اور کثیر المطالعہ بزرگ تھے، تذکروں میں موجودہ سنین کے غیر مستند ہونے کا یقیناً انھیں احساس تھا، تعجب نہیں کہ اسی احساس کی بنا پر ان بزرگوں کے انتقال کے باہمی فصل کا ذکر فرما دینا آپ نے مناسب سمجھا ہو اور جو کچھ آپ کے ارشاد کے مطابق ہے وہ حرف حرف صحیح ہے، تذکروں میں جو سنین لکھے ہیں، ان پر بلا تحقیق اعتماد نہیں کیا جا سکتا،

اسرار الاولیاء کے عہد تدوین سے متعلق تحقیق سے بتایا جا چکا ہے کہ اس کا عہد تدوین ۶۵۶ھ تا ۶۶۹ھ ہے، لہٰذا جن بزرگ کا انتقال ۶۶۰-۶۱ھ میں ہوتا ہے، تو ان کا ذکر ۶۵۶ھ تا ۶۶۹ھ کی نوشتہ کتاب میں ہونا صحیح اور بالکل صحیح ہے، اور اسرار الاولیاء میں شیخ سعد الدین حمویہؒ کی وفات کا ذکر صحیح اور برمحل ہے، اس میں اختلاف و تردد کی گنجائش نہیں ہے،

دوسری مشکل جو سطحی علم رکھنے والوں کو لاحق ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اور حضرت بابا صاحبؒ نے شیخ سعد الدین حمویہؒ کے نماز جنازہ کے منظر کو کیسے دیکھ لیا تھا، اس کا تعلق بصیرت باطنی سے ہے، مختصراً اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہے کہ یہ مشہور و معتبر روایت ہے کہ حضرت ساریہؓ سرزمین قبطیوں سے جنگ فرما رہے تھے، امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں جمعہ کی نماز کا خطبہ دیتے ہوئے فرمایا یا ساریۃ الجبل حضرت ساریہؓ حضرت عمرؓ کی آواز سے متنبہ ہوئے، پہاڑ کی طرف رخ کیا، جہاں قبطی چھپے ہوئے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ حضرت ساریہؓ اور ان کا لشکر آگے نکل جائے تو پیچھے سے یہ حملہ کریں، اور شکست خوردہ مصری فوج پلٹ کر مقابلہ کرنے لگے اس طرح گھیر کر اسلامی لشکر کو شکست دیدیں، واقعہ سے آگاہی اور حضرت ساریہؓ کو متنبہ فرمانا اور حضرت ساریہؓ کا یقین و اعتماد اور تعمیل ارشاد اسی پر شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ کی اور حضرت بابا صاحبؒ کی شیخ سعد الدین حمویہ کے واقعہ وفات سے آگاہی کو قیاس کر لینا چاہیے، ورنہ یہ تصوف کا اہم مسئلہ ہے تاوقتیکہ معرفت کے پردے مرتفع نہ ہوں اس کی حقیقت تک رسائی نہیں ہو سکتی، اس اشکال کے رفع ہونے کے بعد اس روایت کو درست مان لینے میں کوئی شے مانع نہیں رہتی،

(باقی آئندہ)

امام الحرمین عبدالملک جوینی

از جناب مولوی نصر احمد صاحب پھلواروی

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو معارف ستمبر ۱۹۶۶ء)

نظامیہ نیشاپور اور امام الحرمین کا درس

نظام الملک نے ہر شہر میں اہل علم کے لیے مدرسے اور کتبخانے تعمیر کئے، اور ان کے مصارف کے لیے ان پر جاگیریں وقف کیں[1]، پایۂ تخت میں اس کی نگاہِ انتخاب امام الحرمین پر پڑی اس لئے ان کے فیض درس کو عام کرنے کے لیے ایک بہت بڑا مدرسہ نیشاپور میں قائم کیا، اور اس کا نام نظامیہ رکھا، سلجوقی ذوقِ تعمیر میں بہت ممتاز سمجھے جاتے تھے، اس لئے نظام الملک کی تعمیرات بھی عجائبات میں شمار کی جاتی ہیں، اس کی مثال نظامیۂ اصفہان میں ایک مینارہ کا زینہ تھا، چنانچہ مینارہ پر جانے کے لیے اگر بیک وقت تین آدمی اس کی تین سیڑھیوں پر چڑھیں تو مینارہ کے اوپر پہونچنے تک ان میں سے کوئی دوسرے کو نظر نہیں آتا تھا[2]،

اب نیشاپور کے نظامیہ کا اسی سے اندازہ کیا جائے کہ اس میں فن تعمیر کے کیسے کیسے کمالات دکھائے گئے ہونگے، لیکن افسوس کہ امتداد زمانہ سے اس کا نام ونشان مٹ گیا ہے، صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ ایک پُرشکوہ عمارت تھی، اس کے ساتھ چمن، پارک اور تالاب و نہریں جاری تھیں، طلبہ یہاں مطالعہ اور مذاکرہ کرتے تھے، تالاب کی سیڑھیاں ستر تھیں، ابوالحسن علی الکیا ہراسی درس کے بعد تالاب کے کنارے استاذ کی تقریر زبانی یاد کرتے تھے، اور ہر سیڑھی پر اسے سات بار دہراتے تھے،[3]

---

[1] تاریخ دولۃ آل سلجوق ص ۵۰ [2] محاسن اصفہان ص ۱۰۲ [3] المنتظم ۹/ ۱۶۰، طبقات ۳/ ۲۰۲

جس زمین پر امام الحرمین کبھی ایک گوشے میں مسند درس بچھاتے تھے، وہاں اکناف عالم سے کشاں کشاں لوگ چلے آتے تھے، طوس سے امام غزالی کے ساتھ ایک جماعت آئی، نیشاپور کی تمام درسگاہیں ٹوٹ ٹوٹ کر اس سے مل گئیں، اور یہ عروس المعارات مدرسہ کعبۂ علم و فن بنگیا، امام کے درس میں منتخب اور مستعد طلبہ کبھی تین چار سو سے کم نہیں ہوتے تھے، ان ہی میں نظام الملک کا برادرزادہ عبدالرزاق طوسی اور وزارت اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد بھی نظر آتے تھے، امام غزالی، ابوالمظفر خوافی، ابوالحسن علی کیا ہراسی معید درس ہوتے تھے[1]،

امام نہایت خوش بیان تھے، ان کی درسی تقریر کافی طویل اور مبسوط ہونے کے ساتھ نہایت مرتب و مربوط ہوتی تھی، اپنے دلنشیں انداز بیان اور افہام و تفہیم کے خاص ملکہ کی وجہ سے مشکل اور ادق مباحث کو سادہ اور عام فہم کر دیتے تھے، درسی تقریر کا یہ انداز امام کے کمالات میں سے ہے[2]، ان کے والد کے ذکر میں بیان کیا گیا ہے کہ ان کو تدریس میں مہارت تام حاصل تھی، ابو محمد جرجانی کا بیان ہے کہ امام کے درس میں حاضر ہونے کے لیے خراسان، حجاز اور عراق کے لوگ شد رحال کر کے آتے تھے، ان کی وفات کے بعد بھی ان کے مسند درس کو اسی عظمت و شان سے باقی رکھنے کے لیے، اصحاب کمال کا انتخاب ہوتا تھا، ملک شاہ کے لڑکے سلطان سنجر کے عہد میں اس کے وزیر فخر الملک بن نظام الملک نے اس منصب کو قبول کرنے کے لیے امام غزالی کو دمشق خط لکھا، چنانچہ ذیقعدہ ۴۹۹ھ میں امام غزالی نے استاد کی جگہ نیشاپور کے مدرسۂ نظامیہ میں درس دینا شروع کیا اور ایک سال تک درس دیا[3]، اس سے قبل ابوسعید عبدالواحد قشیری پانچ سال تک یہاں درس دے چکے تھے، اور امام کے شاگرد

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبری ج ۴ ص ۲۵۲، یہ جس زمانہ کا ذکر ہے اس زمانہ میں نامور علما کے ہاں معمول تھا کہ جب وہ درس دے چکتے تو شاگردوں میں جو سب سے زیادہ لائق ہوتا تھا وہ باقی طالب علموں کو دوبارہ درس دیتا تھا اور استاد کے بتائے ہوئے مضامین کو اچھی طرح ذہن نشین کراتا تھا، یہ منصب جس کو حاصل ہوتا تھا اسکو معید کہتے تھے [2] ابن خلکان ۱/۵۱۵ [3] المنقذ من الضلال ص ۳۰-۱۲۵،

شیخ ابوالقاسم انصاری مدرسہ کی لائبریری کے نگران تھے[1]، اور چھٹی صدی میں ابوالمعالی مسعود بن احمد خوافی (م ۵۰۶ھ) اور ابوالمعالی قطب الدین مسعود (م ۵۰۸ھ) اور امام کے وابستگان میں سلطان سنجر کا وزیر عبدالرزاق طوسی (م ۵۱۵ھ) کے اسمار بھی شیوخ نظامیہ نیشاپور کی فہرست میں آتے ہیں[2]، یہاں ان کی روشنی ایسی پھیلی کہ دوسرے چراغ ماند پڑ گئے، ابن عساکر کا بیان ہے،

"دیگر حلقہائے درس خموش ہو گئے، کشورِ علم میں ان کی حکمرانی اور ان کے بے پایاں علم کے اثر سے فقہار اور علمار گوشۂ خمول میں جا چھپے اور اطراف و جوار علمی کساد بازاری کا شکار ہو گئے، اور امام کے مخصوص تربیت یافتہ محققین اور تلامذہ سے بازار علم آباد دبارونق ہوا،[3]

ع گئے سر ما چراغ ایسے کہ گُل بند ہو گئے ان میں

امام الحرمین کے مناظرے | مشاہیر اور چوٹی کے علمار ان سے مناظرے میں بند ہو جاتے تھے، مسئلہ خلق قرآن پر ایک فلسفی سے مناظرہ ہوا اس نے اپنے دعویٰ کو اس طرح مدلل کیا کہ علمار اس کی تردید نہ کر سکے لیکن امام نے ایک ایک کر کے اس کے تمام دلائل رد کر دیئے، اور مسلکِ حق کو اس طرح واضح کیا کہ حضرت شیخ ابوالقاسم قشیریؒ نے امام کی قدرت کلامی کی داد دی اور مسرت کا اظہار فرمایا[4]، علامہ تاج الدین السبکی نے مناظرہ کے وقت امام کے استحضار کو اس شعر میں بیان کیا ہے،

ابدا علی طرف اللسان جوابہ فکانما هی دفعۃ من صیب

یکبارگی برس پڑنے والی بارش کی طرح ہمیشہ ان کی نوک زبان پر جواب موجود ہوتا تھا،

۴۶۸ھ میں شیخ ابواسحٰق شیرازی نیشاپور آئے، وہ نظامیہ بغداد کے مدرس اعظم تھے، اور نیشاپور میں امام بھی موجود تھے، اسی تقریب سے نظام الملک نے مجلس مناظرہ آراستہ کی اور قصرِ وزارت میں

---

[1] طبقات ۴/۲۲۳ [2] ایضاً ۴/۲۵۲ - ۲۰۹-۲۰۸ [3] تبیین کذب المفتری [4] طبقات ۴/۲۵۳

سلے علم کے اور خورشید کا طلوع اسی سے ہو رہا ہے[1]

فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایسی جگہ پہونچ جائے جہاں اسکو سمت قبلہ کا پتہ نہ چل سکے اور نماز کا وقت ہو جائے تو وہ تحری کرے یعنی غور و فکر کر کے خود فیصلہ کرے جس سمت اس کا قلب مطمئن ہو اسی طرف رخ کر کے نماز ادا کر لے، نماز ادا کرنے کے بعد اگر اس کی تحقیق ہو جائے کہ اس نے قبلہ رخ نماز نہیں پڑھی تھی جب بھی نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، اگر نماز کی حالت میں معلوم ہو جائے یا خود اس کا ظن غالب دوسرے رخ کی طرف ہو جائے تو نماز ہی میں اس رخ کو مڑ جائے، اس مجلس میں امام اور شیخ کے درمیان یہی مسئلہ موضوع بحث ٹھہرا، امام کا خیال یہ ہے کہ تحری میں خطا کے یقین ہو جانے کے بعد اعادۂ صلوٰۃ واجب ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ استقبال قبلہ کے از شرائط صلوٰۃ ہے، جب شرط نہیں تو مشروط کا وجود بھی نہیں جس طرح وقت نماز کے شرائط میں سے ہے، اور وقت شروع ہونے سے قبل یا ختم ہونے کے بعد نماز پڑھنے کی صورت میں اعادہ واجب ہے،

اس کے بعد دوسرا مسئلہ زیر بحث آیا کہ ولی کے لیے باکرہ بالغہ کا نکاح کرنا اس کے بغیر اذن جائز ہے یا نہیں، اس مسئلہ میں شیخ ابو اسحاق کے نزدیک ولی بغیر اذن کے اس کا نکاح کر سکتا ہے، مگر امام الحرمین اذن کو ضروری قرار دیتے ہیں، دونوں بزرگوں میں دونوں مسئلوں پر خالص اصولی انداز سے طویل گفتگو ہوئی، ان دونوں مسئلوں پر امام کے مستقل رسالے بھی ہیں، یافعی نے لکھا ہے کہ اس مناظرہ میں امام کے تفقہ اجتہاد کا رنگ نمایاں رہا، یہ مناظرہ علماء کے بڑے اجتماع میں ہوا تھا بغداد سے شیخ کے ساتھ آنے والے یہ علماء تھے، فخر الاسلام ابو بکر شاشی، حسین بن علی طبری مصنف عدہ، ابن بیان مدرس بصرہ، ابو معاذ، ابو ثعلب الواسطی، عبد الملک شاہ خواشتی، ابو الحسن الآمدی، ابو القاسم الزنجانی، ابو بکر محمد بن علی المیانجی، ابو علی الفارقی، ابو العباس ابن الرطبی[2]

---

[1] ابن خلدون ۳/۲۴۰۳، ابن اثیر ۱۰/۲۳، تاریخ دولۃ آل سلجوق ۹۹ [2] مرآۃ الجنان ۳/۱۱۲ و طبقات ۳/۹۱

علمی مناظروں میں فتح کا علم ہمیشہ امام کے ہاتھ رہتا تھا، لیکن یہ بات ان کی طلاقت لسانی یا مناظرانہ داؤ پیچ کی وجہ سے نہیں ہوتی تھی، بلکہ اس میں ان کے علمی تبحّر اور زور استدلال کو دخل ہوتا تھا، اس لئے کہ جہاں تک طلاقتِ لسانی کا تعلق ہے اُن میں ایک خلقی نقص موجود تھا، جس کا اعتراف خود انھوں نے ذیل کے واقعہ میں کیا ہے، ایکبار کسی مناظرہ میں ان کی زبان لکنت زدہ ہوگئی اور رکنے لگی اسوقت انھوں نے اپنے ایام رضاعت کا واقعہ بیان کیا کہ ان کے محلہ میں ایک کنیز تھی، وہ ان کے ہاں پہونچی، ان کی والدہ کسی کام میں مصروف تھیں، وہ بھوک سے رو رہے تھے، اس کنیز نے اپنی گود میں لے لیا، اسی وقت ان کے والد شیخ جوینی آگئے، یہ دیکھ کر وہ سخت ناراض ہوئے، جسقدر دودھ پیا تھا قے کرا دیا، انکی زبان میں یہ خلقی نقص اسی شیر کنیز کا اثر ہے، ابن خلکان نے لکھا ہے کہ یہ کیفیت مناظرہ کی کئی مجلسوں میں دیکھی گئی،[1]

جامع منیعی میں امام الحرمین کا وعظ

محی السنۃ امام بغوی رحؒ کے استاذ حسان بن سعید المخزومی منیعی (م ۴۶۳ھ) نے نیشاپور میں عالیشان مسجد تعمیر کی، حسان تجارت کرتے تھے، اور ان کے تقوی وطہارت کی بنا پر سلطان الپ ارسلان ان کا مداح ہو کر کہتا، "میرے حدود سلطنت میں ایک بندہ خدا ہے جو مجھ سے نہیں اللہ سے ڈرتا ہے"[2] اس درویش صفت مرد کے اخلاص کی برکت سے نیشاپور کی اس جامع منیعی کو بڑی شہرت وعظمت حاصل ہوئی بیس سال تک شیخ الاسلام ابو عثمان الصابونی اس کے خطیب رہے[3]، ان کے بعد امام ہر جمعہ کو یہاں وعظ کہنے لگے، ان کے وعظ میں علم وحکمت کے درس اور بیش بہا معلومات کی فراوانی ہوتی تھی، اور طویل ترین مضامین کو اختصار وایجاز کے ساتھ بیان کرنا انکا امتیاز تھا، بیش پا افتادہ مضامین کو اس خوش اسلوبی سے بیان کرتے تھے کہ اس میں تاثیر اور دلکشی پیدا ہو جاتی تھی، امام نے سلطان ابو سعید ابوالخیرؒ

---

[1] ابن خلکان ۱/ ۵۱۶ [2] المنتظم ۸/ ۲۶۰، العبر ۳/ ۲۵۳ [3] طبقات ۳/ ۱۱۸

جیسے صوفی اور صاحب حال بزرگ کی صحبت میں پلی تھی، اس سے امام کو تصوف سے قلبی مناسبت تھی اور صوفیہ کے حالات سے انکو شغف تھا، انکا وعظ اگرکسی وقت خالص علمی ہوتا تھا، تو بعض وقت احسان و عرفان کی باتوں اور صالحین امت کے تذکروں پر بھی مشتمل ہوتا تھا، اس لئے وعظ میں مجمع پر بے خودی و وارفتگی طاری ہوجاتی تھی، وہ خود بھی روتے اور سب کو رلاتے،

ابن خلکان کا بیان ہے،

كان اذا شرع فى علوم الصوفية وشرح الاقوال ابكى الحاضرين[1]	صوفیہ کے علوم اور اقوال کی تشریح کرتے تو حاضرین کو رُلا دیتے،

تبیین میں ہے،

اذا شرع فى حكاية الاحوال وخاض فى علوم الصوفية فى فصول مجالسه بالغدوات ابكى الحاضرين ببكائه[2]	اپنی مجالس وعظ میں صوفیہ کے علوم اور ان کے حالات و مقامات کے بیان پر آتے تو خود بھی روتے اور سبھوں کو رلاتے،

شافعی مذہب میں امام الحرمین کا مرتبہ

شاطبی، محدث ابن الصلاح اور امام نووی نے کہا کہ جب تک کرۂ ارض اسلام اور مسلمانوں کے وجود سے روشن ہے، اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے، اور کوئی زمانہ مجتہدین سے خالی نہیں، چنانچہ صدر اسلام سے پانچویں صدی تک اصحاب اجتہاد کی طویل فہرست ملتی ہے، اور بقول حضرت شاہ ولی اللہؒ شافعی مذہب میں ایسے فقہاء ہر عہد میں موجود رہے ہیں جو اجتہاد کے اعلیٰ مراتب پر فائز تھے، پانچویں صدی میں امام الحرمین اسی طائفہ میں تھے، امام الحرمین کے مرتبہ کی تعیین کرتے ہوئے مورخین فقہ اسلامی نے ان کو مجتہدین منتسبین کی صف میں رکھا ہے،[3]

---

[1] اسرار التوحید فی مقامات الشیخ ابی سعید ۱۰۰، [2] ابن خلکان ا/۵ ۱۵ [3] تبیین ۲۸۰ [3] الانصاف فی بیان سبب الاختلاف ص ۲۰،

مجتہد کی تین قسمیں بیان کی جاتی ہیں، مستقل منتسب اور مجتہد فی المذہب، اجتہاد بالاستقلال اور بالانتساب کے لیے پانچ علوم میں کامل دسترس ہونی شرط ہے، کتاب اللہ، حدیث نبویؐ، مذاہب سلف، قیاس اور لغت، ان میں سے کسی ایک میں کمی کی بنا پر تقلید لازم ہوگی، ائمہ اربعہ چونکہ ان شرائط کے ساتھ اپنے اصول اجتہاد کی تدوین کی اور کسی دوسرے اصول کو قبول نہیں کیا ان کو مجتہد مستقل کہتے ہیں اور یہ اعلیٰ مرتبہ اجتہاد ہے، مجتہد منتسب، امام منسوب الیہ کے بعض اصول کی مخالفت بھی کرتا ہے لیکن اقوال و مسائل میں بیشتر کو قبول کرتا ہے، اور وہ اپنے اجتہادات کے دلائل کی تلاش اور ماخذ تک رسائی میں امام منسوب الیہ کے طریقہ سے روشنی حاصل کرتا ہے، اس کے مجتہدات و استنباطات اس امام کے نصوص سے مستفاد ہوتے ہیں،[۱]

فقہ اسلامی کا وسیع سرمایہ امام الحرمین کے احاطۂ علم میں تھا ان کے فتاوی کسی ایک مذہب کی جزئیات پر محدود نہ تھے، بلکہ ہر ایک مذہب کے مطابق جواب دیتے تھے، اور اپنی بالغ نظری اور وسعت معلومات کی بنا پر تمام ائمہ مجتہدین کے بارے میں اپنی مستقل رائے رکھتے تھے، امام محمدؒ، امام ابو یوسف امام مزنی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ مزنی کی تفریعات شافعی مذہب کے تابع ہوتی ہیں، وہ امام شافعی کی مخالفت نہیں کرتے، اور امام ابو یوسف اور امام احمد دونوں اپنے استاذ کے اصول کی مخالفت کرتے ہیں،[۲]

امام الحرمین میں تنقید و تحقیق کے جوہر کمسنی سے آشکار تھے، اسی بنا پر مکمل تقلید ان کو گوارا نہ تھی، فقہی مسائل میں علٰحدہ رائے رکھتے تھے، یہاں تک کہ بیس سال کی عمر میں وہ محققین میں شمار کئے جانے لگے،[۳] امام کے والد شیخ جوینی، صبح کی نماز میں دعائے قنوت میں اس قدر اضافہ کرتے تھے، اللھم لا تعقنا عن العلم بعائق ولا تمنعنا عنہ بمانع لیکن امام اسکو جائز

---

[۱] عقد الجید [۲] تہذیب الاسماء واللغات [۳] طبقات ۳/۲۵۲

نہیں سمجھتے تھے، ایک بار ابوالقاسم اسیاری اور امام نے شیخ جوینی کی اقتداء میں نماز فجر ادا کی، شیخ نے اس میں قنوت کے ساتھ یہ دعا بھی پڑھی ابوالقاسم اسیاری ایک رکعت کے بعد شریک ہوئے تھے، جماعت کے بعد فوت شدہ رکعت ادا کی اور اس میں قنوت کے ساتھ انھوں نے بھی دعا کا اضافہ کیا، نماز ختم کرنے کے بعد امام نے ان کو منع کیا، امام کا خیال یہ تھا کہ تعدیل ارکان بھی ایک رکن ہے، ماثورہ ادعیہ کے اندر اضافہ سے تعدیل میں طوالت ہوگی، اور یہ صحیح نہیں ہے سلف کی ایک جماعت ایسی صورت میں نماز کے باطل ہونے کی قائل ہے، غرض یہ مسئلہ مختلف فیہ رہا ہے اور اس بارے میں امام صاحب زیادہ محتاط ہیں لیکن ابوالقاسم نے اپنی تائید میں شیخ جوینی کا عمل بیان کیا اور امام سے کہا انت تحتاج علی کل احد حتی علی ابیک[1]

اس واقعہ سے آغاز شعور سے ہی امام کی بصیرت اور ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے، ابوالقاسم اسیاری کے الفاظ بھی تفردات امام کی شہرت کی دلیل ہیں، شیخ جوینی کی جانشینی کے زمانہ میں جب امام کے وسیع مطالعہ کا دور شروع ہوا اور والد کی ہر ہر تصنیف کا انھوں نے بنظر غائر مطالعہ کیا تو نہ صرف یہ کہ ان کے تسامحات کی نشاندہی کی بلکہ ان کے خطوط پر قائم نہ رہ سکے مسائل شرعیہ میں اپنی فکر پر مکمل اعتماد کیا، اور علم و تحقیق کے اس بلند منصب پر فائز ہوئے کہ تقلید و انقیاد سے کامل آزاد ہوکر مطلق اجتہاد کا دعوی کیا، محققین اور پایہ شناسوں نے امام کے اس دعوی میں صداقت کی شہادت دی، ابوالفداء نے کہا کہ امام الحرمین کے اندر اجتہاد مطلق کے شرائط و ارکان موجود تھے،[2]

واقعہ یہ ہے کہ امام کی علمی جامعیت اور جلالت شان کی بناء پر اس سے کسی کو انکار نہیں کہ وہ ان تمام اوصاف و کمالات کے حامل تھے، جو مجتہد مطلق میں پائے جانے ضروری ہیں

---

[1] طبقات ۳/۲۰۹ [2] ابوالفداء ۲/۱۹۰

لیکن یہ بھی حقیقت مسلمہ ہے کہ اجتہاد بالاستقلال کا دروازہ ذاتی طور پر ختم ہوگیا، لیل ونہار کی ہزار سالہ گردش میں ایک مجتہد ایسا نہیں پیدا ہوا کہ ائمۂ اربعہ کی طرح اس کی مستقل امامت پر پوری امت نے اتفاق کیا ہو اور ہر عہد میں علمار کی ایک جماعت نے اس کے مذہب کی اشاعت کی ہو، شاطبی نے اپنے زمانہ تک کے اس خلار کو دیکھ کر کہدیا کہ اجتہاد بالاستقلال عالم کے موجود رہتے معدوم ہو جائے گا[1]، اور ابن الصلاح اور امام نووی نے کہا کہ مستقل مجتہد کا دور چوتھی صدی میں ختم ہوگیا[2]، چنانچہ امام پر جب یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ اب بناءِ مذہب اور تدوین اصول کی ضرورت نہیں تو انھوںؒ نے شافعی اصول کو تسلیم کیا، اور مقلد ہو گئے، اس طرح فقہ اسلامی کے اندر مذہب خامس کی بنیاد تو نہ پڑی لیکن شافعی مذہب کو امام کی ذات سے تائید حاصل ہوئی، اور ان کے اجتہادات نے فقہ شافعی میں وسعت اور نمو پیدا کی۔

امام غزالی پر امام الحرمین کے اثرات

امام غزالی کو اپنے اساتذہ میں جتنی طویل صحبت امام کی میسر رہی اور کسی کی نہیں، طوس سے امام غزالی کے روانہ ہوتے وقت ان کی قابلیت اس حد تک پہونچ چکی تھی کہ وہ طوس کی درسگاہوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے، ان کی بے پایاں علمی تشنگی، جس بحر بیکراں کی متلاشی تھی وہ نیشاپور میں بہ رہا تھا، وہ آستانۂ امام پر حاضر ہوئے اور ان کے کعبۂ فضل وکمال کا برابر طواف کرتے رہے، امام کے سفر آخرت کے بعد نظامیۂ بغداد کے مدرس ہو گئے اس لئے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام غزالی کی اولین تربیت میں امام الحرمین کو مرکزی حیثیت حاصل تھی، خصوصاً مجاہدہ وریاضت اور ترک وزہد کی عزلت گزینی سے قبل امام غزالی کے فکری ارتقار میں امام کا اثر کارفرما رہا۔

امام الحرمین کی فقہی تصنیفات میں شافعی مذہب کی تائید وحمایت غیر معمولی ہے امام نے

---

[1] الموافقات [2] آداب الفتیا شرح المہذب

تھا کتاب "منخول فی علم الاصول" جو مذہب شافعی کی مذہب فقہ پر ... ہے ...
یکسا خلاف ... کہ اس کا پڑھنا تو امام غزالی کی "منخول" ہے، اس میں امام غزالی نے
سے بڑھ کر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر نہایت سختی سے حرف گیری کی ہے یہاں تک کہ امام کے
...وفی صد مسائل کو غلط قرار دیا ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ امام غزالی جب یہ کتاب لیکر استاذ کی خدمت میں آئے تو مطالعہ کے بعد فرحت و انبساط اور حیرت و استعجاب کے ملے جلے جذبات میں امام کی زبان سے یہ الفاظ نکل پڑے،

دفنتنی و انا حی هلا صبرت حتی اموت[1]۔ تم نے تو مجھ کو زندہ در گور کر دیا، میری موت کا انتظار کیے ہوتے" بعض وقت فرط خوشی میں خوردوں کے حق میں بزرگوں کے کلمات تحسین عام متعارف الفاظ سے ہٹ کر ہوتے ہیں، مثلاً کوئی بزرگ اپنے عزیز سے کہے کہ میاں تم نے تو وہ کمال کر دکھایا کہ اب میری ضرورت نہیں، امام کے یہ کلمات اسی قبیل سے ہیں، اصول فقہ میں امام غزالی کی یہ پہلی تصنیف ہے، جو نظامیہ نیشاپور کے قیام کے زمانہ میں لکھی گئی ہے، امام غزالی نے احیاء العلوم میں حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مدح کی ہے اور ان کی شان میں تعریف کرنے سے اپنی برأت کی ہے، لیکن چونکہ "منخول" میں اس کے بالکل برعکس، امام صاحب کو تعریض کا نشانہ بنایا ہے، اور یہ بات ان کے عام مزاج تحریر کے خلاف بھی ہے، اس لئے لوگوں نے اس کتاب کو ان کی فہرست تصنیفات سے خارج کر دینا چاہا کہ وہ امام غزالی کی تصنیف نہیں ہے، یا وہ عبارتیں الحاقی ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب امام غزالی کے ابتدائی دور کے خیالات و افکار کی ترجمان ہے اور اس فکر کا آئینہ ہے، جس کی تربیت امام الحرمین کے درس میں ہوئی تھی۔

حضرت امام غزالیؒ اپنے اساتذہ کا ذکر نہیں کرتے، جہاں شیوخ و اساتذہ کا ذکر ناگزیر ہوتا ہے

---

[1] کنوز الاجداد (ابن کرد) ۲۰۳، ۲۰۲ - ۲۰۲

بعد میں بھی پھر بجا جاتے ہیں، چنانچہ اپنی سرگزشت حیات میں عبادت و ریاضت، مجاہدہ و مراقبہ کے بیان کے وقت بھی محتاط الفاظ میں یہ کہکر بڑھ جاتے ہیں کہ کنتُ حصّلتُہ من علم الصوفیۃ[1] حد متعین یک زبان ہیں کہ وہ شیخ ابو علی فارمذی کے دست گرفتہ تھے، جس طرح وہ باطنی علوم و کیفیات میں اپنے شیخ کے سپاس گذار نہو سکے ظاہری علوم میں بھی استاذ امام الحرمین کو فراموش کر گئے،

حضرت امام غزالی کی کتاب حیات کا یہ بہت واضح باب ہے، جس سے "سر العالمین" کے ان کی طرف غلط انتساب کا عقدہ کھل جاتا ہے، کیونکہ اس کو لکھنے والے نے جا بجا امام الحرمین کا اس انداز سے ذکر کیا ہے، جیسے ایک شاگرد اپنے استاذ کا ذکر کر رہا ہو، مگر چونکہ یہ انداز امام صاحب کی عام عادت کے خلاف ہے، اس لئے یہی امر اس کتاب کے جعلی ہونے کی کافی دلیل ہے،

امام الحرمین نے امام غزالی کی جس انداز سے تربیت کی تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ استاذ نے شاگرد کو فقیہ کہا امام غزالی نے اس کو اپنے لئے سند و اجازت سمجھا اور یہ خیال کیا کہ جلد ہی مسند فقہ و افتا ان کے لئے پابوس ہونے کو ہے، لیکن امام الحرمین نے اس کے بعد ایک بند حجرہ کھولنے کا حکم دیا جو کتابوں سے اٹا تھا، اور فرمایا۔

ما قیل لی یا فقیہ حتیٰ اتیتُ	ان تمام کتابوں کی ورق گردانی کے بعد
علی ھذہ الکتب کلھا[2]	مجھکو فقیہ کہا گیا،

یعنی تفقہ و اجتہاد اس قدر آسان نہیں، جو اس دفتر کو اپنے سینے میں محفوظ کرلے وہ فقیہ ہے،

اس واقعہ سے امام الحرمین کے علمی تبحر کے ساتھ ان کے طریقۂ تعلیم اور طلبہ کی تشویق و ترغیب کے نہایت موثر انداز پر روشنی پڑتی ہے،

حلقۂ تدریس علوم و فنون کے اس تابناک و بے مثال عہد میں جب کہ کاروان علم کے حدی خوانوں[3]

۱؎ المنقذ من الضلال ص ۲۲ ۲؎ طبقات ۳/۲۵۹

دمشق و حمص فقہ و حدیث تھے، آستانہ امام پرجیہ سال کے بیٹے علی سفرائنام رہتا تھا، شام کے فقیہ شیخ ابوالفتح نصر مقدسی کا (م ۴۹۰ھ) جن سے امام غزالی نے دمشق میں علمی استفادہ کیا،[1] اور جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جو بلند مرتبہ ان کو اپنے عہد میں ملا سلف کا زمانہ پاتے تو اس وقت بھی بے کم و کاست اسی قدر و منزلت کے مستحق ہوتے، ان کے ایک شاگرد و بلاد اسلامیہ کی علمی سیاحت کے دوران امام الحرمین کے ہاں آئے اور اس پیکر علم سے اپنے دیدۂ شوق کو روشن کیا،[2]

امام کا فیضانِ درس شعاعِ آفتاب کی طرح ملک کے گوشے گوشے میں پہونچا اور خراسان کے علاوہ عراق، حجاز، شام اور پوری مملکتِ سلجوقیہ کے امام الحرمین تاجدارِ علم تھے، امام کے قلمرو درس اور سلجوقی حکومت کی سرحدیں ایک دوسرے سے متوازی تھیں، ان کے نامور تلامذہ کے علاوہ وہ علما جو امام کے مدرسہ میں مقیم ہوکر ان کے درس میں شریک ہوتے رہے اور جنھوں نے آپ سے سندِ تلمذ حاصل کیا تھا، ان کی تعداد چار سو ہے، اور یہ تمام لوگ اپنے وقت کے منتخب اور ممتاز علماء ہیں، ان ہی میں عبدالغافر فارسی ہیں، ان کی کتاب تاریخ نیشاپور، طبقات الشافعیۃ الکبریٰ اور دوسری کتب طبقات و تاریخ کا اہم ماخذ ہے، سلاجقہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ مذہبی صیغوں اور علمی معاہد پر امام الحرمین کی تیار کردہ جماعت فائز رہی،

سفر اصفہان اور بغداد کا دوسرا سفر

نیشاپور کی مسند درس پر امام الحرمین کے جلوس کے ساتھ ہی ساری علمی دنیا ان کی طرف سمٹ آئی اور اس طباشیر صبح میں کواکب و نجوم کی تابانیاں ماند پڑ گئیں، چنانچہ اس شہرت و مقبولیت نے مخالفین کی ایک جماعت پیدا کر دی اور امام کی علمی خدمات میں رکاوٹیں پڑنے لگیں، اس وقت سلجوقیوں کا پایۂ تخت، اصفہان منتقل ہو چکا تھا، اور نظام الملک کا قیام اصفہان میں تھا، امام نے اصفہان کا رخ کیا، نظام جو امام کا نیاز مند قدیم تھا

---

[1] شذرات ۳/۲۹۵ [2] طبقات ۴/۲۸

ں نے خیر مقدم کیا وہاں قلیل قیام کے بعد امام نیشاپور واپس آئے ،

اسی زمانہ میں شہر دبوسیہ[۱] کے ایک جید عالم اور فقیہ سید ابوالقاسم علی بن مظفر دبوسی نیشاپور
ئے اور امام کی علمی مجلس میں کسی مسئلہ پر ان سے بحث ہوگئی، اور اس بحث نے ناگوار فضا پیدا
ردی، وہ نیشاپور سے اصفہان روانہ ہوگئے، اتفاق یہ کہ اس کے بعد ہی امام کا سفر ہوا اور اصفہان
ں ان دونوں میں مناظرہ ہوا، اصفہان سے مراجعت کے بعد امام، فقہ میں اپنی مشہور کتاب "
نہایۃ المطلب فی درایۃ المذہب" کی تصنیف میں مصروف ہوگئے۔[۲]

ابن العماد نے امام کے دوبارہ بغداد جانے کا ذکر کیا ہے، لیکن دیگر مؤرخین اور عبدالغافر
ارسی جو امام کے شاگرد ہونے کی وجہ سے زیادہ قابلِ اعتماد ہیں، اس سفر کے بارے میں خموش
ں، ابن العماد کے سہو قلم سے نظامیۂ نیشاپور کی جگہ نظامیۂ بغداد کا ذکر آگیا ہے، اور نیشاپور کی
دریس، وعظ و خطابت، مذہبی امور کی افسری بغداد کے حالات میں آگئے ہیں لیکن واقعہ یہ ہو کہ نظامیۂ بغداد سے
کا تعلق نہیں رہا، یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ نظامیۂ بغداد کا وہ منصب جس پر اس عہد کے مشاہیر اور ممتاز علماء فائز ہوتے رہے امام کیوں خالی رہا،
دراصل امام مدرسہ کی بنیاد پڑنے سے قبل نیشاپور آچکے تھے، جشنِ افتتاح کے وقت بھی بغداد میں
موجود نہیں تھے، اور پھر مستقل قیام نیشاپور میں رہا، یہاں امام کے لیے مدرسہ بنا اس میں بیٹھ کر امام نے
ی عہد آفریں شخصیتوں کی تعمیر و تشکیل کی جو شیوخ نظامیۂ بغداد بن کر چمکے، امام کے علمی اخلاف امام غزالی کیا ہراسی
ور دوسرے تلامذہ جن کی ایک طویل فہرست ہے وہ نظامیۂ بغداد کے مسند نشین ہوتے رہے،[۳]

سلجوقی حکومت میں امام کا منصب اور امور مذہبی کی سرپرستی

دولت سلجوقیہ میں امام کے جیسا اعتماد شاید ہی کسی کو حاصل ہوا ہوگا،
اوقاف اور دیگر امور مذہبی کے رئیس تھے تمام مذہبی کام امام کی ہدایات
ے مطابق انجام پاتے تھے پورے ملک سے استفتے ان کے پاس آتے تھے، ان کے فتاوی علماء کے لئے

---

[۱] شہر بخارا اور سمرقند کے درمیان ہے، [۲] طبقات الشافعیہ، [۳] مرآۃ الجنان ۳/ ۱۱۹

تھی ملاقات کا ذریعہ ہو سکتے تھے، یہ آپ کے علم اور فضیلت کے سبب سے نظام الملک کا احترام
کر دیتے تھے، ایک مرتبہ سلام کی حق گوئی اور شخصیت کی عظمت سے اس کے دل پر نقش ہو جاتی ہے۔

ایک بار ۲۹ رمضان کی شام کو نیشاپور میں چاند نظر نہیں آیا، لیکن بعض شاہی مصاحبوں نے ملک شاہ کو چاند نظر آنے کی خبر دی اور بادشاہ کے فرمان کے مطابق نقارہ بج گیا، اور شامِ عید سے شہر گونج اٹھا، چونکہ امام کو عدم رویت کی صحیح خبر تھی، اور یہ اعلان جھوٹی شہادت پر مبنی تھا، امام نے منادی کرا دی کہ آج چاند نہیں دیکھا گیا اس لئے کل ۳۰ رمضان ہے، شاہی اعلان کے بعد بالکل اس کے خلاف امام الحرمین کی طرف سے منادی سنی گئی، اس کے بعد ان جھوٹی گواہی دینے والوں کو اپنی خیر نظر نہ آئی، ان لوگوں نے ملک شاہ کے پاس پوری شد و مد کے ساتھ امام کے خلاف باتیں پہونچائیں کہ امام حکم شاہی کے خلاف کرتے ہیں اور عوام ان کے اطاعت کیش ہیں، یہ بات سلطنت کے لیے ہرگز خوش آیند نہیں ہو سکتی، ملک شاہ کے غیظ و غضب کے لیے اس قدر کافی تھا لیکن ملک شاہ مذہبی مسائل کا لحاظ کرتا تھا، اس نے امام کو طلب کیا، اُس وقت شاہی ملاقات کے لیے لباس مخصوص ہوتا تھا، امام عام لباس میں پہونچے مصاحبوں نے یہاں بھی بادشاہ کو برانگیختہ کیا کہ امام سادہ لباس میں آئے، ملک شاہ نے حاجب کے ذریعہ دریافت کیا کہ سادہ کپڑے میں کیوں آئے؟ امام نے اپنی جگہ سے بآواز بلند کہا کہ سلطان کو براہِ راست مجھ سے دریافت کرنا چاہیئے، غرض ملک شاہ سے بالمشافہ گفتگو کی اور فرمایا کہ جس لباس میں میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہوں اسی لباس میں تمھارے سامنے آیا ہوں، میں اسی کپڑے میں نماز پڑھتا ہوں اور نماز ادا ہو جاتی ہے، اُس کے بعد ملک شاہ نے کہا کہ آپ نے میرے فرمان کے خلاف اعلان کر کے میری عدول حکمی کی، امام نے فرمایا کہ جو امور فرمانِ سلطان پر موقوف ہیں، ان کی اطاعت مجھ پر

لہ طبقات (جدید ایڈیشن) ج ۵/ ۱۷۰

مسائل کے علاوہ خالص مذہبی اور شرعی امور فتوی سے متعلق ہیں، ان کے بارے میں تم کو بے شک معلوم کرنا چاہیے کیونکہ علماء کے فتاوی شاہی احکام کے برابر ہوتے ہیں، روزہ رکھنا اور افطار کرنا یہ فتوی پر موقوف ہے، تم کو اس سے کوئی تعلق نہیں، امام کی اس تقریر سے سلطان کی ناراضی ختم ہو گئی، ملک شاہ نے امام کی جرأت حق گوئی سے خوش ہو کر ان کو عزت و احترام کے ساتھ رخصت کیا، اور دوسرا اعلان کیا کہ میرا فرمان غلط تھا، امام الحرمین کا اعلان صحیح ہے[1]

امام الحرمین اور علم کلام

امام کے زمانہ میں علم کلام کی عمر تین سو برس ہو چکی تھی لیکن اس مین فنی اور علمی حیثیت سے بہت سی خامیاں ابتک باقی تھیں، شروع میں علم کلام کے دو حصے تھے، ایک وہ جو قرآن وحدیث کے نصوص کے ذریعہ اسلامی فرقوں کے شبہات کے ازالہ اور انشراح واطمینان قلبی کے لیے تھا اور دوسرا وہ جو فلسفہ کے ذریعہ غیر قوموں کی موشگافیوں اور نکتہ چینیوں کے سد باب کے لیے، چوتھی صدی کے آغاز میں امام ابو الحسن اشعری اور امام ابو منصور ماتریدی نے ایک ایسے نئے علم کلام کی طرح ڈالی جس کی اصل نقل پر تھی، لیکن فلسفہ کے بعض اعتراضات کے جوابات بھی شامل ہوئے، اور فلسفہ کی رعایت سے بعض اصول ونظریہ مین تبدیلی آئی، مثلاً رویت باری کا مسئلہ کہ ارباب نقل، رویت کے قائل تھے اس کے ساتھ عرش پر اللہ تعالیٰ کے متمکن ہونے ذوجہت اور قابل اشارہ ہونے کو بھی جائز کہتے تھے لیکن اربابِ عقل، فلاسفہ اور معتزلہ سرے سے اس مسئلہ کے منکر تھے،[2]

رویت باری تعالیٰ پر قرآن ناطق ہے، امام اشعری کا مسلک یہ ہے کہ رویت حق ہے لیکن اللہ تعالیٰ متحیز، ذوجہت اور قابلِ اشارہ نہین ہے، چونکہ عقلی دلائل سے وہ اس کو تسلیم کر چکے تھے کہ تحیز حدوث کا خاصہ ہے، اور خدا حادث نہیں بلکہ ازلی وابدی ہے،[3] اس طرح وہ اربابِ

---

[1] اخلاق جلالی علامہ جلال الدین محقق دوانی، [2] علم الکلام علامہ شبلیؒ [3] شرح مواقف

نقل کی طرح اللہ تعالیٰ کے دیدار کو حق سمجھتے ہیں، اور فلسفہ کے مطابق لوازم رویت یعنی متحیز ہونے اور قابل اشارہ ہونے کا انکار بھی کرتے ہیں، اس مسئلہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اشعری کلام، سابق دونوں کلام کے درمیان تھا، امام اشعری اور امام ماتریدی کے قدرے نظریاتی اختلاف سے اس کلام کے بھی دو اسکول ہوگئے، اشعری اور ماتریدی اور تقریباً تمام اہل سنت و الجماعت انہی دونوں کے پیرو ہوگئے۔

اگرچہ عباسیوں کے دور اقبال میں علم کلام کی جو پذیرائی اور عزت افزائی ہوئی بعد کو نہ ہوسکی، لیکن خالص علم و فن کی ترقی کے لحاظ سے اس کے لیے امام کا عہد مبارک و مسعود ہے، چوتھی صدی میں علم کلام کے اصول پر قرآن مجید کی تفسیریں لکھی گئیں اور اس کے بعد پانچویں صدی میں ایسے افراد پیدا ہوئے، جنھوں نے اس فن کو غیر معمولی ترقی دی یعنی امام الحرمین، امام غزالی، عبدالکریم شہرستانی، علامہ ابن حزم بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس جماعت نے اپنی تشریحات و توضیحات اور حذف و اضافہ سے اس علم کو مکمل کردیا تو شاید خلاف واقعہ نہ ہوگا، کیونکہ اس کے بعد اس فن میں اضافہ نہ ہوسکا، اور آج تک امت کے پاس علم کلام کا جو مفید اور کارآمد سرمایہ ہے، وہ ان ہی اسلاف کا ترکہ ہے۔

امام ابوالحسن اشعری کے وقت میں علم کلام میں فلسفہ کی آمیزش نہیں ہوئی تھی، ابوبکر باقلانی غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے فلسفہ کے چند مسائل کو کلام میں جگہ دی، مثلاً جوہر فرد ثابت ہے، خلاء ممکن ہے، عرض، عرض کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا، عرض دو زمانہ تک نہیں رہ سکتا، [1] اور اور ان کے بعد امام الحرمین نے اس طریقہ کو اختیار کیا، اور اپنی تصنیفات میں فلسفہ کے مسائل کثرت سے بیان کیے، اور خاص اس فن میں ضخیم اور عظیم کتابیں لکھیں، ان میں ایک "الشامل" اور

---

[1] مقدمہ ابن خلدون

اس کی مختصر الارشاد ہے، یہ کتاب اپنی افادیت کی بناء پر اس قدر مقبول و متداول ہوئی کہ دو صدی بعد تک نصاب درس میں داخل رہی، امام رازی نے اسکو انہماک اور کمال ذوق وشوق سے پڑھا اور بقول ابن خلکان پوری کتاب حفظ کی،[1] امام صاحب نے اصول فقہ میں اپنی دیگر تصنیفات "البرہان" وغیرہ میں بھی ان مسائل کو بیان کیا۔

علم کلام کے وہ مسائل جن کی حیثیت اصول اور بنیاد کی ہے ان میں ایک "حدوث عالم" ہے، یہ مسئلہ وجود صانع اور صانع کے فعل خلق و ایجاد پر دلیل ہے اس لئے امام الحرمین نے اس مسئلہ کی طرف خاص توجہ کی ہے، اور تمام مسائلِ کلامیہ میں اس کو مقدم رکھا ہے، اپنی ایک کتاب کی ابتداء میں لکھتے ہیں۔

ثم مایقتضیہ الترتیب ان	ترتیب مسائل کا اقتضا ہے کہ حوادث کی
نبتدی الکلام عن الحوادث	بحث سے ابتدا کی جائے اس لئے کہ اللہ
اذ القدیر سبحانہ وتعالیٰ	سبحانہٗ تعالےٰ کا علم اضطراری طور پر نہیں
لا یُعلَم اضطراراً وانما	حاصل ہوتا بلکہ اس کی معرفت نظری
یتوصل الی معرفتہ نظراً و	واستدلالی ہے، اور مسئلۂ حوادث کے
استدلالاً وسبیل الاستدلال	تمام وکمال احاطہ کے بغیر استدلال کا
لا ینفع الا بالاحاطۃ بالحوادث	طریقہ روشن نہیں ہوتا اس لئے کلام کی
فاقتضی ذٰلک البداءۃ	ابتداء اس بحث سے ناگزیر ہے،
بالکلام علیھا[2]	

امام نے اپنی تین کتابوں میں اس مسئلہ کو اشعری مذہب کے مطابق بیان کیا ہے اور اسکی

---

[1] ابن خلکان ۲/ ۲۶۶ [2] الجوینی ۱۳۳، ڈاکٹر فوقیہ،

مکمل تائید کی ہے اس کے علاوہ "العقیدۃ النظامیہ" میں بھی انھوں نے نئے انداز سے اس پر بحث کی
اس کو سمجھنے کے لیے پہلے فلاسفہ، معتزلہ اشاعرہ کے نظریات مختصراً معلوم کر لینا مناسب ہوگا۔

اکثر فلاسفہ قدم عالم کے قائل ہیں ان کے نزدیک موجودات کی اصل ہیولیٰ ہے، جو قدیم مادہ ہے، اور اس مادہ سے عالم کا وجود اسی طرح ہوا ہے، جس طرح علت سے معلول موجود ہوتا ہے، اس لئے قدیم الاصل ہونے کی بنا پر عالم قدیم ہوا اور بعض فلاسفہ کے نزدیک عالم کی اصل ہیولیٰ کے بجائے دوسری چیزیں مثلاً قدمائے خمسہ وغیرہ ہیں لیکن قدیم ہونے کا مفہوم تمام فلاسفہ کے نزدیک مسلّم ہے،

اہل حق یعنی اشاعرہ اور ماتریدیہ، موجودات کو قدیم نہیں، بلکہ حادث کہتے ہیں، اور حادث کے معنی ان کے یہاں کسی چیز کا عدم سے وجود میں آنا ہے، پس جس چیز کا کسی زمانہ میں وجود نہیں تھا، اب موجود ہو گئی تو وہ حادث ہوئی نہ کہ قدیم، وہ موجودات کے لئے کوئی اصل قدیم نہیں مانتے بلکہ عدم محض سے وجود کے قائل ہیں، ان کے نزدیک موجودات کی دو قسم ہے، عرض اور جوہر اور یہ دونوں حادث ہیں جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے وجود میں آئے، ماحصل کلام یہ ہے کہ فلاسفہ کے ہاں عالم قدیم ہے، اور اہل سنت والجماعت کے نزدیک حادث،

امام ابوالحسن اشعری حدوثِ عالَم کے ثبوت کے لئے آفاق و انفس اور وجود انسانی سے مثال دیتے ہیں کہ انسان کو ہم پہلے کمسن بچہ پھر جوان اور ایک عرصہ کے بعد بوڑھا دیکھتے ہیں، وہ اپنے بچپن سے پیری کی عمر تک اپنی مرضی اور کسب و ارادہ سے نہیں پہونچتا، اگر ایسا انسانی اختیار سے ممکن ہوتا تو وہ بوڑھا اپنی جوانی اور بچپنے کو پھر پلٹ آئے لیکن ابتدائے آفرینش سے آج تک ایسی کوئی مثال نہیں ملتی، اس سے معلوم ہوا کہ ہم سے مخفی مگر ہم سے بہت قریب ایک ایسی قادر مطلق اور مختار کل ذات ہے، جس کی کرشمہ سازی سے گردش لیل و نہار اور کائنات کے تمام کام ظہور پذیر ہیں، اس تمثیل سے امام اشعری نے انسانی عجز و درماندگی کے ذریعہ عالَم کا حدوث اور اللہ تعالیٰ کی خالقیت

وحدانیت دونوں باتیں ثابت کر دی ہیں،

عالم کے لغوی معنی " الخلق کلہ" یا ماحواہ بطن الفلک" ہے۔ مگر قدیم متکلمین کی اصطلاح کے مطابق ذات واجب الوجود کے سوا سارے موجودات کو عالم سے تعبیر کیا جاتا ہے، "کل موجود سوی اللہ تعالیٰ" اور متاخرین نے اس کی تعریف جوہر اور عرض سے کی ہے متقدمین ومتاخرین کی ان تعریفات میں کوئی معنوی اختلاف نہیں ہے کیونکہ تمام موجودات کا وجود کسی ایک وجود بخشنے والی ہستی کا محتاج ہے، اور جواہر واعراض بھی ایسے ہی موجودات ومحدثات ہیں،

امام الحرمین نے اپنی جن چار کتابوں میں حدوث عالم کا مسئلہ بیان کیا ہے ان کے نام یہ ہیں (۱) لمع من الادلۃ فی قواعد عقائد اھل السنۃ والجماعۃ (۲) الارشاد الی قواطع الادلۃ فی اصول الاعتقاد" (۳) الشامل فی اصول الدین (۴) العقیدۃ النظامیۃ، اول الذکر تین تصنیفات کا مقصد فلاسفہ اور معتزلہ کی تردید اور اشاعرہ کی تائید وحمایت ہے، چنانچہ کتاب اللمع اور الارشاد میں عالم کے اصطلاحی معنی متکلمین کی دونوں جماعتوں قدماء ومتاخرین کے نقطۂ نظر کے مطابق اس طرح بیان کرتے ہیں،

العالم ھو کل موجود سوی اللہ تعالیٰ وصفۃ ذاتہ ثم العالم جواھر واعراض۔	اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے علاوہ کل موجودات عالم ہیں اور عالم جواہر واعراض بھی ہیں،
ما العالم ولم سمی العالم عالما قلنا العالم عند سلف الامۃ عبارۃ عن کل موجود سوی اللہ تعالیٰ وعند خلف الامۃ	اگر یہ سوال کیا جائے کہ عالم کیا ہے؟ اور اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے تو یہ جواب دیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمام موجودات کو سلف کے نزدیک عالم کہتے ہیں

عبارۃ عن الجواھر والا — اور خلف کے ان جواہر و اعراض کا نام

عراض۔[1] — عالم ہے،

علم کلام کے مصطلحات شئ، موجود، جوہر اور عرض کی بحث میں معتزلہ اور فلاسفہ کی پوری تردید ملتی

عالم کی تعریف امام کے الفاظ میں | امام نے عالم کی نئی تعریف اپنے الفاظ میں یوں کی ہے،

اجسام محدودۃ متناھیۃ — محدود اور اختتام پذیر اجسام

المنقطعات

یعنی عالم ایسے موجودات کا نام ہے، جو ظاہری و محدود حجم وجسم والے ہیں ان کی مختلف شکلیں اور صورتیں ہیں، اس تعریف سے امام نے عالم کو ظنیات سے ہٹا کر ہمارے محسوسات اور مشاہدات کے ساتھ خاص کر دیا ہے، اور عرض کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے،

واعراض قائمۃ بھا کألوانھا — اور اعراض جسم کے ساتھ قائم ہیں جیسے

وھیئاتھا فی ترکیبھا وسائر — رنگ اور اجزائے ترکیبی کی ہیئتیں اور

صفاتھا۔ — دیگر صفات۔

عرض کے لیے اہل حق کی اس اصطلاح کہ "جوہر سے علیحدہ اس کا کوئی حیز نہیں" کو امام صفات متغیرہ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، ان کی اس تعریف کی بنا پر وہ موجودات عینی جن کی معرفت ہمارے ظاہری حواس خمسہ کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، عالم ہیں اور عالم کی کنہ کی دریافت کے لیے ہم دقت نظر کے محتاج نہیں، کیونکہ عالم ہم اور ہمارے گرد وپیش کی مخلوقات ہیں، چونکہ تمام موجودات تغیر پذیر ہیں اس لئے امام کے نزدیک عالم جائز ہے، واجب نہیں، اس وقت کائنات جس نظم وضبط کے ساتھ قائم ہے، کسی وقت میں وہ بالکل درہم برہم ہو سکتی ہے،

---

[1] الجوینی ۱۳۲

بجوز تغیر الممتنع تقدسہ تعالیٰ	عالم اس وقت جس ہیئت پر ہے،
خلاف ماھو علیہ	اس کے خلاف ہونا ممتنع نہیں ہے،

اور یہ تغیرات از خود نہیں ہوتے بلکہ کسی فاعل کے فعل کا نتیجہ ہیں اور وہ فاعل مرید و مختار اور قادر مطلق ہے وہ اپنے ہر ارادے اور مشیت کو وجود بخشنے پر پوری طرح قادر ہے، وہ فعال لما یرید ہے، اور اس کی عقلی دلیل یہ ہے کہ

لان الموجب الذی لا یوثر	اگر خالق و موجد غیر مؤثر ہے تو
یستحیل ان یقتضی شیئاً دون	اپنے سے کمتر چیزوں کی تخلیق کا ارادہ
ما ثلہ[1]	کرنا اس کے لئے محال ہے،

امام نے اشاعرہ کی حمایت میں مذہب اشعری کے تتبع کے ساتھ اپنی طرف سے جدید اصطلاحات وضع کر کے اور نیا انداز فکر پیدا کر کے آپس کے کلام کو آسان اور وسیع کر دیا لیکن چونکہ یہ خالص علمی و فنی مباحث ہیں جن سے عموماً علماء واقف ہوتے ہیں، اور عام لوگوں کو ان سے کم دلچسپی ہوتی ہے، اس لیے اب مزید تفصیل غیر ضروری ہے، (باقی)

---

[1] الجوینی بحوالہ العقیدۃ النظامیہ،

کراچی کا ایک مکتوب

کراچی، ۱۰ نومبر ۱۹۶۷ء

حضرت سید محترم! معارف سے معلوم ہوا کہ آپ کو حکومت نے علمی خدمات کی بنا پر ایوارڈ دیا ہے، ہرچند کہ آپ اور آپ کی حیثیت بہت بلند و بالاتر ہے، ان بیساکھیوں کی قطعاً ضرورت نہیں لیکن پھر بھی زمانہ کا دستور ہے، سو وہ پورا ہوا، بہت اچھا ہوا! میری طرف سے دلی مبارک باد قبول فرمائیے!

سید صاحب! اب تو آپ کی زیارت کو بہت جی چاہتا ہے، میں اس روز کو ترستا ہوں جب آپ اچانک تشریف لے آئیں، اور آپ کو گلے لگا لوں، میرا ایک آپریشن گلے کا ہوا، الحمد للہ اب بہت ٹھیک ہوں، یہ چھوٹا آپریشن تھا، دعا فرمائیں کہ رب العزت اس مرض سے نجات عطا فرمائے، آمین!

بزم تیموریہ جلد دوم اپریل سے فوراً بھجوا دیں، دو تین کتابیں چھپی ہیں، جو عنقریب خدمت اقدس میں روانہ کر دی جائیں گی، ایک تذکرہ "مجمع الشعرائے جہانگیری" آپ کی بزم تیموریہ کی دوسری جلد میں کام آتا۔ کاش کہ چھپنے سے پہلے آپ کے ملاحظہ سے گذرتا، آپ کب تک ایک بار پھر کراچی تشریف لا رہے ہیں، لکھئے،

والسّلام حسام الدین راشدی

معارف:- جناب سید حسام الدین راشدی صاحب دار المصنفین کے بڑے قدر دان اور پاکستان کے حلقۂ علم کے جلیل القدر مصنف ہیں، دار المصنفین اور حکومت پاکستان میں یہاں کی مطبوعات کے کاپی رائٹ کے فروخت کا جو معاہدہ ہوا تھا، اس میں آپ کا بہت ہی اہم کردار رہا، دعا ہے اللہ تعالیٰ اُن کو صحت کاملہ کے ساتھ بہت دنوں تک بقید حیات رکھے تاکہ وہ علم کی خدمت کرتے رہیں اور دار المصنفین سے بھی اُن کی دلچسپی اور عقیدت باقی رہے، آمین!

ادبیات

غزل

جناب نسیم احمد نسیمؔ، ایڈوکیٹ، شاہ جہاں پور

کون کہتا ہے کہ یہ غم سے اماں مانگے ہے
حادثے اور مرا عزم جواں مانگے ہے،

کون توڑے گا مرے دوست اے تیرے سوا
شیشۂ دل ہو کہ پھر سنگِ گراں مانگے ہے

میں ہوں اس دور کا منصور چڑھا دو سولی
دار پھر سنتا ہوں نذرانۂ جاں مانگے ہے

بے گناہی ہے کہ ہر در پہ صدا دیتی ہے
دستِ قاتل ہو کہ شمشیر و سناں مانگے ہے

زندگی کس نے تیری سمت اسے پھینکا ہے
نشترِ غم ہو کہ خونِ رگِ جاں مانگے ہے

کل جو ڈوبا تو کوئی پوچھنے والا بھی نہ تھا
آج ابھرا ہوں تو ہر موجِ رواں مانگے ہے

اس سے کہنا ہے حدیثِ غمِ دل مجھ کو نسیمؔ
آرزوئے دلِ بیتاب زباں مانگے ہے

غزل

از جناب محمد حسین فطرتؔ بھٹکلی

اگر عزمِ سفر دل میں ترے بیدار ہو جائے
تری راہوں کا ہر کانٹا گلِ گلزار ہو جائے

یہ اک زندہ صداقت ہے یہ اک روشن حقیقت ہے
نہ ہو مرنا تو پھر جینا یہاں دشوار ہو جائے

مجھے ہر رات بیداری کا اک پیغام دیتی ہے
ہو خوابیدہ زمانہ تو یہ دل بیدار ہو جائے

مرے دل نے حجابِ رازِ ہستی چاک کر ڈالا
یہی تھا اس کے شایاں محرمِ اسرار ہو جائے

نگاہِ مردِ مومن کی خصوصیت یہی تو ہے
کبھی یہ برگِ گل ہو تو کبھی تلوار ہو جائے

شرابِ عشق کی تاثیر کا منکر ہے کیوں واعظ
عجب کیا ایک میکش محرمِ اسرار ہو جائے

مصفّیٰ اور مجلّیٰ نور ساماں اور طور رہے
ترا دل بھی مثالِ ساغرِ گلنار ہو جائے

نگاہِ یار کی تعریف کن لفظوں میں ہو فطرتؔ
یہ تیرِ نیم کش ہے کیوں جگر کے پار ہو جائے

باب التقریظ والانتقاد

مجدد الف ثانیؒ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ پر ایک اہم کتاب

تقریباً بیالیس سال پہلے کی بات ہے کہ اس راقم نے اپنی کتاب بزم صوفیہ کے سلسلہ میں مکتوبات امام ربانی کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی، اس کے کچھ حصے سمجھ میں نہیں آئے تو استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے سمجھنے کی کوشش کی، انھوں نے کچھ دیر تک سمجھایا، پھر یہ کہہ کر کتاب رکھ دی کہ مولانا عبدالباری ندوی (مرحوم) تشریف لانے والے ہیں، وہ فلسفی بھی ہیں، اور صوفی بھی، اس لیے وہ اچھی طرح سمجھا دیں گے، اس وقت تک حضرت استاذی المحترم تھانہ بھون جاکر بیعت نہیں ہوئے تھے، مولانا عبدالباری ندوی (مرحوم) تشریف لائے تو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے مکتوبات ربانی کو سمجھانے کی گذارش کی، فرمایا میں کس چکر میں پڑ گیا ہوں مجھ کو بھی یہ مکتوبات خود سمجھ میں نہیں آئے تو مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے سمجھنے کی کوشش کی، وہ سمجھانے لگے تو کچھ سمجھ میں نہ آیا، ان سے عرض کیا کہ وہ ان مطالب کو تحریر فرمادیں تاکہ ان کو وہ بار بار پڑھ کر سمجھ سکیں،

خوشی کی بات ہے کہ ان مکتوبات کے غوامض و حقائق کو مولانا ابوالحسن علی ندوی نے بڑی خوبی کے ساتھ اپنی کتاب تاریخ دعوت و عزیمت جلد چہارم میں سمجھانے کی کوشش کی ہے، جو مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ کے حالات و تعلیمات پر مشتمل ہے، اس کے مندرجۂ ذیل ابواب سے پوری کتاب کی نوعیت کا اندازہ ہوگا،

باب اول، عالم اسلام دسویں صدی میں، باب دوم اکبری عہد حکومت اور اس کے متضاد دور، باب سوم حضرت مجدد الف ثانیؒ، حالات زندگی از ولادت تا خلافت، باب چہارم اہم واقعات وحالات، ارشاد وتربیت کی سرگرمی، وفات، باب پنجم حضرت مجددؒ کے دائرۂ تجدید کا مرکزی نقطہ نبوت محمدی پر ایمان واعتماد کی تجدید، باب ششم وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود، باب ہفتم اکبر سے جہانگیر تک سلطنت کو راہ راست پر لانے کے لیے آپ کی خاموش جدوجہد، باب ہشتم حضرت مجددؒ کے خلفائے کبار اور ان کے منتسبین کے ذریعہ آپ کے تجدیدی کام کی توسیع وتکمیل۔

ان ابواب سے ظاہر ہوگا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے عہد اور ان کے حالات وتعلیمات پر اس کتاب میں وہ سب کچھ ملیگا جو اب تک معلوم تھا، اور وہ بھی جو اب تک معلوم نہ تھا، حضرت مجددؒ پر اردو اور انگریزی میں اس ملک اور بیرون ملک بہت کچھ .. .. لکھا جا چکا ہے، لیکن مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ادب بھی ہے، انشا پردازی بھی ہے تحقیق بھی ہے، حقیقت پسندی بھی ہے، اور مصنف کے دل کی سرشارانہ کیفیت بھی ہے، اور ناظرین کے سکینت قلب کا کافی سامان بھی ہے، اسکو پڑھتے وقت کبھی ادب وانشا کی لذت ملتی ہے، کبھی گہری تحقیقات کی داد دینی پڑتی ہے، کبھی تاریخ کی گتھیاں سلجھتی دکھائی دیتی ہیں، کبھی راہ سلوک کی منزلیں طے ہوتی نظر آتی ہیں،

اس کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ سے پہلے دسویں صدی ہجری میں عالم اسلام میں جو سیاسی، علمی، مذہبی اور روحانی تحریکیں چل رہی تھیں اُن کا بھی اس کتاب میں جائزہ لیا گیا ہے، پھر اکبر کے عہد حکومت میں جو مذہبی اور روحانی فتنے اٹھے، اُن پر بھی ناقدانہ تبصرہ ہے، ان کے مطالعہ کے بعد حضرت مجددؒ کے تجدیدی کارناموں کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی، ان ابواب کو پڑھتے وقت ٹھہر کر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی مختلف تحریکیں ان کو کس سمت لے جا رہی تھیں، ان تحریکوں نے انکے معاشرے یا ذہن کو سنوارا یا ان کو بگاڑ کر ان کو انتشار کی طرف لے گئیں، مثلاً اس کے پہلے باب میں شطاریہ

سلسلہ کا اب ہے جس کے مشہور بزرگ شیخ محمد غوث گوالیاری کے ... سلسلہ ... کا
زمانہ سلسلہ کی ترقی کا تھا ، اس کے بعد ... ہی سے ... ختم ہوگیا ، ... بڑے ... تھا ...
... جانتے ، اس کے باوجود ملک میں ان کے نفوذ کی دھوم مچی ہوئی تھی (ص ۳۴۳-۳۴۵) ... کے
لکھتے ہیں کہ اس سلسلہ نے پہلی مرتبہ جوگ کو تصوف کے ساتھ ملایا ، اور اس کے بعض طریقے اور
اشغال اور بعض آسن اور حبس دم کا طریقہ اختیار کیا (ص ۳۴۳) آگے چل کر یہ بھی ہے کہ شیخ محمد غوث گوالیاری
کی مقبول کتاب جواہر خمسہ کی بنیاد زیادہ تر بزرگوں کے اقوال اور اپنے تجربات پر ہے ، ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ صحیح احادیث سے ثابت ہونے یا معتبر کتب شمائل و سیر سے اخذ کرنے کو ضروری نہیں سمجھا گیا (ص ۳۴۴)

ان کو پڑھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تصوف میں جوگ آسن اور حبس دم کے طریقے ملائے گئے
تو کیا اس کو اسلامی تصوف کہنا صحیح ہوگا ، پھر شطاریہ سلسلہ میں جو چیزیں اختیار کی گئیں کیا وہ چشتیہ
سلسلہ کے بزرگوں کے یہاں بھی تھیں ، اور اگر نہیں تھیں تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس سلسلہ کے بزرگوں
نے صاحب ولایت چشتیہ سے اس ملک کا روحانی چارج لیا (ص ۳۴۳) اور اگر انھوں نے واقعی
سارے ہندوستان کو تسخیر کر لیا (ص ۳۴۳) تو کیوں اور کیسے ؟ کیا اس زمانہ کے لوگ درویشی میں
مہارت چاہتے تھے ، اور اپنے ہم وطنوں سے قریب ہونے کی خاطر ان کے روحانی کمالات میں حصہ
دار بننا چاہتے تھے ، اور وہ واقعی اس کے خواہاں تھے تو پھر شطاریہ سلسلہ آگے چل کر کیوں اتنا
مقبول نہیں رہا ، جتنا کہ دسویں صدی میں تھا ، پھر شیخ محمد شطاری کی تصنیف "کلید مخازن"
میں جو وحدت الوجود پیش کیا گیا ہے وہ کیا وہی وحدت الوجود ہے ، جس کو شیخ راجح بن داؤد
گجراتی ، شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ اور حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے پیش کیا ہے ، مولانا ابوالحسن علی
ندوی نے یہ بحث چھیڑ کر اس کی دعوت دی ہے کہ اس سلسلہ کا مطالعہ اس نوعیت کے ساتھ
بھی کیا جائے ،

دسویں صدی ہجری میں مسلمانوں کی ذہنی بے چینی اور اعتقادی انتشار خیال سے [illegible] گئی بلوچستان کے فرقہ ذکری کو خلافِ اسلام بتایا گیا ہے، (ص ۴۹) گو اس کے محرکین مسلمان ہی تھے اسی طرح فرقہ روشنیہ کو انتشار پسندوں میں شمار کیا گیا ہے، جو پشاور کے قبیلوں اور [illegible] افغانیوں اور بلوچیوں میں ضرور پھیلا، مگر نہ صرف اکبر بلکہ علماء کی شدید مخالفت کی وجہ سے تتر بتر ہوگئے، اور بالآخر ناپید ہوگئے، (ص ۵۰)

محمد جونپوری کی تحریک کا ذکر انتشار پسندی ہی کے سلسلہ میں کیا گیا ہے، مگر اس کو ولولہ انگیز بھی کہا گیا ہے، (ص ۵۲) ان کی تحریک مہدویت کے نام سے مشہور ہوئی گو خود محمد جونپوری نے اپنے کو مہدیِ وقت نہیں کہا، ان کے غالی متبعین نے ان کو مہدی ہی تسلیم کر لیا، بلکہ ان کو انبیاؑ کا ہمسر اور بعض سے افضل و برتر بنا دیا، (ص ۵۵) اس کے پیروؤں نے افغانستان اور ہندوستان میں کئی سلطنتیں قائم کر لیں، مگر راسخ علماء اس تحریک کے شدید مخالف ہو کر اسکو گمراہی اور ضلالت ہی قرار دیتے رہے، اس لیے اس کے اثرات رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے،

ان فرقوں کے وجود میں آجانے سے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ انتشار پسند فرقے کیوں پیدا ہوتے گئے، مولانا ابو الحسن علی ندوی نے اس کے کچھ اسباب بتائے ہیں، ایک سبب تو یہ بتایا ہے کہ معاشرہ کے قول و عمل، عقیدہ اور زندگی میں جب مطابقت نہیں ہوتی تو بے اطمینانی پیدا ہو جاتی ہے، پھر تشکک پیدا ہونے لگتا ہے، جس کے بعد انتہا پسندی میں دینی تعلیمات بالائے طاق رکھ دی جاتی ہیں، اور کوئی تحریک چلا کر اس میں پناہ لی جاتی ہے، پھر جب سلاطین وقت احکام شریعت سے چشم پوشی کرنے لگتے ہیں تو پھر کچھ لوگ انقلابی تحریک کے نام پر بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں، دوسرا سبب یہ بتایا ہے کہ جب نظام تعلیم بے روح ہو جاتا ہے تو لوگ ایسی تحریکوں میں اپنے ذہن کی تسکین پانے لگتے ہیں، مولانا نے ان اسباب کی نشاندہی مختصر طریقہ پر

کہ اس کی ضرورت دی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان جو مختلف مذہبی تحریکیں چلتی رہی ہیں ان کے اسباب و علل کا مطالعہ تفصیل سے کیا جائے، تاکہ آئندہ مسلمانوں کی اس قسم کی تحریکیں، انھیں تو ماضی کے تجربات کی بنیاد پر ان کے روشن اور تاریک پہلوؤں پر ان کی نظر رہے۔

اسی باب میں ایران کی نقطوی تحریک کا بھی ذکر ہے جو بالکل ملحدانہ تھی، اس کی مختلف شکلیں مزدک، مانی، اور حسن بن صباح کی تحریکوں میں ابھریں یہ سب ایران سے اٹھیں، مولانا نے یہ سوچنے کی دعوت دی ہے کہ آخر ایران کی سرزمین ملحدانہ تحریکوں کے لئے کیوں سازگار ہوتی ہے؟ ان کے ماننے والوں کی تعداد میں کیوں اضافہ ہوجاتا ہے؟ ان کے پیروان کی طرف نیک نیتی یا دینی سادہ لوحی میں مائل ہوجاتے ہیں؟ یا ان تحریکوں کے چلانے والے ایسے ریاکار اور فریبی ہوتے ہیں کہ ان کی طرف مائل ہونا ناگزیر ہوجاتا ہے؟ جب ہم اسی کتاب میں یہ پڑھتے ہیں کہ شاہ عباس صفوی نے ہزاروں نقطویوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ تاریخ کا یہی فیصلہ ہے کہ مسلمانوں میں جب ملحدانہ تحریکیں چلائی جائیں گی تو اس کا حشر یہی ہوگا۔

ابوالفضل کو تاریخ عالم آرائے عباسی کے حوالے سے نقطوی قرار دیا گیا ہے، (ص ۹۹) مگر میرا اپنا خیال ہے کہ وہ کچھ بھی نہ تھا، اور تھا تو اکبر کا بہت بڑا مزاجدار، خود مولانا نے بھی لکھا ہے کہ اس نے اپنے علم و ذہانت سے کام لے کر بادشاہ کی خواہشات کو علمی جامہ پہنانے اور اس کو علمی اسلحہ فراہم کرنے اور فرمانروائے سلطنت کی سطح سے دمام زمان اور ہادی دوران کے منصب رفیع تک پہونچاتے میں جو کردار ادا کیا تھا، اس پر اس کا ضمیر مطمئن نہیں تھا، اور وہ خود اپنے ایک خط میں جو خانخانان کو لکھا ہے اس کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ مشاغل لایعنی کے جہنم میں پھنس کر بندۂ فطرت ہوگیا، اور اس کے قریب پہونچ گیا کہ خدا کی بندگی کے بجائے بندۂ درہم و دینار کہا جانے لگا، (ص ۱۰۰)

اکبر کے مذہبی مزاج کی تبدیلی کی ذمہ داری مولانا نے درباری علماء پر ڈالدی ہے، انھوں نے ایک عربی شعر لکھ کر یہ واضح کیا ہے کہ اگر سلاطین مذہبی ذہن کو اپنے مفاد کی خاطر بگاڑتے ہیں تو علمائے

مورخین اور دانشوروں نے بھی اس کو بہت کچھ بگاڑا ہے، درباری علماء پر اکبر کے مذہبی انحراف کی ذمہ داری ڈال کر۔ مولانا نے ان غیر عالم مورخوں کی تائید بڑی حد تک کر دی ہے، جو اس قسم کی باتیں برابر لکھتے آئے ہیں۔ اس باب کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں اکبر کے دین الٰہی کی پوری تصویر ابوالفضل کی تحریروں سے دکھائی گئی ہے، اب تک دین الٰہی ملا عبدالقادر بدایونی کی تحریروں کے ذریعہ سے سمجھا جاتا تھا، مگر ان کی تحریروں کو یہ لکھ کر مجروح کیا جاتا ہے، کہ یہ ایک متعصب اور انتہا پسند کی ہیں جو زیادہ قابل اعتماد نہیں، حالانکہ انھوں نے خدا کی قسم کھا کر لکھا ہے کہ انھوں نے اکبر کے مذہبی خیالات کے بارہ میں جو کچھ قلمبند کیا ہے، اس میں ملامت، نفرت، حسد اور تعصب کا جذبہ نہیں، بلکہ صرف شرع مبین اور دین متین کی حمایت ہے، (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۰۵) مگر آئین اکبری کے گہرے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابوالفضل اور ملا عبدالقادر بدایونی نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں کچھ زیادہ فرق نہیں صرف اسلوب بیان کا فرق ہے، آئین اکبری میں اکبر کے خود ساختہ مذہب کی تفصیلات ایسی مشکل اور مغلق عبارت آرائیوں میں قلمبند کی گئی ہیں کہ ان کا سمجھنا آسان نہیں، اس لئے وہ نظر انداز کر دی جاتی تھیں، اب مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اکبر کی ایسی تمام تحریروں کے ٹکڑوں کو ایک ساتھ جمع کر کے اردو میں ان کے ترجمے بھی دے دیئے ہیں، ان کے مطالعہ کے بعد موجودہ دور کی سیکولرزم میں اس مذہب کی خوبیاں جتنی بیان کی جائیں، لیکن یہ دین الٰہی واہی تباہی دین کے سوا کچھ بھی نہ تھا، مولانا کی نظر اکبر نامہ پر بھی پڑی ہوگی، شاید طوالت سے بچنے کی خاطر اس میں اکبر کے عبادت خانہ کے مباحث کا جو ذکر ہے اس کی تفصیل لکھنا پسند نہ کیا ہو، اسی اکبر نامہ میں ہے کہ اکبر نے ۲۵ ویں سال جلوس میں خدا شناسی کی خاطر کچھ ضابطے مقرر کئے جن میں کچھ یہ ہیں، سال کے بارہ حصے ہیں، اس لئے سچقان آئیل میں، چوہے نہ مارے جائیں، ییلان آئیل میں سانپ نہ مارے جائیں، تخاقو آئیل میں مرغ نہ ذبح کئے جائیں اور نہ وہ لڑائے جائیں، ایت آئیل میں کتے جیسے وفادار جانور سے دوستی کا ثبوت دیا جائے، تینگو آئیل میں سوروں کو تکلیف

جلد سوم ص ۳۳۲-۳۳۳)۔

ان منابطوں کے بعد اکبر کے مذہب اور اس کی خداشناسی کے متعلق بہت کم شک باقی رہ جاتا ہے، مولانا کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ مذہب کی حیثیت ایک زنجیر کی سی تھی جو اس وقت اسلام کے گلے میں ڈال دی گئی تھی (ص ۲۰۰) ابوالفضل نے اکبر کا [illegible] کر کے اسکو اکبر اعظم ضرور بنا دیا لیکن اکبر کے دین الٰہی کی جب پوری تفصیل ابوالفضل ہی کی زبانی سمجھی جائے گی، تو اکبر اعظم کے دین الٰہی کو ایک فتنۂ اعظم سمجھنے پر ناظرین مجبور ہونگے۔

اسی فتنۂ اعظم کے مضرت رساں اثرات کے انسداد کے لئے حضرت شیخ احمد سرہندیؒ اٹھے، جو بعد میں مجدد الف ثانی کے نام سے مشہور ہوئے ان کی زندگی کے اہم ترین واقعات میں سے ایک جہانگیر کے حکم سے ان کی اسیری بھی ہے۔ راقم ایک عرصہ دراز سے اس واقعہ پر جتنا غور کرتا ہے، یہ ایک عقدہ لاینحل نظر آتا ہے۔ جہانگیر اپنے چودھویں سال جلوس میں ان کے بارہ میں لکھتا ہے۔

"ان ہی دنوں مجھ سے عرض کیا گیا کہ شیخ احمد نامی ایک جعل ساز (شیاد) نے سرہند میں مکر و فریب کا جال بچھا کر بہت سے ظاہر پرستوں کو پھانس رکھا ہے، اس نے ہر شہر اور ہر علاقہ میں ایک خلیفہ مقرر کر رکھا ہے، جو دوکانداری، معرفت فروشی اور مردم فریبی میں بہت پختہ ہیں، [illegible] اپنے مریدوں اور معتقدوں کو بہت سے خرافات لکھے ہیں، ان کو ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے اور نام مکتوبات رکھا ہے، اس میں بہت سی مہمل اور لاطائل باتیں ہیں جو کفر کی حد تک پہنچتی ہیں۔

اسی سلسلہ میں وہ لکھتا ہے،

"ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ میں سلوک کی راہ میں ذی النورین کے مقام سے گذرا جو نہایت عالی اور پاکیزہ تھا، اس سے گذر کر مقام فاروقی میں پیوست ہو گیا اور مقام فاروقی سے

[illegible] کو حمد کیا، ہر مقام کی تعریف اس کے مطابق کرکے لکھا ہے، . . . .
[illegible] کی گستاخانہ باتیں لکھی ہیں۔ . . . . "

چونکہ جہانگیری کی عبارتیں مولانا نے قصداً اپنی کتاب میں نقل کرنا پسند نہیں کیا ہے، شاید ان کی ثقاہت اور متانت نے اس کو نقل کرنے سے ابا کیا ہو، صرف اتنا لکھنے پر اکتفا کیا ہے کہ شیخ صاحب کا ذکر جہانگیر نے بہت نامناسب انداز اور کسی قدر تحقیر آمیز طریقہ پر کیا ہے، (ص ۱۵۰)

تزک جہانگیری کی مذکورہ بالا عبارتوں کو نظر انداز کرنے کے بجائے ان کا ناقدانہ مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے، اور راقم کو جہانگیر کے قلم سے ایسی عبارت کا لکھنا قابل یقین نہیں معلوم ہوتا، کیا وہ چودہ سال تک حضرت مجدد الف ثانیؒ کی دعوت و عزیمت کی سرگرمیوں سے بے خبر رہا؟ شہزادہ خرم کو حضرت شیخ احمد سرہندیؒ سے عقیدت تھی، خود مولانا بھی تحریر فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہجہان کے دل میں ہمیشہ حضرت مجددؒ کے لیے نرم گوشہ اور احترام و اخلاص رہا (ص ۳۱۹) کیا جہانگیر کو اس کی خبر نہیں رہی؟ پھر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بہت ہی محبوب مرید شیخ فرید مرتضیٰ خاں بخاری تھے، وہ جہانگیر کے بھی بہت ہی مقرب درباری امیر تھے، اس کی تخت نشینی میں ان کا بڑا کارنامہ ہے، جب وہ شاہی تخت پر بیٹھا تو اس نے ان کو صاحب السیف والقلم کا خطاب اور پنج ہزاری منصب بھی دیا، (مآثر الامرا جلد دوم ص ۶۳۳-۴۰) حضرت مجددؒ کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ فرید کو بادشاہ کا قرب حاصل تھا، ان کو خلوت و جلوت میں شریعت محمدی کی ترویج کا موقع حاصل تھا، حضرت مجددؒ کو ان سے امید تھی کہ وہ ترویج شریعت کی سعادت حاصل کرکے سب سعادت مندوں سے بازی لے جائیں گے (مکتوبات ربانی جلد اول نمبر ۵۱، ص ۶۸) خود مولانا بھی تحریر فرماتے ہیں کہ "نواب سید فرید نے حکومت کا رخ بدلنے میں بنیادی اور مرکزی کردار ادا کیا، (ص ۳۱۶) یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت مجددؒ ہی کے اثر سے شیخ فرید نے جہانگیر پر دباؤ ڈالا

کہ وہ اسلامی شعائر کے ساتھ حکومت کرے، جہانگیر نے اس کے لئے وعدہ بھی کر لیا، بعد شیخ فرید کو چار علماء کو مقرر کر کے اس کے دربار سے وابستہ کرنے کی ہدایت بھی دی، تاکہ وہ مسائل شرعیہ بیان کرتے رہیں، شیخ فرید نے خوشی کے عالم میں اس کی اطلاع حضرت مجدد کو دی، جس کے جواب میں انھوں نے شیخ فرید کو تحریر فرمایا کہ اس مقصد کے لئے ایک عالم ہی کا انتخاب کیا جائے تو بہتر ہوگا، تاکہ چار علماء کے اختلاف سے مقصد فوت نہ ہو جائے، اس کی تفصیل خود مولانا ابوالحسن علی ندوی نے زیر نظر کتاب ص ۱۴۔۳۱۳ پر لکھی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ حضرت مجدد دربار پر اثر انداز ہو رہے تھے،

وہ خود جہانگیر کے دربار کے ایک بااثر امیر صدر جہاں (م ۱۰۲۰ھ) کو لکھتے ہیں کہ احکام شرعیہ کے جاری ہونے اور مذہب مصطفوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دشمنوں کی خواری کی باتیں سن کر ماتم زدہ مسلمانوں کے دل کو خوشی ہوئی، اس باب میں اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کا احسان ہے، (مکتوبات امام ربانی نمبر ۱۹۴) جہانگیر کے دربار کا رکن رکین خان اعظم (م ۱۰۳۳ھ) تھا، اس کو بھی حضرت مجددؒ سے بڑی محبت و عقیدت تھی، اور خود حضرت مجدد اس کے معترف تھے، اس لئے اس کو اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں، کہ ہاری ہوئی بازی میں اس کے سوا کوئی اور مرد میدان نہیں (مکتوبات ربانی جلد اول نمبر ۶۵) اسی طرح عبدالرحیم خان خانان (م ۱۰۳۶ھ) اور اس کا لڑکا داراب خان (م ۱۰۳۴ھ) اور دوسرے امراء بھی ان کے معتقد تھے، کیا جہانگیر اپنے ان امراء کے روحانی پیشوا سے بے خبر رہا؟ جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد شیخ فرید بخاری (م ۱۰۲۵ھ) گیارہ سال تک زندہ رہے، کیا انھوں نے حضرت مجدد کی عظمت اور بزرگی سے جہانگیر کو ناواقف رکھا؟ یہ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے، پھر خود مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اس کی طرف توجہ دلائی ہے کہ حضرت مجدد کے جس مکتوب پر جہانگیر نے ان کو مورد الزام قرار دے کر اسیر کیا، وہ ۱۰۱۳ھ میں لکھا گیا، اور حضرت مجدد کی گرفتاری ۱۰۲۸ھ میں عمل میں آئی (ص ۱۹۱ [illegible]

گرفتاری کا ذکر اپنے چودھویں سال جلوس . . . . . میں کرتا ہے اس کی تخت نشینی ۱۰۱۴ھ
میں ہے ظاہر ہے کہ حضرت مجددؒ نے فتنازع فیہ مکتوب اس کی تخت نشینی سے دو سال پہلے لکھا
حکومت کے چودہ سال تک اس مکتوب سے گویا بے خبر رہا، یہ تسلیم کرنے میں تامل ہے پھر یکایک
سے بعد اس کی رگِ حمیت کیوں پھڑک اٹھی، اس کا مورخانہ تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے اگر
باری زندہ ہوتے تو شاید حضرت مجددؒ کی اسیری عمل میں نہ آتی، وہ اس اسیری سے تین سال
پہلے فوت ہو گئے مگر خان اعظم صدر جہاں، عبدالرحیم خان خاناں اور داراب خان وغیرہ تو اس وقت زندہ
خاموش کیوں رہے؟ ان کی رگ حمیت کیوں نہیں پھڑکی؟ وہ اپنے شاہی آقا کے سامنے اپنے
کے اخلاص، للہیت، بے لوثی، بے غرضی اور علوئے مقام کو تو ظاہر کر سکتے تھے، یا ان کا ضمیر ان کے
اور وجاہت پرستی کی خاطر اتنا مردہ ہو گیا تھا کہ انھوں نے اپنے مذہبی پیشوا کے لیے کچھ کرنا
کیا، یا وہ دربار کے شیعی امرا کے اثرات سے اتنے دب کر رہ گئے تھے کہ شیعی امرا نے حضرت
ات جہانگیر کو استعمال کیا، اور سنی امرا کے لئے دم بخود رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا، حضرت
لاف شیعی امرا کا ہونا تو سمجھ میں آتا ہے کیونکہ دربار میں جو شیعی اثرات بڑھ رہے تھے،
زائل کرنا چاہتے تھے، حضرت مجددؒ نے ردِ شیعیت میں جو کچھ لکھا یا کیا، اس کے متعلق . . . . .
حسن علی ندوی نے اپنی اس کتاب میں کچھ لکھنا پسند نہیں فرمایا، شاید لکھنؤ کے سنی شیعہ کے
کی فضا میں احتراز کرنا ہی مناسب سمجھا ہو مگر حضرت مجددؒ کی اسیری کے سلسلہ میں شیعیت
پرودہی، شاہی حرم میں نور جہاں کے داخل ہونے کے بعد دربار پر اس کے خاندان کے افراد
شیعی اثرات کا بڑھنا لازمی تھا، نور اللہ شوستری کا قتل شاہی حرم میں نور جہاں کے آنے سے
جس سے شیعہ بہت بددل اور آزردہ تھے، عام خیال تو یہی ہے کہ جہانگیر نے ان کو قتل کرایا،
تزک میں اس کا ذکر مطلق نہیں، اقبال نامۂ جہانگیری اور مآثر جہانگیری سے بھی اس کی

شہادت بھی ہو کہ جہانگیر نے ان کو قتل کیا، یہ شیعہ [illegible] جہانگیر [illegible] اور اس کے خاندان کے [illegible] بعد جہانگیر نے اپنے [illegible] امرا کی [illegible] حضرت مجدد کو گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا، مگر بعد میں ان کے علو مقام کا معترف ہو گیا۔

اس کے علاوہ اس کی طرف بھی ذہن جاتا ہے کہ جہانگیر نے جب خود تزک قلمبند کرنا چھوڑ دیا تو سترہویں جلوس سے انیسویں جلوس تک کے کچھ حصے اس کے ندیم خاص محمد شریف نے لکھے جس کو معتمد خان کا خطاب دیا تھا، وہ ایرانی یعنی شیعہ تھا، (مآثر الامرا جلد سوم ص ۴۳۱) جہانگیر کے ایک اور درباری مرزا محمد ہادی نے تزک کا تکملہ لکھا، یہ بھی شیعہ ہی تھا، اس کے شروع میں دیباچہ بھی اسی کا تحریر کیا ہوا ہے، وہ دیباچہ میں لکھتا ہے کہ اس نے تزک جہانگیری کو اپنے قلم سے نقل کیا، اور اس کا تکملہ بھی کیا ہے، یہ قرین قیاس ہے، کہ اس نے یا معتمد خاں نے حضرت مجددؒ سے متعلق ایک ناروا تحریر لکھ کر اپنی شیعیت و دشمنی کا انتقام لیا ہو، یہ بحث ایسی ہے، جس کا ناقدانہ تجزیہ اچھی طرح کرنا ضروری ہے، جہانگیر، اکبر اور شاہجہان سے زیادہ علم شناس تھا، اس کی نظر ادب، شاعری، لغت اور مذہبی علوم پر بھی رہی، وہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا قدردان تھا، ان کی کتاب اخبار الاخیار کی خوبیوں کا بھی قائل رہا، اس نے اگر مکتوبات ربانیؒ کے متعلق واقعی وہی لکھا ہے، جو پچھلے صفحوں میں درج کیا گیا تو یہ عقدہ لاینحل معلوم ہوتا ہے، خود مولانا ابوالحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں "یقیناً وہ (یعنی جہانگیر) ایک سلیم الطبع ذہین اور ہوشمند فرمانروائے سلطنت کی حیثیت سے جس کو امرا و علما کے ساتھ، دنیاداروں اور دینداروں کی ایک بڑی تعداد کے حالات کا اپنے والد اکبر کے دور سے اس وقت تک مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا، اور اس سے اس میں مردم شناسی کی وہ صلاحیت پیدا ہو گئی تھی جو ان لوگوں کو حاصل نہیں ہو سکتی جن کو کھرے اور کھوٹے کے پرکھنے کا اتنا طویل موقع نہیں ملتا (ص ۱۰۳)" پھر کیسے یقین کیا جائے کہ حضرت مجددؒ کا رتبہ ناشناس ہو کر اس نے ان کے متعلق ایسا ناروا تحریر [illegible]

تزک میں حضرت مجددؒ پر جو یہ الزام ہے کہ انھوں نے خلفاء کے مقام سے گذر کر عالی تر مقام پر پہنچنے کا دعویٰ کیا ہے، اس پر کافی بحث ہو چکی ہے، مگر مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنے امعانِ نظر سے اس الزام کو کس طرح دیکھتے ہیں، اس کو جاننے کی ایک فطری خواہش پیدا ہوتی ہے۔ داراشکوہ جہانگیر کا پوتا تھا، اس نے حضرت مجدد صاحب کے سلسلہ میں لکھا ہے،

از متاخرین مشائخ و صاحب ریاضت و مجاہدات و خوارق و تصانیف اند، در اواخر حال بعضے بر شیخ تہمت کردند کہ شیخ می گوید مرتبۂ من زیادہ از خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اما این محض بہتان و افترای مخالفان است بر شیخ چرا کہ این فقیر خود شنیدہ از سیادت و نقابت پناہ فضائل و کمالات دستگاہ حقائق و معارف آگاہ افضل فضلائے عصر علامی فہامی استاذی حضرت میرک شیخ بن شیخ فصیح الدین کہ می فرمودند وقتے ما را عبور بسرہند واقع شد و کیف ما اتفق ملاقات شیخ احمد روی داد و در اثنائے ملاقات بخاطر گذشت کہ اگر شیخ را کرامتے است باید کہ مردم آنچہ از ایشان بیان می کنند خاطرنشان ما سازند.......

چون ساعتے پیش شیخ نشستم جزوے کہ از زیر مسند خود بیرون داد کہ مطالعہ نمایند، چون از اتمام بہم رسید گفتند ازین چیزی ظاہر می شود، گفتم ازین خود ہیچ ظاہر نمی شود و آنچہ درین جا است درست است، گفتند پس باید کہ آنچہ از ما واقع شدہ عین است و باقی افترا است۔"

(سفینۃ الاولیاء ص ۳۲۰)

یہ تحریر بہت اہم ہے، اس سے ظاہر ہے کہ حضرت مجددؒ کے خلاف افتراپردازی کی ایک مہم چلائی گئی جس میں یقیناً غیر سنی ہی شریک ہوں گے۔ ان کی اسیری کا روشن پہلو یہ ہے کہ جہانگیر، نور جہاں اور اس کے خاندان کے متعلقین کے ساتھ رہنے کے باوجود حضرت مجددؒ کی رہائی کے بعد ان کی تعلیمات سے متاثر ہوا

ہو، اسکو احساس ہوا، جیسا کہ مولانا نے بھی تحریر فرمایا ہے کہ حضرت مجددؒ ان لوگوں سے مختلف ہیں جو ملک مسند بار کی زینت یا بوریائے فقر کے مسند نشین تھے، (ص ۱۰۳)

زیرِ نظر کتاب کے باب پنجم میں حضرت مجددؒ کے دائرۂ تجدید کا مرکزی نقطہ کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے اور حضرت مجددؒ نے نبوت محمدیؐ کی ابدیت کو جس طرح ثابت کیا ہے اس کو اس کتاب میں بہت ہی دل نواز انداز میں پیش کیا گیا ہے، یہ بہت ہی مفید حصہ ہے، جہاں حضرت مجددؒ کی تحریروں کی روشنی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ عقل کہاں عاجز ہو کر رہ جاتی ہے، کچھ دن ہوئے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے ایک سمینار میں حیدرآباد کے ایک مقالہ نگار نے یہ کہہ کر اپنے سامعین کو چونکا دیا کہ اگر وحی بھی عقل کے مطابق نہ ہو، تو یہ بھی قابلِ قبول نہیں، ایسے ذہن رکھنے والے حضرات زیرِ نظر کتاب کے اس حصہ کا مطالعہ کریں گے تو ان کا تاریک ذہن یقیناً روشن ہو جائے گا، ان پر اچھی طرح واضح ہو جائے گا، کہ انبیاؑ کی اطلاعات کو اپنی عقل کا پابند بنانا طریقِ نبوت کا انکار ہے جس کے بعد الحاد کی سرحد شروع ہو جاتی ہے،

حضرت مجددؒ نے کتاب و سنت کی پابندی اسوۂ رسول کی پیروی اور شمائل و اخلاقِ نبوی کے تتبع اور اسی کے ساتھ طریقت کو شریعت کی خادم قرار دینے کی جو زلزلہ انگیز تحریک چلا کر اس دور کے ظلمات کے امنڈتے ہوئے دریا کا جس طرح رخ موڑ دیا اس کی تصویرکشی اس کتاب میں بہت عمدہ طریقے پر کی گئی ہے،

اس کتاب میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی بڑی فاضلانہ بحث ہے، یہ دونوں مسئلے ایسے ہیں کہ ان کا سمجھنا سب لوگوں کے بس کی بات نہیں، مگر ان کو اس کتاب میں ایسا منقح کر دیا گیا ہے کہ ان کو سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوگی، موجودہ دور کے کچھ ایسے بھی لوگ ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ وحدت الوجود کے حامی راحم و رحیم، کفر و ایمان، حق و باطل میں تفریق نہیں کرتے، یہ غلط فہمی اس کتاب کے

مخالفت دور ہوجائیگی ، عام طور سے یہ سمجھا جاتا رہا کہ حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ وحدت الوجود کے بہت بڑے حامی تھے، مگر مولانا ابوالحسن علی ندوی نے شاید پہلی دفعہ اس کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ان کے یہاں وحدت الوجود کے متوازی وحدت الشہود کا بھی ذکر ملتا ہے (ص ۲۰۳) اسی کے ساتھ یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ حافظ ابن تیمیہؒ بھی وحدت الشہود کے کوچہ سے آشنا ہے (ص ۲۰۳) مگر وحدت الشہود کو جس مفصل اور واضح طریقہ سے حضرت مجددؒ نے پیش کیا، پہلے کسی اور نے نہیں کیا، اب محی الدین ابن العربیؒ کا وحدت الوجود اور حضرت مجددؒ کا وحدت الشہود دو متوازی طرز فکر سمجھا جانے لگا ہے، حضرت مجددؒ کو محی الدین ابن العربیؒ کے وحدت الوجود کے بنیادی تخیل سے اختلاف نہیں، وہ ابن العربی کو مقبولین حق میں شمار کرتے ہیں، لیکن وہ ان کے ان غالی متبعین پر ضرب کاری لگاتے ہیں جو وحدت الوجود کی من مانی تعبیر کرکے اپنے بے باکانہ اقوال سے اباحت، توسع اور اخلاقی انارکی کی ترویج کی طرف مائل ہوجاتے ہیں،

۸ اس کتاب میں عقیدۂ وحدت الوجود ہندوستان میں کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو پڑھ کر ذہن میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں، جن صوفیائے کرام نے توحید وجودی کا سبق ہندوستان ہی سے لیا، اس کی کیا نوعیت تھی، کیا وہ اسلامی توحید وجودی سے ہم آہنگ تھا، یا دونوں متضاد چیزیں تھیں، یہ تسلیم کہ ہندوستان میں مسلمان آکر آباد ہوئے تو مقامی خیالات سے ان کا متاثر ہونا ناگزیر تھا، انھوں نے جو تاثرات قبول کئے وہ اسلامی طرز فکر سے قریب تر تھے یا یہ بدعات تھیں، حضرت مجددؒ صاحب تو بدعات حسنہ کے بھی قائل نہیں (ص ۲۵۳) اگر توحید وجودی کا سبق ہندوستان سے واقعی لیا گیا تو کیا اس سے فکری انتشار نہیں پھیلا ؟ اس کتاب میں یہ بحث تفصیل کے ساتھ آجاتی تو مفید ہوتی، شیخ محمد غوث گوالیاریؒ اور دارا شکوہ خود ہندوستان کے تخیل وحدت الوجود سے متاثر ہوئے مگر وہ مقبول نہ ہوسکے، انکے خیالات کتابوں تک محدود رہ گئے، جو مورخین کے لیے ایک اچھا موضوع ہے،

کہ یہ ہندوستان کے [illegible]

اس فلسفہ کے مزاج نے مقامی مزاج سے ہم آہنگ و ہم آغوش ہو کر ایک نیا ہی عمل اور ایک نیا مکتبِ خیال پیدا کر لیا، یہاں کے مشائخ میں ایک بڑی تعداد اس مشرب کی حامی و حامل اور مبلغ و داعی نظر آتی ہے، (ص ۲۰۱) اس کے بعد شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، شیخ عبدالرزاق جھنجھانویؒ، شیخ محمد برہانپوریؒ اور شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ کے نام لئے گئے ہیں، یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو نیا مکتبِ خیال پیدا ہوا وہ کیا ہندوستان کے فلسفۂ وحدت الوجود سے متاثر ہوا، اور کیا اس نئے مکتبِ خیال اور ابن عربی کے وحدت الوجود میں فرق تھا، مقامی مزاج سے ہم آہنگ و ہم آغوش ہو کر اس نئے مکتبِ خیال سے کفر و اسلام، امر و نہی اور ثواب و عذاب کی تفریق باقی رہی کہ نہیں، جن بزرگوں کے نام اوپر درج کئے گئے ہیں، وہ تو اس تفریق کے قائل تھے، البتہ شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ کا رسالہ تسویہ متنازعہ فیہ ہو گیا تھا، مگر ان پر شیخ ابن عربی ہی چھائے رہے، انھوں نے فصوص الحکم کی شرحیں فارسی اور عربی دونوں میں لکھیں، اور سعادت و طاعتِ شریعت کو قبول کرنے کی دعوت دی، اس کے بعد یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ وہ کیا اور دوسرے صوفیائے کرام نے مقامی مزاج سے ہم آہنگ و ہم آغوش ہو کر وحدت الوجود میں کیا نئی چیز قبول کی جس سے ایک نیا مکتب خیال پیدا ہوا۔

حضرت مجددؒ کے بعد توحید وجودی کے بارے میں مشائخ و علماء کا جو مصالحانہ رویہ رہا، اس سلسلہ میں شاہ عبدالرحیمؒ، شاہ ولی اللہؒ، ان کے چچا شاہ ابوالرضاؒ، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، اور مرزا مظہر جانجاناںؒ کی رائیں بھی مختصر طریقہ پر لکھ دی جاتیں تو یہ بحث مکمل ہو جاتی، مولانا نے صرف اتنا لکھنے پر اکتفا کیا ہے کہ بعض بعد

بعض محققین نے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ اختلاف (یعنی وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا اختلاف) محض نزاعِ لفظی تھا، بعض حضرات نے یہاں تک لکھا کہ مجدد صاحبؒ سے اس بارہ میں تسامح ہوا، اور شیخ اکبر کی تمام تصنیفات ان کی نظر سے نہیں گذریں (ص ۴۰۹)، جہاں تک اس عاجز راقم کا مطالعہ ہے شاہ ولی اللہؒ ہی نے یہ تحریر فرمایا کہ شیخ محی الدینؒ ابن عربی کا وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کا وحدت الشہود ایک ہی شے کے دو نام ہیں، وجود و شہود محض نزاعِ لفظی ہے، ان میں مطابقت ہے، مخالفت نہیں، (مکتوب مدنی شایع کردہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور) یہ بہت ہی اہم رائے ہے، امید کہ مولانا ابو الحسن علی ندوی کو بھی اس رائے سے اتفاق ہوگا۔ اگر وہ اپنی شگفتہ تحریروں کے ذریعہ اس کی وضاحت فرما دیتے تو شاید وحدت الوجود . . . . . اور وحدت الشہود کا جھگڑا ختم ہو جاتا، اسی طرح جن حضرات کا یہ خیال ہے کہ مجدد صاحبؒ سے شیخ اکبر کے خیالات کے سمجھنے میں تسامح ہوا تو یہ تسامح واقعی ہوا یا نہیں، اگر اس کی بھی توضیح ہو جاتی تو ایک مفید کام ہوتا،

باب ہفتم کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مجددؒ اپنی رہائی کے بعد لشکر شاہی کے ساتھ ساڑھے تین سال تک رہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مدت بھی حضرت مجددؒ کی نظر بندی کی تھی، مگر شاہی لشکر سے حضرت مجددؒ نے جو خطوط لکھے ان سے وہ جہانگیر کے شاکی نظر نہیں آتے، بلکہ اس کی صحبتوں میں جو دینی مذاکرے ہوتے رہے، اس سے وہ مطمئن دکھائی دیتے ہیں، بلکہ ان کے ایسے مکتوبات میں انشراحی کیفیت محسوس ہوتی ہے، خود مولانا ابو الحسن علی ندوی کا خیال ہے کہ جہانگیر کی تزک کی تحریروں میں حضرت مجددؒ کی صحبت و جذبات کا اثر صاف جھلکتا ہے (ص ۳۱۶) پھر بادشاہ اسلام نے اسلام سے دلچسپی لی (ص ۳۱۹) وہ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ شاہ جہاں کے عہدِ سلطنت پر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے اثرات سایہ افگن ہوئے، (ص ۳۱۹) انھوں نے

مختلف اقتباسات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں شریعت کا احترام کرتا تھا ...
قوانین شریعت کی پابندی ... لیکن ... لکھتے ہیں کہ اس کا احترام شریعت ... مسلم ہے ... کوئی شبہ نہیں کہ شریعت
اپنے متشرع، صاحب علم اور صاحب صلاحیت فرزند اورنگ زیب کے مقابلہ میں اپنے صلح کل اور آزاد مشرب
بڑے بیٹے دارا شکوہ کو ترجیح دیتا تھا، اور اسی کو تخت و تاج کا وارث اور اپنا
جانشین بنانا چاہتا تھا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ دکھ اور درد کے ساتھ لکھتے ہیں کہ یہی شخصی
و موروثی سلطنت کا اور دین و سیاست کی تفریق کے اصول پر کاربند فرمانروایان سلطنت کی
وہ خصوصیت ہے جو ان کی ذاتی دینداری اور سلطنت پر اثر انداز اور کسی غلط یا
مضر جانشین کے انتخاب میں مانع نہیں بنتی، (ص ۲۲ - ۳۲۱)

اسی باب میں مولانا دارا شکوہ کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ عہد عالمگیری میں جو تاریخیں مرتب
کی گئی ہیں، محض ان کے اعتماد پر ہم دارا شکوہ کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے، نہ اس کے
قطعی طور پر بے دین اور بدعقیدہ ہونے کا حکم لگا سکتے ہیں (ص ۳۲۲) مگر اسی کے بعد وہ
دائرۂ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار کا جب یہ حوالہ دیتے ہیں کہ وہ ہندو فلسفہ اور صنمیات
سے متاثر تھا، جس کی وجہ سے وہ متعدد ایسے ملحدانہ خیالات کی طرف مائل ہو گیا جن کے واضح
مماثل ہندو فلسفہ میں پائے جاتے ہیں، اور جن کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں (ص ۳۲۲) تو پھر
اسلامی نقطۂ نظر سے دارا شکوہ کے بے دین اور بدعقیدہ ہونے کا تو حکم لگ ہی جاتا ہے، اس کے
علاوہ دارا شکوہ نے اپنشد کے فارسی ترجمہ میں جو دیباچہ لکھا ہے، یا جگ بشست کے فارسی ترجمہ
کرانے کی جو وجہ بتائی ہے، اس سے خود وہ قطعی طور پر بے دین اور بدعقیدہ ظاہر ہو جاتا ہے،
پھر عالمگیری عہد کی تاریخوں کو اعتماد میں لینے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے،

اسی باب میں اورنگ زیب کی دینی حمیت کا ذکر ہے، جو حضرت مجدد کے خاندان سے

عقیدت مند تھا، اور ان کی دعوت سے شروع سے متاثر تھا، اس نے حضرت خواجہ محمد معصومؒ سے بیعت و ارادت کا تعلق بھی قائم کر لیا تھا، (ص ۳۲۲) حضرت مجددؒ کی اصلاحی وتجدیدی تحریک کا اثر تھا کہ وہ سلطنت کو ہادم اسلام کے بجائے خادم اسلام بنانے کی کوشش میں لگا رہا (ص ۳۲۷)

حضرت مجددؒ کی مخالفت اور تضلیل کی تحریک کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی تفصیل پڑھ کر عام قارئین کو یہ تکلیف ہوتی ہے کہ آخر ان کے خلاف مخالفت اور تضلیل کی تحریک کیوں چلائی گئی، مولانا ابو الحسن علی ندوی اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں کہ ایسا معاملہ اکثر ان نادرۂ روزگا شخصیتوں کے ساتھ پیش آیا ہے، جو کسی علم وفن کے مجتہد، کسی سلسلہ وطریق کے بانی اور اپنے زمانہ کی عام علمی ذہنی وباطنی سطح سے بلند ہوتی ہیں، اور جن کو اللہ تعالیٰ علوم وکمالات سے بھی سے نوازتا ہے، (ص ۳۳۷) مگر اس سے ان علماء کی براءت نہیں ہوتی، جو خواہ مخواہ مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں، اس سے ان انتشار پسندوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، جو اسلام کی ہر میں ایسی تحریکیں چلاتے ہیں، جن میں صرف انار کی، انتشار ضلالت، گمراہی اور پستی، بد دینی ہوتی ہے، ان کی مخالفت ہوتی ہے تو وہ اپنے گمراہ پیرودن اور سادہ لوح مقلدوں کو یہ کہہ کر تسلی دیتے ہیں کہ اسلام کی کون ایسی مفید تحریک ہے جس کی مخالفت نہیں کی گئی،

حضرت مجددؒ کی مخالفت کچھ دنوں شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے بھی کی ہے، مگر اس کا روشن پہلو یہ ہے کہ ان کی غلط فہمی جب دور ہوگئی تو ان کی مخالفت عقیدت میں تبدیل ہوگئی، حضرت مجددؒ کے متعلق ان کی ایک تحریر اخبار الاخیار کے آخر میں درج ہے، جس میں انھوں نے حضرت مجددؒ سے اپنی محبت وعقیدت اور اسی کے ساتھ ان کی جلالت وعظمت کا پورا اعتراف کیا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تحریر الحاقی ہے، شاید اسی لئے مولانا ابو الحسن علی ندوی نے اس کا حوالہ اپنی کتاب میں نہیں دیا ہے، اس دور میں کچھ ایسے اہل قلم بھی پیدا ہو گئے ہیں، جو

خلاف اوعادی وہم علمی وراثت کو الحاقی قرار دے کر اس میں شک و شبہ پیدا کر رہے ہیں۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ لکھنے کے سلسلہ میں کچھ مورخین من گھڑت فرضی اور مشکوک مواد کہیں کہیں سے منتخب کر کے اپنی من پسند تاریخ مرتب کرنے میں مشغول ہیں، مگر ہماری وراثت میں جو مفید چیزیں ہیں ہم لوگ ان سے فائدہ اٹھانے کے بجائے کچھ اہل قلم ان کو الحاقی اور فرضی قرار دینے میں مشغول ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا جو خط حضرت خواجہ حسام الدین دہلوی کے نام ہے اس کو مولانا ابوالحسن علی ندوی نے نقل کیا ہے، (ص ۳۳۹) اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں" ان کی (یعنی شیخ عبدالحقؒ کی) حضرت مجددؒ کے بارے میں غلط فہمی رفع ہوئی، اور آپ کا علوئے مقام ان پہ منکشف ہوا تو انھوں نے اس کی تلافی کرنے میں قطعاً تقصیر و تاخیر سے کام نہیں لیا اور بڑے بلند الفاظ میں حضرت مجددؒ کے ساتھ خلوص و محبت کا اظہار کیا جو ان کے جیسے عالم ربانی ہی کے شایان شان ہے، (ص ۳۳۹) اخبار الاخیار کے آخر میں جو تحریر ہے اس میں بلند الفاظ کے ساتھ اسی خلوص و محبت کا اظہار ہے، جو ان کے جیسے عالم ربانی ہی کے شایانِ شان ہے۔ اور جو بات شیخ عبدالحق نے حضرت خواجہ حسام الدین احمد دہلوی کو لکھی ہے، وہی اخبار الاخیار کے آخری ضمیمہ میں ہے صرف اجمال اور تفصیل کا فرق ہے، ظاہر ہے کہ ایک مکتوب میں وہ ساری باتیں نہیں لکھی جا سکتی تھیں جو اخبار الاخیار کی تحریر میں ہیں،

اسی باب میں اورنگ زیب عالمگیر کا ایک مراسلہ یا فرمان نقل کیا گیا ہے، جو ایک غیر معروف اور غیر مستند مصنف کی کتاب کاسر المخالفین سے لیا گیا ہے، اس میں اورنگ زیب کی طرف سے یہ روایت ہے کہ مکتوبات شیخ احمد سرہندی کے بعض مقامات ظاہراً عقائد اہل سنت کے مخالف ہیں، شیخ مذکور کے معتقد جو شہر اورنگ آباد میں سکونت رکھتے ہیں، ان کی اشاعت کرتے ہیں، ان کا درس دیتے ہیں، ان عقائد باطلہ کی حقیت پر اعتقاد رکھتے ہیں،

حکم ہے کہ اس کے درس وتدریس کو روک دیا جائے، اور جس کے متعلق معلوم ہو کہ وہ ان عقائد باطلہ پر اعتقاد رکھتا ہے، اس کو سزائے شرعی دی جائے۔ (ص ۳۰۱)

اورنگ زیب کو حضرت مجددؒ اور ان کے خاندان سے جو روحانی اور قلبی تعلق تھا اسکی بنا پر یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا ہے، کہ وہ اس نتیجہ پر پہونچا ہو کہ مکتوبات شیخ احمد سرہندیؒ کے بعض مقالات ظاہراً عقائد اہل سنت کے مخالف ہیں، اگر یہ مراسلہ یا فرمان اورنگ زیب کے ضخیم مجموعۂ فرامین میں مل جائے تو اسکو مستند سمجھنے میں کسی کو عذر نہ ہوگا، دار المصنفین میں فیاض القوانین کا ایک ضخیم عمدہ نسخہ موجود ہے، راقم کی نظر اس پر جہاں تک گئی، اس میں یہ مراسلہ یا فرمان نہیں گذرا، اس سے یہ یقین کامل ہے کہ یہ ایک غیر مستند، جعلی اور فرضی تحریر ہے، جس کو حضرت مجددؒ کے مخالفین نے وضع کیا ہے، اور اس کو ایک یہودی مصنف نے زیادہ اہمیت دی ہے، جو اس بات کا مزید ثبوت ہے، کہ یہ افترا محض انتشار پسندی کی خاطر کیا گیا ہے،

حضرت مجددؒ کے خلفائے کبار اور ان کے منتسبین کے ذریعہ سے ان کے تجدیدی کام کی جو توسیع اور تکمیل ہوئی، اس کی تفصیل کتاب کے باب ہشتم میں ہے، اور آخر میں حضرت مجددؒ کی تمام تصانیف کا ذکر ہے، آخر میں بے اختیار ہو کر یہ لکھنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ اہم اور مفید کتاب ایسی ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے مسلمان قارئین کے ذہن پر نہ صرف ہندوستان کی ایک عظیم مذہبی شخصیت کی عظمت، جلالت اور اہمیت کا اندازہ ہوگا، بلکہ خود ان کی دینی حمیت میں جلا پیدا ہوگی، اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ضرور ہونا چاہئے، البتہ انگریزی ترجمے میں بعض ثانوی ماخذوں کو نکال کر معاصر ماخذوں کے حوالے زیادہ سے زیادہ دیے جائیں، جو آسانی سے حاصل کیے جا سکتے ہیں،

"ص۔ ع"

مطبوعات جدیدہ

اجتہاد کا تاریخی پس منظر: مرتبہ مولانا محمد تقی امینی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۱۶، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۸ روپیے، غیر مجلد ۱۵ روپیے، پتہ ادارہ علم و عرفان، امینی منزل، دودھ پور روڈ، علی گڑھ۔

اجتہاد مسلمانوں کی دقیقہ سنجی، نکتہ رسی، بصیرت، ژرف نگاہی، تفریع، استنباط، استدلال اور غور و فکر کا حیرت انگیز ثبوت ہے، اس کتاب میں اجتہاد کا تاریخی پس منظر اور تدریجی ارتقا بیان کر کے اس کے اہم اصول و ضوابط اور نامور مجتہدین کے طریقۂ استنباط کی خصوصیات تحریر کی گئی ہیں، اور اجتہاد کے سلسلہ میں مسلمانوں کا تاریخی کردار اور کارنامہ دکھایا گیا ہے، پہلے اجتہاد کی تعریف، اہمیت، اس کے شرعی دلائل، اس کے لئے ضروری اوصاف اور اس کی صورتیں بیان کی ہیں، اس ضمن میں شعور نبوت و شعور اجتہاد کی دقیق و لطیف بحث اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد کے بعض نمونے بھی دیئے ہیں، پھر آپ کے بعد کے زمانہ کے ترقی پذیر معاشرہ میں اجتہاد کی وسعت و ترقی دکھلانے کے لئے اسکے تین دور کا ذکر ہے، پہلا اور دوسرا دور صحابہ و تابعین کے اجتہادی کارناموں پر مشتمل ہے، اور تیسرا دور ائمۂ مجتہدین کے اجتہاد پر بحث کے لئے خاص ہے، یہی اس کتاب کا زیادہ اہم حصہ ہے، اس میں فقہائے اربعہ اور بعض دوسرے ممتاز فقہا کے استنباط کے طریقے اور مثالیں درج ہیں، مصنف نے مختلف قوموں کے اختلاط سے اسلامی معاشرہ میں پیدا ہونے والی بحرانی کیفیت اور کشمکش کا مقابلہ کرنے کے لئے فقہاء کے اجتہاد کے زریں اصول وضع کرنے کا ذکر کیا ہے، اور دکھایا ہے کہ اجتہاد کی تین قسمو

توضیح، استنباطی اور استصلاحی میں غیر معمولی وسعت دے کر انھوں نے ہر دور اور ہر معاشرہ میں خوشگوار زندگی کے لیے رہنمائی آسان کر دی ہے، ان بحثوں میں اجتہاد کی مختلف قسموں اور ضوابط کے علاوہ اس کی متعدد اصطلاحات کی تعریف و توضیح مثالوں کے ذریعہ کی ہے، اسطرح اس کتاب سے اجتہاد کا تاریخی پس منظر بھی سامنے آجاتا ہے، اوّلیات کے مجتہدین کی غیر معمولی تحقیق، تدقیق، کاوش اور دقت نظر وغیرہ کا مرقع بھی ہے، مصنف کو جس طرح اجتہاد کی نزاکتوں کا احساس ہے، اسیطرح موجودہ دور کی پیچیدگیوں کا بھی اندازہ ہے، اس موضوع پر ان کی متعدد مفید کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان سے دور حاضر میں اجتہاد کی راہ ہموار ہوتی ہے، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی اور اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے،

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمرے اور سفر حجۃ الوداع } مرتبہ جناب مولوی معین الدین رہبر فاروقی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۹۰، قیمت پانچ روپیے، پتہ از، مولف بیرون یاقوت پورہ محلہ الی بن مکان نمبر ۱-۳-۰۵-۴ حیدر آباد دکن۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمروں کا ذکر ہے، اور دوسرے میں حجۃ الوداع کی تفصیل درج ہے، پہلے حصہ میں عمرۃ القضا اور عمرۃ الجعرانہ کے علاوہ صلح حدیبیہ کا مفصل تذکرہ ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سفر بھی عمرہ ہی کے ارادہ سے کیا تھا، لیکن کفار کی مزاحمت سے آپؐ عمرہ نہ کر سکے۔ تاہم یہ تاریخ اسلام کا اہم بالشان واقعہ ہے، اور یہی صلح فتح مبین کا پیش خیمہ بنی، اس لئے لائق مصنف نے آنحضرتؐ کے اس سفر کے عام حالات و واقعات، بیعت رضوان، صلح کے بارہ میں مسلمانوں کے فوری ردعمل، اس کی شرطیں اور اس سے متعلق آیتیں نقل کر دی ہیں، دوسرے حصہ میں حجۃ الوداع کے آغاز سے اختتام تک کے تمام حالات و واقعات تاریخ وار بیان کئے ہیں، اس ضمن میں حج کے ارکان و مناسک، خطبۂ حجۃ الوداع اور اس میں بیان کئے گئے احکام کی تشریح کی ہے،

سنہ ۱۰ھ [illegible] آنحضرت نے حضرت [illegible]
کی ملاقات سے متعلق ہیں، شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی مدارج النبوۃ کی کتاب بڑی مستند اور مفید ہے، اس
کتاب میں احادیث بہت نقل کی گئی ہیں، لیکن مولانا کی کتاب عربی میں تھی، اردو میں غالباً یہ پہلی جامع
کی پہلی کتاب ہے، اس کے متن میں جن اشخاص اور جگہوں کے نام آئے ہیں، ان کی اور بعض دوسرے علمی
و فقہی مسائل کی حواشی میں توضیح کر دی گئی ہے، اور حجۃ الوداع میں آپ کے مدینہ سے مکہ کی روانگی
اور واپسی کے راستوں کے نقشے بھی دیے ہیں، لیکن اس میں کہیں کہیں ضعیف روایات بھی درج ہو گئی ہیں، مثلاً
لکھتے ہیں حضرت میمونہؓ کا انتقال ۵۱ھ میں ہوا...... ازواج النبی میں سب سے آخر میں آپ کی وفات
ہوئی، یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں، گو حضرت میمونہؓ کے سنہ وفات کے متعلق مختلف روایتیں ہیں، مگر صحیح روایت
۵۱ھ کی ہے، اور حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کا انتقال ان کے بعد ہوا تھا، ازواج مطہرات میں سب سے
آخر میں حضرت ام سلمہؓ کا انتقال ہوا تھا،

پیکر ۱ــ از جناب رشید انصاری صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۹۰، مجلد
مع گرد پوش، قیمت صہ، پتہ آل انڈیا ہندی اردو سنگم باغ انوار لکھنؤ ۳

یہ جناب رشید انصاری کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے، انھوں نے غزل کے روایتی پیکر میں نئے حالات و مسائل کی
ترجمانی کی ہے، اور فکر نو کو جذبۂ احساس میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، وہ درد و غم کے لذت آشنا ہیں، مگر
عشق و محبت کی عظمت و برتری کا احساس بھی ہے، اور وہ اس راہ کی صعوبتوں پر آہ و فریاد نہیں کرتے بلکہ زخم کھا کر
مسکراتے ہیں، ان کے یہاں عشق کی بلند ادائیں، غیرت، خودداری، خود اعتمادی، عزم و جہد کا ذکر بھی ہے، اور ترقی
و خردمندی کے اس دور کی خامیوں پر ان کی نظر بھی ہے، اس لئے اس مجموعہ میں غزل کی رنگینی و لطافت
کے ساتھ اچھے جذبات کے نمونے بھی ملتے ہیں، رشید انصاری نوجوان شاعر ہیں، مشق سے ان کے کلام میں
پختگی اور مزید رچاؤ پیدا ہوگا۔

دلاورانِ اسلام :۔ مرتبہ خواجہ جمیل احمد صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت تحریر نہیں، پتہ: اردو اکیڈمی سندھ، کراچی (پاکستان)

مسلمانوں کی تاریخ کا کوئی دور بھی بہادروں اور دلاوروں سے خالی نہیں، یہ کتاب ان کے زریں جنگی کارناموں کا مرقع ہے، اس میں عہدِ رسالت سے اس صدی تک کے مندرجہ ذیل فاتحین اور سپہ سالاروں کی حربی مہارت اور فتوحات کا تذکرہ ہے، (۱) حضرت امیر حمزہؓ (۲) حضرت علیؓ (۳) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ (۴) حضرت خالد بن ولیدؓ (۵) حضرت ابو عبیدہؓ (۶) حضرت عمرو بن عاصؓ (۷) موسیٰ بن نصیر (۸) طارق بن زیاد (۹) محمد بن قاسم (۱۰) یوسف بن تاشفین (۱۱) محمود غزنوی (۱۲) سلطان صلاح الدین ایوبی (۱۳) شہاب الدین غوری (۱۴) بختیار خلجی (۱۵) سلطان بایزید یلدرم (۱۶) صاحبقران تیمور (۱۷) سلطان محمد فاتح (۱۸) ظہیر الدین بابر (۱۹) خیر الدین باربروسہ (۲۰) نادر شاہ افشار (۲۱) احمد شاہ ابدالی (۲۲) حیدر علی (۲۳) ٹیپو سلطان (۲۴) جنرل بخت خان (۲۵) مصطفےٰ کمال (۲۶) شاہ عبد العزیز بن سعود (۲۷) غازی انور بے (۲۸) مہدی سوڈانی، یہ سب نام حسنِ انتخاب کا نتیجہ ہیں گو ان سب کی شجاعت اور دلیری کے کارناموں سے اسلامی تاریخیں بھری ہیں، فاضل مصنف نے ان کو بہت سلیقہ سے یکجا کر دیا ہے، متعصب غیر مسلم مورخین نے اسلام کے ان بہادروں کو جنگجو اور خونخوار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اس کتاب کا مقصد اس کی تردید ہے، اس لئے مصنف نے ان حضرات کے جنگی کارناموں کے ساتھ ان کی مروت، شرافت، نیکی، رحمدلی، عدل و انصاف پسندی اور علم و ہنر پروری کا بھی ذکر کیا ہے، اور دکھایا ہے کہ انھوں نے جس سرزمین کو فتح کیا وہاں خوشحالی اور فارغ البالی آگئی، اور امن و امان اور عدل و انصاف کا گہوارہ بن گئی کیونکہ ان کا مقصد مال و زر اور جاہ و حشمت کی طلب اور کشور کشائی نہ تھا، شروع میں جنگ کا اسلامی مقصد بھی بتایا ہے، اور مشہور اسلامی فتوحات کا تذکرہ بھی کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو اکثر جنگوں میں کامرانی

نصیب ہوئی اور جو کچھ شکست ہوئی [illegible] کی سلطنت کے موجودہ زوال کا سبب کیا ہوا
ہے، دوسری عیش کوشی اور شغل سے دوچار ہے، خواجہ جمیل [illegible] صاحب پاکستان کے انگریزی اور اردو
کے مشہور مصنف ہیں، مسلمانوں کے زریں کارنامے ان کی اکثر کتابوں کا موضوع ہے، یہ کتاب بھی اسی
کی کڑی ہے، امید کہ مسلمان اپنے اسلاف کے ان ولولہ انگیز واقعات سے سبق حاصل کریں گے،

دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی ادبی خدمات — مرتبہ جناب مجید بیدار صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ اچھا، کتابت و طباعت بہتر،
صفحات ۸۰، قیمت ۱۰ روپیے، پتہ (۱) الیاس بک ٹریڈرس پنج محلہ حیدرآباد
(۲) ادارہ فروغ اردو، ۱۳۰، امین آباد پارک لکھنؤ (۳) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، دہلی،

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا دارالترجمہ و تالیف کب کا قصہ پارینہ بن چکا ہے، لیکن اس کی خدمات فراموش کردینے کی چیز نہیں،
زیر نظر رسالہ میں دارالترجمہ کے کارنامے پیش کیے گئے ہیں، یہ سات ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں اس کا پس منظر، قیام،
مقصد، اہمیت اور خصوصیت درج ہے، دوسرے باب میں اس کی مجلس وضع اصطلاحات پر گفتگو ہے، اس میں اردو
اصطلاح سازی کی ضرورت، مجلس کی وضع اصطلاحات کے طریقے اور دوسری خصوصیات بیان کرکے یہ دکھایا ہے کہ وضع
میں کس قدر اہتمام اور کاوش کی جاتی تھی، تیسرے باب میں دارالترجمہ کے اس کارنامہ کا ذکر ہے کہ اس کی بدولت اردو میں
علوم و فنون کی ترویج ہوئی، اس میں ان علوم کی فہرست دی ہے جن پر دارالترجمہ نے کتابیں شائع کیں، کتابوں
کی تعداد بھی تحریر ہے، چوتھے باب میں دارالترجمہ کے ۳۰ برسوں کی کارگزاری کا نقشہ ہے، اسمیں مترجمین کے علاوہ کتابوں کے نام
بھی درج ہیں، پانچواں باب دارالترجمہ کے مترجمین و ارکان کی عظمت و خدمات پر مشتمل ہے، چھٹے باب میں دارالترجمہ کے اردو پر
احسانات کا ذکر ہے، ساتویں باب میں اس کے خاتمہ اور بربادی کی غمناک داستان ہے، مصنف نے مجلس وضع اصطلاحات کی تالیفی نو[illegible]
اہل علم کے اعتراضات کا ذکر کیا ہے لیکن دارالترجمہ کے تراجم کا اس حیثیت سے جائزہ نہیں لیا ہے، یہ کتاب ایم۔اے کا ایک مقالہ ہے،
دارالترجمہ و تالیف جیسے عظیم الشان ادارہ کا حق [illegible] ادا نہیں ہوسکا، تحریر میں ژولیدہ بیانی ہے، جملوں کا دروبست
ٹھیک نہیں، بعض لفظوں کا استعمال بھی برمحل نہیں، زبان کی غلطیاں بکثرت ہیں، حالانکہ اب مصنف مولانا آزاد کالج اورنگ آباد
[illegible]